ایک دلچسپ اور تفریحی میگزین

پندرہ روزہ

نئے اُفق

مارچ ۱۹۸۳ء

3-1983

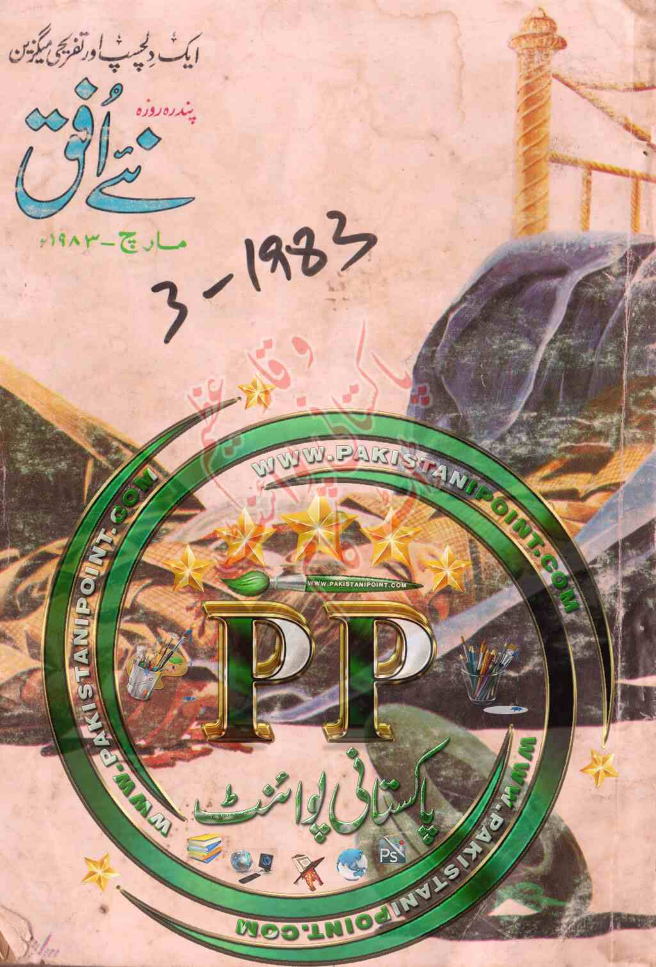

WWW.PAKISTANIPOINT.COM
پاکستانی پوائنٹ

نئے افق

۷۴

مُدیر ---- اظہر کلیم

جلد ---- ۷
شمارہ ---- ۳

مارچ ---- ۱۹۸۳ء
قیمت ---- دس روپے

مُنتظم ---- شیخ غلام احمد
نگران ---- مُشتاق احمد قریشی
نائب مُدیر ---- ابرار صفی
مُصوّر ---- رؤف تارا
تزئین ---- سلیم اختر

۸ گفتگو — اظہر کلیم
قارئین سے مُدیر ابن صفی میگزین کی کھٹی میٹھی اور دلچسپ باتیں، آپ بھی اس محفل میں شرکت کیجیے

۱۰ سرفروش — اظہر کلیم
انجانے دیسوں کے سیاح آفاقی سرفروش کی داستانِ حیات، ماضی کے تاریک اور پُراسرار پردوں میں جنم لینے والی سرگزشت

۴۳ کائی کی کلید — ش م جمیل
اُس قاتل کی گرفتاری پر بے شمار زندگیوں کا انحصار تھا۔ فرض کی راہوں پر بھٹکنے والے ایک فرض شناس پولیس افسر کا قصہ

۵۱ شب گرفتہ — فوزیہ ناہید
ایک نوعمر حسینہ کو پیش آنے والے پُراسرار واقعات سے لبریز کہانی برائے کرم کمزور دل اصحاب اسے رات کی تنہائی میں نہ پڑھیں

۷۹ تکیہ کلام — عمران احمد
سنائے کے حقائق سے چشم پوشی کا شاخسانہ ایک ایسے شخص کی روداد جو دور اندیش تھا اور اس نے کمال کی منصوبہ بندی کی تھی

۸۲ مسٹر ۵×۵ — شمیم امان
مٹاپے سے نجات حاصل کرنے والوں کے لیے لمحۂ فکریہ، اُس شخص کا افسانہ جو اپنی جسامت کم کر کے ناقابلِ شناخت بننا چاہتا تھا

۸۵ چاہِ آفات — محبوب اظہر
ایک بے ضرر سا چوہا پہاڑوں سے ٹکرا گیا اِس کی زندگی کا انحصار اس بات پر تھا کہ وہ زندگی کو زیادہ سے زیادہ خطرات میں ڈالے

۱۰۹ حرم کا گل — طاہر قریشی
ان لوگوں کے لیے بطورِ خاص جو آسانی سے شکست تسلیم نہیں کرتے۔ وہ لڑکی اپنی حیثیت سے کہیں زیادہ اونچے خواب دیکھنے لگی تھی

۱۱۹ پہیلی — صابر حسین
وہ سمجھتا تھا کہ انسانوں کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہوتا اور دولت دو محبت کرنے والوں کے درمیان دیوار نہیں بن سکتی

۱۲۹ ہمالیہ — ایم اے راحت
سنگلاخ چٹانوں کے دیس سے، خون اور آہوں میں ڈوبی ہوئی سرگزشت۔ نئے افق کے لیے ایم اے راحت کی دلچسپ ترین سلسلے وار کہانی

۱۶۳ خوابِ پریشاں — ش م جمیل
جرم کے اثرات فوراً ہی ختم نہیں ہوجاتے ایک صدی پر محیط مجرم کی داستانِ حیرت خوف وہراس میں ڈوبی ہوئی تحریر

۱۷۲ آغوش — اقبال کاردار
ماں کی آغوش بیٹے کے لیے ترس رہی تھی لیکن اس کے مجازی خدا نے بیٹے کو ایک عفریت میں بدل دیا تھا، ایک دلچسپ تخیل

۱۷۹ دو قالب — ناصر حسنانی
محبت جب جنون کی حدوں کو چھونے لگتی ہے تو کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ محبت کرنے والوں کے لیے ایک دل گداز تحریر، ایک منفرد افسانہ

۱۸۳ انگلی کا ہنگامہ — سیدہ حشام
ایک ننھے سے تابوت میں بند ایک کٹی ہوئی انگلی کا فساد۔ اس انگلی کی قیمت پچاس ہزار ڈالر تھی۔ تجسس پسندوں کے لیے تجسس آمیز تحریر

۱۹۳ پیمانۂ نفرت — شکیل صدیقی
ایک خط سے شروع ہونے والی خوفناک کہانی۔ مکتوب الیہ یہ خط پڑھ کر ایسی راہ پر چل نکلتا ہے جہاں پھانسی کا پھندا منتظر تھا

۲۰۱ غیر متوقع — انعام الدین
قانون کے اس محافظ کو عجیب امتحان سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کی منگیتر کی شرط یہ تھی کہ وہ ملازمت چھوڑ دے، پھر ایک عجیب صورتحال سامنے آئی

۲۱۰ بزدل سورما — ابن صفی
تھکے تھکے سے اور بوجھل لمحوں کے لیے اکسیر ابن صفی کی زندہ جاوید تحریر، عمران کا ایک شوخ اور دلچسپ کارنامہ، ایک مکمل ناول

۲۵۵ آپ کی عدالت — عبید احمد
ابن صفی میگزین کا انعامی سلسلہ مقدمے کا فیصلہ کیجیے۔ پُر تجسس اور دلچسپ کہانی۔ آپ کی ذہانت کو چیلنج

WWW.PAKISTANIPOINT.COM
پاکستانی پوائنٹ

پبلشر: مشتاق احمد قریشی ◎ پرنٹر: وسیم احمد صابری ◎ مطبوعہ: شیخ سلطان ٹرسٹ پریس کراچی
مقام اشاعت: ۵/اے، ۸/۲ ناظم آباد کراچی ◎ خط وکتابت کا پتہ: جی پی او بکس ۸۷۴ کراچی ◎ فون ۲۱۴۳۵۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

گفتگو

قارئینِ گرامی!

نئے اُفق کا ۴۹، واں شمارہ پیشِ خدمت ہے۔

گزشتہ ماہ "سرفروش نمبر" پیش کیا گیا تھا جسے بے پناہ پسند کیا گیا۔ بعض خطوط ایسے بھی موصول ہُوئے جن سے اندازہ ہُوا کہ ہماری یہ کاوش کچھ دوستوں کی پسند کے معیار پر پوری نہیں اُتری چونکہ بیشتر قارئین نے اسے سراہا اس لیے میَں اسے ایک کامیاب نمبر کہنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا۔ اَب کچھ دوستوں کا اصرار ہے کہ ماہنامہ نیا رُخ کی سِلسلے وار کہانی "ٹائیگر" کا خصوصی شمارہ بطور "ٹائیگر نمبر" بھی شائع کیا جائے۔ انشاء اللہ آیندہ ماہ کے آخر تک اس کی تیاری مکمّل ہو جائے گی تو یہ خصوصی شمارہ بھی پیش کر دیا جائے گا اور اس سلسلے میں میری انتہائی کوشش یہ ہوگی کہ جن چند اصحاب کو سرفروش نمبر زیادہ پسند نہیں آیا تھا، انھیں ٹائیگر نمبر ضرور پسند آئے۔ یہ ایک وعدہ ہے اور آپ جانتے ہی ہیں کہ وعدے نبھانے کے سِلسلے میں میری ساکھ خراب نہیں ہے (اپنے گھر والوں اور قریبی دوستوں سے معذرت کے ساتھ جنھیں باقاعدگی سے مِلنے جُلنے اور باقاعدگی سے خط لکھنے کا وعدہ میں کبھی پُورا نہیں کر سکا)۔ ٹائیگر نمبر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوگی کہ ڈاکٹر ایم۔ اے قریشی صاحب اس سِلسلے وار کہانی کے تقریبًا ایک سو بیس صفحات لِکھنے پر کمر بستہ ہیں۔ اللہ ان کی کمر اور ان کے بستے پر رحم کرے۔ یہ ڈائجسٹوں کی تاریخ میں غالبًا سب سے طویل قسط ہوگی۔ ایک بات اور نوٹ کر لیجیے کہ اَب ہمارے ادارے کے پرچے ہر ماہ اس ترتیب سے آپ تک پہنچا کریں گے۔ نیا رُخ ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ، نئے اُفق ہر ماہ ۱۵ تاریخ اور خواتین کا ماہنامہ آنچل ہر ماہ ۲۰ تاریخ کو شائع ہُوا کرے گا۔ اَب آیئے اپنے خطوط کی طرف جن کی اشاعت کے لیے آپ منتظر رہتے ہیں۔ اس ماہ سب سے پہلا خط م۔ س۔ اقبال صاحب کا شاملِ اشاعت کر رہا ہُوں کیوں کہ انھیں نہ جانے کیسے یہ شُبہہ ہو گیا ہے کہ ان کا تنقیدی خط شاملِ اشاعت نہیں ہوگا۔ لِکھتے ہیں: عرصہ دراز سے ڈائجسٹوں کا قاری ہوں اور تقریبًا تمام اچھے ڈائجسٹ میرے پاس آتے ہیں ڈائجسٹوں کے اضافے سے میری خالی اور ویران راتیں آباد ہو گئی ہیں۔ "مقدس ہیرا" نامی کہانی چھ یا سات سال قبل ایک معروف رسالے میں کسی اور عنوان سے شائع ہو چکی ہے۔ آپ کے ہاں شائع ہونے والی کہانی میں بعض نام بھی بدلے گئے ہیں۔ نئے اُفق میرے محبوب مصنّف کا رسالہ ہے جو خود تو چلا گیا لیکن ورثہ آپ کے حوالے کر گیا۔ اس ورثے کی حفاظت کرنا آپ کا فرض ہے۔

برادرم اقبال! اگرچہ آپ کا خط باری آنے پر شاید تین ماہ بعد شائع ہونا چاہیے تھا لیکن آپ کی بے اطمینانی کے باعث اسے جلد جگہ دے رہا ہوں۔ محترم! تراجم کے سلسلے میں بڑی احتیاط سے کام لیا جاتا ہے اس کے باوجود کبھی کبھی کوئی کہانی پھسل ہی جاتی ہے۔ ایسا دانستہ نہیں کیا جاتا۔ آخر گزشتہ چھ سال میں آپ کو یہ شکایت کرنے کا کتنی بار موقع مِلا ہے؛ اس قسم کے REPRINT کو چوری اور سرقے کا نام نہ دیا کریں۔ ممکن ہے، آپ نے یہ کہانی پہلے بھی پڑھی ہو لیکن بیشتر قارئین نے اس کی بے پناہ پسندیدگی کے خطوط بھی لِکھے ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ کہانی اُنھوں نے پہلے کبھی نہیں پڑھی۔ بہرحال اس سِلسلے میں آپ کی باریک بینی اور تنقید ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے اور ہمیں خوشی ہے کہ آپ ہمارے رسالے کو اچھے رسالوں میں شمار کر کے خریدتے ہیں۔

عزیز احمد، رام نگر لاہور سے فرماتے ہیں: سرفروش نمبر پڑھا۔ یہ نمبر مُبارک باد کا مستحق ہے۔ خاص طور سے ایم۔ اے راحت کی سِلسلے وار کہانی ہمالیہ نے لاج رکھی۔ جب کہ سرفروش کی قسط ہلکی تھی۔ باقی کہانیاں بہت اچھی تھیں۔

عزیز بھیّا! سرفروش نمبر مجموعی طور پر آپ کو پسند آیا۔ یہی بڑی بات ہے۔ ہمالیہ کی پسندیدگی کا شُکریہ۔ مجھے افسوس ہے کہ سرفروش کی طویل قسط آپ کو زیادہ پسند نہیں آئی۔ ڈائجسٹ اسی لیے زیادہ پڑھے جاتے ہیں کہ اس میں ہر قاری کی پسند کا کچھ نہ کچھ سامان ضرور ہوتا ہے۔

اشوک کمار انجم بنو عاقل سے لِکھتے ہیں: سرفروش بہت اچھی کہانی ہے۔ پڑھ کر لُطف آ گیا۔ وحشی کیوں بند کر دی؟ ہمالیہ بھی اچھی رہی۔ مقدّس ہیرا، چکّر باز، ہاتھ کی صفائی اور شاہین خاص طور سے بے حد پسند آئیں۔

بھائی اشوک! آپ کو سرفروش نمبر پسند آیا شکریہ۔ . . . وحشی اس لیے بند کر دی کہ اس کی جگہ آپ کو ایک اور اچھی کہانی ہمالیہ پڑھنے کو دی جا سکے۔ اُمید ہے آپ آیندہ بھی ہمیں یاد کرتے رہیں گے۔

ناصر سعید ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل لاہور سے کہتے ہیں: پیاسوں کی پیاس تو سرفروش نمبر نے بُجھا دی مگر آپ نے شہباز اس میں شائع نہیں کی۔ ہمالیہ اچھی لگی۔ خاص طور سے مقدس ہیرا نے بہت متاثر کیا۔ آپ نے تصویر شائع کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ مارچ کے شمارے میں ضرور شائع کریں بلکہ اسے گفتگو کے صفحے پر ہر ماہ شائع کیا کریں۔

محترم ناصر سعید! سرفروش نمبر کی پسندیدگی پر اس قدر پُرجوش خط لِکھنے کا شکریہ۔ جو کچھ آپ کو پسند آیا، اس کے لیے بھی ہمیں خوشی ہے۔ تصویر کھنچوانے کی فرصت تو مِلنے دیں۔ ابھی جا کر کھنچواؤں گا تو شائع ہونے والی تصویر کسی اشتہاری مجرم کی شبیہ لگے گی۔ مَیں بہرحال آپ کا امیج خراب نہیں کرنا چاہتا۔ . . اور یہ فرمائش جلد پُوری کر دیں گے۔ شہباز کی مکمل کہانی ماہنامہ نیا رُخ کے تازہ شمارے میں موجود ہے۔

فاروق احمد۔ اللہ یار خان۔ موضع کلوآنی سے فرماتے ہیں: عرصہ دراز سے آپ کا ماہنامہ ہماری تنہائیوں کا بہترین رفیق ہے۔ بڑی بے چینی سے انتظار کرتے ہیں۔ ہمیں نہ تو تنقید کے پتھر برسانے آتے ہیں اور نہ ہی تعریف کے پھُول نچھاور کرنے کا ڈھنگ آتا ہے کہ آپ کی توجہ کے مستحق قرار پائیں۔ جنوری کے شمارے کے سرورق میں کوئی جاذبیت نہیں تھی۔ وحشی کا انجام کچھ اچھے انداز میں نہیں ہُوا۔ سرفروش بہت اچھی جا رہی ہے۔ ہم لطائف بھیجیں تو شائع ہو جائیں گے؟

فاروق اور اللہ یار، برادران! آپ کا محبت نامہ شاملِ اشاعت ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ ہمارا ماہنامہ آپ کی تنہائیوں کا بہترین رفیق ہے۔ آپ نے جس بے لوث انداز میں خط لکھا، بس یہی ڈھنگ . . . ہماری توجہ آپ کی طرف مبذول کرانے کے لیے کافی ہے۔ سرفروش کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ لطائف ضرور بھیجیں۔ ضرور شائع ہوں گے بشرطیکہ اچھے ہوں۔

قاضی خالد مسعود نے منگلا ڈیم ضلع جہلم سے بہت ہی پیارا سا پنجابی زبان میں خط لکھا ہے۔ پنجابی میری مادری زبان ہے اور اس سے مجھے بے پناہ محبت ہے۔ اس زبان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جذبات کے اظہار میں بے پناہ شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ بھیّا خالد مسعود! مجھے افسوس ہے کہ مَیں آپ کا خط من وعن شائع نہیں کر رہا۔ بہرحال یہ خط مجھے بہت عرصے تک یاد رہے گا۔ آپ کو سرفروش پسند آئی۔ اس کے لیے شکریہ۔ اس کے صفحات میں اضافے کی فرمائش پُوری کر دی گئی ہے۔ اُمید ہے آپ آیندہ بھی ہمیں یاد کرتے رہیں گے۔

آیندہ ماہ پھر ملاقات رہے گی — انشاءاللہ

اظہر کلیم

انجانے دیسوں کے سیاح آقلئے سرفروش
کی داستانِ حیات، ماضی کے تاریک اور پُراسرار
پردوں میں جنم لینے والی سرگزشت

اظہر کلیم

میں صرف نام ہی کا سرفروش نہیں ہوں، سرفروشی میرا پیشہ بھی ہے۔ مارشل آرٹس کی تربیت مکمل کرنے کے بعد میں نے ایک تربیتی کلب کھولا لیکن دیانت داری سے کام جاری رکھنا مشکل ہو گیا۔ دوسرے کلبوں کے اساتذہ جرائم پیشہ تھے۔ اُنھوں نے مجھے بھی اپنے ساتھ ملانا چاہا لیکن میں نے صاف انکار کر دیا۔ یہ انکار میری زندگی کی نفی کا اشارہ بن گیا اور مجھے تختۂ دار تک لے گیا لیکن میں ایک حادثے کی وجہ سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ میری بدقسمتی تھی یا خوش قسمتی کہ میں قانون کے ہاتھوں سے تو محفوظ ہو گیا لیکن میری گردن ایک اور پھندے میں پوری آ گئی۔ میں ایک ایسی عمارت میں پناہ لینے پر مجبور ہو گیا جہاں سے باہر آنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ یہاں ایک بوڑھا سائنسدان، ڈاکٹر فریدل

WWW.PAKISTANIPOINT.COM
پاکستانی پوائنٹ

تجربات میں مصروف تھا۔ اس نے میرے سامنے موت سے ہمکنار ہونے کی دو تجویزیں رکھیں جن میں سے ایک میں نے قبول کرلی۔ اس نے کمپیوٹر کے ذریعے مجھے قدیم اشکانی دَور میں منتقل کر دیا۔ وہاں ایک خوفناک سفر درپیش رہا حتی کہ ڈاکٹر فریدوں نے مجھے واپس بُلالیا۔ اگرچہ اس دَوران میں اصل مجرم قانون کے ہاتھ لگ گئے تھے اور میں قتل کے الزام سے بُری ہو گیا تھا لیکن ڈاکٹر فریدوں سے نجات ممکن نہ تھی۔ اس نجات کا مطلب سیدھی سیدھی موت تھا۔ اب وہ وقفے وقفے سے مجھے مختلف اَدوار میں بھیجنے لگا۔ رفتہ رفتہ اعتماد بحال ہُوا تو مجھے قدرے آزادی بھی مل گئی لیکن اس آزادی سے استفادہ کرتے ہُوئے میں اپنی منگیتر لالہ رُخ سے شادی نہ کرسکا اور آخر میں یہ المیہ ہُوا کہ عین اس وقت جبکہ کمپیوٹر مجھے تحلیل کرکے واپس بُلا رہا تھا، ایک تیر میری پسلیوں میں پیوست ہو گیا۔ میرے مرنے اور اپنے دَور میں منتقل ہونے کا عمل بیک وقت شروع ہوگیا۔

اب آپ اس سنسنی خیز کہانی
کے باقی واقعات ملاحظہ فرمائیے!

بڑی ہی عجیب صورتِ حال تھی۔

ایک طرف تو میرا جسم تحلیل ہو رہا تھا اور دُوسری طرف موت تیزی سے مجھے اپنی آغوش میں سمیٹ لینا چاہتی تھی۔ ایک طرح سے میں دُہری موت کا شکار ہو رہا تھا۔ ڈُوبتے ہُوئے ذہن کے ساتھ میں صرف یہی سوچ رہا تھا کہ اگر میرے دماغ نے، جسم تحلیل ہونے سے پہلے پہلے کام کرنا بند کر دیا تو کمپیوٹر میری ہستی کو فی الفور رَد کر دے گا اور میں جہاں ہُوں، وہیں رہ جاؤں گا... گویا کئی صدیوں پہلے کے اس گمنام دَور میں موت سے ہمکنار ہو جاؤں گا۔

ذہن پر تاریکی کا غلبہ بڑھتا جا رہا تھا۔

جسم کے تحلیل ہونے کا عمل بھی بڑی سرعت سے جاری تھا۔

اچانک مجھے یُوں لگا جیسے میں زندہ تو ہُوں لیکن میرا نام و نشان تک مِٹ چکا ہے۔ میری ہستی بکھر گئی ہو اور میرا ذہن موت کی بھاری سِل تلے ناکارہ ہو کر رہ گیا ہو... اور اندھیروں نے مجھے نِگل لیا ہو۔

⁂

ذہن بیدار ہُوا تو اپنی ہستی اور اپنے وجُود کا احساس ہونے لگا۔ اس کے باوجُود یہ ڈر اور یہ خوف بھی لاحق رہا کہ آنکھ کُھلے گی تو میں اپنے اعمالوں کی سزا بھگتنے کے لیے قُدرت کی عدالت میں کھڑا ہُوں گا... لیکن جب چشمِ تصوّر بند ہُوئی اور ظاہری آنکھیں ماحول کی تصویر میرے ذہن میں منتقل کرنے لگیں تو مجھے سب سے پہلے ڈاکٹر فریدوں کا چہرہ دکھائی دیا۔ وہ بڑے ہی شفیق انداز میں مجھے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

"ڈاکٹر...!" میں نے گھُٹی گھُٹی سی آواز میں کہا۔ "میں زندہ ہُوں ... یا آپ بھی انتقال فرما کر میرے ساتھ جہنم رسید ہو چکے ہیں؟"

"ہم دونوں ہی زندہ ہیں۔" وہ ہنس کر بولا۔ "اس بار تم بال بال بچے ہو۔ اگر تمھیں یہاں پہنچنے میں صرف بیس سیکنڈ کی دیر ہو جاتی تو تمھاری موت یقینی تھی۔ کمپیوٹر نے جیسے ہی تمھاری تجسیم کی، میں نے دیکھ لیا کہ تم قریب المرگ ہو۔ تمھاری واپسی پر میں ہمیشہ کسی نہ کسی غیر متوقع صُورت حال کے لیے تیار رہتا ہُوں۔ میری یہی احتیاط پسندی کام آگئی اور تمھیں فوری طبّی امداد بہم پہنچا دی گئی جس کے نتیجے میں تم نہ صرف زندہ ہو بلکہ میں دیکھ رہا ہُوں کہ تمھاری زندہ دلی بھی برقرار ہے۔ تمھاری یہی خوبی تمھیں دُوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔"

میں نے ایک طویل سانس لی تو میری پسلی میں خفیف سی ٹیس اُٹھی اور یہ سانس ایک کراہ میں ڈھل کر رہ گئی۔

"اتنی لمبی سانسیں نہ لو، ڈیئر!" ڈاکٹر فریدوں نے بڑے پیار سے کہا۔ "کہیں ٹانکے نہ کُھل جائیں۔ تمھیں اس بستر پر آج تیسرا ہفتہ ہے۔ اُمید ہے کہ آئندہ چند ہفتوں میں تم بالکل تن دُرست ہو جاؤ گے۔ اس وقت تک کے لیے تمھیں مکمل چھٹی دی جاتی ہے۔ اگلے ہفتے ٹانکے کُھل جائیں تو تمھیں یہاں سے رُخصت کرکے ساحلِ سمندر بھیج دیا جائے گا۔"

میں نے آنکھیں بند کرلیں۔

... اور گہری نیند میں ڈُوب گیا۔

وسط مارچ کے دن تھے۔

میں صحت یاب ہونے کے بعد تفریحی چھٹیاں منا رہا تھا اور اب مجھے اس شعر پر یقین آچکا تھا کہ...

وقت دونوں طلسم رکھتا ہے
آپ ہی زخم اور آپ ہی مرہم

اگر ایسا نہ ہوتا تو میں شاید لالہ رُخ کو کبھی نہ بھول پاتا جو میری زندگی میں بہاریں لائی تھی لیکن مجھے خزاؤں کی تحویل میں دے کر نہ جانے کس کے آنگن میں جا اُتری تھی۔ تب مجھے انگریزی زبان کی یہ مثل بہت یاد آنے لگی... کہ مرد، عورتوں کے لیے تاج و تخت چھوڑ دیتے ہیں لیکن عورتیں اُن کے لیے صرف کانٹے چھوڑ جاتی ہیں... مگر وقت نے میرے دل پر لگنے والا یہ گھاؤ جلد ہی بھر دیا اور میری سوچ کی راہیں بدل گئیں۔ اب میں اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ مرد کا لگایا ہُوا زخم مرد اور عورت کا لگایا ہُوا گھاؤ عورت ہی بھر سکتی ہے۔

اُن دنوں میرا یہ گھاؤ عینی شیرازی بھر رہی تھی۔ وہ بلاشبہ دلکش و دلآرا لڑکی تھی۔ وہ گھر سے تو تہران یونیورسٹی میں داخلہ لینے آئی تھی لیکن شہرت، دولت اور کیمرے نگار خانے کی چہار دیواری میں گھسیٹ لائے تھے۔ اب وہ اداکارہ بن رہی تھی لیکن اسے فلموں کے ہیروز سے زیادہ میں پسند آیا تھا۔ وہ اکثر مجھ سے کہا کرتی تھی کہ یہ ہیرو جو پردۂ سیمیں پر رُستم و سہراب دکھائی دیتے ہیں اور ایک مُکّے سے چھ چھ آدمی گراتے نظر آتے ہیں، چڑیا کا سا دل رکھتے ہیں اور درحقیقت عورتوں سے بھی زیادہ نازک ہوتے ہیں جبکہ مرد کو ایک ٹھوس چٹان کی طرح ہونا چاہیے... اور میں اس لحاظ سے اس کے معیار پر پُورا اُترتا تھا۔

اُس روز بھی شوٹنگ کے بعد وہ سیدھی میرے اپارٹمنٹ پہنچ گئی تھی اور وہاں سے ہم سمندر کے ساحل پر اُسی ہٹ کی جانب چل دیے تھے جو مجھے آرام کرنے کی غرض سے بطورِ خاص دیا گیا تھا۔

عینی تو تھوڑی دیر سمندر میں نہانے کے بعد تولیا لپیٹ کر ریت پر لیٹ گئی... مگر میں غروبِ آفتاب تک لہروں سے کھیلتا رہا اور ساحل سے کافی دُور نکل گیا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ عینی مجھے اشارے سے اپنی طرف بُلا رہی ہے۔

جب میں ساحل پر پہنچا تو وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔

"کیا ہُوا؟" میں نے حیرت سے پُوچھا۔

"سردی کے مارے بُرا حال ہو رہا ہے اور تم پُوچھ رہے ہو کہ کیا ہُوا!"

"ارے!" میں نے تعجب سے کہا۔ "تمھیں یہاں ساحل پر سردی لگ رہی ہے اور مجھے نہاتے ہُوئے بھی محسوس نہیں ہُوئی۔"

"مجھے بھی محسوس نہ ہوتی اگر میرے اندر قطبی ریچھوں جیسی خاصیت ہوتی۔" وہ جھلا کر بولی پھر کپڑے، تولیے اور اپنا بیگ سمیٹنے لگی۔

مجھے اُس کی بات پر ہنسی آگئی۔ "تمھارے خیال میں، میں کوئی قطبی ریچھ ہُوں؟" میں نے پوچھا۔

"ہو تو نہیں مگر تمھارے اندر اُن کی کم از کم دو خاصیتیں ضرور ہیں۔ اب ہٹ میں چلو، مجھے بھُوک بھی بڑے زور کی لگ رہی ہے۔"

"بھُوک لگ رہی تھی تو کچھ کھا لیتیں یا آدم خور بننا چاہتی ہو؟"

"تم کبھی اپنی زندگی میں سنجیدہ بھی ہُوئے ہو، سرفروش؟" وہ جھینپ کر بولی۔

"میں ہمیشہ ہر بات پُوری سنجیدگی سے کرتا ہُوں۔"

"غلط... بالکل غلط!" وہ بولی۔ "میں اتنے دنوں سے تمھیں پڑھ رہی ہُوں۔ میں نے تمھاری ایک ایک حرکت کا جائزہ لیا ہے اور تمھارا تجزیہ کیا ہے۔ اب میں اس نتیجے پر پہنچی ہُوں کہ تم ایک خُود پسند آدمی ہو جو اپنی خوش وقتی کے لیے تو کسی کو ساتھ رکھ سکتا ہے مگر ہمیشہ کے لیے کسی عورت کا ساتھ نہیں دے سکتا یا دینا ہی نہیں چاہتا۔ کیوں؟ آخر تم ایسے کیوں ہو سرفروش؟"

مجھے عینی کی ان باتوں سے صدمہ محسوس ہُوا۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ ایک شوگرل ایسا بھی سوچ اور سمجھ سکتی ہے۔ دُوسرے اُس کا یُوں سوچنا اور مجھ میں دلچسپی لینا اس بات کی غمازی کرتا تھا کہ وہ بھی ایک گھر اور ایک مرد کے تحفظ کے خواب دیکھ رہی ہے اور وہ مجھ سے ایسی توقع باندھ رہی ہے... لیکن میرے ساتھ تو اب بھی وہی مجبوریاں تھیں جنھوں نے لالہ رُخ کو مجھ سے برگشتہ کر دیا تھا۔ اس لیے میں نے اُسے ٹالنے کے لیے کہا۔ "دیکھو عینی۔ اس وقت میرا مُوڈ کچھ اور ہے جبکہ تم مجھے بحث میں اُلجھانا چاہتی ہو۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ یہ باتیں تم کسی اور وقت کے لیے اُٹھا رکھو؟"

"نہیں سرفروش۔ میں بہت دنوں سے اس موضوع پر تم سے بات کرنے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اب بات چھڑ گئی ہے تو میں کسی فیصلے پر پہنچنا بہتر سمجھتی ہُوں۔"

"اچھا تو پھر کھانے کے بعد اس موضوع پر بات کریں گے۔" میں نے فی الوقت پہلو بچایا اور ہٹ میں پہنچتے ہی باتھ رُوم میں گھُس گیا۔

جب میں نہا کر اور کپڑے بدل کر نِکلا تو عینی فون کا ریسیور کریڈل پر رکھ رہی تھی۔ میں نے پُوچھا۔ "کس کی کال تھی؟"

"کوئی مسٹر رضا تم سے بات کرنا چاہتے تھے۔"

"اوہ...!" میرے مُنہ سے بے ساختہ نِکلا اور میں فون کی طرف بڑھ گیا۔ شاید مجھے پھر کسی نئے سفر کے لیے بُلایا جا رہا تھا۔ میں نے ریسیور

کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہُوئے عینی کی طرف دیکھا تو میرا بڑھتا ہُوا ہاتھ رُک گیا۔

وہ کچن کی طرف جاتے ہُوئے کہہ رہی تھی: ”میں کچھ کھانا وانا تیار کرتی ہُوں۔ جب تک تم آقائے رضا سے بات کر لو۔“

مَیں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر رضا کا نمبر ملایا۔

دُوسری طرف گھنٹی بجنے لگی۔ چند لمحوں بعد آقائے رضا کی آواز سُنائی دی: ”ہیلو۔ رضا بول رہا ہُوں۔“

”آپ نے مجھے یاد کیا تھا جناب؟“

”ہاں سرفروش۔ مَیں تمھیں کئی بار رِنگ کر چُکا ہُوں مگر تم شاید ہٹ میں نہیں تھے۔ خیر... کل صبح کا پروگرام بن چُکا ہے مگر ڈاکٹر فریدوں کے پاس جانے سے پہلے مجھ سے ضرور مل لینا۔“

”خیریت تو ہے جناب؟“ مَیں نے پُوچھا۔

”ہے بھی اور نہیں بھی۔ جب تم آؤ گے تو بات ہو گی۔“

”آپ نے تو مجھے فکر اور تجسّس میں مُبتلا کر دیا ہے جناب۔“

”بات ہی کچھ ایسی ہے... مگر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اپنی مصروفیت جاری رکھو۔“ اور اس کے ساتھ ہی اُنھوں نے فون بند کر دیا۔

مَیں جانتا تھا کہ آقائے رضا مجھ سے اپنے بچّوں کی طرح محبت کرتے ہیں۔ اُن میں اور مجھ میں اگرچہ ایک افسر اور ماتحت کا رشتہ تھا مگر وہ ایک افسر کی بجائے ایک بزرگ کی حیثیت سے میرا زیادہ خیال رکھتے تھے اور میری خاطر ڈاکٹر فریدوں سے بھی اُلجھ جایا کرتے تھے۔ ہرچند کہ اُنھوں نے مجھے پریشان نہ ہونے کی تلقین کی تھی مگر اُن کی اپنی آواز سے پریشانی ہی جھلک رہی تھی۔ اس لیے جب عینی کھانا تیار کر کے لے آئی تو مَیں نے کہا: ”کھانا جلدی سے کھا لو عینی! مجھے فوری طور پر واپس جانا ہے۔“

”مگر تم نے تو رات بھر یہیں قیام کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔“ وہ شکایت آمیز لہجے میں بولی۔

”مَیں تمھاری رفاقت سے کسی نسبتاً زیادہ اہم کام کی وجہ سے ہی محروم ہو رہا ہُوں۔“ مَیں نے سنجیدگی سے کہا۔

یہ سُن کر عینی کا چہرہ اُتر گیا۔ خُود میرا ارادہ بھی ڈانواں ڈول ہونے لگا مگر پھر تجسّس میری سوچوں پر غالب آ گیا اور مَیں اپنا سامان سمیٹنے لگا۔

▲ ”مَیں حیران تھا کہ ڈاکٹر فریدوں کو کمپیوٹر کی بجائے اچانک دماغ کی سرجری سے کیوں عشق ہو گیا ہے۔ وہ سائنس دانوں کی بجائے دماغ کی سرجری کرنے والے ڈاکٹروں سے کیوں ملنے لگا ہے۔ بالآخر آج یہ عقدہ کھُل ہی گیا۔“ رضا کہہ رہے تھے اور مَیں اُن کے سامنے بُت بنا بیٹھا تھا۔

”وہ کیا ہے جناب؟...“ مَیں تجسّس پر قابو نہ رکھ سکا تو پُوچھ ہی بیٹھا۔

”وہ تمھارے دماغ کا آپریشن کرنا چاہتا ہے۔“

”وہ کیوں؟“ میرے لہجے میں بےپناہ حیرت سمٹ آئی۔

”اُسے بہت دُور کی سُوجھی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ تمھارے دماغ کو کمپیوٹر سے مربُوط کر دے۔ یعنی جب تم ماضی کے اندھیرے سفر پر جاؤ تو تمھاری ہر سوچ کمپیوٹر تک پہنچتی رہے اور کمپیوٹر تمھاری ہر سوچ سے ڈاکٹر کو آگاہ کر دے۔“

”لیکن وہ تو پہلے بھی میرے دماغ پر قسم قسم کی شعاعیں ڈالتے اور عجیب سے عمل کرتے رہے ہیں۔“ مَیں نے کہا۔

”وہ سب کچھ تمھاری یادداشت بڑھانے کے سلسلے میں تھا۔ اُس نے اُس عمل کے ذریعے تمھاری یادداشتوں کے لیے ایک ذخیرہ گاہ فراہم کر دی تھی... مگر اب وہ تمھارے دماغ کو براہِ راست کمپیوٹر سے مربُوط کرنا چاہتا ہے اور اس کے لیے تمھارے دماغ کا نازک ترین آپریشن ضروری ہے جو جان لیوا بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے مَیں چاہتا ہُوں کہ جب وہ تم سے بات کرے تو تم انکار کر دو۔“

”لیکن...“

”لیکن ویکن کچھ نہیں۔“ اُنھوں نے میری بات قطع کرتے ہوئے کہا: ”مَیں نے ڈاکٹر فریدوں کو دو ٹوک جواب دے دیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اس کا فیصلہ تم خود کرو گے۔ بہرحال، تم انکار کر دینا۔“

... مگر مَیں جانتا تھا کہ جب وہ قوم و وطن کے نام پر مجھ سے آپریشن کروانے کو کہے گا تو مَیں انکار نہیں کر سکوں گا۔ تاہم مَیں نے آقائے رضا کو خوش کرنے کے لیے کہہ دیا کہ جیسا وہ چاہتے ہیں مَیں ویسا ہی کروں گا اور آپریشن کے لیے انکار کر دُوں گا۔

* * *

دُوسری صبح مَیں لنگوٹ باندھے کمپیوٹر چیمبر کی الیکٹرک چیئر پر بیٹھا تھا۔ ڈاکٹر فریدوں نے حسبِ معمُول میرے جسم پر عجیب سا مرہم مَل دیا تھا اور الیکٹروڈز بھی چسپاں کر دیے تھے۔ اب صرف کمپیوٹر کا سُرخ سوئچ آن کرنے کی دیر تھی لیکن ہمیشہ کے برعکس آج ڈاکٹر فریدوں سوئچ آن کرنے کی بجائے مختلف میٹروں کا جائزہ لینے میں مصرُوف ہو گیا... پھر اُس نے لیجر جیسا ایک موٹا سا رجسٹر اُٹھایا اور اس میں اندراج کرنے لگا۔ وہ کمپیوٹر کے مختلف میٹر دیکھتا، کچھ حساب کرتا اور رجسٹر میں درج کرتا جاتا۔ مَیں کافی دیر تک یہ تماشا دیکھتا رہا، آخر بول پڑا۔

”یہ سب کیا ہے ڈاکٹر۔ کیا کمپیوٹر میں کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے؟“

ڈاکٹر فریدوں نے کوئی جواب دینے کی بجائے ہاتھ اُٹھا کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا، پھر اندراجات مکمل کرنے کے بعد رجسٹر ایک جانب رکھتے ہُوئے بولا: ”گڑبڑ تو کوئی نہیں سرفروش... مگر مَیں اس بار ایک نیا تجربہ کرنے والا ہُوں۔“ یہ کہہ کر اُس نے ایک بورڈ کی طرف اشارہ کیا جس پر متعدد چھوٹے بڑے میٹر نصب تھے: ”مَیں نے کمپیوٹر میں کچھ نئے آلات کا اضافہ کیا ہے۔ اس لیے چاہتا ہُوں کہ اس نئے تجربے کے متعلق تمھیں بھی پہلے سے آگاہ کر دُوں۔“

”کیا آقائے رضا بھی اس نئے تجربے کے متعلق جانتے ہیں؟“ مَیں نے پُوچھا۔

”اُونھوں... وہ کچھ نہیں جانتا۔ اگر اُسے معلوم ہو جاتا تو وہ میرے لیے خواہ مخواہ کی مشکلات پیدا کر دیتا۔ گھبراؤ نہیں سرفروش۔ اس نئے تجربے میں کوئی خطرہ نہیں اور اگر کوئی ہُوا بھی تو بے حد معمُولی نوعیت کا ہو گا۔“

”پھر بھی آپ مجھے اس نئے تجربے اور معمُول کے خطرات سے آگاہ کر دیں تو بہتر ہے۔“

ڈاکٹر فریدوں وہی موٹا رجسٹر اُٹھا لایا اور اُسے کھول کر دکھاتے ہوئے بولا: ”یہ دیکھو۔“

مَیں نے رجسٹر کو غور سے دیکھا۔ اس پر سائنس اور حساب کی کچھ نشانیاں بنی ہُوئی تھیں جنھیں سمجھنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔

”یہ کیڑوں مکوڑوں کی تصویریں میری سمجھ سے باہر ہیں ڈاکٹر۔“ مَیں نے بےبسی سے کہا۔

”مَیں سمجھتا ہُوں۔ یہ میرے تجربات کا ریکارڈ ہے۔ مَیں کافی عرصے سے سوچ رہا تھا کہ تمھیں اُسی زمانے میں دوبارہ بھیج دُوں جہاں تم پہلے بھی جا چکے ہو۔ اسی لیے مَیں نے کمپیوٹر کی سیٹنگ میں تبدیلی نہیں کی۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ تمھیں دوبارہ اپنی بقا کی جدّوجہد نہیں کرنا پڑے گی۔ تم اُس دَور کے لوگوں اور وہاں کے مقامی حالات سے آگاہ ہو چکے ہو گے۔ تمھیں یہ بھی معلوم ہو چُکا ہو گا کہ وہاں کن معدنیات کے خزانے موجُود ہیں۔ دراصل اس پروجیکٹ پر حکومت کی بہت بڑی رقم خرچ ہو چکی ہے اور وہ اس رقم کا نعم البدل چاہتی ہے۔ اگر دورِ گزشتہ کے خزانے مثلاً: ہیرے اور یورانیم وغیرہ دورِ حاضر میں منتقل کیے جا سکیں تو ہماری قوم اور ہمارا ملک دُنیا کا امیر ترین ملک بن سکتا ہے چنانچہ یہ خزانے منتقل کرنے کے لیے ایک علٰحدہ پروجیکٹ بھی قائم کیا جا چُکا ہے اور تجربات جاری ہیں۔ کمپیوٹر کی یہ وہی سیٹنگ ہے جس میں تم تاشیہ سے ملے تھے۔“

مَیں یہ سُن کر خوش ہو گیا کہ اس طرح تاشیہ سے ایک بار پھر ملاقات ہو جائے گی... پھر مجھے خیال آیا کہ تاشیہ کے دَور میں تو مجھے ایسا کوئی خزانہ دکھائی نہیں دیا تھا جس سے ہمارا ملک دُنیا کا امیر ترین مُلک بن سکے۔ اس لیے مَیں کہے بغیر نہ رہ سکا۔

”مگر ڈاکٹر، مجھے اس دَور میں بھیجنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس کی بجائے مجھے اُس دَور میں منتقل کریں جس میں مَیں نے سرزمین سراما پر یورانیم کی کانیں دیکھی تھیں۔“

”مَیں سب سمجھتا ہُوں سرفروش۔“ ڈاکٹر بولا: ”اس دَور میں تو مَیں تمھیں صرف تجربے کے طور پر چند گھڑیوں کے لیے بھیجنا چاہتا ہُوں۔ اگر تم اس دَور میں پہنچ گئے تو پھر مَیں تمھیں سراما والے دَور میں بھی بھیج دُوں گا۔“

”اس کا مطلب ہے کہ آپ کو اپنے تجربے کی کامیابی کا پُورا پُورا یقین نہیں ہے اور پھر مجھے کمپیوٹر میں کچھ نئی تبدیلیاں بھی نظر آ رہی ہیں۔“

ڈاکٹر فریدوں نے رجسٹر بند کر کے مجھے گھورتے ہُوئے کہا: ”پچھلی مرتبہ تم نے کب سفر کیا تھا۔ میرا مطلب ہے کہ تمھیں واپس آئے کتنا عرصہ ہو گیا؟“

”تقریباً چھ مہینے۔“ مَیں نے جواب دیا۔

”اور ان چھ ماہ میں مَیں کمپیوٹر کی کارکردگی بڑھانے کے لیے تقریباً اٹھارہ گھنٹے روزانہ کام کرتا رہا ہُوں۔ ظاہر ہے کہ یہ پہلے جیسا نہیں رہا۔ اس میں تبدیلیاں آئی ہیں اور اس کی کارکردگی پہلے سے کہیں بہتر ہو گئی ہے۔“

”اچھی بات ہے جناب۔“ مَیں کچھ لاجواب سا ہو کر بولا: ”اس کی بہتر کارکردگی کا بھی پتہ چل جائے گا۔ بھیجیے مجھے تاشیہ کے دَور میں۔“

”خوب۔ یہ ہُوئی نا بات۔“ ڈاکٹر مُسکرا کر بولا: ”تیار ہو جاؤ۔“ اور یہ کہتے ہُوئے اُس نے کمپیوٹر کا سُرخ سوئچ آن کر دیا۔

میٹر بورڈ پر بلب جلنے بُجھنے لگے۔

سوئیاں حرکت میں آ گئیں۔

میرے اعضا سے بندھے ہُوئے الیکٹروڈز میں برقی رَو... دوڑنے لگی۔

مَیں نے سوچا کہ ابھی درد کی شدید لہر اُٹھے گی اور میرے جسم کا رُواں رُواں تحلیل ہو کر سالموں میں تقسیم ہو جائے گا۔ یہ سالمے ماضی کے کسی دَور میں یکجا ہوں گے اور وہاں مَیں ایک بار پھر اپنی بقا کی جدّوجہد میں مصرُوف ہو جاؤں گا لیکن جتنی دیر میں مَیں نے یہ ساری باتیں سوچیں اتنے وقت میں تو مجھے ماضی کے کسی دَور میں پہنچ بھی

جانا چاہیے تھا.. مگر میں اب تک وہیں تھا۔ مجھے اپنے جسم اور سر میں درد تو محسوس ہُوا تھا مگر پہلے جیسا نہیں۔ یہ درد الیکٹروڈز میں برقی لہر دوڑنے کی وجہ سے تھا اور مجھے سالموں میں تقسیم کرنے والا نہیں تھا۔ کوئی گڑبڑ ضرور ہوگئی تھی۔

اتنے میں مجھے کمپیوٹر کی ایک مشین سے گاڑھا گاڑھا دُھواں نکلتا دکھائی دیا اور چیمبر میں گونجنے سے پھٹنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر فریدوں کھانستے ہُوئے جلدی جلدی مختلف سوئچ آف کر رہا ہے۔

میں نے اپنی کرسی سے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن برقی لہروں نے مجھے ہلنے بھی نہیں دیا۔ اتنے میں ڈاکٹر فریدوں نے کمپیوٹر کا مین سوئچ آف کر دیا۔ الیکٹروڈز کی برقی رَو ختم ہوگئی۔ میں نے اپنے جسم کے ساتھ چپیاں الیکٹروڈز کا تار جھٹکے اور کمپیوٹر چیمبر سے نکلنے ہی والا تھا کہ وہ نظارا دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔

میرے اور ڈاکٹر فریدوں کے درمیان بھورے رنگ کے دھوئیں کا ایک بگولا سا بڑی تیزی سے گردش کر رہا تھا... پھر یہ دُھواں ایک ہیولے میں بدلنے لگا اور آخر میں اس نے بالکل واضح شکل بلکہ جسامت اختیار کر لی۔ میں نے ایسی عجیب الخلقت ہستی پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اُس مخلوق کو دیکھ کر دہشت کے مارے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

وہ نہ تو آدمی تھا اور نہ ہی کوئی جانور تھا۔

اُس کے ہاتھ میں پتّھر کا ایک بھدا سا بھاری کلہاڑا تھا۔ وہ ڈاکٹر فریدوں کی طرف دیکھ کر بڑے مکروہ اور خوفناک انداز میں غرّایا۔ پھر کلہاڑا سنبھالے اُس کی طرف بڑھا تو ڈاکٹر فریدوں چلّایا۔

"بچاؤ... مجھے بچاؤ، سرفروش"

ڈاکٹر فریدوں کی پُکار پر مجھے جیسے ایک دم ہوش آگیا اور اس سے پہلے کہ وہ وحشی، ڈاکٹر فریدوں پر کلہاڑے کا وار کرتا، میں اُچھلا اور میری فلائنگ کِک نے اُسے مُنہ کے بل گرا دیا۔

اگرچہ وہ قد میں مجھ سے نصف تھا مگر اُس میں بلا کی طاقت اور پھُرتی تھی۔ اُس کے جسم پر گھنے بال تھے اور اُس سے عجیب سی بدبُو آ رہی تھی۔ وہ گرتے ہی فوراً اُٹھا اور مجھ پر ٹوٹ پڑا۔

میں بڑی مشکل سے اپنے آپ کو کلہاڑے کے وار سے بچا سکا۔

دُوسرے وار سے پہلے ہی میں نے اُس کی کلائی پکڑ کر مروڑی اور جھٹکا دیا تو کلہاڑا اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میں نے پاؤں کی ٹھوکر سے کلہاڑا دُور پھینک دیا۔ اُس نے اپنا خونخوار جبڑا کھولا اور بڑے بڑے نوکیلے دانت میرے نرخرے میں گاڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے دائیں ہاتھ سے اُس کے جبڑے پر کراٹے کی ضرب لگانا چاہی مگر اُس نے سر جُھکا لیا۔ تاہم یہ ضرب اُس کے سر پر پڑی تو وہ بلبلا اُٹھا اور "غزررررگ... غزرررگ گ رر... غزررگ گ" کی آوازیں نکالنے لگا۔

معاً کہیں دُور سے ڈاکٹر فریدوں کی آواز آتی محسوس ہُوئی۔

"خُدا کے لیے اسے ختم نہ کر دینا سرفروش۔ اسے جان سے نہ مارنا۔ اسے زندہ رہنے دینا۔"

ڈاکٹر فریدوں کی اس بات سے میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ وہ وحشی مخلوق بار بار میرے نرخرے میں دانت گاڑنے کی کوشش کر رہی تھی اور ڈاکٹر مجھے اُس کو زندہ رکھنے کی ہدایات دے رہا تھا۔ میرے لیے سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ وہ چکنے سانپ کی طرح بار بار میری گرفت سے نکل جاتا تھا... پھر میں نے وہ کیا جو مجھے بہت پہلے کرنا چاہیے تھا۔

میں اُس سے چند قدم دُور ہو گیا۔

وہ وہیں کھڑا مجھے نفرت سے گھورتا اور غرّاتا رہا۔

میں نے اُسے غچّہ دینے کے لیے اپنا بایاں بازو اُٹھایا۔ وہ میرے بازو کو دیکھنے لگا۔ اچانک میں نے اپنے دائیں پاؤں سے اُس کے جبڑے پر زوردار ٹھوکر لگائی۔ وہ چکرا کر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ اس وقت تک میرے جسم پر اُس کے نوکیلے پنجوں سے کافی خراشیں آ چکی تھیں۔ میں نے لپک کر کلہاڑا اُٹھا لیا اور اُسے مارنا ہی چاہتا تھا کہ ڈاکٹر فریدوں دوڑ کر بیچ میں آگیا۔

"ارے ارے کیا غضب کرتے ہو۔ خُدا کے لیے اسے مت مارو۔ یہ تو میری محنتوں کا ایسا انعام ہے جو کبھی میں نے بھُولے سے بھی نہیں سوچا تھا.. اوہ... کوئی گڑبڑ تو ضرور ہو گئی تھی... مگر... مگر اُس گڑبڑ سے قدرت نے کتنا بڑا انعام دے دیا ہے۔"

"انعام؟" میں نے تعجب اور غصّے سے دُہرایا۔ "مگر یہ انعام آیا کہاں سے ڈاکٹر... اور آپ اس خونخوار وحشی کو بچانا کیوں چاہتے ہیں؟"

ڈاکٹر اُس وحشی کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور بڑے پیار سے اُس کے جسم پر ہاتھ پھیرتے ہُوئے بولا: "یہ کہاں سے آیا ہے، میں نہیں جانتا... لیکن یہ ماضی کے اُس دَور سے آیا ہے جب انسان ارتقا کی ابتدائی منزلوں سے گزر چکا تھا۔ یہ انسانی ارتقا کی درمیانی منزلوں کا مظہر ہے۔ لاکھوں سال پہلے ہم اس جیسے تھے۔ یعنی انسان اسی منزل سے گزر رہا تھا۔ وہ اچانک اُٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا: "مگر ہمیں اس کی آمد اور وجود صیغۂ راز میں رکھنا پڑے گا۔ یہ انتہائی اہم راز ہے سرفروش جو کسی قیمت پر بھی کسی کو معلوم نہیں

ہونا چاہیے۔ تم سمجھ گئے نا؟ یہ میرا حکم ہے۔"

"آقائے رضا کو بھی معلوم نہیں ہونا چاہیے؟" میں نے پُوچھا۔

ڈاکٹر چند لمحے سوچتا رہا... پھر بولا: "میرا خیال ہے، اُسے تو بتانا پڑے گا مگر اور کسی کو نہیں۔ اب تم یہیں ٹھہرو اور اس کا خیال رکھو۔ میں بے ہوشی کا انجکشن لے کر آتا ہوں۔ اسے کچھ دیر کے لیے بے ہوش رکھنا پڑے گا ورنہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ اپنے آپ کو خود ہی ختم کر دے... یعنی اپنا سر ٹکرا ٹکرا کر مر جائے۔ میں ابھی آیا۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے چلا گیا اور میں اس وحشی کو دیکھنے لگا جو میرا خُون پینا چاہتا تھا لیکن اب شکست خوردہ پڑا تھا۔

وہ اپنے بڑے بڑے نتھنوں سے سانس لے رہا تھا اور اُس کے مُنہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔ تاہم وہ ساکت پڑا تھا۔ میں نے جس ہاتھ اور پاؤں سے اُسے ضربیں لگائی تھیں اب وہ بُری طرح دُکھنے لگے تھے۔ کمرے میں کمپیوٹر کی وائرنگ جلنے کے ساتھ ساتھ اُس وحشی کی بدبُو بھی پھیلی ہُوئی تھی۔ مجھے ڈاکٹر فریدوں پر حیرت ہو رہی تھی کہ اُسے اپنا کمپیوٹر جل جانے کا ذرا بھی دُکھ نہیں ہُوا بلکہ وہ اس وحشی کو پا کر بے حد خوش تھا۔

میں نے اُسے پاؤں سے چھُو کر دیکھا۔

اُس کے جسم پر پسینے سے گیلے بال، مٹّی سے اَٹے ہُوئے تھے۔ اتنے میں ڈاکٹر فریدوں ایک ٹرے میں ضروری سامان رکھے آ گیا۔ مجھے ڈاکٹر فریدوں پر ہنسی آگئی۔

"یہ ہنسی کی بات نہیں سرفروش بلکہ بڑا اہم معاملہ ہے۔ تمھیں اس کی اہمیت کا اندازہ نہیں۔ ہم نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ ماضی کے اندھیرے دَور سے زمانۂ حال میں اس کی آمد سائنس کی بہت بڑی دریافت ہے۔"

"لیکن اب ہمیں کرنا کیا ہے اور یہاں سے کہاں جانا ہے؟" میں نے پُوچھا۔

"ہمیں بڑی احتیاط سے کام لینا پڑے گا۔ میں نے اپنے اختیارات سے کام لیتے ہُوئے سارے عملے کو یہاں سے بھیج دیا ہے تاکہ کسی کو اس نیم انسان کی آمد اور موجودگی کا علم نہ ہو سکے۔ تم ایسا کرو کہ جا کر رضا کو بُلا لاؤ۔ فوراً..."

"اگر آپ اجازت دیں تو پہلے میں اسے ایک گھونسہ اور مارتا جاؤں۔" میں نے ہنس کر کہا۔

ڈاکٹر نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اس وحشی کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیر رہا تھا جو سب سے پہلے اُسی کو مارنا چاہتا تھا اور اگر میں نہ ہوتا تو وہ ڈاکٹر فریدوں کا خُون پی چکا ہوتا۔

☆☆

جب میں اور آقائے رضا کمپیوٹر چیمبر میں پہنچے تو ڈاکٹر فریدوں پیمائشی فیتے سے اس وحشی مخلوق کے مختلف اعضا ناپ کر ایک رجسٹر میں لکھتا جا رہا تھا۔ وہ آقائے رضا کو دیکھتے ہی خوشی سے چہک کر بولا: "دیکھو رضا۔ قدرت نے ہمیں بِن مانگے کتنے بڑے انعام سے نواز دیا ہے۔"

آقائے رضا نے استہزائیہ تبسّم سے کہا: "یہ انعام کس باغِ حیوانات کی زینت بنایا جائے گا؟"

"باغِ حیوانات!" فریدوں نے حقارت سے جواب دیا۔ "تم چڑیا گھر کی بات کرتے ہو رضا؟ اگر میرا بس چلتا تو میں اسے تم سے بھی چھپا لیتا۔ اب اسے کوئی چوتھا آدمی نہیں دیکھ سکتا۔"

"میرا خیال ہے کہ ہمیں چوتھے آدمی یعنی وزیرِ اعظم کو تو اس کے درشن کروانا ہی پڑیں گے ورنہ تم نہ تو کمپیوٹر کی تباہی کا کوئی جواز بتا سکو گے اور نہ ہی اپنے تجربات کے لیے مزید سرمایہ حاصل کر سکو گے۔"

آقائے رضا کی یہ بات ڈاکٹر فریدوں کی سمجھ میں آگئی چنانچہ رات کے بارہ بجے جب وزیرِ اعظم تشریف لائے تو وہ انسان نُما جانور ایک چھوٹی سی کھاٹ پر بے ہوش پڑا تھا اور اسے ربڑ کی نلکیوں کے ذریعے غذا دی جا رہی تھی۔

"یہ کیا بلا ہے؟ اس کا نام کیا ہے؟" وزیرِ اعظم نے پوچھا۔

"یہ ہزاروں سال پہلے کا انسان ہے جنابِ والا اور میں نے وقتی طور پر اس کا نام غزگ تجویز کیا ہے کیونکہ یہ ہر وقت غزرررگ رر غزرررگ رر کرتا رہتا ہے۔ غزگ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے ذریعے سائنس دانوں کو انسانی ارتقا کی گمشدہ کڑیاں مِل جائیں گی۔ اس لیے میں اپنی تحقیق مکمل ہونے تک اسے سب سے چُھپا کر رکھنا چاہتا ہُوں۔"

...اور اس نے جو کچھ وزیرِ اعظم سے کہا تھا، وہی کیا بھی تھا۔

سب سے پہلے مجھے غزگ کو اُٹھا کو دُوسرے تہ خانے میں لے جانا پڑا کیونکہ وہ اتنا وزنی تھا کہ نہ تو ڈاکٹر اسے اُٹھا سکتا تھا اور نہ ہی آقائے رضا... غزگ سے اتنی بدبُو خارج ہو رہی تھی کہ میں اُسے تہ خانے میں چھوڑنے کے بعد سیدھا باتھ رُوم میں گیا اور بڑی دیر تک نہاتا رہا... مگر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُس کی بدبُو میرے مساموں میں رچ گئی ہو۔

ڈاکٹر فریدوں کو غزگ کیا مِلا کہ وہ سب کچھ بھُول گیا۔ اُسے نہ تو اپنے تن من کی پروا رہی اور نہ ہی کمپیوٹر کا کوئی خیال رہا۔ وہ

نمرگ کے لیے ایک "خصوصی رہائش گاہ" بنوانے میں مصروف ہو گیا اور جب بڑے تہ خانے میں یہ رہائش گاہ تعمیر ہو گئی تو اُس نے مجھے اور آقائے رضا کو وہاں پہنچنے کا حکم دے دیا۔

نمرگ حسبِ معمول اپنی کھاٹ پر بے ہوش پڑا تھا۔

ڈاکٹر فریدوں نے تہ خانے میں بنے ہوئے ایک غار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ہے نمرگ کی اور تمھاری رہائش گاہ۔"

"جی؟" میں نے تعجب سے کہا۔ "میری اور نمرگ کی رہائش گاہ؟"

"ہاں... تم بھی نمرگ کے ساتھ ہی رہو گے۔"

"مگر میں اس بدبُودار وحشی کے ساتھ کیوں رہوں، ڈاکٹر؟ نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔" میں چیخ پڑا اور آقائے رضا نے بھی میری تائید کر دی۔

"یہ قوم اور وطن کی سربلندی کا سوال ہے، رضا۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "یہ علمی تحقیق کا معاملہ ہے سرفروش، ذرا غور سے دیکھو۔ میں نے اس تہ خانے میں یہ غار ہی نہیں بنوایا بلکہ یہاں مصنوعی چٹانیں، جھاڑیاں اور چھوٹی سی دلدل بھی موجود ہے۔ میں نے حتی الوسع ایسا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جو نمرگ کے لیے نیا اور بالکل اجنبی نہ ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ اُس کے رہن سہن، عادات و اطوار اور حرکات و سکنات کا مطالعہ کر سکوں۔ اگرچہ میں نے اس مقصد کے لیے متعدد خفیہ روزن بھی بنوائے ہیں جن سے نمرگ پر نظر رکھی جا سکتی ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہو سکے گا کہ یہ تم سے کیا اثرات قبول کرتا ہے اور اُس کی دماغی صلاحیت کتنی ہے؟ ہماری یہ تحقیق، سائنس کی دُنیا میں ایک نیا باب کھول دے گی اور ہماری سربلندی کا باعث ہو گی۔"

"مگر میرے لیے اس کے ساتھ رہنا ناقابلِ برداشت ہے ڈاکٹر۔" میں نے احتجاج کیا۔

"قوم و وطن کی سرخروئی اور برتری کے لیے ہر قسم کے مصائب برداشت کرنا پڑتے ہیں برخوردار۔ ہماری زندگی قوم کی امانت ہے اور پھر... یہ تمھارے لیے زندگی یا موت کا کوئی سوال نہیں کیونکہ تم اس سے زیادہ طاقت ور ہو۔ یہ نہتا ہو گا جب کہ تمھارے پاس ایک مضبوط ڈنڈا ہر وقت موجود رہے گا۔ میں تمھیں پستول رکھنے کی بھی اجازت دیتا مگر خطرہ ہے کہ کہیں تم اشتعال میں آ کر نمرگ کو مار نہ ڈالو۔"

اگرچہ میں نے اور آقائے رضا نے کافی احتجاج کیا.. مگر ڈاکٹر فریدوں اپنی بات پر اَڑا رہا۔ دراصل اُس نے بالا ہی بالا وزیرِ اعظم سے اس سلسلے میں منظوری بھی لے لی تھی۔ میں موت سے نہیں ڈرتا کہ موت تو برحق ہے لیکن نمرگ کے ساتھ مستقل قیام اور اُس کی ناقابلِ برداشت بدبُو ایک عذاب تھا جو مجھے برداشت کرنا ہی پڑا۔

◆

غار میں ایسے خفیہ روزن بھی بنے ہوئے تھے جن سے تازہ اور سرد ہَوا مسلسل آتی رہتی تھی۔ غار کے بیچوں بیچ ایک چھوٹا سا الاؤ روشن کر دیا گیا تھا مگر غار کے باہر بالکل اندھیرا تھا۔ پھر ڈاکٹر فریدوں نے باہر لاؤڈ اسپیکر چھپا کر نصب کروائے تھے جن سے حسبِ ضرورت کام لیا جا سکتا تھا۔ ان اسپیکرز کو مختلف ٹیپ ریکارڈرز سے مربوط کر دیا گیا تھا۔

یہ سارے انتظامات دکھانے کے بعد ڈاکٹر نے کہا۔ "میں نے متعدد روزنوں میں موی کیمرے بھی فٹ کر دیے ہیں۔ اُن لمحات کی عکاسی بے حد ضروری ہے جب نمرگ ہوش میں آ کر ماحول کا جائزہ لے گا۔ تب میں ٹیپ ریکارڈرز آن کر دوں گا جن سے خوفناک آوازیں آئیں گی۔ بادلوں کی گھن گرج بھی سنائی دے گی اور درندوں کی دھاڑیں بھی آئیں گی۔ تب یہ وحشی اس غار کو ہی اپنے لیے محفوظ ترین پناہ گاہ سمجھے گا اور ایک کونے میں دُبک کر بیٹھ جائے گا۔"

"اور اگر وہ دُبک کر نہ بیٹھا رہا تو؟" میں نے سوال کیا۔ "اُس نے مجھ پر حملہ کر دیا تو؟"

"تب تم خود ہی اُس سے نمٹ لینا۔ پہلے بھی تو تم اسے ہلاک کیے بغیر نمٹ ہی چکے ہو۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بھوکا ہو گا اور بھوک میں حملہ آور بھی ہو سکتا ہے مگر میں نے اُس کے لیے گوشت کا انتظام کر دیا ہے۔"

"ہاں ڈاکٹر۔" آقائے رضا نے کہا۔ "سرفروش کا گوشت اُس کے لیے خاصا لذیذ ثابت ہو گا۔"

"تم ہمیشہ اُلٹی سیدھی باتیں کرتے ہو رضا۔ میں نے تازہ گوشت منگوا رکھا ہے۔ جب نمرگ ہوش میں آئے گا تو سرفروش دوستی اور خیرسگالی کے اظہار کے لیے اُسے وہ گوشت پیش کرے گا۔ چلو اب نمرگ کو اُٹھا کر غار میں لٹا دو سرفروش۔" ڈاکٹر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے نمرگ کو غار میں لٹا دیا اور کھال کا بنا ہُوا وہ لباس پہن لیا جو ڈاکٹر فریدوں نے میرے لیے تیار کروایا تھا۔ اس لباس میں بلاشبہ میں ایک گوریلا ہی نظر آتا تھا۔ غار اور اُس کے باہر کا ماحول مجھے بار بار "دس لاکھ سال پہلے" نامی ایک فلم کی یاد دلا رہا تھا۔

ڈاکٹر فریدوں نے ٹیپ ریکارڈرز ٹیسٹ کیے اور باہر جا کر ایک خفیہ روزن سے جھانکنے لگا۔ آقائے رضا بھی ایک سوراخ سے نمرگ اور میری پہلی ملاقات کا منظر دیکھنے کا منتظر تھا مگر نمرگ ابھی ہوش میں نہیں آیا تھا۔

میں بھینسے کی تازہ کھال میں گوشت کے بڑے بڑے لوتھڑے لیے بیٹھا رہا۔ بالآخر ڈیڑھ گھنٹے بعد نمرگ کے جسم میں جنبش ہُوئی اور وہ ہلنے جُلنے لگا۔ ڈاکٹر فریدوں نے ٹیپ ریکارڈر آن کر دیے اور... لاؤڈ اسپیکرز پر جھینگروں اور دُوسرے حشرات الارض کی آوازیں گونجنے لگیں۔ پھر اژدہوں کی پھنکار اور درندوں کی دھاڑیں بلند ہوئیں تو نمرگ نے آنکھیں کھول دیں اور غور سے یہ آوازیں سُننے لگا... پھر اُس نے اپنے سینے پر ہاتھ مارے، اپنے بال نوچے اور چاروں ہاتھوں پاؤں سے چلتا ہُوا الاؤ کے قریب آ گیا۔

جُوں جُوں درندوں کے لڑنے کی آوازیں بڑھیں، نمرگ کی بے چینی بھی بڑھتی گئی۔ وہ سیدھا کھڑا ہو گیا... پھر آہستہ آہستہ غار کے دہانے کے قریب آیا اور کان لگا کر سُنتا رہا۔ اتنے میں اُس کی نگاہ لکڑیوں کے ڈھیر پر جا پڑی۔ اُس نے کچھ لکڑیاں اُٹھائیں اور انھیں الاؤ میں جھونک دیا۔ شعلے بڑھے تو وہ اُن کی روشنی میں ادھر اُدھر یُوں دیکھنے لگا جیسے اُسے کسی خاص چیز کی تلاش ہو۔ غالباً وہ اپنا کلہاڑا ڈھونڈ رہا تھا مگر جب کلہاڑا اُسے نہ مِلا تو وہ اپنے سینے پر ہاتھ مارنے اور بال نوچنے لگا۔ اُس کی غراہٹ بتا رہی تھی کہ وہ جھنجلا رہا ہے۔

میں غار کے باہر اندھیرے میں چھپا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ یکایک ڈاکٹر فریدوں نے سرگوشی کی۔ "جاؤ سرفروش۔ وہ زیادہ جھنجلا گیا تو کہیں کوئی غلط حرکت نہ کر بیٹھے۔"

میں نے نمرگ کی طرف دیکھا۔ اُس نے یُوں کان کھڑے کر رکھے تھے جیسے یہ سرگوشی سُن چکا ہو۔ پھر وہ یُوں تن کر کھڑا ہو گیا جیسے کسی اَن دیکھے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو۔

میں ایک ہاتھ میں گوشت اور دُوسرے میں پکڑا ہُوا ڈنڈا فرش پر مارتے ہُوئے غار کی طرف بڑھنے لگا۔ نمرگ ڈنڈے کی آواز سے چوکنا ہو کر چند قدم پیچھے ہٹا اور غرّانے لگا۔ اگرچہ اُس کی یہ حرکت صاف بتاتی تھی کہ وہ خوف زدہ ہے مگر اُس کی تیز ہوتی ہُوئی غرّاہٹ اور بار بار آگے پیچھے ہونے والا سر اُس کے غصّے کا مظہر بھی تھا۔

میں کن انکھیوں سے اُسے دیکھتا ہُوا الاؤ کی طرف بڑھا اور ڈنڈا سیدھے ہاتھ میں تھام کر اس طرح روشنی میں کھڑا ہو گیا کہ وہ ڈنڈے کو بخوبی دیکھ سکے۔

نمرگ اپنی چھوٹی چھوٹی سُرخ آنکھوں سے مجھے گھُورتا رہا۔ اُس کا سر مسلسل آگے پیچھے حرکت کر رہا تھا مگر گوشت کی بُو پا کر اُس کی غرّاہٹ بدل گئی تھی۔

میں نے اُس کی غرّاہٹ غور سے سُنی اور پھر بالکل اُسی طرح خُود بھی غرّانے لگا۔ میں نے سوچا کہ اگر وہ بہت زیادہ ڈر گیا یا اُس نے اپنے آپ کو مجھ سے زیادہ طاقت ور سمجھا تو یقیناً مجھ پر حملہ کر دے گا ورنہ اُسے سُدھانا مشکل نہ ہو گا۔

میں نے اسی طرح اپنا سینہ کھُجاتے ہُوئے ڈنڈا پھینک دیا اور آہستہ آہستہ "نمرررگ۔ نمرررگ" کہنے لگا۔

یہ اگرچہ ایک احمقانہ سی حرکت تھی.. مگر اس میں ایک پُکار اور ایک بُلاوا سا تھا جیسے کوئی پچکار پچکار کر کسی بچّے کو بُلاتا ہے۔

نمرگ نے ایک بار ڈنڈے کو اور پھر میری طرف دیکھا۔

چند لمحے اسی طرح گزر گئے۔

اچانک اُس کی غرّاہٹ میں نرمی آ گئی۔

میں نے جھولی سے گوشت کا ایک لوتھڑا نکال کر اسے دکھایا اور مسلسل بولتا بھی رہا۔

نمرگ کے نتھنے پھڑکنے لگے اور اُس کی باچھوں سے رال ٹپکنے لگی۔ اچانک اُس نے اپنا ہاتھ یُوں بڑھا دیا جیسے گوشت مانگ رہا ہو۔ ساتھ ہی اُس کی غرّاہٹ ایک مخصوص لفظ میں ڈھل گئی۔ اب وہ نمرررگ نمرررگ کی بجائے "نمرواہ... نمرواہ" کہہ رہا تھا۔

میں نے بھی یہی لفظ دو تین بار دُہرایا اور گوشت کا ٹکڑا اُس کی طرف اُچھال دیا۔ نمرگ نے اُسے ہاتھوں میں دبوچا اور لکڑیوں کے ڈھیر کی طرف بڑھا، ایک نوکدار لکڑی منتخب کی، گوشت کا ٹکڑا اُس میں پرو دیا اور بھُوننے کے لیے الاؤ پر رکھ دیا۔

اُس کی یہ حرکت صاف بتاتی تھی کہ وہ جانوروں کی حدود سے نکل کر انسانی حدود میں قدم رکھ چکا تھا۔ میں نے اُس روزن کی طرف دیکھا جس سے ڈاکٹر فریدوں جھانک رہا تھا۔ خوشی کے مارے اُس کی باچھیں کانوں تک کھلی ہُوئی تھیں۔

اگرچہ نمرگ نے مجھ سے گوشت مانگ لیا تھا مگر ابھی اُسے مجھ پر پُوری طرح اعتماد نہیں ہُوا تھا۔ وہ مسلسل میری طرف دیکھے جا رہا تھا اور اُس نے الاؤ کو حدِ فاصل بنا لیا تھا۔ جب گوشت کا وہ پارچہ بھُن گیا تو اُس نے جلدی سے اُسے، لکڑی سے نکالا اور دو ہی لقموں میں چٹ کر گیا۔

میں نے دُوسرا پارچہ اُس کی طرف اُچھال دیا۔

اُس نے بھُوننے والا عمل دُہرایا.. مگر اب کے اُس نے پارچے کے تین لقمے کیے پھر اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہُوئے نرمی سے غرّایا۔ "نمرررنا۔ نمرررنا۔"

میں نے بھی اُس کی نقل کی تو اُس نے عجیب انداز سے میری طرف دیکھا اور اپنے سینے کے بالوں کو ٹٹولنے لگا۔

اتنے میں غار کے باہر لاؤڈ اسپیکرز پر پھر درندوں کی

دھاڑیں گونجنے لگیں۔ ٹمرگ خوفزدہ ہوگیا۔ اُس نے مجھ سے نگاہیں ہٹا کر باہر کی طرف دیکھا اور پیچھے ہٹنے لگا۔

مَیں غار کے دہانے کی طرف بڑھ کر ہوا میں مُکا لہراتے ہُوئے چلّایا جیسے درندوں کو للکار رہا ہُوں۔ مگر جب درندوں کے آنے کی بجائے اُن کی آوازیں بھی معدوم ہوگئیں تو مَیں نے ٹمرگ کی طرف پلٹ کر دیکھا تاکہ اُس کا ردِ عمل معلوم کرسکوں اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ اپنے ہاتھ باندھے یُوں مُنہ کھولے کھڑا ہے جیسے ہنس رہا ہو۔

اُس کی غراہٹ "ہاہ ہاہ ہاہ" پر مشتمل تھی۔ کبھی کبھی وہ خوشی سے اُچھل بھی پڑتا تھا۔

"مان گئے نا اُستاد۔ اب تمھاری میری خوب نبھے گی مگر تمھیں میرے ساتھ دوستی کرنا پڑے گی ٹمرگ۔" مَیں نے کہا۔

مَیں نہیں جانتا تھا کہ وہ کچھ سمجھ بھی رہا ہے یا نہیں مگر مَیں مُنہ آئی بکتا رہا اور اشاروں سے سمجھاتا رہا کہ کوئی اِدھر آیا تو اُس کی گردن مروڑ دُوں گا۔ پھر مَیں اپنے ڈنڈے کی طرف بڑھا جو تقریباً دس فٹ کے فاصلے پر پڑا تھا۔ یہ دیکھ کر ٹمرگ فوراً چوکنا ہوگیا۔ اُس کا قہقہہ غراہٹ میں بدلا اور نگاہیں مجھ پر مرکوز ہوگئیں۔

مَیں بڑی نرمی سے بولتا رہا: "مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ٹمرگ۔ ہم ایک دُوسرے کے دوست ہیں اور مَیں اپنی دوستی کا ثبوت دینا چاہتا ہُوں۔ بس تم آرام سے میری طرف دیکھتے رہو۔"

... مگر ٹمرگ اطمینان سے دیکھنے کی بجائے زور زور سے سینہ کوبی کرنے لگا۔

جُونہی مَیں نے ڈنڈا اُٹھایا، وہ الاؤ سے دُور ہٹ کر کونے میں جا کھڑا ہُوا۔ وہ مجھ سے بُری طرح خوفزدہ تھا۔ مگر مَیں نے اُس پر توجہ دیے بغیر ڈنڈے کو گھٹنے پر مار کر دو ٹکڑے کیا اور الاؤ میں پھینک دیا۔

ٹمرگ کی غراہٹ اور بے چینی ایک دم دُور ہوگئی۔ وہ بڑے تعجب سے مجھے دیکھنے لگا۔

مَیں نے ٹمرگ سے بے نیازی برتتے ہُوئے جھولی سے گوشت کا ایک پارچہ نکالا اور اُسی، ٹمرگ والی لکڑی میں پرو کر اُسے آگ پر رکھ دیا۔ باہر پھر ویسی ہی خوفناک آوازیں گونجنے لگیں۔

ٹمرگ پہلے تو ڈرا... مگر پھر آہستہ آہستہ الاؤ کے قریب آگیا۔ اتنے میں وہ پارچہ بھی بھُن گیا تھا جسے مَیں نے الاؤ میں رکھا تھا۔ مَیں نے اُسے لکڑی سے نکالا اور پھونکیں مار مار کر ٹھنڈا کرتے ہُوئے کھانے لگا۔ اس دوران مَیں نے ٹمرگ کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ شاید بھُنتے ہُوئے گوشت کی خوشبُو نے پھر اُس کی اشتہا جگا دی تھی۔ وہ پھر اسی انداز میں غرانے لگا جیسے گوشت طلب کر رہا ہو۔

مَیں نے جھولی سے گوشت کا ایک پارچہ نکالا مگر اُسے اُچھالنے کی بجائے ہاتھ میں پکڑے پکڑے اُس کی طرف بڑھا دیا۔

ٹمرگ نے جھجکتے ہُوئے دو تین بار ہاتھ بڑھایا، کھینچ لیا ... پھر اُس نے وہ پارچہ جھپٹ ہی لیا۔

ایک لمحے کے لیے اُس کی انگلیاں میری انگلیوں سے چھُو گئیں تو مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے مَیں نے سردی میں کسی ٹھٹھرے سانپ کو چھُو لیا ہو۔

ٹمرگ وہ پارچہ بھُوننے لگا۔

مَیں کھاتا اور خواہ مخواہ کی بکواس کرتا رہا۔ اس دوران ٹمرگ نے اپنی توجہ مجھ سے ہٹالی اور کچا پکا پارچہ کھانے میں مصروف ہوگیا۔ جب وہ اپنا پیٹ بھرنے سے فارغ ہوگیا تو مَیں اُٹھا، بڑے زور سے ایک جماہی لی اور جھولی اُٹھا کر غار سے باہر جانے لگا۔

ڈاکٹر فریدوں نے ایک بار پھر حشرات الارض والے ٹیپ چلانے شروع کر دیے تھے۔

ٹمرگ بھی اُٹھ کر میری طرف دیکھنے لگا اور پھر اُس کے حلق سے "عزمرو... عزمرو" قِسم کی آوازیں نکلنا شروع کر دیں۔

مَیں نے غار کے دہانے پر رُک کر اُس کی طرف دیکھا تو وہ ہاتھ کے اشارے سے مجھے بلانے لگا۔

مَیں اُس کی طرف بڑھ گیا۔

ٹمرگ جو اَب تک الاؤ کی دُوسری جانب ہی رہا تھا، آگے بڑھ کر میرے قدموں میں بیٹھ گیا۔ مَیں نے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو وہ میرے قدموں سے لپٹ گیا۔ اُس نے میرے ساتھ دوستی کرلی تھی۔ مَیں نے جھولی میں پڑے ہُوئے گوشت کے دونوں پارچے اُسے دے دیے۔ وہ خوشی کے مارے اُچھلنے اور "ٹمر ہاہاہا۔ ٹمر ہاہاہا" کرنے لگا۔

●

آیندہ چند روز مَیں ٹمرگ کے ساتھ اُسی غار میں گزارے۔ اب وہ میرے اشارے اور مَیں اُس کی غراہٹیں سمجھنے لگا تھا۔

اس دوران ہمیں اندازہ ہوگیا کہ اُس میں دماغی صلاحیت برائے نام ہی ہے۔ اُسے اب تک یہی پتہ نہیں چلا تھا کہ آخر اتنے عرصے سے غار کے باہر رات کا اندھیرا کیوں چھایا ہُوا ہے۔ اُس پر اس سارے عرصے میں یہی تاثر رہا کہ باہر رات ہے اور رات کو باہر نکلنا خطرناک ہوتا ہے۔ گویا یہ غار ہی اُس کے لیے ایک اچھی پناہ گاہ ہے جہاں ہر وقت آگ جلتی رہتی ہے۔ جونہی الاؤ مدھم پڑنے لگتا، وہ اُٹھ کر چند لکڑیاں اُس میں جھونک دیتا۔

جب مَیں وقتِ مقررہ پر گوشت کا راشن لینے کے لیے غار سے باہر نکلتا تو وہ غار کے آخری حصے میں ایک جگہ بیٹھ جاتا اور میرا انتظار کرنے لگتا۔

● اس دوران ڈاکٹر فریدوں نے کمپیوٹر کی مرمت کرلی تھی۔

"وہ کمپیوٹر سیٹ کر چکا تھا..." مگر وہ تمھیں ماضی کے سفر پر بھیجنے کی بجائے ٹمرگ میں زیادہ دلچسپی رکھتا ہے۔" آقائے رضا نے ملنے پر مجھے بتایا۔

"اگر آپ نے مجھے اس غار اور ٹمرگ سے نجات نہ دلائی تو مَیں پاگل ہو جاؤں گا۔" مَیں نے کہا۔

"گھبراؤ نہیں برخوردار۔ مَیں پہلے ہی وزیرِ اعظم سے مِل چکا ہُوں۔ اُنھوں نے ڈاکٹر فریدوں سے کہا ہے کہ وہ بلا تاخیر تمھیں اور ٹمرگ کو ماضی کے اسی دور میں منتقل کر دے کیونکہ پارلیمانی مجلس اور شاہ ان تجربات کا نتیجہ دیکھنے کے منتظر ہیں۔ چونکہ ٹمرگ تم سے کافی مانوس ہوگیا ہے اس لیے وہ اپنے دَور اور دُنیا میں تمھارا ممد و معاون ثابت ہوسکتا ہے۔ ڈاکٹر فریدوں نے پہلے تو ٹال مٹول سے کام لینا چاہا پھر اُسے سرِ تسلیم خم کرنا ہی پڑا۔ بس اب ایک دو روز کے اندر ہی تمھیں ٹمرگ کے دَور میں منتقل کر دیا جائے گا۔"

اُسی رات ڈاکٹر فریدوں نے جو گوشت بھجوایا، اُس میں نشہ آور دوائیں مِلی ہُوئی تھیں اور مجھے وہ گوشت کھانے سے منع کر دیا گیا تھا۔ وہ ٹمرگ کو کمپیوٹر چیمبر میں لانے سے پہلے بے ہوش کر دینا چاہتا تھا تاکہ ٹمرگ ڈر کے مارے یا گھبرا کر کوئی توڑ پھوڑ نہ کر بیٹھے۔

دُوسری صبح مجھے ٹمرگ کو اُٹھا کر کمپیوٹر چیمبر لے جانا پڑا۔

ڈاکٹر فریدوں بے حد اُداس تھا۔ ٹمرگ کی واپسی پر اُس کی کیفیت ایسی تھی جیسے کسی سے اُس کی محبوبہ ہمیشہ کے لیے چھینی جا رہی ہو۔ وہ بار بار ٹھنڈی سانس لیتا اور کہتا "ہائے۔ تم نے میرے ساتھ بڑی دُشمنی کی ہے رضا۔ اگر تم وزیرِ اعظم سے نہ مِلتے تو ٹمرگ نہ جاتا۔ یہ سب تمھاری سازش کی وجہ سے ہُوا ہے۔"

"مگر تم جب چاہو ٹمرگ کو واپس بُلا سکتے ہو ڈاکٹر۔" آقائے رضا نے مُسکرا کر کہا۔

"نہیں۔ ٹمرگ کبھی واپس نہیں آئے گا۔ سرفروش کو تو اس لیے واپس بُلایا جاسکتا ہے کہ اس کے دماغ پر سائنسی عمل کیے جاچکے ہیں مگر ٹمرگ کا دماغ نہ انسان کی صلاحیت رکھتا ہے اور نہ ہی اس پر سائنسی عمل کیے جاسکتے ہیں۔"

بہرکیف ڈاکٹر فریدوں کو دل پر پتھر رکھنا ہی پڑا اور ٹمرگ کو میرے ساتھ الیکٹرک چیئر پر بٹھا دیا گیا۔ وہی سارے عمل دُہرائے گئے جو اس موقعے پر کیے جاتے تھے۔ پھر ڈاکٹر فریدوں نے کمپیوٹر کا سُرخ سوئچ آن کر دیا۔ مجھے اور ٹمرگ کو برقی جھٹکا لگا۔

مجھے دَرد کی شدت میں اتنا ہی محسوس ہُوا کہ مَیں ٹمرگ بن گیا ہُوں اور ٹمرگ ایک گڑیا ہے... پھر ہم دونوں پاش پاش ہو کر فضائے بسیط میں تحلیل ہوگئے۔

جان پہچان

برسوں تک احمد دین ایک چھوٹی سی دُکان چلاتا رہا۔ دُکان پر کوئی ملازم رکھنے کی استطاعت نہ تھی لہٰذا اسے سارا کام خود ہی کرنا پڑتا تھا لیکن اچانک ہی اس کا پرائز بونڈ کھُلا تو اس نے دُکان میں توسیع کرلی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ سُپر مارکیٹ میں بدل گئی۔ چند سال بعد اس نے ایک فیکٹری لگا لی اور کاروباری سلسلے میں اسے کراچی، پشاور، لاہور، حیدر آباد اور ایسے ہی دوسرے شہروں میں تجارتی دَورے کرنے پڑے۔ بے شمار لوگوں سے اس کی ملاقاتیں ہُوئیں۔

ایک روز وہ کراچی سے واپس آیا تو اسے اپنے قصبے کی گرد آلود سڑک پر ایک شخص نظر آیا۔ دونوں کا آمنا سامنا ہُوا تو وہ رُک گئے۔ "مَیں نے تمھیں کہیں دیکھا ہے۔" احمد دین نے کہا۔ "شاید کلفٹن کے ساحل پر ملاقات ہوئی ہوگی۔"

"مَیں آج تک کراچی نہیں گیا۔" دوسرے شخص نے اسے جواب دیا

"تب پھر... پھر مَیں نے تمھیں مری میں دیکھا ہو گا، جہاں مَیں ذہنی سکون کے لیے گیا تھا۔" احمد دین نے ذہن پر زور دیتے ہُوئے کہا۔

"مَیں وہاں بھی کبھی نہیں گیا۔"

"اوہ... اب یاد آیا... تم سے لاہور میں ملاقات ہوئی تھی اور ہم نے انٹر کانٹی نینٹل میں ایک ساتھ کھانا کھایا تھا۔ تم یہاں کیسے آئے؟" احمد دین نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

"زیادہ بک بک مت کر احمد دین۔ مَیں تیرا بڑا بھائی فضل دین ہُوں، چل گھر چل۔"

* * *

تجربے نے مجھے یہی سکھایا تھا کہ جب کمپیوٹر ماضی کے کسی دور میں منتقل کرے تو میں کچھ دیر تک ساکت پڑا رہوں اور جب تک ماحول کا اچھی طرح جائزہ نہ لے لوں اپنی جگہ سے خفیف سی حرکت بھی نہ کروں۔ چنانچہ میں نے اپنے آپ کو ایک دلدلی قطعے پر جھاڑیوں کے درمیان، زمین پر منہ کے بل لیٹے پایا تو پتہ چلا کہ میرے نیچے اور سامنے گھاس لہلہا رہی ہے مگر اس گھاس کا رنگ سبز نہیں بلکہ سُرخ ہے۔

میں نے آہستہ آہستہ سر گھما کر اِدھر اُدھر دیکھا تو ہر طرف اس عجیب سی گھاس کے سوا کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ یوں لگتا تھا جیسے سُرخ گھاس کا ایک سمندر میرے چاروں طرف پھیلا ہوا ہو... پھر یکایک کہیں قریب سے دو مہیب درندوں کی خوفناک آوازیں آنے لگیں جیسے وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر دھاڑ رہے ہوں۔

چند لمحے بعد اُن درندوں میں لڑائی ہونے لگی اور اُن کی خوفناک آوازوں سے غیظ و غضب کی ایک سرد سی لہر دوڑ گئی۔

اچانک ایک درندے کی آواز موت کی چیخ بن کر فضا میں گونجی۔ جسے دوسرے درندے کی فاتحانہ دھاڑ نے نگل لیا۔ پھر ماحول پر ایک عجیب سا پُراسرار سناٹا چھا گیا۔

ان آوازوں نے مجھے ڈاکٹر فریدوں کے ٹیپ ریکارڈرز کی یاد دلا دی اور اس کے ساتھ ہی مجھے نمرگ یاد آ گیا۔ اُسے بھی تو میرے ساتھ ہی ماضی کے اس دور میں منتقل کیا گیا تھا... مگر وہ اس وقت کہاں ہے؟ کیا وہ کسی دوسرے دور میں چلا گیا ہے؟ پھر مجھے خیال آیا کہ اگر کمپیوٹر نے ہمیں، نمرگ کے دور اور دُنیا کی بجائے ماضی کے کسی دوسرے دور میں بھیج دیا ہو تو وہ میرے کس کام کا؟ وہ تو اُلٹا میرے لیے مصیبت ہی بن جائے گا۔

میں اُٹھ بیٹھا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

لمبی لمبی گھاس کے اس سمندر میں مجھے نمرگ کہیں بھی دکھائی نہ دیا۔ یوں لگتا تھا جیسے آفتاب غروب ہونے والا ہو اور شام اُترنے والی ہو۔

معاً مجھے اپنے بائیں جانب دھپ دھپ کرتے کسی دوڑتے ہوئے جانور کی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے دائیں جانب سے سانپ کی سی تیز پھنکار کی آواز بھی آئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے زندگی اور موت کا دوسرا کھیل شروع ہونے والا ہو۔

میں مارے خوف کے وہیں منجمد سا ہو کر رہ گیا۔

اگلے ہی لمحے کسی نے میرے بازو پر زور سے لکڑی ماری۔

میں نے جلدی سے لکڑی تھام لی اور پلٹ کر دیکھا۔ لکڑی کا دوسرا سرا نمرگ کے ہاتھ میں تھا وہ خونخوار انداز میں غرّانے لگا۔ میں نے جھٹکے سے لکڑی چھین لی۔

نمرگ مجھ پر جھپٹا اور اپنے نوکیلے دانت میری گردن میں گاڑ دینا چاہے۔ مگر میں نے بڑے زور سے اُس کے ماتھے پر مکّا مارا تو وہ چکرا کر گر پڑا۔

میں اُس پر لکڑی سے حملہ کرنے ہی والا تھا، مجھے یاد آ گیا کہ اُس کی دماغی صلاحیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس لیے وہ مجھے اس نئے ماحول اور نئے دور میں بھول چکا ہو گا۔ لہٰذا اُسے ایک بار پھر "جس کی لاٹھی، اُس کی بھینس" والا سبق دینا پڑے گا۔ چنانچہ جونہی نمرگ کے حواس بحال ہوئے اور اس نے آنکھیں کھولیں، میں نے اُسے مارنے کے لیے لکڑی بلند کی۔ وہ فوراً میرے قدموں سے لپٹ گیا۔

اُس نے ایک بار پھر طاقت کے سامنے سر جھکا دیا تھا۔

میں نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ویسی ہی آواز نکالی جیسی کہ نمرگ بھوک کا اظہار کرنے کے لیے غار میں نکالا کرتا تھا۔ وہ میرا اشارہ سمجھ گیا اور اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر ایک طرف اشارہ کرنے لگا۔

میں نے بھی لکڑی سے اُسی جانب اشارہ کرتے ہوئے اُسے اُدھر بڑھنے کے لیے ٹہوکا دیا تو وہ میرے آگے آگے چلنے لگا۔ اس کی حرکتوں سے اندازہ ہوتا تھا جیسے یہ جگہ اس کی دیکھی بھالی ہو... اور اس کا مطلب تھا کہ کمپیوٹر نے ہمیں واقعی اُسی کے دور میں منتقل کیا ہے۔

نمرگ تیزی سے آگے بڑھتا رہا۔ اُسے تو گھاس میں چلنے سے کوئی تکلیف محسوس نہ ہوئی جبکہ میرے جسم پر جگہ جگہ خراشیں آ گئیں۔ یہ گھاس درانتی کی مانند کاٹ رکھتی تھی۔ پھر ایک جگہ وہ گھاس زمین پر بچھی دکھائی دینے لگی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس ٹکڑے پر کسی نے گھاس کو روند کر زمین پر بچھا دیا ہو۔ اس قطعے کے بیچوں بیچ ایک چھوٹا سا چشمہ اُبل رہا تھا۔ یہ چشمہ دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ یہاں جانور پانی پینے اور آرام کرنے کے لیے آتے ہوں گے اس لیے گھاس زمین پر بچھ گئی ہے۔

نمرگ چشمے پر پانی پینے لگا اور پھر وہ چشمے میں لیٹ گیا۔ شام سر پر آ رہی تھی اس لیے میں نے اُسے ٹہوکا دیا اور بھوک یاد دلائی تو وہ بادلِ نخواستہ چشمے سے نکلا اور میری رہنمائی کرنے کے بجائے ایک جانب جا کر کچھ دیکھنے لگا۔ پھر اُس نے مجھے قریب آنے اور دیکھنے کا اشارہ کیا۔

میں اُس کے قریب جا کر اُدھر دیکھنے لگا۔

کچھ فاصلے پر مجھے گھاس کے درمیان ایک راستہ سا دکھائی دیا اور یہ راستہ دُور اُن پہاڑیوں تک چلا گیا تھا جن کی چوٹیوں پر جگہ جگہ دُھواں اُٹھ رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ پہاڑیاں وہاں سے ایک میل دُور ہوں گی۔ یہ دُھواں آگ کی نشاندہی کرتا تھا۔ میں نے سوچا کہ آگ، درندوں سے حفاظت کے لیے جلائی گئی ہو گی۔ ممکن ہے وہاں نمرگ کے بھائی بند رہتے ہوں۔ اگر ہم وہاں پہنچ جائیں تو ہمیں خوراک اور پناہ مل جائے گی۔

میں نے مسکراتے ہوئے نمرگ کی طرف دیکھا اور پیٹ پر ہاتھ پھیرا تو نمرگ ہنس پڑا۔ "نمرہاہاہا۔ نمرہاہاہا"۔ اور پہاڑیوں کی طرف اشارہ کر کے اُچھلنے لگا۔ پھر وہ میری رہنمائی کے لیے آگے آگے چل دیا۔ مجھے آغائے رضا کی بات یاد آ گئی۔ نمرگ واقعی اپنے دَور اور دُنیا میں میرا ممد و معاون ثابت ہو رہا تھا اب وہ تیزی سے اس راستے پر پہاڑیوں کی طرف اُچھلتے ہوئے بڑھ رہا تھا۔ میں اس سے تقریباً پچاس قدم پیچھے تھا کہ اچانک ایک جگہ زمین نے میرے پاؤں پکڑ لیے اور میں ریت کی دلدل میں اُترتا چلا گیا۔ صورتِ حال کا احساس ہونے تک میں کمر تک ریت میں دھنس چکا تھا۔

میں نے نمرگ کو آواز دی تو وہ پلٹ کر میرے قریب آ گیا۔ اب مجھے پتہ چلا کہ وہ اُچھل اُچھل کر راستہ کیوں طے کر رہا تھا۔ ...یہ راستہ ریت کی دلدل سے گزرتا تھا۔ اس لیے جہاں دلدل آتی تھی، وہ اُچھل کر اُسے پار کر لیتا تھا۔

میں سخت ترین مشکل حالات میں بھی گھبرایا نہیں کرتا مگر اس طرح ریت میں دھنس کر بے بسی سے جان دینا بھی مجھے منظور نہیں تھا۔ میں نے نمرگ کی طرف دیکھا تو مجھے اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی وحشیانہ چمک ناچتی دکھائی دی۔ میں اپنے آپ کو ریت سے نکالنے کی کوشش بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس طرح اور زیادہ تیزی سے اس میں دفن ہوتا چلا جاتا۔ نمرگ بھی میری بات نہیں سمجھ رہا تھا اور ٹکٹکی باندھے میری طرف دیکھے جا رہا تھا۔

... پھر ایک ترکیب میری سمجھ میں آ گئی۔

میرے دونوں ہاتھ ابھی تک ریت سے باہر تھے۔ میں نے وہی لکڑی نمرگ کی طرف بڑھائی جو اُس نے میرے بازو پر ماری تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ لکڑی پکڑ کر کھینچے گا تو میں دلدل سے نکل آؤں گا مگر اپنی طرف اُٹھی ہوئی لکڑی دیکھ کر وہ بُری طرح بدکا اور پیچھے ہٹ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا... پھر اُس نے زمین پر پڑے کچھ چھوٹے چھوٹے پتھر اُٹھائے اور مجھے مارنے لگا۔ اب میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ نمرگ کے بھائی بند اپنے شکار کو گھیر گھار کر یا اپنے پیچھے لگا کر ادھر ہی لے آتے ہوں گے اور جب وہ اس دلدل میں پھنس جاتا ہو گا تو اُسے پتھر مار مار کر ہلاک کر دیتے ہوں گے۔

نمرگ کا پھینکا ہوا پہلا پتھر میرے کندھے پر لگا۔ میں نے اُسے لکڑی سے ڈرایا تو نمرگ دو قدم پیچھے ہٹا اور اس نے دوسرا پتھر کھینچ مارا۔ اگر میں جلدی سے سر نہ جھکاتا تو میری کھوپڑی پاش پاش ہو جاتی۔ تیسرا پتھر میرے سامنے ریت میں گرا اور اس سے پہلے کہ وہ گہرائی میں اُتر جاتا۔ میں نے ٹٹول کر اُسے نکال لینا چاہا مگر اُسے تلاش نہ کر سکا۔ میں نے نمرگ کی طرف دیکھا، وہ چوتھا پتھر مارنے کی تیاری کر رہا تھا۔ میں بھی تیار ہو گیا اور جونہی پتھر میرے قریب آیا، میں نے اسے دبوچ لیا۔

نمرگ حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے اُسے وہ پتھر کھینچ مارا جو اس پیٹ میں جا لگا۔ نمرگ درد کے مارے بلبلا اُٹھا اس نے باقی ماندہ پتھر پھینک کر اپنا پیٹ پکڑ لیا اور پیچھے ہٹنے لگا۔

میں نے آخری کوشش کے طور پر لکڑی کا نوک دار سرا راستے کی پکی زمین کی طرف بڑھایا تاکہ اگر وہ وہاں گڑ جائے تو میں اُسے پکڑ کر ریت کی دلدل سے نکل آؤں۔ مگر لکڑی ٹھوس زمین سے چند انچ اِدھر ہی رہ گئی۔ میں نے اُدھر کھسکنے کے لیے زور لگایا تو سینے تک ریت میں دھنس گیا۔

اب موت میری آنکھوں کے سامنے رقص کر رہی تھی اور میں چند گھڑیوں کا مہمان تھا۔ جب مجھے مرنا ہی تھا تو بے بسی سے زندہ دفن ہونے کی بجائے موت سے پنجہ لڑانا زیادہ بہتر سمجھتا تھا۔ چنانچہ میں نے ایک بار پھر لکڑی کا نوک دار حصّہ ٹھوس زمین میں گاڑنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔

لکڑی کا نوک دار حصّہ ٹھوس زمین میں گڑ ہی گیا۔

میں آہستہ آہستہ لکڑی پر دباؤ ڈال کر ٹھوس پگڈنڈی کی طرف بڑھنے لگا۔

چند انچ سرکنے کے بعد میں پوری قوت سے لکڑی پر دباؤ ڈالتا تھا تاکہ وہ مزید گڑ جائے۔ اس طرح بالآخر میں بھُربھُری موت کے شکنجے سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

اس دوران میں نمرگ غائب ہو چکا تھا۔ شاید وہ اپنے بھائی بندوں کو بلانے گیا تھا کہ شکار پھنس چکا ہے... وہ آئیں اور مجھے ریت سے نکال کر میرے گوشت سے ضیافت اُڑائیں۔

میں نے اپنے بدن سے ریت جھاڑی لکڑی نکالی اور اُس سے راستہ ٹٹولتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ اب اُترتی شام کے مٹیالے اندھیرے میں پہاڑیوں پر آگ جلتی دکھائی دینے لگی تھی اور میں جلد از جلد وہاں پہنچ جانا چاہتا تھا۔

ابھی میں بمشکل پانچ سو گز ہی گیا تھا کہ مجھے نمرگ کی آواز بلکہ چیخ سُنائی دی۔ وہ اپنے بھائی بندوں کو بلانے نہیں گیا تھا بلکہ سامنے والے موڑ کے پیچھے چھپا میری موت و حیات کی کشمکش کا تماشا دیکھ رہا تھا اور یہ بھول گیا تھا کہ موت خود اُسی کی تاک میں ہے۔

میں اُس کی موت کا منظر نہیں دیکھنا چاہتا تھا مگر دیکھنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

چیونٹیاں کھانے والے جانور یعنی مورخور جیسے ایک بہت بڑے جانور نے جس کی زبان کم از کم بیس فٹ لمبی تھی، نمرگ کو اپنی زبان میں لپیٹ رکھا تھا اور اس کی گرفت اتنی سخت ہو گئی تھی کہ نمرگ آواز بھی نہیں نکال سکتا تھا، پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس کی ہڈیاں کڑکڑائیں اور وہ چُرمرا کر رہ گیا۔ عظیم الجثہ مورخور کی زبان سمٹنے لگی... پھر اس نے جبڑا کھولا اور نمرگ کو نگل گیا۔ وہ خبیث جانور اب مجھ پر نظریں گاڑے ہوئے تھا۔ اُس کا مُنہ اژدہے کا سا اور جسم مگرمچھ جیسا تھا۔ وہ پانچ فٹ اونچا اور تقریباً تیس فٹ لمبا تھا۔ وہ ہلے جلے بغیر ہی میری طرف دیکھے جا رہا تھا کہ کب میں بھاگنے کی کوشش میں آگے بڑھوں اور اس کی زبان اسپرنگ کی طرح اچھل کر مجھے اپنی لپیٹ میں لے لے۔

مجھ پر اس خوفناک بلا نے کپکپی سی طاری کر دی۔ میں نے آج تک اس قسم کی کسی مخلوق کا ذکر کسی کتاب میں نہیں پڑھا تھا۔ اس قسم کے جانوروں کا ذکر تو صرف دیومالائی قصوں اور کہانیوں میں ہی آتا ہے... لیکن اب پتہ چلا کہ ہر خیال کے پیچھے کوئی نہ کوئی حقیقت ضرور ہوتی ہے۔

میرے لیے اس وقت سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ میں اُس کے سامنے سے کیسے گزروں۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اسی قبیل کی ایک اور بلا گھاس سے برآمد ہوئی۔ دونوں نے اپنی لہراتی ہوئی زبانیں نکالیں اور پھنکارتے ہوئے ایک دوسرے سے معرکہ آرائی میں مصروف ہو گئیں۔ یہ دونوں جانور اپنی زبانوں کے ذریعے ایک دوسرے سے جکڑ گئے تھے پھر وہ لوٹنے لگے اور ان کی اس زور آزمائی سے زمین تھرتھرانے لگی۔

میں موقع غنیمت جان کر وہاں سے بھاگ اُٹھا۔

نمرگ کا دَور عجیب الخلقت بلاؤں کا دَور ثابت ہو رہا تھا جس نے مجھے بُری طرح دہلا کے رکھ دیا تھا۔ نمرگ جس سے مجھے معاونت کی اُمید تھی، وہ بھی دُشمن نکلا اور مارا گیا تھا... پھر بھی مجھے اُس کی موت پر دُکھ ہو رہا تھا۔ اس وقت تک میں دو بار موت کو چکمہ دے کر بھاگ نکلا تھا مگر نہیں جانتا تھا کہ آنے والا وقت میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ تاہم میں پہاڑیوں پر جلتی آگ کو منزل بنا کر بھاگتا چلا گیا۔

میرے پیچھے اب مختلف درندوں کی آوازیں بلند ہونے لگی تھیں۔ میں نے کئی جگہ گھاس میں سرسراہٹ اور پھنکاریں بھی سُنیں مگر ہر آواز میری رفتار بڑھاتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ میں گھاس کے سمندر سے نکل آیا۔ اب وہ پہاڑیاں تقریباً پانچ سو گز دُور رہ گئی تھیں جن کے غاروں میں الاؤ جل رہے تھے۔ میں نے اپنی رفتار کم کر دی اور پلٹ کر دیکھا۔ کوئی درندہ یا کوئی "بلا" اس وقت میرا تعاقب نہیں کر رہی تھی لیکن آگے مجھے کیسے وحشیوں سے پالا پڑنے والا ہے، یہ میں نہیں جانتا تھا۔

میں دم لینے کے لیے رُک گیا۔

ابھی میری سانس بھی درست نہیں ہوئی تھی کہ مجھے اپنے پیچھے کچھ فاصلے پر دھب دھب کی آوازیں سُنائی دیں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

ہر چند کہ اب شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا مگر اُفق کے پس منظر میں مجھے اُس خوفناک بلا کا ہیولا صاف دکھائی دے رہا تھا جو ایک اچھے خاصے گھر جتنی بلند تھی۔ اس کے سر پر سینگ تھے اور وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ ہر قدم پر سُونگھنے کے لیے اپنا مُنہ اوپر اُٹھا لیتی تھی۔ میں نے کسی شکاری کتے کی طرح دوڑ لگا دی اور پہاڑیوں کے قدموں تک بھاگتا چلا گیا پھر میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ بلا بھی کچھ فاصلے پر رُک گئی تھی۔ شاید وہ آگ سے خوفزدہ تھی۔ چند لمحوں کے بعد جب وہ خود ہی پلٹ گئی تو میری جان میں جان آئی اور میں نے اطمینان کی ایک طویل سانس لی۔ اس عمل کے ساتھ ہی میرے نتھنوں میں ویسی ہی بدبو بھی در آئی جیسی کہ نمرگ سے آیا کرتی تھی... مگر اس بدبو میں گوبر اور بھنے جانے والے گوشت کی بُو بھی شامل تھی۔

گوشت کی بُو باقی ہر بُو پر غالب آ گئی اور اس نے میری اشتہا بڑھا دی۔ میں ایک غار کی طرف رینگنے لگا۔ چونکہ وہ

وحشی اوپر تھے اور ہوا بھی اوپر سے آ رہی تھی اس لیے وہ میری بُو نہ سُونگھ سکے اور میں آگے بڑھتا چلا گیا۔

سب سے پہلے غار کے دہانے کے باہر ایک چھوٹی سی ستون نما چٹان کھڑی تھی۔ میں نے اس کی اوٹ لے کر غار کا جائزہ لیا۔ الاؤ کے ارد گرد مجھے دس ہیولے دکھائی دیے۔ ان کے قد تقریباً چار فٹ، ٹانگیں چھوٹی، ہاتھ لمبے اور سر بڑے بڑے تھے۔ ان کی یہ جسمانی ساخت صد فی صد نمرگ سے ملتی جلتی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ مخلوق نمرگ ہی کی قبیل سے تعلق رکھتی تھی۔ اُن دس نمرگوں میں سے چار نر اور چھ مادہ تھیں۔ چاروں نر الاؤ کے اس طرف اور مادہ دوسری طرف تھیں۔ ہر مذکر کے پاس ڈنڈا یا کلہاڑا رکھا ہوا تھا اور ہر چند لمحوں بعد وہ غار کے باہر... اندھیرے میں دیکھتے اور سُونگھتے تھے جیسے کسی بھی ناگہانی خطرے کے لیے تیار رہنا چاہتے ہوں۔ دو عورتیں لکڑیوں میں گوشت کے پارچے پرو کر انھیں بھون رہی تھیں۔ دو بچّوں کو دودھ پلا رہی تھیں اور باقی دو غالباً کھانے کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔

میرے پاس حملے یا مدافعت کے لیے صرف وہی لکڑی تھی مگر وہ کلہاڑیوں اور ڈنڈوں کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ میرے لیے غار میں جانا بھی ناگزیر تھا کہ پیچھے جنگل میں بلائیں موت کا رُوپ دھارے مجھے لقمہ بنانے کے لیے تیار بیٹھی تھیں۔ بھونے جانے والے گوشت کی بُو نے میری اشتہا کو بہت بڑھا دیا تھا اور اب مجھے سردی بھی لگ رہی تھی۔ میں نے بلا تاخیر غار میں جانے کا فیصلہ کر لیا لیکن آگے بڑھنے سے پہلے میں نے وہ لکڑی وہیں پھینک دی کیونکہ وہ ہتھیار ثابت نہیں ہو سکتی تھی۔ دوسرے نمرگ میرے ہاتھ میں لکڑی دیکھ کر فوراً مشتعل ہو جاتے اور خوف یا غصّے میں حملہ کر دیتے مگر نہتا ہونے کی صورت میں شاید وہ حملہ کرنے میں عجلت نہ دکھاتے۔

میں آگے بڑھ کر غار میں داخل ہو گیا اور نمرگ کی وہی غرّاہٹ دُہرانے لگا جو وہ گوشت مانگنے کے لیے حلق سے نکالا کرتا تھا۔ سارے نمرگ میری طرف متوجہ ہو گئے مگر غار میں ایک دم گمبھیر خاموشی چھا گئی۔ شاید وہ اپنی جسامت سے دُگنا نمرگ دیکھ کر بھونچکا رہ گئے تھے ورنہ اُن کے ڈنڈے اور کلہاڑے اُن کی دسترس سے باہر نہیں تھے۔

میں پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دوبارہ غرّایا تو مادہ نمرگوں میں بھگدڑ سی مچ گئی۔ انھوں نے اپنے بچّے اُٹھائے اور بھاگ کھڑی ہوئیں، نر نمرگوں نے بھی اُن کی تقلید کی اور جاتے وقت اپنے ہتھیار اُٹھانا بھی بھول گئے۔ مگر ایک جوان نمرگ جو میرے سامنے تھا وہ نہ بھاگ سکا اور غرّانے لگا۔ میں اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے اس کی طرف جانے لگا تو دو قدم پیچھے ہٹا اور پھر الاؤ پھلانگتا ہوا وہ بھی بھاگ نکلا۔

اب میں غار میں تنہا کھڑا تھا۔

نمرگ واپس بھی آ سکتے تھے اور اپنے ساتھ بہت سے بھائی بند بھی لا سکتے تھے اس لیے میں نے جلدی سے ایک کلہاڑا اور ڈنڈا منتخب کیا اور الاؤ کے دوسری طرف بیٹھ کر وہ گوشت کھانے لگا جو بھننے کے بعد بڑبونگ میں الاؤ کے قریب ہی گر پڑا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کس جانور کا گوشت ہے مگر اس وقت وہ مجھے ایک نعمتِ غیر مترقبہ سے کم محسوس نہ ہوا۔ میں نے ڈٹ کر کھایا، پیٹ بھرا تو میری ہمت و قوت بھی لوٹ آئی۔

اب میں ہر مصیبت کا مقابلہ کرنے کو تیار تھا۔

اس وحشی دَور میں آنے کے بعد اگرچہ بدترین وقت گزر چکا تھا مگر میں جانتا تھا کہ درندے کچھ دُور اندھیرے میں اور نمرگ غار کے باہر کھڑے میری جانب دیکھ رہے ہیں۔ درندے خوفناک آوازوں کے ساتھ دھاڑ رہے تھے جبکہ نمرگ خاموشی سے میرا جائزہ لے رہے تھے۔ درندے آگ کے خوف سے اندر نہیں آ سکتے تھے مگر نمرگ نہ صرف اندر آ سکتے تھے بلکہ باہر سے پتھراؤ بھی کر سکتے تھے لیکن یہ رات تو بہر حال مجھے یہاں گزارنا ہی تھی۔ گوشت کھانے کے بعد میں نے پانی کے لیے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی مگر وہاں کوئی برتن نہیں تھا البتہ مجھے کسی جانور کی کھال کا ایک ٹکڑا اور سُوکھی بیلوں کا ایک ڈھیر ضرور دکھائی دے گیا۔ میں نے وہ کھال لنگوٹ کی طرح سُوکھی جنگلی بیل سے باندھ لی۔ ہر چند کہ میں وحشی دَور میں تھا مگر تہذیب میرے لاشعور میں اتنی رَچ بس چکی تھی کہ میں ایسا کرنے کے لیے مجبور ہو گیا تھا۔

اب مجھے نیند محسوس ہونے لگی مگر یہ نیند مجھے ہمیشہ کے لیے بھی سُلا سکتی تھی اس لیے میں ایک کونے میں بیٹھ کر نیند کو بھگانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں بار بار اپنی آنکھیں ملتا اور رانوں پر زور زور سے چٹکیاں لیتا تھا لیکن نیند جیسے آنکھوں کی منڈیروں پر آ بیٹھی تھی۔ میری آنکھیں اپنے آپ بند ہونے لگتیں مگر میں انھیں زبردستی کھول لیتا اور جماہیاں لینے لگتا تھا۔

ایک بار میں نے آنکھیں کھول کر جماہی لی تو یہ دیکھ کر مجھے جھرجھری آ گئی کہ وہ میرے سامنے کھڑی تھی... اور مجھے گھور رہی تھی مگر اس کی آنکھوں میں غصّے کی بجائے خوف کی پرچھائیاں

تیر رہی تھیں۔

وہ ایک جوان نمرگ تھی۔ وہ میری طرف دیکھنے کے ساتھ ساتھ پلٹ کر پیچھے اندھیرے میں بھی دیکھ لیتی تھی اور بادلِ نخواستہ کچھ آگے بڑھ آتی تھی پھر وہ مجھے اپنی طرف بُلانے لگی۔

اس کی حرکات دیکھ کر مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی اور میں سمجھ گیا کہ نمرگوں نے اسے رشوت کے طور پر بھیجا ہے لیکن پھر میں نے خود ہی اپنی یہ سوچ رَد کر دی کیونکہ نمرگ کی ذہنی استعداد میرے سامنے تھی۔ یہ وحشی مخلوق ابھی انسانوں کی سوچ، بالخصوص اس گھٹیا سوچ تک نہیں پہنچ سکی تھی جس کے تحت وہ ہمارے دَور اور دُنیا میں اس قسم کی رشوت دیتے لیتے ہیں۔ اس نمرگ خاتون کو غالباً پہلی نظر کی محبت کا جذبہ میری طرف کھینچ لایا تھا۔

میں مسکراتا اور اس سے باتیں کرتا رہا۔

وہ میری باتیں تو کیا خاک سمجھتی مگر بڑے پیار سے میری طرف دیکھتی رہی۔ میں کبھی اُس سے پیار بھرے مکالمے بولنے لگتا اور کبھی ڈاکٹر فریدوں کو کوسنا شروع کر دیتا جس نے لالہ رُخ کو مجھ سے برگشتہ کر کے اس وحشی مخلوق کو میری محبت میں مبتلا کر دیا تھا۔

نمرگ خاتون کی آمد سے میری نیند اُڑ گئی اور وقت گزرنے کا پتہ بھی نہ چلا جب غار کے باہر صبحِ کاذب کا اُجالا پھیلنے لگا تو وہ اُٹھی اور چپ چاپ غار سے باہر چلی گئی۔

میں کچھ دیر وہیں بیٹھا آگ تاپتا رہا اور جب باہر اچھا خاصا اُجالا پھیل گیا تو میں کلہاڑا اور ڈنڈا لیے غار کے دہانے پر پہنچ گیا۔ میرے سامنے تقریباً نصف میل دُور سُرخ گھاس کا سمندر پھیلا ہوا تھا۔ پہاڑیوں میں جگہ جگہ بنے ہوئے غار شہد کے کسی چھتے کی یاد دلا رہے تھے اور ہر طرف قبرستان کی سی گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

میں جانتا تھا کہ نمرگ اِدھر اُدھر غاروں میں چھپے ہوئے مجھے دیکھ رہے ہوں گے مگر وہ میرے سامنے نہیں آ رہے تھے۔ میں وہاں سے چل پڑا۔ میرا جی چاہا کہ کسی غار میں جا کر دیکھوں مگر پھر میں نے یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔ خواہ مخواہ بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے سے کیا فائدہ تھا۔

ایک غار کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں رُکنے پر مجبور ہو گیا۔

اس غار کے باہر مجھے سُرخ مٹّی کی بنی ہوئی ایک بھدّی سی انگیٹھی دکھائی دے گئی۔ اس انگیٹھی کے ساتھ جنگلی بیل کی بٹی ہوئی رسّی بھی بندھی ہوئی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے کانگڑی کی طرح اُٹھایا جا سکتا ہے۔ انگیٹھی کے قریب کچھ بھدّے سے آلات بھی رکھے ہوئے دکھائی دیے ان میں کچھ کھُردرے سے پتھر، سوئی کی طرح نوکیلی ہڈیاں، پتھر کی سان اور ہتھوڑے وغیرہ شامل تھے۔ میں نے بیٹھ کر ان اشیا کا جائزہ لیا تو مجھے چقماق کے کچھ ٹکڑے اور چقماق کا بنا ہوا ایک، دو دھاری بھدّا سا چاقو بھی نظر آ گیا۔

میں نے چاقو اور انگیٹھی اُٹھا لی۔

انگیٹھی میں راکھ بھری ہوئی تھی۔ میں نے اُسے اُلٹ دیا۔ راکھ میں کچھ انگارے موجود تھے، میں نے انھیں دوبارہ انگیٹھی میں ڈالا اور کانگڑی کی طرح لٹکا کر چل دیا۔ تاہم میں اس غیر معمولی ذہین نمرگ کا شکریہ ادا کرنا نہ بھولا جو اس وحشی اور غیر مہذب دَور میں شاید لوہار کا کام کرتا تھا اور نمرگوں کے لیے ہتھیار بناتا تھا اس کی یہ کانگڑی مجھے سردی سے بچا سکتی تھی اور چاقو بھی بوقتِ ضرورت کام دے سکتا تھا۔

میں نے وہیں کھڑے ہو کر اطراف کا جائزہ لیا۔ جنگل میں واپس جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور نمرگوں میں مزید قیام بھی ناممکن تھا اس لیے میں نے پہاڑیوں کے دوسری طرف جانے کا فیصلہ کر لیا اور چڑھائی چڑھنے لگا جو نصف گھنٹے میں مکمل ہو گئی۔

میں نے پہاڑی کی چوٹی سے نیچے دیکھا۔ میرے سامنے ایک وسیع میدانی علاقہ تھا جس میں جا بجا پہاڑی نالوں کی گزرگاہیں دکھائی دے رہی تھیں مگر اُن کے کسی گڑھے میں بھی پانی نظر نہ آیا۔ میں آگے بڑھنے لگا۔

چند گھنٹوں کی مسافت مجھے ایک ایسے جنگل کے کنارے لے آئی جو میرے دائیں بائیں تا حدِ نظر پھیلا ہوا تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور ایسا لگتا تھا کہ شام سے پہلے پہلے بارش شروع ہو جائے گی... مگر اس جنگل میں داخل ہونے سے مجھے ڈر سا لگ رہا تھا کیونکہ وہاں نہ تو پرندوں کی چہکار تھی اور نہ ہی درندوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ہر طرف ایک مہیب اور بے کراں سناٹا طاری تھا۔ البتہ جب ہوا درختوں کے بیچ سے گزرتی تھی تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے عورتیں قبروں کے سرہانے کھڑی اپنے پیاروں کی یاد میں سسکیاں لے رہی ہوں۔

میں چلتے وقت بچا کھُچا گوشت بھی اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ ایک جگہ بیٹھ کر میں نے وہ گوشت کھایا اور جنگل کے باہر ہی ایک طرف بڑھنے لگا کیونکہ جنگل میں کسی بھی درخت کی اوٹ میں موت گھات لگا سکتی تھی لیکن پھر میں نے جنگل میں داخل ہونے کا فیصلہ کر لیا... مگر مشکل یہ تھی کہ جنگل کے کنارے والے درختوں پر عجیب سی گھنی گھنی بیلیں یوں چڑھی ہوئی تھیں جیسے ان کا جال تان دیا گیا

ہو۔ سارے درخت اسی جال میں جکڑے دکھائی دے رہے تھے۔ بالآخر ایک جگہ مجھے اندر گھسنے کے لیے ایک چھوٹا سا موکھا مل گیا۔ میں نے کلہاڑے اور چاقو سے بیلیں کاٹیں اور راستہ بناتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

یوں تو اس گھنے جنگل میں خاصا اندھیرا تھا مگر جب وہ گہرا ہوگیا تو میں نے اندازہ لگایا کہ شام ہوگئی ہے اور اب مجھے سونے کا ٹھکانہ ڈھونڈ لینا چاہیے۔ تھوڑی دُور آگے بڑھنے پر مجھے ایک چھوٹا سا صاف قطعہ اراضی دکھائی دیا۔ میں نے وہیں رات گزارنے کا ارادہ کرلیا۔

اب میرے پاس نہ تو کھانے کے لیے کچھ تھا اور نہ ہی پینے کو پانی تھا۔۔ پھر مجھے رات کو آگ جلانے کے لیے خشک لکڑیاں بھی درکار تھیں۔ میں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی تو مجھے کچھ خشک جھاڑیاں اور درخت دکھائی دے گئے۔ میں ان کی ٹہنیاں کاٹنے کے لیے اُدھر گیا تو مجھے قریب ہی کہیں ایک نالہ بہنے کی آواز آئی۔ میں آواز کی سمت بڑھا تو واقعی مجھے ایک چھوٹی سی ندی دکھائی دی جس کا پانی ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔ میں جلدی جلدی نہایا اور پیاس بجھانے کے بعد لکڑیاں جمع کرنے لگا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اب میرا رزق کہاں سے اُترے گا۔

جب میں اُس صاف جگہ انگیٹھی جلانے لگا تو مجھے اپنے عقب میں کچھ کھٹکا سا محسوس ہُوا۔ میں نے جلدی سے وہ چقماق والا چاقو نکال لیا مگر اس کا دستہ نہ ہونے کے باعث گرفت مضبوط نہیں رکھی جاسکتی تھی تاہم میں نے اُسے ممکنہ مضبوطی سے تھام لیا۔ اتنے میں مجھے یوں لگا جیسے کوئی جانور میرے قریب آگیا ہو۔ اس کا اندازہ مجھے اس کی کھال سے خارج ہونے والی بُو سے ہُوا تھا۔ میں ایک دم جلدی سے گھوم گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ گُرگ قسم کا کوئی جانور نما آدمی ہوگا مگر وہ ایک خرگوش نکلا تاہم یہ خرگوش بھی جسامت میں چھوٹی سی بھیڑ سے کم نہیں تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر نہ تو خوفزدہ ہُوا اور نہ ہی اُس نے بھاگنے کی کوشش کی۔۔۔ بلکہ اپنی لال لال آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ شاید اس نے پہلے کبھی مجھ جیسا آدمی نہیں دیکھا تھا اس لیے وہ نتھنے پھڑکاتا اور سونگھتا ہُوا میرے قریب آگیا۔ میں نے ایک دم اُسے دبوچ کر اُس کے گلے پر چاقو پھیر دیا۔

میں نے زندگی میں اس سے زیادہ آسان شکار کبھی نہیں کیا تھا۔

خرگوش ذبح کرنے کے بعد میں نے اپنے اِرد گرد ایک حلقے میں لکڑیاں پھیلا کر آگ جلادی تاکہ کوئی جانور اندر نہ آسکے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے بہت سی فالتو لکڑیاں بھی رکھ لیں تاکہ یہ الاؤ رات بھر جلتا رہے۔ پھر میں نے خرگوش کا کچھ گوشت بھونا اور پیٹ کی آگ بجھانے کے بعد ایک خم دار ٹہنی سے سوکھی بیل باندھ کر بھدی سی کمان بنائی اور بہت سے تیر بھی تراش لیے۔ ان تیروں کا سرا چاقو سے چیر کر میں نے اُن میں چھوٹے چھوٹے چقماق اَٹکا دیے۔۔۔ پھر الاؤ میں مزید لکڑیاں ڈال کر لیٹ گیا۔ اگرچہ جنگل میں اب بھی گمبھیر خاموشی تھی اور مجھے خرگوش کے سوا کوئی ذی روح دکھائی نہیں دیا تھا، تاہم لیٹتے وقت میں نے ایک ہاتھ میں کلہاڑے کا دستہ اور دوسرے میں ڈنڈا تھام لیا تھا۔

لیٹتے ہی مجھے گہری نیند آگئی۔

۔۔۔ پھر نہ جانے کیا ہُوا کہ مجھے اپنے سارے جسم میں سُوئیاں سی چُبھتی ہُوئی محسوس ہوئیں اور پورا جسم پھوڑے کی طرح دُکھنے اور دَرد کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ مجھے شدید کھجلی بھی ہونے لگی۔ میں نے اپنی پنڈلیاں کھُجانا چاہیں تو مجھے اپنی ٹانگوں سے کچھ لجلجی سی چیزیں چمٹی محسوس ہُوئیں۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو خوف و وحشت سے میری چیخیں نکل گئیں۔ میرے اَنگ اَنگ سے لجلجی جونکیں چمٹی ہُوئی میرا خون چُوس رہی تھیں۔

میں بڑی تیزی سے انھیں اپنے جسم سے نوچ نوچ کر پھینکنے لگا۔۔۔ مگر یہ کام اتنا آسان نہیں تھا۔ پیٹھ سے چمٹی ہُوئی جونکیں نوچنا میرے بس سے باہر تھا اور اب تک وہ میرا اتنا خون پی چکی تھیں کہ مجھے نقاہت کا احساس ہونے لگا تھا۔ اگر میں گزشتہ رات کا جاگا ہُوا اور دن بھر کا تھکا ماندہ نہ ہوتا تو شاید مجھے اتنی گہری نیند نہ آتی۔ پھر بھی خدا کا شکر ہے کہ درد کی وجہ سے میری آنکھ بروقت کھُل گئی۔

میں نے پیٹھ سے چمٹی ہُوئی جونکوں سے پیچھا چھُڑانے کے لیے الاؤ سے جلتی ہُوئی ایک لکڑی اُٹھالی اور اُسے اپنی پیٹھ پر پھیرنے لگا۔ یہ تدبیر کارگر ثابت ہُوئی اور جونکوں سے نجات مل گئی۔

میری پیٹھ پر اتنی جونکیں تھیں کہ جلتی ہُوئی لکڑی سے میری پیٹھ کہیں کہیں سے معمولی طور پر جلی ورنہ جونکیں ہی اس کا شکار ہوتی رہیں۔

مجھے جونکوں پر اتنا زیادہ غصہ تھا کہ اُنھیں اپنے پیروں تلے روندنے لگا مگر یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ بڑی تیزی سے زمین میں سوراخ کرتی ہوئی غائب ہوتی جارہی تھیں۔ اِن اَرضی جونکوں کا ذکر بھی میں نے کسی کتاب میں نہیں پڑھا تھا اور اب یہ بھی دیو مالائی داستانوں کی مخلوق ہی معلوم ہوتی تھیں۔

میں نے اپنے جسم کا جائزہ لیا تو مجھے اس پر گرمی دانوں کی طرح سینکڑوں نشانات نظر آئے۔ ہر نشان جونکوں کی نشانی تھا۔ میں گرتا پڑتا اس ندی کی طرف بھاگا جہاں میں کل شام نہایا تھا۔ ٹھنڈے پانی نے میرے جسم کی جلن اور خارش تو مٹادی۔۔ مگر نقاہت دُور نہ کرسکا۔ یہ نقاہت صرف خوراک ہی ختم کرسکتی تھی۔ گزشتہ رات میں نے جو خرگوش شکار کیا تھا، ابھی اُس کا تین چوتھائی گوشت باقی تھا۔ میں واپس آیا اور اُسے بھوننے میں مصروف ہوگیا۔

پیٹ بھرنے کے بعد میں نے ایک لمبی سی شاخ کے ساتھ چاقو باندھ کر بھدا سا بھالا بنالیا اور خشک بیلیں تلاش کرنے لگا تاکہ اُن کا جھولا بنا کر کسی درخت سے باندھ سکوں اور رات کو اُسی جھولے میں سویا کروں۔

* * *

اُس رات، دن بھر کے سفر کے بعد میں جھولے میں سویا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ جنگل کسی پہاڑ کی ڈھلان پر واقع ہو۔ اس لیے کہ میرا سفر بتدریج چڑھائی کی طرف جاری تھا۔ گزشتہ تین روز کے دوران اندازاً میں تین ہزار فٹ اونچائی پر پہنچ چکا تھا۔ اس عرصے میں میں نے نئے سرے سے تیر کمان اور بھالا بنالیا تھا اور تین خرگوش شکار کیے تھے لیکن اس جنگل میں مجھے کبھی کسی پرندے کی چہکار یا درندے کی دھاڑ سُنائی نہیں دی تھی اور قبروں کا سا ہولناک سناٹا میری رُوح پر بوجھ بنتا جارہا تھا۔ مگر چوتھی صبح میری آنکھ کوؤں کی سی کائیں کائیں سے کھُلی۔

میں کائیں کائیں کی ان آوازوں سے بھی خوفزدہ ہوگیا۔۔ کیونکہ یہ کوؤں کے مقابلے میں کہیں زیادہ بھاری، تیز اور سمع خراش تھیں۔ تاہم میں ان پرندوں کو دیکھنے کے اشتیاق میں آنکھیں ملتا ہُوا آگے چل پڑا۔

ابھی میں تھوڑی ہی دُور گیا تھا کہ مجھے وہ پرندے نظر آگئے، یہ کوّے نہیں بلکہ بڑی بڑی خم دار چونچوں والے آبی پرندے تھے۔ ایک پرندے کی چونچ میں مجھے خاصی بڑی ایک مچھلی بھی دکھائی دی۔ جب میرے جذبۂ تجسّس کی تسکین ہوگئی تو میں ٹھہر گیا اور ایک مقام پر اپنا ناشتہ تیار کرنے لگا۔ شاید اُن پرندوں کو بھی میری موجودگی کا احساس ہوگیا تھا اس لیے وہ ایک دائرے میں میرے سر پر منڈلانے لگے تھے۔

ان پرندوں کی بڑی تعداد بتاتی تھی کہ کہیں قریب ہی کوئی دریا یا جھیل ضرور ہوگی جس کے آس پاس کسی آبادی کا امکان بھی تھا اور یہ آبادی میرے لیے یقینی خطرہ تھی۔ لہٰذا اس روز میں نے بڑی احتیاط سے سفر کیا۔

تیسرے پہر میں ایک ایسے راستے پر آنکلا جو شاید کافی عرصے سے زیرِ استعمال نہیں تھا۔ تاہم یہ راستہ مجھے چوکنّا کرنے کے لیے کافی تھا۔ میں تقریباً آدھ گھنٹے تک جھاڑیوں میں چھپا اس کا جائزہ لیتا رہا۔۔۔ پھر اللہ کا نام لے کر اُسی پر چل پڑا۔

یہ راستہ آگے جاکر اچانک ایک کھائی میں اُتر گیا۔

جب میں کھائی عبور کرکے دوبارہ اوپر چڑھنے لگا تو دائیں ہاتھ کا موڑ مُڑتے ہی جو نظارہ مجھے دکھائی دیا، اُس نے میرے قدم وہیں روک لیے۔

میرے سامنے کچھ فاصلے پر ایک بہت بڑا ننگی بُت اِستادہ تھا۔

اس بُت کی اونچائی کم از کم دو سو ہاتھ تھی۔ اس کی تخلیق انسانی ہاتھوں کی مرہونِ منت تھی اور بنانے والے کوئی معمولی انسان نہیں ہوسکتے تھے کیونکہ یہ مجسمہ سازی کا ایک اچھوتا نمونہ تھا۔ مجسّمے کی ٹانگیں پھیلی ہُوئی تھیں اور ہاتھ سینے پر بندھے ہوئے تھے جہاں سے میں اُسے دیکھ رہا تھا، وہاں سے اس کی پشت دکھائی دیتی تھی۔ اس کا رُخ دوسری جانب تھا۔

میں مجسّمے کا چہرہ دیکھنے کے لیے کافی چکّر کاٹ کر سامنے پہنچا تو دہشت کی ایک سرد لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں اُتر گئی مجسّمے کا آدھا چہرہ ایک نقاب سے ڈھکا ہُوا تھا لیکن آنکھیں اور کھوپڑی دکھائی دے رہی تھی اور یہ دونوں چیزیں کسی مُردے کی کھوپڑی اور آنکھوں سے مشابہت رکھتی تھیں۔ مجسّمے کے نقاب پر بھی مُردے کی کھوپڑی کی تصویر بنی ہُوئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے موت مجسّم و منجمد ہوکر اسی چٹان پر کھڑی ہوگئی ہو۔

میں نے اِرد گرد دیکھا۔ وہاں میرے سوا کوئی ذی رُوح نہیں تھا۔

ہر طرف گمبھیر سناٹا تھا۔

وہ آبی پرندے اور اُن کی آوازیں بھی جیسے ابدی خاموشی میں معدوم ہوگئی تھیں۔

میں کچھ دیر کھڑا سوچتا رہا پھر میں نے مجسّمے کو قریب سے دیکھنے کا فیصلہ کرلیا اور چٹان پر چڑھنے لگا۔ مجسّمے کے ٹخنے میں مجھے ایک دروازہ نظر آیا۔ میں نے ایک ہاتھ میں برچھا اور دوسرے

میں چاقو سنبھالا اور اُس دروازے میں داخل ہوگیا۔

اندر خاصا اندھیرا تھا۔ میں کچھ دیر وہاں کھڑا رہا یہاں تک کہ میری آنکھیں اس اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہوگئیں میرے سامنے ایک چکّردار تنگ زینہ تھا۔ دیواروں سے ویسی ہی سیلن کی بُو آرہی تھی جو طویل عرصے تک بند پڑے رہنے والے مکانوں یا مقابر سے آتی ہے۔

میں زینہ چڑھنے لگا۔ تقریباً بیس سیڑھیاں چڑھنے کے بعد مجھے ایک چھوٹا سا کمرہ ملا جو غالباً مجسّمے کے گھٹنے میں بنایا گیا تھا۔

میرے سامنے ایک مُردے کا پنجر پڑا تھا۔

میں نے اپنے برچھے سے اُسے چھُوا تو پنجر کی ہڈیاں خاک کے ڈھیر میں تبدیل ہوگئیں۔

شاید اُسے مرے ہوئے صدیاں گزر چکی تھیں۔

مجسّمے کے چہرے تک پہنچتے پہنچتے مجھے دو اور کمرے ملے جو پہلے کمرے سے قدرے کشادہ تھے۔

ہر کمرے میں ویسے ہی پنجر بھی ملے مگر کوئی ہتھیار، کوئی زیور یا دوسری چیز نہ ملی۔

چوتھے کمرے میں خاصی روشنی تھی یہ روشنی مجسّمے کی آنکھوں سے اندر آرہی تھی۔ میں نے غور سے دیکھا تو مجھے اس کمرے میں تین قربان گاہیں نظر آئیں۔

ہر قربان گاہ پر ایک ایک بہت بڑی کتاب کھُلی رکھی نظر آئی۔ میں نے ایک کتاب کو چھُوا تو وہ بھی خاک میں بدل گئی۔ یہ کیسی کتابیں تھیں، انھیں کس نے لکھا تھا اور ان میں کیا لکھا گیا تھا؟ ان سوالوں کے جواب مجھے کسی سے نہیں مل سکتے تھے وقت کے طویل سفر نے ہر چیز کو فرسودگی اور اسرار کی دبیز گرد میں دفن کردیا تھا.... سوچوں نے پھر میرے ذہن پر یلغار کردی۔ وہ کون ہوں گے جنھوں نے اس دورِ وحشت میں اتنا بڑا مجسّمہ تعمیر کیا؟ ہوسکتا ہے کہ ہم سے پہلے تہذیب، ارتقا کی منزلیں طے کرچکی ہو۔ وہ لوگ یقیناً پڑھے لکھے ہوں گے، تبھی تو یہ کتابیں یہاں رکھی ہیں۔ وہ کسی دیوتا کی عبادت بھی کرتے ہوں گے۔ ممکن ہے، یہ مجسّمہ اُسی دیوتا کا ہو... مگر ان لوگوں پر کیا بیتی؟ اُن کی نسلیں کیسے معدوم ہوئیں؟

میری سوچوں کا سلسلہ نہ جانے کب تک جاری رہتا کہ اتنی آبی پرندوں کی کرخت آوازوں نے مجھے چونکا دیا۔

میں آگے بڑھ کر مجسّمے کی آنکھوں سے باہر دیکھنے لگا۔

سامنے ہی کچھ فاصلے پر ایک پیالہ نُما جھیل چمک رہی تھی اور یہ پرندے اُس پر پرواز کرتے ہوئے مچھلیاں پکڑ رہے تھے... مگر میں اُن پر زیادہ دیر توجہ نہ دے سکا۔ میری نگاہیں اُن گھروں کا جائزہ لینے لگیں جو جھیل میں تیرتے ہوئے تختوں پر بنائے گئے تھے۔ کچھ گھروں سے بھُورا دھُواں اُٹھ رہا تھا۔

اچانک میری نگاہ ایک عورت پر پڑی جو مٹی کے ایک بڑے برتن میں مُوسل سے کچھ کُوٹ رہی تھی۔

میں نے غور سے دیکھا تو مجھے وہ عورت نمرگ نسل سے کچھ بہتر نسل کی معلوم ہوئی۔ اس نے کھال کے ٹکڑوں سے ستر پوشی کر رکھی تھی۔ تیرتے تختوں پر بنے ہوئے یہ جھونپڑے بھی اس خیال کی تائید کرتے تھے کہ یہ نسل نمرگوں سے زیادہ تہذیب و ترقی یافتہ ہے۔ اگر ڈاکٹر فریدوں یہ نسل دیکھتا تو اسے بن مانس سے تعبیر کرتا یا اس کا کوئی ایسا نام بتاتا جسے زبان مشکل ہی سے ادا کرپاتی۔

یہ نسل پتھروں اور لکڑیوں کے ہتھیار استعمال کرتی تھی...

کاشت کاری سے بھی آشنا تھی کہ جھیل سے جنگل تک کوئی فصل لہلہاتی دکھائی دے رہی تھی۔ جھیل کے کنارے سے گھروں تک جانے کے لیے چھوٹی چھوٹی گول کشتیاں استعمال کی جارہی تھیں۔ میں جھیل کی طرف جانے کا ارادہ ہی کررہا تھا کہ ناگاہ میری نظر کھیتوں میں کام کرنے والے ایک گروہ پر پڑگئی اور میں نے وہاں جانے کا ارادہ ملتوی کردیا۔ یہ نسل نمرگوں سے کہیں زیادہ ظالم اور خونخوار تھی۔

یہ بن مانس قسم کے لوگ کھیتوں میں غلاموں سے کام لے رہے تھے اور ان غلاموں میں عورتوں کی تعداد زیادہ تھی۔ سارے غلام ستر پوشی سے محروم تھے۔ عورتوں میں جوان بھی تھیں اور بوڑھی عورتیں بھی تھیں۔ بن مانس نُما نگران کھیتوں میں کام کرنے والوں پر کوڑے برسا رہے تھے مگر یہ دیکھ کر مجھے بڑا تعجب ہُوا کہ وہ مرد غلاموں کو تو کبھی کبھار یا ایک آدھ ہی کوڑا مارتے تھے مگر عورتیں مسلسل اُن کے تشدّد کا نشانہ بن رہی تھیں... اور پھر اس سے زیادہ تعجب خیز بات یہ تھی کہ غلام عورتیں اور مرد میری طرح مکمل انسان تھے۔ نمرگ یا بن مانس نہیں تھے۔

کھیتوں میں پرندوں کو ڈرانے کے لیے انھوں نے ڈنڈے پر ہانڈی نہیں لٹکائی تھی بلکہ مُردہ غلام کھمبوں کے ساتھ باندھ دیے تھے۔

یہ منظر دیکھ کر میرا خون کھول اُٹھا مگر اس کے ساتھ ہی خوف سے جھُرجھُری بھی آگئی۔

اتنے میں، کھیتوں میں کام کرنے والی ایک عورت گر پڑی۔ ایک بن مانس نُما نگران اس کی طرف لپکا اور اس پر کوڑے

سانے لگا۔ وہ بے چاری بمشکل تمام اُٹھی اور پھر گر پڑی... اور اس ار ایسی گری کہ دوبارہ نہ اُٹھ سکی۔ نگران نے جھک کر اس کا جائزہ لیا اور ساتھیوں کو بلانے لگا۔ وہ اُدھر گیا تو ایک غلام لڑکی جو کم عمر اور کافی خوبصورت تھی، کھیت سے جنگل کی طرف کھسکنے لگی۔ شاید وہ وہاں سے فرار ہونا چاہتی تھی۔ یہ سوچ کر میرا دل کانپ گیا کہ اگر ان ظالم نگرانوں نے اُسے بھاگتے دیکھ لیا تو کوڑے مار مار کر اس کے پرخچے اُڑا دیں گے... مگر مجھے یہ دیکھ کر کچھ اطمینان ہوگیا کہ وہ دونوں نگران اس مردہ عورت کو گھسیٹ کر ایک خالی کھمبے کی طرف لے جارہے تھے تاکہ اُسے باندھ کر پرندوں کو ڈرانے کا کام لے سکیں۔

میں نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ اب وہ کھیت سے نکل کر تیزی سے جنگل کی طرف دوڑ رہی تھی۔ اتنے میں بن مانس نُما نگران کی نگاہ اُس پر پڑگئی۔ وہ لاش چھوڑ کر اُس کی طرف دوڑے۔ ان کی رفتار لڑکی سے کہیں زیادہ تیز تھی۔ میں لاشعوری طور پر چیخ اُٹھا۔ ”بھاگو... اور تیزی سے بھاگو، لڑکی!“

... اور پھر مجھے اپنی اس حرکت پر خود ہی ہنسی آگئی۔

اب لڑکی جنگل سے تقریباً سو گز دُور رہ گئی تھی لیکن بن مانس ہر لمحہ اس کے قریب تر ہوتے جارہے تھے۔ میری دھڑکنیں بھی ہر لمحے بڑھتی جارہی تھیں۔ اُس وقت تو مجھے اپنا دل مٹھی میں بند ہوتا محسوس ہونے لگا جب بن مانس، لڑکی کے بالکل قریب پہنچ گئے اور اُن میں سے ایک نے اُسے بڑے زور سے کوڑا مارا۔

لڑکی گر پڑی۔

دونوں بن مانس بھی خود کو نہ روک سکے، وہ لڑکی سے ٹکرائے اور خود بھی گر پڑے۔ اتنے میں لڑکی اُٹھی اور راستہ بدل کر جنگل کی طرف بھاگنے لگی۔ بن مانس بھی تیزی سے اُٹھے لیکن اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے آپس میں ٹکرا گئے۔ میرا دل یہ منظر دیکھ کر خوشی سے بھر گیا۔ لڑکی کو تھوڑی سی مہلت مل گئی تھی اور وہ نگرانوں کے رفتار پکڑنے سے پہلے ہی جنگل کے کنارے پہنچ گئی تھی۔

”شاباش۔ نکل جاؤ لڑکی!“ میں ایک بار پھر بے ساختہ چیخ پڑا مگر یہ دیکھ کر میرا دل بجھ سا گیا کہ جنگلی بیلوں کی وجہ سے لڑکی کو جنگل میں جانے کا راستہ نہیں مل رہا تھا اور بن مانس پھر اُس کے قریب تر ہوتے جارہے تھے۔

اب لڑکی کبھی اِدھر بھاگتی تھی اور کبھی اُدھر جاتی تھی یہاں تک کہ اس میں اور نگرانوں میں بمشکل تیس قدم کا فاصلہ رہ گیا۔

نگرانوں نے فاتحانہ نعرہ لگایا۔ لڑکی کے مُنہ سے ایک چیخ نکلی اور پھر میری حیرت زدہ آنکھوں نے دیکھا کہ لڑکی نے پُوری قوت سے زقند بھر کر آگے چھلانگ لگادی تھی۔

وہ بیلوں کا جال توڑتی ہُوئی جنگل میں داخل ہوگئی لیکن نگران بھی اب بیلوں تک جاپہنچے تھے۔ میری آنکھیں ایک بار پھر حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ بن مانس بیلوں کے اندر جانے کی بجائے وہیں رُک گئے تھے اور آپس میں تبادلۂ خیالات کرنے لگے تھے۔

میری سمجھ میں نہ آسکا کہ وہ جنگل میں داخل کیوں نہیں ہُوئے اور لوٹ کیوں گئے ہیں؟

غروبِ آفتاب سے کچھ پہلے بن مانس نگران کھیت میں کام کرنے والے غلاموں کو چھوٹی گول کشتیوں میں بھر کر جھیل میں بڑے تختے پر بنے ہُوئے ایک کشادہ جھونپڑے میں لے گئے اور کچھ مرد غلام اُن کے لیے کھانا لانے لگے۔

ایک ایسا ہی مرد غلام جب دوسرے جھونپڑے میں داخل ہُوا تو بن مانسوں کی قبیل کی دو عورتیں اُس کی طرف یوں دیکھنے لگیں جیسے وہ اُن کا محبوب رہا ہو۔ تب میں نے اندازہ لگایا کہ اس مخلوق میں غالباً مردوں کی کمی ہے اسی لیے مرد غلاموں کے ساتھ ترجیحی سلوک کیا جاتا ہے۔

وہ رات میں نے مجسّمے کے سر والے کمرے میں بسر کی اور صبح دوبارہ اپنے سفر پر روانہ ہوگیا۔ جُوں جُوں میں آگے بڑھا جنگل دوبارہ گھنا ہوتا گیا۔ دن بھر کے سفر میں مجھے کوئی خرگوش بھی دکھائی نہیں دیا۔ تاہم ابھی میرے جھولے میں پہلے خرگوشوں کا کافی گوشت موجود تھا جو دو تین روز تک میرے پیٹ کی آگ بجھا سکتا تھا۔

دن کے تیسرے پہر میں ایک چشمے پر پہنچا تو پانی پینے اور ستانے کے لیے رُک گیا۔ چشمے کا پانی نمکین تھا اور بعض مقامات پر پانی خشک ہونے کے بعد وہاں نمک جم کر رہ گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر یہاں کہیں جانور ہوں گے تو پانی پینے ضرور آتے ہوں گے چنانچہ چھپ کر بیٹھ گیا۔

تقریباً آدھ گھنٹے بعد چھوٹے قد کا ایک ہرن وہاں آیا اور پانی پینے لگا۔

یہ ہرن جسامت میں سیامی بلّی سے کچھ ہی بڑا تھا۔ میں اسے بآسانی شکار کرسکتا تھا مگر میں نے اُسے ہلاک نہیں کیا اور وہ جانے لگا تو کچھ فاصلے سے اس کا پیچھا کرنے لگا۔

تھوڑی دُور جاکر وہ اپنے گلّے میں مل گیا۔

ہرنوں کا گلّہ دیکھ کر میری یہ فکر دُور ہوگئی کہ اب پیٹ کیسے بھروں گا۔ اتنے میں سارے ہرن ایک جانب دیکھنے لگے اور پھر

وہاں سے بھاگ نکلے۔ میں نے اِدھر دیکھا لیکن مجھے کوئی ذی رُوح دکھائی نہ دیا۔

میں آگے چل پڑا۔

جنگل میں ہر جگہ ہرنوں کے کھروں کے نشانات موجود تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ میں جب چاہوں گا، ضرورت کے مطابق شکار کرلوں گا۔

غروبِ آفتاب سے تقریباً ایک گھنٹہ پہلے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی میرا تعاقب کررہا ہو۔ جنگل کے سناٹے میں مجھے اپنے پیچھے کھٹکا سا سنائی دیا تو میں چونک گیا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا مگر درختوں کے سوا وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

میں محتاط انداز میں آگے بڑھنے لگا۔

اگرچہ دوبارہ مجھے کوئی آواز یا کھٹکا سنائی نہیں دیا تھا مگر میری چھٹی حس مجھے یقین دلا رہی تھی کہ کوئی میرے پیچھے لگا ہُوا ہے۔

جب شام اُتری تو میں نے ایک مقام پر الاؤ روشن کرلیا اور جنگلی بیلوں سے دو تین پھندے بنا کر راستے میں اس طرح رکھ دیے کہ اگر کوئی انسان میرا تعاقب کررہا ہو تو وہ یہ پھندے دیکھ لے۔ جب شام کا اندھیرا کافی گہرا ہوگیا تو میں الاؤ سے ہٹ کر اندھیرے میں چھپ گیا۔

میں جانتا تھا کہ اگر تعاقب کرنے والا انسان ہے تو وہ پھندوں سے بچ کر وہاں سے گزرے گا جہاں اس وقت میں پہنچ گیا تھا۔ یہاں بھی میں نے دو تین پھندے لگائے اور پھر الاؤ کے پاس آکر گوشت بھوننے لگا۔

گوشت بھوننے میں، مَیں نے جان بوجھ کر زیادہ دیر لگائی تاکہ اُس کی بُو دُور تک پھیلتی ہے۔ احتیاطاً میں نے جنگل کی طرف ہی اپنا رُخ رکھا تاکہ وہاں سے کوئی مجھ پر حملہ آور نہ ہوسکے۔ میں نے اپنے اردگرد مزید دو تین الاؤ بھی جلادیے اور گوشت کھانے کے بعد یوں سر جھکا کر بیٹھ گیا جیسے نیند مجھ پر غالب آگئی ہو۔۔۔ میرے ہتھیار میری دسترس میں تھے۔

اس حالت میں بیٹھے بیٹھے مجھے تقریباً ایک گھنٹہ گزر گیا اور اب نیند سچ مچ مجھ پر غالب آنے لگی تھی۔ میں سونے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ اتنے میں پہلے کھٹکا ہُوا پھر ایک ہلکی سی چیخ نے مجھے بتادیا کہ میرا تعاقب کرنے والا اس پھندے میں پھنس گیا ہے جو میں نے اندھیرے میں لگایا تھا۔ میں نے جلدی سے ایک جلتی ہُوئی لکڑی اُٹھائی، ایک ہاتھ میں بھالا تھاما اور دوسرے میں چاقو لیے اُس طرف لپکا تاکہ اپنے دُشمن کو پہلے ہی ریلے میں ختم کردوں مگر جونہی میں نے اپنا بھالا تولا جلتی ہُوئی لکڑی کے لرزتے شعلے میں مجھے اس کی جھلک دکھائی دے گئی۔

یہ وہی لڑکی تھی جو کل کھیت سے فرار ہُوئی تھی۔

وہ پھندے میں پھنس کر سر کے بل درخت کی شاخ سے لٹکی ہُوئی تھی۔

میں اس کا بھرپور جائزہ لینے کے لیے آگے بڑھا تو اُس نے اپنے ناخنوں سے میرا مُنہ نوچ لینا چاہا۔ میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ اُس نے مجھے کوستے ہُوئے مجھ پر تھوک دیا۔ میں سوچنے لگا کہ اب اس کا کیا کروں؟ پھر خیال آیا کہ وہ بن مانسوں کی قید سے فرار ہو کر جنگل میں سفر کررہی ہے تو اس کی کوئی نہ کوئی منزل بھی ضرور ہوگی اگر وہ مجھے اپنا ہمدرد اور دوست سمجھ کر مجھ پر اعتماد کرے تو فرگ کی طرح میری رہنمائی کرسکتی ہے۔ اس دوران میں لڑکی اپنے آپ کو چھڑانے کی جدوجہد کرتی اور گالیاں بکتی رہی۔

آخر وہ تھک ہار کر چپ ہوگئی۔

میں خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا۔ اس کی عمر مشکل بارہ تیرہ سال تھی اور وہ بلاشبہ بے حد حسین تھی۔ میری نگاہیں اُس پر جم کر رہ گئیں۔

"کون ہو تم اور مجھے کیوں ٹکا رکھا ہے؟ تم اُن وحشیوں میں سے تو نہیں لگتے؟" وہ بولی۔

"وہ کون؟" میں نے پوچھا۔

"وہی جن کے جسم پر بال ہیں۔ تم نہ تو اُن میں سے ہو اور نہ ہی ہم میں سے ہو۔"

"تم کون ہو؟" میں نے پوچھا۔

وہ جواب دینے کے بجائے کچھ دیر میری طرف دیکھتی رہی پھر بولی: "واقعی تم ہمیں نہیں جانتے؟"

"اگر میں جانتا تو تم سے کیوں پوچھتا۔"

"پہلے مجھے اس مصیبت سے نکالو پھر بتاؤں گی کہ میں کون ہوں۔" وہ تلملا کر بولی۔

میں بیلوں کا پھندا کاٹنے لگا۔

"یہ بڑی عجیب بات ہے کہ تم جمشیدیوں کو نہیں جانتے۔ ہم جمشیدی تو دُور سے جمشیدی نظر آتے ہیں۔ پہلے جمشیدی اسی علاقے میں رہتے تھے۔ ساری دُنیا انھیں جانتی ہے مگر تم کہتے ہو کہ تم جمشیدیوں کو نہیں جانتے۔"

مگر جونہی اس کا ایک پاؤں پھندے سے آزاد ہُوا اور میں نے اُسے اُتارا تو وہ ایک دم تیزی سے بھاگی۔ شاید وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ دوسرے پاؤں کے پھندے کا ایک سرا میرے ہاتھ میں ہے۔ وہ چند قدم ہی گئی تھی کہ میں نے وہ سرا کھینچ لیا۔

وہ دھڑام سے گر پڑی۔

میں اُس کے قریب گیا تو وہ بلّی کی طرح میرا سینہ نوچنے لگی۔ میں نے اُس کی کنپٹی پر ہلکا سا ہاتھ مار کر اُسے بے ہوش کردیا۔ بیلوں سے اس کے ہاتھ پاؤں باندھے اور اُٹھا کر الاؤ کے پاس لے آیا۔ اُسے آرام سے آگ کے قریب لٹانے کے بعد میں دوبارہ گوشت بھوننے لگا۔ اس دوران میں، مَیں کن انکھیوں سے اُس کی طرف دیکھتا بھی رہا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور جب حواس میں آئی تو میں نے اُس کی طرف دیکھے بغیر کہا: "پہلے میں بولوں گا اور تم غور سے سنو گی۔ پھر میری بات کا جواب دو گی۔ یاد رکھو اب میں حکم دوں گا اور تم اُس کی تعمیل کرو گی۔ بولو کیا کہتی ہو؟"

"ٹھیک ہے تم جو کہو گے، میں کروں گی۔"

"خوب۔ نام کیا ہے تمھارا؟"

"دیپا۔"

"مجھے جمشیدیوں کے بارے میں بتاؤ۔"

وہ بھونے جانے والے گوشت کی خوشبو سے بے تاب ہوتے اور رال ٹپکاتے ہُوئے بولی: "میں بہت بھوکی ہوں۔ ان وحشیوں کی قید میں پچھلے ایک سال سے میں نے گوشت نہیں کھایا پہلے مجھے گوشت کھلاؤ، پھر سب بتادوں گی۔"

میں گوشت کا پارچہ اُس کے سامنے ہلا کر خود کھانے لگا۔

وہ رال ٹپکاتی اور نفرت سے مجھے دیکھتی رہی۔

"پہلے تم بتاؤ گی اور پھر کھاؤ گی۔ اگر تم نے نہ بتایا تو تمھیں ایک بوٹی بھی نہیں ملے گی۔ حالانکہ میرے پاس بہت سارا گوشت موجود ہے۔"

وہ بڑے زور سے کسمسائی اور اپنے آپ کو بیلوں کی گرفت سے چھڑانے کی جدوجہد کرنے لگی۔۔۔ مگر جب ناکام ہوگئی تو بولی۔ "ٹھیک ہے۔ میں تمھارا حکم مان رہی ہوں۔۔۔ پھر بھی تم نے مجھے گوشت نہ کھلایا تو جب تم سو جاؤ گے، میں تمھیں قتل کردوں گی۔"

"میں تمھیں گوشت ضرور کھلاؤں گا۔ مجھے اپنے قبیلے یا قوم کے بارے میں بتاؤ۔" یہ کہہ کر میں گوشت کا ایک بڑا پارچہ بھوننے لگا۔

"میں جمشیدی ہوں جو پہاڑوں پر رہتے ہیں۔ جمشیدیوں کی حکمران ایک عورت ہے جسے ملکۂ جم کہا جاتا ہے۔ وہ بہت بوڑھی اور قریب المرگ ہے۔"

میں نے سوچا کہ دیپا مجھے اس لامتناہی جنگل سے نکال سکتی ہے۔ اگر جمشیدیوں کی کوئی ملکہ ہے تو وہ لوگ یقیناً تہذیب سے آشنا ہوں گے۔ چنانچہ میں دیپا کا ایک ایک لفظ غور سے سنتا اور ذہن میں محفوظ کرتا رہا۔ جب وہ میرے تمام سوالوں کے جواب دے چکی تو میں نے اُس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی کردی اور بھنا ہُوا گوشت اس کی طرف بڑھا دیا۔

وہ مربھکوں کی طرح اس پر ٹوٹ پڑی۔

جب وہ شکم سیر ہوچکی تو الاؤ کے قریب لیٹ گئی اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولی: "میں نے تمھیں اپنے اور اپنی قوم کے بارے میں سب کچھ بتادیا ہے۔ اب تم بھی مجھے اپنے بارے میں بتاؤ کہ تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو۔ میرا خیال ہے کہ تم کسی دُور دراز علاقے سے آئے ہوگے کیونکہ تم جمشیدیوں سے زیادہ قدآور، توانا اور خوبصورت ہو۔"

"ہاں۔ میں بہت دُور سے آیا ہوں۔ اس جنگل کے درختوں کے جتنے پتے ہیں نا، اگر تم اتنے دن سفر کرو تو بھی وہاں نہیں پہنچ سکو گی۔"

"تم جھوٹ بولتے ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو تم بہت بوڑھے ہوتے۔" وہ بولی۔

"میں تو جادو کے ذریعے یہاں آیا ہوں، میرا نام سرفروش ہے۔"

"سرفروش!" اُس نے دُہرایا۔

"ہاں، تمھاری زبان سے اچھا لگتا ہے۔" میں نے کہا۔

"مگر مجھے نہ تو تم اچھے لگتے ہو اور نہ ہی تمھارا نام۔۔۔ تم جن نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہو، ان سے مجھے خوف آتا ہے۔ میں جانتی ہوں، تمھارے دل میں کیا ہے مگر میں اُسے کبھی پورا نہیں ہونے دوں گی۔"

بلاشبہ وہ بڑی تیز و طرار لڑکی تھی۔ بہرحال میں اُس پر اپنی کوئی کمزوری عیاں نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ مجھے اس کی ضرورت تھی۔

"آیندہ مجھ سے اس لہجے میں بات نہ کرنا۔ مجھ سے ڈرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ میں تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا اور تمھیں اس وقت تک ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا جب تک کہ تم خود ایسا نہیں چاہو گی۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ ہم دوستوں کی طرح ایک دوسرے کی مدد کریں تم میرے سوالوں کے جواب دیتی رہو اور میری رہنمائی کرتی رہو۔ اس کے بدلے میں تمھیں تمھاری

قوم اور تمھارے گھر تک پہنچا دوں گا اس لیے کہ تم تنہا اس جنگل میں سفر نہیں کر سکو گی۔ راستے میں پیش آنے والے خطروں کا مقابلہ نہیں کر سکو گی۔"

وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر بولی: "تم ٹھیک کہتے ہو سرفروش راستے میں کاشیوں سے سابقہ پڑے گا اگر ہم اُن کے ہتھے چڑھ گئے تو وہ تمھیں مار کر تمھارا گوشت کھا جائیں گے اور میرے ساتھ اتنا ذلیل سلوک کریں گے کہ میں جانبر نہ ہو سکوں گی لیکن تمھیں ابھی سے متفکر ہونے کی ضرورت نہیں، ابھی وہ ہم سے چار یوم کی مسافت پر ہیں۔ بہرحال، مجھے تمھاری دوستی کی پیش کش منظور ہے۔"

"تم خاصی سمجھ دار لڑکی ہو۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"اب جب ہم دوست بن گئے ہیں تو میرے ہاتھ پاؤں بالکل آزاد کر دو۔ یا تمھارے وطن میں لوگ، دوستوں کے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہیں؟"

میں اس کی بات پر ہنس پڑا۔ "نہیں۔ ہمارے ہاں دوست ایک دوسرے پر اندھا اعتماد کرتے ہیں۔ مجھے تم پر اعتماد ہے اس لیے میں تمھیں پوری طرح آزاد کیے دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے اسے بیلوں کی جکڑ بندی سے آزاد کر دیا۔

اُس نے بازو کے گرد لپٹی ہوئی بیل چھڑائی اور اچانک اتنے زور سے میرے منہ پر ماری کہ میں اُلٹ کر گر پڑا اور جب میں نے اُٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھا تو وہ غائب ہو چکی تھی۔

یکایک اندھیرے سے اس کا قہقہہ سنائی دیا پھر آواز آئی: "الوداع سرفروش... اور سنو... مجھے پتہ چل گیا ہے کہ تمھارے وطن میں بھی بے وقوف ہوتے ہیں۔"

اُس کے قہقہے دُور ہوتے چلے گئے۔

پہلے تو میں اُسے کوستا اور اپنی آنکھیں ملتا رہا... پھر مجھے اپنے آپ پر ہنسی آ گئی۔ وہ ٹھیک ہی کہتی تھی۔ میں بے وقوف تھا جو اس کی باتوں میں آ گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ جمشیدی مکر و فریب میں ہم سے کم نہیں ہیں۔ ابھی میں انھی سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ ناگاہ جنگل کے گمبھیر سناٹے میں ایک چیخ نما دھاڑ گونج اُٹھی۔ آواز اتنی ہیبت ناک اور دہشت انگیز تھی کہ میں نے ڈاکٹر فریدوں کی کسی ٹیپ پر بھی نہیں سُنی تھی۔ ہر چند کہ یہ مہیب آواز میلوں دُور سے آئی تھی... مگر اس نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیے تھے اور میں خود بھی بے ساختہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس آواز میں زندگی اور موت کا تمام تر کرب اور عذاب گھلا ہوا تھا۔

میں کچھ دیر گوش بر آواز کھڑا رہا مگر جب وہ شیطانی چیخ دوبارہ سنائی نہ دی تو لیٹ گیا لیکن اب نیند میری آنکھوں سے بہت دُور جا چکی تھی۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد مجھے الاؤ کے پار پھیلے ہوئے اندھیرے سے دیپا کی آواز سُنائی دی: "سرفروش..."

آواز اتنی مدھم تھی کہ میں نے اسے اپنے تصور کا کرشمہ ہی سمجھا اور چپ چاپ لیٹا رہا... مگر چند لمحے بعد پھر دیپا کی آواز آئی: "سرفروش۔ مجھے افسوس ہے۔ میں شرمندہ ہوں۔ میں الاؤ کے پاس آنا چاہتی ہوں۔"

میں نے کروٹ بدل کر جماہی لی اور کہا: "تم واپس آنا چاہتی ہو؟ میرا خیال تھا کہ تم جنگل میں تنہا رہنا زیادہ پسند کرتی ہو۔"

"نہیں... مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"مگر تمھیں تو مجھ سے بھی ڈر لگتا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں... لیکن جنگل میں اور زیادہ ڈر لگتا ہے۔ مجھے اپنے پاس آنے دو آقائے سرفروش۔"

"تم میری دوست نہیں ہو اس لیے میں تم پر اعتماد نہیں کر سکتا۔ شب بخیر دیپا۔" یہ کہہ کر میں پھر سوتا بن گیا... مگر مجھے الاؤ کے باہر اُس کے چلنے اور حرکت کرنے کی آوازیں آتی رہیں۔ کچھ دیر بعد پھر اُس کی آواز آئی۔

"معاف کر دو، نا آقائے سرفروش! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے اور سردی بھی لگ رہی ہے۔ مجھے الاؤ کے پاس آنے دو نا۔"

"آجاؤ... مگر مجھے پریشان مت کرنا۔ مجھے سخت نیند آ رہی ہے۔" میں نے بالآخر کہہ دیا۔

وہ آہستہ سے آئی اور بڑے الاؤ کے پاس بیٹھ گئی۔ میں نے بظاہر اپنی آنکھوں کو بازو سے چھپا رکھا تھا مگر میں اُسے دیکھتا رہا۔ وہ پہلے آگ تاپتی رہی... پھر اُس نے ہاتھوں سے پورے جسم کی گرد اور بالوں سے پتے وغیرہ جھاڑے۔ اس کے بعد وہ دبے پاؤں چلتی ہوئی میرے پیچھے آ گئی۔ میرا جی چاہا کہ آنکھوں سے بازو ہٹا کر اور کروٹ لے کر دیکھوں کہ وہ کیا کر رہی ہے مگر پھر میں نے یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔ چند لمحوں بعد میں نے اُس کا بازو اپنے بازو پر محسوس کیا۔ ساتھ ہی اُس کی آواز آئی: "آقائے سرفروش! کیا تم سو گئے؟"

"تم واپس کیوں آ گئیں؟" میں نے لہجہ برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

"میں جنگل میں ڈرتی اور سوچتی رہی کہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے اور تم سچے ہو۔ اب ہم ایک دوسرے کے دوست ہیں اور میں تم پر اعتماد کرتی ہوں۔"

"وہ آواز کیسی تھی؟" میں نے پوچھا۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس بات سے اس پر کپکپی طاری ہو گئی ہو۔ وہ کسی خوفزدہ بچے کی طرح میرے قریب آ گئی اور بولی: "وہ کاشیوں کا نعرہ تھا۔ وہ رات کو شکار کھیلتے ہیں اور عام طور پر اپنے ٹھکانے سے زیادہ دُور نہیں آتے۔ البتہ جب اُن کے پاس غذا نہیں ہوتی تو وہ اتنی دُور بھی آ جاتے ہیں... مگر اب میں اُن کا ذکر نہیں کرنا چاہتی میں صرف تمھاری بات کرنا چاہتی ہوں اور تمھاری باتیں سُننا چاہتی ہوں۔ اگر میں یہ کہوں کہ مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے تو تمھارے تاثرات کیا ہوں گے؟"

اُس کی زبان سے یہ بات سُن کر مجھے بے حد تعجب ہوا کیونکہ وہ بمشکل بارہ تیرہ سال کی لڑکی تھی۔ "کیا تمھارے ہاں بارہ تیرہ سال کی لڑکیاں جذبۂ محبت سے آگاہ ہو جاتی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہمارے ہاں بارہ سال میں لڑکی شادی کر لیتی ہے۔" وہ بھاری آواز میں بولی اور پھر تاریکی کچھ زیادہ ہی گہری محسوس ہونے لگی۔ یہ ریشمی اندھیرا صبح تک مجھے انوکھے خواب دکھاتا رہا۔

◆

ہمیں سفر کرتے ہوئے چوتھا روز تھا۔ ہم بتدریج بلندی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان چار دنوں میں دیپا نے ثابت کر دیا تھا کہ عورت چاہے ہمارے دَور اور دُنیا کی ہو یا ماضیٔ بعید سے تعلق رکھتی ہو، اُس کی زبان قینچی کی طرح چلتی ہے۔ وہ ہر وقت بولتی ہی رہتی ہے۔ چوتھے روز راستے میں ہمیں ایک چشمہ ملا تو ہم نے غسل کیا۔ جب ہم چشمے سے نکلے تو میں دیپا کو حیرت سے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اُس کا حُسن بے حد نکھر گیا تھا اور وہ پہلے والی دیپا تو معلوم ہی نہیں ہوتی تھی۔

وہ توجہ کا مفہوم بھانپ گئی اور مسکرا کر بولی: "آفتابی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ جب تک..."

آفتابی کتابوں کے ذکر پر مجھے وہ بڑی بڑی کتابیں یاد آ گئیں جو مجسّمے کی کھوپڑی والے کمرے کی قربان گاہوں پر رکھی ہوئی تھیں۔ پھر دیپا کی یہ بات بھی ذہن میں اُتر آئی کہ جمشیدی ایک زمانے میں وہاں آباد تھے۔ میں نے دیپا سے اس سلسلے میں پوچھا تو وہ بولی...

"میں مذہب کے بارے میں بہت کم جانتی ہوں۔ ہمارے بزرگ اکثر راتوں کو آگ کے گرد بیٹھ کر مذہب کی باتیں کرتے ہیں۔ وہ عجیب سی کہانیاں سُناتے ہیں کہ سب سے پہلے دُنیا کا انڈا پیدا ہوا۔ اُسی بیضۂ ارض سے بزرگ مہر شناس نے جنم لیا۔ وہ دانائے راز تھا۔ اُس نے مذہبی کتابیں لکھی تھیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جمشیدی اُس کی تعلیمات سے رُوگردانی کرتے چلے گئے اور کتابوں کے اوراق پر لکھی تحریر مدھم پڑتی چلی گئی... پھر ایک ایسا دَور آیا کہ کوئی جمشیدی اُنھیں پڑھنے کے قابل نہ رہا۔ وہ بدی اور گناہوں میں ڈوب گئے۔ انھی گناہوں کی سزا میں اُنھیں جلاوطن ہونا پڑا اور وہ آج تک جلاوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں۔"

مجھے ایک بار پھر اُن کتابوں کا خیال آ گیا جن کی تحریر معدوم ہو چکی تھی اور جو خود بھی قربان گاہوں پر رکھے رکھے خاک ہو گئی تھیں۔

مجھے سوچ میں ڈوبے دیکھ کر دیپا بولی: "اب بدی سے اتنا مت ڈرو کہ میری طرف توجہ ہی نہ دو۔"

اگلی صبح ہمارا سفر پھر شروع ہو گیا۔

ڈھلان شروع ہوتے ہی دیپا نے بتا دیا کہ اب ہم کاشیوں کی حدود میں داخل ہو رہے ہیں۔

"کاشی کیسے ہوتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"اُن بالوں والے وحشیوں سے زیادہ وحشی۔ اُن سے کہیں توانا اور قدآور... بڑے ظالم اور چالاک... اگر انھوں نے تمھیں قتل کر دیا یا آگے بڑھنے کی اجازت دے دی تو دونوں صورتوں میں مجھے نہیں چھوڑیں گے اور میں اُن کا شکار ہونے کی بجائے موت کو ترجیح دیتی ہوں۔ مجھے اپنا یہ چھوٹا سا چاقو دے دو تاکہ میں اُن کے جبر کا نشانہ بننے سے پہلے ہی اپنے آپ کو ختم کر سکوں۔"

مجھے اُس کی بات کا اس لیے یقین نہ آیا کہ وہ مبالغہ آرائی سے بہت کام لیتی تھی۔ میں نے کہا: "اگر میں تمھیں چاقو نہ دوں تو...؟"

"تو پھر میں خودکشی کیسے کروں گی؟ کسی ہتھیار کے بغیر کوئی اپنے آپ کو کیسے ختم کر سکتا ہے؟"

"کیا تم یہ سنجیدگی سے کہہ رہی ہو؟"

"ہاں۔ اگر میں زندہ اُن کے ہتھے چڑھ گئی تو جب تک میرے اندر زندگی کی رمق باقی رہے گی، وہ مجھے اپنے ستم کا نشانہ بناتے رہیں گے۔"

یہ سُن کر میں نے اپنا چاقو اُسے دے دیا کہ وہ چاہے اُس سے خودکشی نہ کرے مگر کسی حد تک مدافعت تو کر ہی لے گی۔

دوپہر تک ہم ایک ایسے میدان میں پہنچ گئے جس کے پس منظر میں پہاڑ سر اُٹھائے کھڑے تھے۔ اُس طرف سے آنے والی ہوا میں کافی خنکی تھی جس سے پتہ چلتا تھا کہ اُن پہاڑوں کی چوٹیوں نے برف کے کلس سجا رکھے ہوں گے۔

دیپا نے وہ پہاڑ دیکھے تو گہری سنجیدگی سے بولی: "ان پہاڑوں کے اُس پار جمشیدیوں کا مسکن ہے۔ وہ انھی پہاڑوں کی وادی میں رہتے ہیں جن سے تمھیں ہر قیمت پر فتح حاصل کرنی چاہیے۔ میں اپنے لوگوں، اپنے عزیزوں کے علاوہ اپنا شہر، اپنا گھر اور اپنا آنگن دیکھنا چاہتی ہوں۔ بزرگ مہر شناس تمھیں کاشیوں پر فتح یاب کرے۔"

ایک چھوٹی سی کھائی سے گزرنے کے بعد مجھے میدان میں تقریباً

تین سو قدم دُور ایک جھونپڑا نظر آیا۔ اس کی چھت مسطح تھی اور اس کے ارد گرد چہار دیواری بنی ہوئی تھی جس میں کوئی دروازہ نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ اُسے بارش کا پانی جمع رکھنے کے لیے بنایا گیا ہو گا... پھر اچانک ہی میں ٹھٹک کر رہ گیا۔

میرے ٹھٹکنے کا باعث وہ کاشی تھا جو پتھروں سے تعمیر کردہ اُس جھونپڑے کی چھت پر بیٹھا ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ کم از کم آٹھ فٹ لمبا اور بھاری بھر کم تھا۔ وہ بندر اور گوریلے کی دوغلی نسل معلوم ہوتا تھا اور اُس کے جسم پر بڑے بڑے بال تھے۔ اُس کا مُنہ کسی شکاری کتے کے مُنہ کی طرح لمبوترا تھا۔ پھر وہ وہیں بیٹھے بیٹھے اچانک ہی کہیں غائب ہو گیا۔

پہلے تو میں اس کے اس طرح غائب ہونے پر سٹپٹا گیا پھر میری سمجھ میں آ گیا کہ وہ چھت میں واقع سُوراخ سے اندر اُتر گیا ہو گا۔

میں نے دیپا کی طرف دیکھا۔ وہ میرے پیچھے کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی اور اُس کی گھگھی بندھی ہوئی تھی۔ میں اُس کاشی کی کمر سے بندھی تلوار دیکھ چکا تھا۔ اُس کے مقابلے میں میرے پاس ایک خود ساختہ بھدا سا بھالا اور تیر کمان تھے۔ میں نے دیپا سے اپنا چاقو واپس لینا چاہا مگر یہ سوچ کر ارادہ ملتوی کر دیا کہ اُس کے بغیر وہ خودکشی نہیں کر سکے گی اور اُس کا خودکشی کر لینا ہی بہتر ہو گا۔ اتنے میں جھونپڑے کی چھت کے سوراخ سے گاڑھا دُھواں بلند ہونے لگا۔

دیپا بمشکل ہکلاتے ہوئے بولی: "وہ... وہ اس دُھویں کے ذریعے... دُوسری چوکیوں کو... خبردار کر رہا ہے... مگر... مگر سب سے زیادہ اہم... یہی چوکی ہے... اگر ہم... یہاں سے نکل گئے تو شاید بچ جائیں۔"

اتنے میں کاشی چھوٹی سی چار دیواری سے کُود کُود کر باہر آنے لگے۔ میں اُنھیں شمار کرتا رہا۔ وہ تعداد میں دس تھے۔ ایک اُن کا کمان دار تھا اور نو ماتحت تھے۔ اُنھوں نے سینگوں والے خود پہن رکھے تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ ہمارے دَور اور دُنیا کی طرح عسکری نظم و ضبط کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ جب اُن کے کمان دار نے اُنھیں صف آرا ہونے کا حکم دیا تو میں بُری طرح چونک گیا۔ چونکنے کی وجہ آٹھ فٹ کے قوی الجثہ کمان دار کی زنانہ آواز تھی۔ میں نے دیپا سے پُوچھا: "کیا یہ عورتیں ہیں؟"

"نہیں..." وہ بولی: "کاشیوں میں کوئی عورت پیدا ہی نہیں ہوتی۔ یہ ہماری عورتوں کو اُٹھا لے جاتے ہیں۔ اُن سے جو اولاد ہوتی ہے، وہ سب کی سب لڑکوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ آؤ واپس بھاگ چلیں۔ یہ جنگل میں ہمارا پیچھا نہیں کریں گے کیونکہ ان کی حد اسی میدان تک ہے۔"

"اب فرار کا وقت نہیں رہا۔ مجھ پر اعتماد رکھو اور وہی کرو جو میں کہتا ہوں۔ میرے پیچھے چھپ جاؤ اور اب اپنی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکالنا۔"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"میں ان سے نمٹ لوں گا۔" میں نے اُس کا حوصلہ بڑھانے کے لیے کہا حالانکہ مجھے خود اپنے زندہ رہنے کی بھی کوئی اُمید نہیں تھی۔

کاشی کمان دار نے اپنے دستے کو آگے بڑھنے کا حکم دیا اور آٹھ فٹ قد والے وہ بندر نُما گوریلے تربیت یافتہ عسکریوں کی طرح میری طرف بڑھنے لگے۔ اُن کا کمان دار اُن سے چار قدم آگے تھا۔ میں اپنے برچھے کا سہارا لے کر یُوں کھڑا ہو گیا جیسے میرے لیے اُن کی کوئی وقعت ہی نہ ہو اور وہ میرے لیے کیڑے مکوڑے ہوں۔ میں اُنھیں اپنے رویّے سے حیران کرنا جبکہ خود ٹھنڈا اور پُرسکون رہنا چاہتا تھا۔

جب وہ مجھ سے بیس قدم دُور رہ گئے تو کمان دار نے اُنھیں رُکنے کا حکم دیا۔ سب ایک دم رُک گئے اور اُنھوں نے تلواریں نکال کر کمان دار کو سلامی دی۔ وہ اُنھیں آخری ہدایات دینے لگا: "میرے دُوسرے حکم تک یہیں آرام سے کھڑے رہو۔ مجھے اس معاملے سے نمٹنے میں دیر نہیں لگے گی اور یاد رکھو۔ کمان دار کی حیثیت سے اس لڑکی پر سب سے پہلے میرا حق ہو گا۔"

یہ ہدایات دینے کے بعد وہ میری طرف آیا اور پانچ قدموں کے فاصلے پر رُک گیا۔ اُس نے تلوار بڑی بے پروائی سے پکڑ رکھی تھی۔ وہ مجھ پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر دیپا کی طرف متوجہ ہو گیا جو کھائی کے کنارے ایک چٹان کی اوٹ میں چھپنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"ادھر کیا دیکھتے ہو؟ مجھ سے بات کرو اور یہ مت بھولو کہ وہ میری بیوی ہے۔" میں نے کہا۔

کاشی کمان دار نے غور سے میری طرف دیکھا بلکہ اپنی نگاہیں مجھ پر مرکوز کر دیں۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی زرد آنکھیں موت کی طرح سرد اور بے حس تھیں۔ وہ کافی دیر تک سانپ کی طرح ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھتا رہا... پھر اُس کے ہونٹ پھڑپھڑائے اور سفید نوکیلے دانت دکھائی دینے لگے۔

"تم کیا چیز ہو، کہاں سے آئے ہو، کیا چاہتے ہو اور تمھیں کہاں جانا ہے؟" اس نے پُوچھا۔

"میرا نام سرفروش ہے۔ میں آدم زاد ہوں۔ مجھے اپنی بیوی کے ساتھ پہاڑوں کے اُس پار جانا ہے۔ اگر ہم تمھاری اجازت کے ساتھ یہاں سے گزر جائیں تو بہتر ہو گا اور ہاں، تم نے میرے اعزاز میں جو سلامی دی ہے اس کے لیے شکریہ۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی ٹانگیں پھیلا دیں، بھالا بغل میں دبایا اور بے نیازی سے مسکرایا تاکہ وہ یہ نہ سمجھے کہ میں اُس سے مرعوب یا خوف زدہ ہوں۔

اُس بندر نما گوریلے کی زرد آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک اُبھری۔ اُس نے اپنی تلوار میری طرف سیدھی کی۔ اگرچہ یہ دو دھاری تلوار کسی سخت لکڑی کی بنی ہوئی تھی... مگر اسے مہلک بنانے کے لیے پھل میں چقماق جڑے ہوئے تھے اور وہ ایک ایسی ہستی کے ہاتھ میں تھی جو مجھ سے دو فٹ اُونچا اور تین گنا زیادہ وزنی تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ دھونس سے کام چل جائے گا... مگر اس سے کام نہیں چل سکا تھا۔ وہ استہزائیہ انداز سے مسکرانے لگا۔

"تم کہتے ہو کہ تمھارا نام سرفروش ہے مگر مجھے اس سے کیا غرض؟ میرا نام پونگ ہے مگر تمھیں اس سے کیا غرض۔ تم کہتے ہو کہ تمھیں پہاڑ کے اُس پار جانا ہے لیکن مجھے جمشیدیوں سے ایسا کوئی پیغام نہیں ملا کہ اُن کے لیے تمھاری آمد متوقع ہے۔ یہ سب کچھ کیا ہے، آخر؟"

میں اگرچہ ماضی کے متعدد سفر کر چکا تھا لیکن ایک بندر نُما گوریلے کو بولتے اور عقل مندی کی باتیں کرتے دیکھ کر خاصا متعجب تھا، تاہم میں نے کہا: "جمشیدیوں کو میرا انتظار نہیں ہے۔ وہ مجھے نہیں جانتے اور جان بھی کیسے سکتے ہیں کیونکہ میں ایک بہت دُور دراز علاقے سے آیا ہُوں۔ بہرکیف مجھے اُن کے پاس جانا ہے اور مجھے اُن کے پاس جانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔"

ایک بار پھر اُس کی آنکھوں میں وحشیانہ چمک عود کر آئی اور مجھے دیپا کی بات یاد آ گئی کہ وہ بے حد سفاک ہوتے ہیں اور اُنھیں وحشیوں کی یلغار روکنے کے لیے اس سرحد پر مامور کیا گیا ہے چونکہ اُن کی نسل میں عورتیں جنم نہیں لیتیں اس لیے وہ اس خدمت کے عوض جمشیدیوں سے مُجرم عورتیں حاصل کرتے ہیں۔ پھر بھی کبھی کبھار وحشی کچھ غلام عورتیں اُنھیں دے کر جمشیدیوں پر حملہ کراتے ہیں اور بہت سے مرد و زن کو غلام بنا کر لے جاتے ہیں۔ دیپا بھی اسی طرح وحشیوں کے ہتھے چڑھی تھی۔

"شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔ پونگ تمھیں یہاں سے گزرنے دے گا۔ پھر تم جانو اور دُوسری چوکیوں والے جانیں مگر یہ لڑکی تمھیں ہمارے حوالے کرنا ہو گی۔ ادھر کافی عرصے سے جمشیدیوں نے مجرم عورتیں نہیں بھیجیں اور پھر ہماری چوکی تو یُوں بھی سب سے آخر میں واقع ہے۔"

دیپا مجھے بتا چکی تھی کہ اُن کی قوم کی وہ عورتیں جنھیں بھیانک جرائم کی پاداش میں موت کی سزا دی جاتی ہے، اُن کاشیوں کے حوالے کر دی جاتی ہیں مگر اُن میں سے بہت سی عورتیں خودکشی کر لیتی ہیں۔

"میں تمھیں بتا چکا ہوں کہ وہ میری بیوی ہے اس لیے وہ میرے ساتھ ہی جائے گی۔"

"تو پھر نہ تو تم جاؤ گے اور نہ ہی وہ جائے گی۔" وہ ہوا میں تلوار چلاتے ہوئے بولا: "میں تمھیں قتل کر کے اُسے حاصل کر لُوں گا مگر جہاں سے بھی تم آئے ہو، وہاں احمق ہی پیدا ہوتے ہیں۔"

میں دو قدم پیچھے ہٹا اور اپنا بھالا تولا جس کا پھل لکڑی کا بنا ہُوا تھا، تیر کمان بھی کھلونوں جیسی تھی جبکہ میرے مدِمقابل کے پاس دو دھاری تلوار تھی۔ اُس کا جُثہ دیکھ کر تو یہ اندازہ ہوتا تھا کہ گھنے بالوں کی وجہ سے نہ تو بھالا کارآمد ثابت ہو گا اور نہ ہی تیر اُس کے جسم میں پیوست ہو سکیں گے۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے اپنی پیٹھ میں کوئی نوک دار چیز چبھتی محسوس ہُوئی۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔

دستے کے ایک گوریلے نے اپنی تلوار کی نوک میری پیٹھ سے لگا دی تھی اور باقی میرے چاروں طرف پھیل گئے تھے۔ اب مجھ پر بیس زرد آنکھیں بیک وقت جمی ہُوئی تھیں۔ ان آنکھوں میں نفرت اور غصہ ہی نہیں، وحشت بھی لہریں لے رہی تھی۔ میری پیٹھ میں تلوار چبھونے والا برہمی سے بولا: "زیادہ بکواس نہ کرو اجنبی۔ کمان دار سے لڑو اور مر جاؤ مگر مرنے میں دیر نہ کرو۔" یہ کہہ کر وہ دیپا کی طرف دیکھنے لگا۔

"بکواس بند کرو۔" کمان دار چلایا: "اس قسم کی باتیں قواعد اور ضوابط کے خلاف ہیں۔ اگر اب کوئی بولا تو شکار پر اُس کا کوئی حق نہیں ہو گا۔ اب اپنا حلقہ تنگ کرو۔ یہ احمق بہادر لگتا ہے لیکن میں اسے بھاگنے کا موقع نہیں دینا چاہتا۔"

اُنھوں نے میرے گرد اپنا حلقہ تنگ کر لیا مگر پونگ اپنی جگہ کھڑا رہا۔ وہ شاید میرے حملے کا منتظر تھا جبکہ میں چاہتا تھا کہ وہ میرے قریب آئے اور وار کرے تاکہ مجھے یہ اندازہ ہو سکے کہ اُس کا طریقِ جنگ کیا ہے۔ جب وہ کوئی غلطی کرے تو میں اُسے کاری ضرب لگا سکوں لیکن اس کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا کیونکہ وہ مجھ سے دو ہاتھ زیادہ قدآور تھا۔ اس کا وزن چھ سو پونڈ تھا جبکہ میرا صرف دو سو پونڈ تھا... پھر اُس کے پاس دو دھاری تلوار بھی تھی۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس بار موت میرا مقدر بن ہی چکی ہے تو بہادروں کی طرح مرنا چاہیے۔

"کھڑے کھڑے دیکھ کیا رہے ہو بزدل، حملہ کرو نا۔" میں نے کہا۔

اچانک پونگ مجھ پر جھپٹا اور اس نے تلوار سے میری کھوپڑی دو ٹکڑے کر دینا چاہی... مگر میں عین وقت پر ہٹ گیا۔ وہ غصے

کے مارے کھول اُٹھا اور پھر میری طرف بڑھا۔ اس بار مَیں نے پہل کی اور اپنا بھالا اُس کے سینے پر دے مارا۔ اُس نے بھالا کھینچا تو اُس کا پھل ٹوٹ گیا۔ اُس نے پھل نکال کر میری طرف پھینکا۔ مَیں نے اُسے ٹوٹے ہُوئے بھالے پر روکا اور اُسی سے پھر وار کر دیا۔

یونگ پیچھے ہٹا اور پیٹھ میری طرف موڑ لی۔ مَیں نے ٹوٹے ہُوئے بھالے سے اُس کی پیٹھ پر بھی ضرب لگائی۔ اس کی تلوار میرے بھالے سے چھوٹی تھی اس لیے مجھ تک نہیں پہنچ سکتی تھی مگر میرا بھالا اُسے مسلسل زخمی کر رہا تھا۔ ہر چند کہ یہ زخم معمُولی تھے مگر اُن سے خُون بہنا شروع ہو گیا تھا۔ مَیں نے سوچا اگر خُون اسی طرح نکلتا رہا تو جلد ہی وہ نقاہت میں مُبتلا ہو جائے گا۔ اُس کے ساتھیوں کا گھیرا ہمارے ہاں کے باکسنگ رِنگ کے برابر تھا چنانچہ مَیں نے باکسنگ کی طرح ہی اُسے پے در پے بھالے مارنے شروع کر دیے۔

وہ جھنجلا کر اندھا دُھند تلوار چلانے لگا مگر مَیں تو ایک باکسر کی طرح بجلی کی رفتار سے پھُدک رہا تھا۔ اس لیے اُس کا ہر وار خالی جاتا رہا تاہم ایک بار اس کی تلوار سے میرے بال کٹ ہی گئے۔

اب مَیں ایسی اداکاری کرنے لگا جیسے بُری طرح تھک گیا ہُوں۔ میرا دَم اُکھڑ رہا ہے اور مَیں کسی بھی لمحے گر پڑوں گا۔ یہ دیکھ کر یونگ کی باچھیں کھِل گئیں۔ اُسے اپنی فتح کا یقین ہو گیا۔

مَیں جلدی سے پیچھا ہٹا۔

یونگ اس اطمینان کے ساتھ رُک گیا کہ اب تو مَیں خُود ہی تھکن سے چُور ہو کر گرنے والا ہُوں مگر مَیں جُونہی اس کی تلوار کی زد سے نکلا، کمان پر تیر چڑھایا اور چِلّا کھینچنے لگا۔ یونگ نے تعجب سے میری طرف دیکھا اور مسکرانے لگا۔

"تم اس کھلونے کے ساتھ یونگ سے لڑنا چاہتے ہو۔ اس رسّی اور لکڑی کے ٹکڑے سے یونگ کو مارو گے؟"

عین اُسی وقت مَیں نے تیر چھوڑ دیا۔

یونگ نے اُسے بائیں ہاتھ سے روکنا چاہا تو وہ اُس کی ہتھیلی میں گڑ گیا۔ اس نے تلوار پھینک دی اور ہتھیلی سے تیر نکالنے لگا۔ یہی وہ نازک اور فیصلہ کُن لمحہ تھا جس کا مَیں انتظار کر رہا تھا۔ اب تک مجھے ستانے اور اپنی قوت بحال کرنے کا وقت بھی مِل چُکا تھا چنانچہ مَیں نے زقند بھری اور اُس سے ٹکرا گیا۔

وہ سمجھا کہ اُس کا شکار خُود ہی اُس کی گرفت میں آ گیا ہے لہٰذا اس نے مجھے اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے کر میری ہڈیاں توڑ دینا چاہیں لیکن اس سے پہلے ہی میرے ہاتھوں کے دونوں انگوٹھے اُس کی آنکھوں میں گڑ گئے تھے۔ مَیں نے اپنے انگوٹھوں کو گھمایا تو اُس نے ایک چیخ کے ساتھ نہ صرف مجھے چھوڑ دیا بلکہ زور سے ہٹایا تو اُس کی آنکھوں کے ڈیلے بھی باہر آ گئے۔

وہ درد کے مارے چیخنے اور دھاڑیں مارنے لگا۔

اس کے ساتھی حیرت سے بُت بنے اپنی اپنی جگہ کھڑے رہ گئے۔ اُن کی سمجھ میں نہ آسکا کہ ہُوا کیا ہے۔

مَیں نے لپک کر یونگ کی تلوار اُٹھالی اور دو قدم پیچھے ہٹ کر اُس کے ساتھیوں پر نظر ڈالی۔ وہ ابھی تک دم بخُود اپنے سردار کو تڑپتا اور چلّاتا دیکھ رہے تھے۔ مَیں نے یونگ کو چڑاتے کے لیے مذاق اُڑانے والے انداز میں کہا "ادھر آؤ یونگ! میری آواز کی سمت بڑھو بُزدل۔ اب بتاؤ کہ احمق کون ہے؟ اگر مجھے ختم کر سکتے ہو تو آؤ نا۔"

وہ دھاڑتا ہُوا اُٹھا اور اپنی بانہیں پھیلا کر اس سمت لپکا جدھر مَیں کھڑا تھا۔ مَیں نے اپنے پیر مضبوطی سے جمائے، دونوں ہاتھوں سے تلوار سیدھی کی اور اُسے چڑایا۔ "آؤ... اور آگے آؤ بدبخت۔"

اس نے آواز سے میری سمت کا اندازہ لگایا اور پوری قوت سے جھپٹا تو تلوار کی نوک اُس کے نرخرے میں اُترتی چلی گئی۔ وہ ایک دھاڑ کے ساتھ رُکا اور پیچھے ہٹا۔ ساتھ ہی میں نے تلوار کھینچ کر نکالی تو خُون کا ایک فوارہ سا اُس کی گردن سے اُبلنے لگا۔

مَیں نے دو مرتبہ تلوار اُس کے سینے میں گھونپی۔ وہ مرتے دم تک تلوار مجھ سے چھیننے کی کوشش کرتا رہا مگر اُس کی یہ حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ مَیں نے اپنا پیر اُس کی لاش پر رکھ کر اُس کے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ وہ آہستہ آہستہ میری طرف بڑھنے لگے۔ مَیں نے خُون آلُود تلوار بلند کرتے ہُوئے کہا۔

"فیصلہ ہو چکا۔ مَیں نے تمھارے سردار کو مار دیا ہے اس لیے اب مَیں تمھارا سردار ہُوں اور نئے سردار کی حیثیت سے وعدہ کرتا ہُوں کہ تم سب کو ایک ایک بیوی اور نرم فرائض پر مامُور کیا جائے گا... یہ میرا... سرفروش کا وعدہ ہے۔ اس پر اعتماد کرو یا مجھ سے لڑو اور یونگ کی طرح مارے جاؤ۔" یہ کہہ کر مَیں یونگ کی لاش کا جائزہ لینے لگا۔ یہ اُس جُوئے کا آخری مرحلہ تھا جو مَیں نے کھیلا تھا۔ مَیں یونگ کا سر کاٹنے لگا مگر میرے کان اُس کے ساتھیوں کی باتوں پر لگے تھے۔

"اُس نے ہمارے سردار کو قتل کیا ہے۔ اسے مار ڈالو۔" ایک نے کہا۔

"تو حکم دینے والے کون ہو؟ اب ہم سب برابر ہیں۔ اُس نے وعدہ کیا ہے کہ سب کو ایک ایک بیوی ملے گی۔" دُوسرا بولا۔

"مجھے اس بات کا یقین نہیں۔ یہ اتنی بیویاں کہاں سے لائے گا؟ اس کے پاس تو ایک ہی عورت ہے اور اس پر بھی اپنا ہی حق جتاتا ہے۔ میری مانو تو اسے مار ڈالو اور لڑکی کو پکڑ لو۔"

"اُس نے یونگ کو مار کر اچھا ہی کیا ہے۔ ورنہ وہ لڑکی کو ہم تک آنے ہی نہ دیتا۔"

"سُنو بے وقوفو۔" پانچواں بولا۔ "ہم اسے کسی بھی وقت مار سکتے ہیں مگر پہلے اس سے پُوچھ لو کہ یہ عورتیں کہاں سے لائے گا اور ہمیں نرم فرائض پر کیسے مامُور کرے گا؟"

"اسے مارنا اتنا آسان نہیں۔ یہ مرنے سے پہلے ہم میں سے دو چار کو مار ہی ڈالے گا اور مَیں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔ آؤ اس سے بات کریں۔" چھٹے بیلانے نے فیصلہ دیا تو میری جان میں جان آئی۔

مَیں یونگ کا سر تلوار کی نوک پر اُٹھاتے ہُوئے اُن کی طرف پلٹا اور بولا۔ "تمھارا فیصلہ بڑا دانش مندانہ ہے۔ مَیں یونگ کا سر اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ تم دُوسری چوکیوں کو اطلاع کے ساتھ ساتھ یہ خوشخبری بھی سُنا دو کہ اُنھیں بھی بیویاں ملیں گی۔ مَیں سب کو آسائشیں بھی فراہم کروں گا۔ تم سوچتے ہو گے کہ کیسے؟ دیکھو جس طرح مَیں یہاں کا سردار بنا ہُوں، اسی طرح جمشیدیوں کا بھی سردار بنوں گا اور اپنا وعدہ نبھاؤں گا۔"

مَیں نے یہ بات اس لیے کی تھی کہ اگر جھُوٹ بولنا اور دھونس جمانا پڑے تو پھر بلا جھجک بہت بڑی بات کرنی چاہیے۔ صرف اسی طرح اچھے نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ ...مگر مَیں نے دیکھا کہ وہ ابھی تک تذبذب میں مُبتلا تھے۔

مَیں نے اپنے جھُوٹ اور دھونس میں وزن پیدا کرنے کے لیے ایک اور چال چلی۔ یونگ کے سر سے تلوار نکالتے ہُوئے مَیں نے اُن میں سے ایک سے کہا۔ "اسے لے جاؤ اور کسی تھیلے میں ڈال کر لے آؤ۔ جاؤ۔ درست کرو۔"

اُس نے ایک نظر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا جو خاموش کھڑے رہے پھر وہ آگے بڑھا اور یونگ کا سر اُٹھا کر جھونپڑے کی طرف چل دیا۔

اُس کے ساتھی اُسے جاتا دیکھتے رہے۔

میری دھڑکنیں بے ترتیب سی ہو گئیں۔ وہ میری دھونس میں آ گئے تھے مگر پُوری طرح نہیں۔ مَیں نے ترپ کا ایک اور پتہ پھینکا اور تلوار زمین پر رگڑ کر صاف کرتے ہُوئے بولا۔۔۔

"سمجھنے کی کوشش کرو کاشیو!... اگر تم مجھ سے لڑتے ہو تو تم میں سے کچھ میرے ہاتھوں میں ضرور مارے جائیں گے لیکن اگر مَیں اپنی بیوی کے ساتھ جمشیدیوں میں پہنچ جاؤں اور اُن کا سردار بن جانے کے بعد اپنا وعدہ نبھاؤں تو تم کتنے فائدے میں رہو گے؟ سب کو ایک ایک بیوی مل جائے گی۔ مجھے آزما کر کیوں نہیں دیکھ لیتے؟"

مجھے جمشیدیوں میں پہنچ کر سردار بننے اور کاشیوں کو بیویاں فراہم کرنے کی کوئی تمنا نہیں تھی۔ یہ مَیں تو جانتا تھا مگر کاشی نہیں جانتے تھے۔

وہ بار بار بیوی کا تذکرہ سُن کر میرے جھانسے میں آ ہی گئے۔

اُنھوں نے آپس میں مشورہ کیا اور بولے "ہم میں سے چھ نے تمھارے حق میں اور تین نے تمھارے خلاف مشورہ دیا ہے، سرفروش۔ اس لیے تم جا سکتے ہو مگر اپنا وعدہ نہ بھُول جانا۔"

جب وہ اپنا فیصلہ سُنا کر جھونپڑے میں چلے گئے تو مَیں دیپا کے پاس گیا اور اُسے لے کر جھونپڑے سے دُور ایک لمبا چکر کاٹتے ہُوئے آگے بڑھ گیا۔ مَیں نے اُس وقت تک نہ تو دیپا کے کسی سوال کا جواب دیا اور نہ ہی اپنی رفتار کم کی جب تک کہ وہ جھونپڑا یا چوکی ہماری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔

یونگ سے میرا مقابلہ دیکھنے کے بعد دیپا مجھ سے بے حد متاثر ہو گئی تھی۔

جب دُوسری چوکی قریب آئی تو اُس نے مجھے پہلے سے بتا دیا۔

"وادی میں جانے کا کوئی دُوسرا راستہ بھی تو ہو گا؟" مَیں نے پوچھا۔

"نہیں... صرف ایک ہی درّہ ہے اور اس پر کاشیوں کی چوکی ہے۔"

"تو پھر ہم اُدھر سے نہیں جائیں گے۔ ورنہ اس بار وہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں آقا۔ مَیں بلا چُون و چرا آپ کے حکم کی تعمیل کروں گی۔"

مَیں نے اُس کے بدلے ہُوئے لب و لہجے اور رویّے پر اُسے تیز نگاہوں سے دیکھا اور کہا۔ "یہ طے ہو چُکا ہے کہ تم مجھے آقا نہیں بلکہ سرفروش کہہ کر مخاطب کیا کرو گی۔"

دیپا کی آنکھیں مُسکرا رہی تھیں لیکن اُس نے ہونٹوں پر آنے والا تبسّم روک لیا... اور پھر ہم دونوں ہی کھِل کھِلا کر ہنس دیے۔

◆

دیپا ٹھیک ہی کہتی تھی کہ وادی میں داخل ہونے کا صرف وہی ایک راستہ تھا جس پر کاشیوں کی چوکی تھی لیکن مَیں نے اپنی کوہ نوردی کے تجربوں سے کام لیتے ہُوئے پہاڑ عبُور کرنے کا تہیّہ کر لیا۔ ہر چند کہ یہ ایک حماقت تھی مگر میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ مَیں نہ تو واپس جا سکتا تھا اور نہ ہی درّے کی جانب بڑھ سکتا تھا۔

جُوں جُوں چڑھائی بڑھتی گئی، سردی میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور راستے کی دُشواریوں میں بھی زیادتی ہوتی گئی۔ دیپا کی حالت سردی کے مارے غیر ہوتی جا رہی تھی۔ جب اُس سے چلنا دوبھر ہو گیا تو مَیں

نے اُسے اپنی پیٹھ پر اُٹھا لیا اور اُس وقت تک سفر جاری رکھا جب تک کہ شام کا اندھیرا گہرا نہ ہو گیا۔

اب اندھیرے میں آگے بڑھنا خود موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ اس لیے مَیں نے رات بسر کرنے کے لیے کوئی محفوظ جگہ تلاش کرنا شروع کر دی تاکہ ٹھنڈی ہوا سے کچھ تو تحفظ حاصل ہو سکے۔ جلد ہی مجھے ایک ایسی جگہ بھی مل گئی۔ یہ دو چٹانوں کے درمیان ایک غار سا تھا۔ مَیں اس اندھیرے غار میں داخل ہو گیا۔

ابھی مَیں نے دیپا کو اپنی پیٹھ سے اُتارا ہی تھا کہ اندھیرے میں کسی جانور نے مجھے اتنے زور سے ٹکر ماری کہ مَیں لڑکھڑاتا ہُوا دُور جا گرا اور اگر فوری طور پر نہ سنبھلتا تو دو قدم دُور رہ جانے والی ڈھلان سے لڑھکنیاں کھاتا ہُوا ہزاروں فٹ گہری کھائی میں جا گرتا۔

اُس جانور کی ٹکر سے مجھے یہ محسوس ہو گیا تھا کہ اُس کا صرف ایک ہی بڑا سا سینگ مجھے اتنے زور سے لگا ہے جس نے مجھے اس بُری طرح اُچھال دیا ہے۔ مَیں نے کمر کی پیٹی سے چقماق کا چاقو نکالا اور فوراً ایک طرف ہٹ گیا کہ وہ جانور ڈکراتا ہُوا پھر میری طرف بڑھ رہا تھا۔

مَیں نے اپنا ایک بازو اپنے چہرے پر ڈھال بنا لیا تاکہ اس کی ٹکر کہیں مجھے اندھا ہی نہ کر دے اور دُوسرے ہاتھ میں چاقو تھام کر انتظار کرنے لگا کہ وہ کب مجھ پر حملہ کرتا ہے۔ میرے لیے سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ وہ اندھیرے میں مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اتنے میں اُس نے پھر مجھے ٹکر ماری جو میرے کندھے پر لگی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب مَیں نے بجلی کی سی پھُرتی سے اس کا ایک سینگ پکڑ لیا اور اُچک کر اُس کی گردن پر سوار ہو گیا... پھر مَیں دیوانہ وار اُس پر چاقو سے حملہ کرنے لگا۔ وہ جانور بھی بہت طاقتور لگتا تھا۔ اس کی گردن پر لمبے لمبے بال تھے۔ اس لیے چاقو آسانی سے اُس کی گردن میں پیوست نہیں ہوتا تھا۔ دُوسرے اب وہ بُری طرح اُچھل اُچھل کر مجھے گرانے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ مجھے یہ خوف تھا کہ کہیں وہ بدبخت ڈھلان کی طرف نہ مُڑ جائے ورنہ اپنے ساتھ مجھے بھی لے مرے گا۔۔ مگر اس کُود پھاند کے دوران جانور گر پڑا میں، اُسے دبوچ کر وحشیوں کی طرح اُس کی گردن پر وار کرنے لگا۔

خون کے فوارے مجھے تر بتر کرنے لگے مگر مَیں دیوانگی اور جوشِ وحشت میں اُس پر مسلسل وار کرتا رہا۔ وہ ٹھنڈا ہو گیا لیکن میرا چاقو والا ہاتھ پھر بھی نہ رُکا۔ مَیں کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔

جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ مر چکا ہے تو مَیں نے اپنی دیوانگی پر خود ہی ایک قہقہہ لگایا اور دیپا کے پاس پہنچ گیا۔

وہ اندھیرے میں سردی کے مارے گٹھری بنی ہُوئی تھی۔ مَیں نے ٹٹول کر اُسے چھُوا تو وہ بولی: "مَیں سردی سے مر رہی ہُوں۔ تم بھی صبح تک زندہ نہیں بچو گے۔"

"نہیں دیپا۔ ہم دونوں زندہ رہیں گے۔ مَیں ابھی تمھیں سردی سے نجات دلاتا ہُوں۔" اُسے دلاسا دے کر مَیں دوبارہ اُس مُردہ جانور کے قریب آیا اور ٹٹول ٹٹال کر اُس کی کھال اُتارنے لگا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد مَیں نے نیم بے ہوش دیپا کو اُس خون آلود کھال میں لپیٹ دیا۔ تھوڑی دیر بعد دیپا کو ہوش آ گیا۔

"اوہ سرفروش، مجھے ایسا لگتا ہے جیسے مَیں اپنی ماں کی آغوش میں ہُوں، مجھے نیند آ رہی ہے۔" وہ بڑبڑائی۔

"سو جاؤ..." مَیں نے کہا اور خود بھی اُس کھال کے ساتھ پیٹھ لگا کر سو گیا۔

*

دو روز بعد ہم پہاڑ کی چوٹی عبور کر چکے تھے اور اب ڈھلان کا سفر کر رہے تھے۔ پہاڑی مینڈھے کی وہ کھال ہمارے پاس تھی مگر تیسرے روز وادی میں پہنچنے کے بعد ہم نے اُسے پھینک دیا۔ دیپا نے بتایا کہ ابھی اُس کے شہر تک پہنچنے میں کئی دن لگیں گے۔

"وہاں تک پہنچنے سے پہلے ہمیں نہا دھو لینا چاہیے۔ ورنہ تمھارے قبیلے کے لوگ ہمیں اس حال میں دیکھ کر کوئی شیطانی مخلوق سمجھیں گے اور مار ڈالیں گے یا خود ہی خوف سے مر جائیں گے۔"

... اور مَیں نے اُسے جھوٹ نہیں کہا تھا۔ میرے جسم پر اب بھی مینڈھے کے خون کی پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ دیپا بھی لڑکی کی بجائے بھُتنی نظر آ رہی تھی۔ ہمارے چہرے خاک آلود تھے اور ہمارے جسموں سے بدبو کے بھبکے اُٹھ رہے تھے۔ اب ہمیں کسی چشمے یا پہاڑی ندی کی تلاش تھی۔

راستہ چلتے چلتے اچانک ہی مجھے اپنی کنپٹیوں میں درد کی ٹیسیں سی محسوس ہونے لگیں۔ ڈاکٹر فریدوں کا کمپیوٹر مجھے تلاش کر رہا تھا۔ وہ مجھے کسی بھی وقت بُلا سکتا تھا۔ کل، پرسوں، ایک ہفتے یا ایک گھنٹے بعد... مَیں نے دیپا کی طرف دیکھا اور مجھے اُس بھُتنی پر پیار آ گیا۔

ٹیسیں تھوڑی دیر بعد ختم ہو گئیں۔

تین روز بعد ہم ایک ایسے شہر میں پہنچے جو شاید صدیوں سے ویران پڑا تھا۔ اس مُردہ شہر میں چھوٹی چھوٹی نہروں کا جال سا بچھا ہُوا تھا مگر ان میں پانی کی بجائے گھاس پھُونس اور جھاڑیاں اُگی ہُوئی تھیں۔ جگہ جگہ مکانوں اور معبدوں کے کھنڈر رفتگاں کا ماتم کر رہے تھے۔ کہیں کہیں ایسے مجسمے بھی اِستادہ تھے جیسا مَیں نے جھیل پر دیکھا تھا۔ ان مجسموں کے چبوتروں پر کسی عجیب سی زبان کے الفاظ کندہ تھے۔ جنھیں دیپا بھی نہ پڑھ سکی۔ اُس نے صرف اتنا بتایا کہ کسی زمانے میں اُس کی قوم یہاں آباد تھی مگر چونکہ لوگوں نے آسمانی کتابوں کی تعلیمات سے

رُوگردانی کر لی تھی، اس لیے اُنھیں اپنے اس شہر سے بھی جلاوطن ہونا پڑا۔ ہم کئی گھنٹے اس مُردہ شہر میں گھومتے رہے۔

ہمارے پاس وہ پہاڑی برف بھی ختم ہو چکی تھی جسے چُوس چُوس کر ہم اپنی پیاس بجھاتے آ رہے تھے۔ اب ہمیں شدت سے پیاس لگ رہی تھی... مگر وہاں پانی کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

چلتے چلتے ہم ایک بڑے معبد کے پاس پہنچے اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ ایک چھوٹی سی جھیل کے بیچوں بیچ واقع ہے۔ مجھے اس بات پر بڑا تعجب تھا کہ جب شہر کی ہر ندی گھاس پھُونس سے اَٹ گئی ہے اور باؤلیاں خشک ہو چکی ہیں تو یہاں پانی کہاں سے آ گیا؟ پھر خیال آیا کہ غالباً اس ننھی سی جھیل کی تہ میں کوئی چشمہ ہو گا۔ مَیں نے دونوں ہاتھوں میں پانی لیا تو وہ بہت ٹھنڈا اور میٹھا نکلا۔ ہم نے پہلے تو خُوب ڈٹ کر پانی پیا اور پھر نہانے کے لیے اس میں اُتر گئے۔

غسل کے بعد مَیں جھیل کے کنارے لیٹ گیا۔

دیپا ایک بار پھر حسین سا مرمریں مجسمہ دکھائی دینے لگی تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ عبادت کرنا چاہتی ہے۔ یہ کہہ کر اُس نے باری باری مشرق اور مغرب کی طرف منہ کر کے اور ہاتھ اُوپر اُٹھا کر دل ہی دل میں کچھ پڑھا اور مجھے بتایا کہ وہ اُس پہاڑی جانور کی رُوح کے لیے دُعا مانگ رہی تھی جس کی کھال نے اُسے موت کے منہ سے بچایا تھا اور جس کے گوشت سے ہم اب تک پیٹ بھرتے آ رہے تھے۔

گوشت کا ذکر آتے ہی میری بھوک چمک اُٹھی مگر وہاں اب تک کوئی شکار دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"یہاں سے چلو ورنہ بھُوکوں مر جائیں گے۔" مَیں نے کہا۔

"ہاں..." وہ بولی۔ "بھُوک مجھے بھی لگ رہی ہے۔ یاد پڑتا ہے کہ کچھ فاصلے پر ایسے درخت ہیں جن کے پھل بہت میٹھے ہوتے ہیں۔"

ہم دونوں تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگے۔

اچانک ایک آواز نے میرے قدم روک لیے۔

مجھے رُکتا دیکھ کر دیپا بھی رُک گئی۔ "رُک کیوں گئے؟" اُس نے پوچھا۔ "تمھیں کوئی آواز سُنائی دے رہی ہے؟"

"نہیں تو..." وہ حیرت سے بولی۔

وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ اُسے وہ آواز سُنائی نہیں دے سکتی تھی... مگر ڈاکٹر فریدوں نے میرے دماغ پر جو سائنسی عمل کیے تھے، اُن سے میری قوتِ سماعت بھی بہت بڑھ گئی تھی اور مَیں نے کسی کی سرسراہٹ سُن لی تھی۔ مَیں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

بالآخر وہ مجھے دکھائی دے گیا۔ ہم سے کوئی پچاس گز دُور ایک بہت بڑا اژدہا درخت کے تنے سے لٹکا ہُوا تھا۔ اگر میری سماعت تیز نہ ہوتی تو ہم چند منٹوں بعد اُس کی لپیٹ میں آ گئے ہوتے۔ مَیں نے دیپا کو وہ اژدہا دکھایا اور پھر ہم راستہ کاٹ کر بھاگتے چلے گئے۔

چند میل آگے جا کر ہم اُن درختوں کے جھنڈ میں پہنچ گئے جن میں وہ پھل لگے ہُوئے تھے۔ اُن کی شکل تو سیب جیسی تھی مگر وہ جسامت میں تربوز سے کم نہیں تھے۔ مَیں نے درخت پر چڑھ کر چار پانچ پھل توڑے۔ اُن کا چھلکا بہت سخت مگر گُودا نرم اور شیریں تھا۔ تین پھل کھانے سے ہی ہمارے پیٹ بھر گئے اور ہم آگے بڑھ گئے۔

اب ہمارے سامنے بڑا ہی خوبصورت علاقہ تھا۔

دونوں طرف چھوٹی چھوٹی آبشاریں اور ندیاں تھیں۔ مَیں نے رات گزارنے کے لیے ایک آبشار کے ساتھ مسطح چٹان منتخب کی اور ہم سرِ شام ہی سو گئے چونکہ ہم بہت تھکے ہُوئے تھے اس لیے لیٹتے ہی ہمیں نیند بھی آ گئی تھی۔

علی الصباح جب میری آنکھ کھُلی تو فضا میں ایک عجیب سی بُو رچی ہُوئی تھی اور یہ بُو ایسی ہی تھی جیسے کہیں گوشت جل رہا ہو۔ مَیں جلدی سے اُٹھ بیٹھا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا اور پھر میری نگاہ دھوئیں کی ایک لکیر پر جا پڑی جو وادی سے اُوپر اُٹھتی چلی گئی تھی۔

یہ کیسی آگ اور کیسا دھُواں تھا؟ یہ جاننے کے لیے مَیں نے دیپا کو جگانا چاہا مگر اسے نیند میں مسکراتے دیکھ کر رُک گیا۔ شاید وہ کوئی خوبصورت خواب دیکھ رہی تھی اور خود بھی بے حد خوبصورت لگ رہی تھی۔ ماضی کے ہر سفر میں مجھے خوبصورت لڑکیاں ملی تھیں اور ہر لڑکی اپنی مثال آپ تھی۔ دیپا کو دیکھ کر مجھے تاشیہ اور لالی یاد آ گئیں۔ اُنھوں نے بھی مجھے دیپا ہی کی طرح ٹُوٹ کر چاہا تھا۔

اچانک مجھے اپنے سر میں درد کی شدید لہریں اُٹھتی محسوس ہوئیں۔ ڈاکٹر فریدوں اور اُس کا کمپیوٹر میری تلاش میں تھے اور شاید کمپیوٹر نے مجھے تلاش کر لیا تھا۔ مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے میرے سر میں دھوئیں کے بادل سے اُٹھ رہے ہوں اور یہ دھُواں کسی شور مچاتے راکٹ سے خارج ہو رہا ہو۔ ڈاکٹر فریدوں شاید مجھے واپس بُلانے کی تیاری کر رہا تھا مگر مَیں ابھی واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ مَیں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا اور چٹان پر لوٹنے لگا کہ درد میری برداشت سے باہر ہو گیا تھا۔

دفعتہً مجھے اپنے چہرے اور سر پر برف سی گرتی محسوس ہُوئی۔ مَیں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ دیپا میرے مُنہ پر آبشار کے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مار رہی تھی اور روہانسی آواز میں کہہ رہی تھی۔ "کیا ہُوا... تمھیں کیا ہو گیا ہے سرفروش؟"

مَیں نے سر جھٹکا اور اُٹھ بیٹھا۔ دیپا روتے ہُوئے مجھ سے لپٹ گئی۔ مَیں نے اس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہُوئے کہا۔ "مَیں بالکل ٹھیک

ہُوں دیپا۔ تم نے مجھے کیوں جگا دیا اور یہ پانی؟ کیا میں کل نہایا نہیں تھا؟"

"مگر تم نیند میں بڑبڑا رہے تھے، رو رہے تھے، چیخ رہے تھے۔ مجھے یُوں لگا جیسے تمھارا جسم تو یہاں ہے مگر تمھاری رُوح کہیں چلی گئی ہے۔ تم مجھے اکیلا چھوڑ گئے ہو۔ میں بہت ڈر گئی تھی، سرفروش۔ مجھے کبھی چھوڑ کر نہ جانا ورنہ میں مر جاؤں گی۔"

مجھے اس پر رحم آنے لگا۔ اُسے کیا معلوم کہ میں کسی وقت بھی ذرّوں میں تبدیل ہو سکتا تھا۔

میری سمجھ میں نہ آسکا کہ ڈاکٹر فریدوں اتنی جلد واپسی کے درپے کیوں ہے؟

میں نے دیپا کی توجہ ہٹانے کے لیے دُھوئیں کی بلند ہوتی لکیر کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے پُوچھا۔ "یہ دُھواں اور بُو کیسی ہے؟"

"شاید وہ مُردے جلا رہے ہیں۔ میں نے کبھی مُردے نذرِ آتش ہوتے تو نہیں دیکھے لیکن اپنے بڑوں سے سُنا ہے کہ ہمارے ہاں کبھی کبھی زرد موت کی وَبا آتی ہے جس سے ہزاروں انسان مر جاتے ہیں اور اُنھیں زمین میں دفن کرنے کی بجائے نذرِ آتش کیا جاتا ہے۔"

میں یہ سُن کر کچھ خوفزدہ سا ہو گیا۔ اگر یہاں کوئی وَبا پھُوٹی ہُوئی ہے تو میں بھی اُس کا شکار ہو سکتا ہُوں۔ میں کچھ دیر تک سوچتا رہا کہ اب کیا کیا جائے۔ پھر میں نے آگے بڑھنے کا فیصلہ کر لیا اور ہم نے اپنا سفر دوبارہ شروع کر دیا۔

"یہ زرد موت کی وبا ہے کیا بلا؟" میں نے پُوچھا۔

"میں نے تو کبھی نہیں دیکھی۔" وہ بولی۔ "بڑے کہتے ہیں کہ ہر جمشیدی کو زندگی میں ایک بار اس وَبا کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔ پہلے اِس مرض کا شکار شدید سر درد میں مُبتلا ہوتا ہے، پھر اس کی بغلوں میں گلٹیاں سی پیدا ہو جاتی ہیں، ناک اور کانوں سے خُون رِسنے لگتا ہے، اُس کا رنگ پیلا پڑ جاتا ہے اور آخر میں وہ ہنستے ہنستے مر جاتا ہے۔ کچھ لوگ اسے قہقہوں والی موت کی وبا بھی کہتے ہیں۔"

"قہقہوں والی موت؟" میں نے تعجب سے دُہرایا۔

"ہاں۔ جب مریض کا آخری وقت آتا ہے تو وہ قہقہے لگانے لگتا ہے۔ یہ قہقہے دراصل موت کی چاپ ہوتے ہیں اور سب سمجھ جاتے ہیں کہ اب وہ نہیں بچے گا۔"

"مریض کتنی دیر تک قہقہے لگاتا ہے؟"

"کبھی گھنٹوں اور کبھی چند منٹ۔۔ مگر میں نے اپنی آنکھوں سے کوئی ایسا مریض کبھی نہیں دیکھا۔"

اس کے بعد میں نے دیپا سے مزید کوئی سوال نہ کیا۔ ہم چپ چاپ آگے بڑھتے رہے اور اُس مقام کے قریب تر آ گئے جہاں مُردے جلائے جا رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ اگر جمشیدی ایسی خطرناک وبا کا شکار ہیں تو یقیناً ان میں افراتفری پھیلی ہوئی ہو گی۔ وہ خوفزدہ ہوں گے اور ایسے حالات میں انھیں زیر کرنا مشکل نہیں ہو گا۔

کچھ دیر بعد ہم ایک بستی کے قریب پہنچ گئے۔ جس کے مکانات مٹی اور پتھروں سے بنے ہوئے تھے۔ کچھ مکانوں کے دروازوں پر زرد نشانات پڑے ہوئے تھے۔ میں نے اُن کے بارے میں دیپا سے کوئی سوال نہیں کیا۔

بستی کے بعد مجھے پہلا شمشان دکھائی دیا۔ یہ تقریباً بیس فٹ گہرا اور سو فٹ مربع نما گڑھا تھا جس میں مردوں، عورتوں اور بچوں کی لاشوں کے ڈھیر لگے ہُوئے تھے۔

"وہ دیکھو۔ ہمارے شہر کی عمارتیں نظر آ رہی ہیں۔"

میں نے ادھر نگاہ ڈالی تو واقعی شہر کی عمارتیں دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی مجھے چھکڑوں کی ایک قطار بھی آتی دکھائی دی۔ ان چھکڑوں میں زرد موت کے شکار ہونے والے مُردے بھرے ہوئے تھے۔

ہم تربوزی سیبوں والے درختوں کے ایک جُھنڈ میں چھُپ کر یہ دلخراش منظر دیکھنے لگے۔ مُردے جلانے والے چھکڑوں سے لاشیں گڑھے میں پھینکتے، اُن پر کوئی تیل چھڑکتے اور آگ لگا دیتے۔ انھیں اتنی فرصت ہی نہیں تھی کہ آنکھ اُٹھا کر بھی ادھر اُدھر دیکھتے۔

میں نے مُردے لانے اور جلانے والوں کو غور سے دیکھا، وہ زرد رنگ کپڑے پہنے ہُوئے تھے۔ اُن کے سینے اور بازو کھُلے ہُوئے تھے لیکن اُن کے چہرے زرد رنگ کے لمبے لمبے نقابوں میں چھُپے ہُوئے تھے جن کے دو سوراخوں سے وہ دیکھ سکتے تھے۔ انھیں دیکھ کر میرے ذہن میں ایک ترکیب آ گئی۔۔۔ مگر دیپا نے میرا بازو پکڑ لیا۔

"آؤ سرفروش۔ میں یہ منظر نہیں دیکھ سکتی۔ یہاں قریب ہی میرے کچھ عزیز رہتے ہیں۔ وہاں ہمیں کھانا اور لباس مل جائے گا۔ چلو۔"

ہم چھپتے چھپاتے شہر کے باہر ایک ایسے مکان کے دروازے پر پہنچ گئے جو ایک پہاڑی پر انھی تربوزی سیبوں والے درختوں کے ایک کنج میں بنا ہُوا تھا۔ یہاں دیپا نے مجھے دو بوڑھی عورتوں اور ایک لحیم و شحیم آدمی سے متعارف کروایا۔ وہ عورتیں دیپا کی پھوپیاں تھیں اور موٹا آدمی غالباً اُن کا محبوب یا شوہر تھا۔ اس کا نام موک تھا۔ اُن لوگوں نے ہماری خاطر مدارت کی اور ہمیں صاف ستھرے لباس بھی دیے جو سُوت سے کھڈیوں پر بنے ہوئے کپڑے کے تھے۔

دیپا اپنی پھوپیوں کے ساتھ دُوسرے کمرے میں چلی گئی اور موک مشروب کا ایک لوٹا لے کر میرے پاس آ بیٹھا۔ یہ مشروب انھی تربوزی سیبوں سے بنایا گیا تھا اور بہت تیز و تلخ تھا۔ چونکہ مجھے موک سے معلومات حاصل کرنا تھیں، اس لیے میں اُس کی ہاں میں ہاں ملانے اور پینے لگا۔

"بوڑھی ملکہ جھیل میں تیرتے چبوترے پر اپنے خیمے میں دم توڑ رہی ہے اور سازندے بار بار وہی ایک ہی دُھن بجائے جا رہے ہیں جو بوڑھی ملکہ کو بہت مرغوب ہے۔ جب بوڑھی ملکہ مر جائے گی تو ننھی شہزادی دلآرا تاج و تخت سنبھالے گی۔۔۔ مگر یہ تو اسی وقت ممکن ہے جب دلآرا زندہ رہ جائے۔۔۔ اس لیے کہ بزرگِ دانشمند اور کمان داروں کے درمیان اقتدار کے حصُول کی چپقلش جاری ہے۔"

موک پیالے بھر بھر کر خود پیتا، مجھے پلاتا اور مسلسل بولتا جا رہا تھا۔ اگرچہ مجھے سخت متلی محسوس ہو رہی تھی۔۔۔ مگر مجھے مُلک، خاص طور پر راجدھانی میں رُونما ہونے والے تازہ ترین واقعات کی معلومات حاصل ہو رہی تھی۔ اس لیے میں نے دیپا کے اشاروں پر بھی کوئی توجہ نہیں دی جو بار بار دُوسرے کمرے سے سر نکال کر مجھے اپنے پاس بُلا رہی تھی۔

میں نے موک کی باتوں سے اندازہ لگایا کہ یہاں بھی ہمارے دَور اور دُنیا کی طرح حصولِ اقتدار کے لیے سازشوں اور مکر و فریب سے کام لیا جا رہا ہے۔

"مجھے بزرگِ دانشمند کے بارے میں کچھ بتاؤ کہ وہ کون ہے؟ کیا وہ وزیر ہے یا ملکہ کا مشیرِ خاص ہے؟" میں نے پُوچھا۔

"وہ بڑا عیّار اور مکّار آدمی ہے، پردیسی! جتنا میں فربہ ہوں وہ اتنا ہی دُبلا ہے، اس کی کھوپڑی پر ایک بال بھی نہیں مگر اس میں بھیجا بہت بڑا ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ ساحرانہ قوتیں بھی رکھتا ہے۔ وہ بوڑھی ملکہ کا وزیرِ اعلا، دستِ راست اور مشیرِ خاص ہے بلکہ، ملکہ تو برائے نام ہے ورنہ حکومت وہی کرتا ہے۔ اب اگر ننھی شہزادی اُس کے قابو میں نہ رہی تو وہ اُسے قتل کروا دے گا۔"

اتنا کہہ کر موک رُکا، اُس نے پیالہ خالی کر کے دوبارہ بھرا اور کہنے لگا۔ "مجھے ننھی شہزادی پر ترس آتا ہے میرے دوست! وہ بہت پیاری اور بے حد حسین ہے۔"

میں نے ایک کھُلے ہُوئے دریچے سے باہر دیکھا۔

ہر طرف اندھیرا چھا گیا تھا اور چاند ابھی طلوع نہیں ہُوا تھا۔

فضا میں مُردے جلنے کی ہلکی ہلکی بساند رچی ہُوئی تھی۔

میں نے موک کی باتوں سے اندازہ لگایا تھا کہ کچھ کر گزرنے کے لیے اس سے زیادہ موزوں وقت پھر نہیں آسکتا۔ موک نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ بزرگِ دانشمند کی اپنی خصوصی سپاہ بھی ہے اور لاتعداد خفیہ مخبر بھی جو اُسے پل پل کی خبریں بہم پہنچایا کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اُسے میرے یہاں آنے کی خبر بھی مل چکی ہو۔

موک مسلسل پیتا اور بولتا رہا مگر میں نے معذرت کر لی۔

اس دوران دیپا بھی شاید مایوس ہو کر سو گئی تھی اور اس کی پھوپیاں تو شام سے پھر دِکھائی ہی نہیں دی تھیں۔ بالآخر موک نے بڑے زور سے ایک ڈکار لی اور اُسی چوبی چوکی پر لیٹ گیا جس پر ہم بیٹھے ہُوئے تھے۔ میں اسی وقت کا منتظر تھا۔ جلدی سے اُٹھ کر گھر سے نکل گیا۔ حلق میں اُنگلی ڈال کر قے کی اور پھر اندر آ کر اُس کمرے میں چلا گیا جس کے دروازے سے دیپا اشارے کر رہی تھی۔

وہ اُس کمرے میں تنہا ایک چٹائی پر پڑی تھی۔ میری راہ دیکھتے دیکھتے اُسے نیند آ گئی تھی۔ میں بڑی آہستگی سے اس کے قریب بیٹھ گیا۔

چراغ کی ٹمٹماتی لَو میں وہ مجھے کسی بچّے کی طرح معصوم نظر آئی۔ ویسے بھی وہ بمشکل بارہ تیرہ سال کی تھی اور اس نے بچپن کی دہلیز ابھی ابھی پار کر کے جوانی میں قدم رکھا تھا۔ پہلے تو میں نے اُسے جگانا چاہا مگر یہ سوچ کر رُک گیا کہ میں جس مہم پر جانے والا ہُوں، وہ اس سے بے خبر اور لاتعلق ہی رہے تو بہتر ہے۔ اگر میرا منصوبہ ناکام ہو گیا تو وہ مجھ سے لاتعلق ہونے کی بنا پر محفوظ و مامون رہے گی بصورتِ دیگر اُسے میری وجہ سے سزا بھگتنا پڑ جائے گی۔۔۔ اور اگر میں اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو خود ہی اُسے ڈھونڈ لوں گا یا اُسے اپنے پاس بُلوا لوں گا۔

یہ سوچ کر میں نے اُس پر پیار بھری ایک الوداعی نگاہ ڈالی اور کمرے سے باہر آ گیا۔ موک چوکی پر لیٹا بڑے زور سے خراٹے لے رہا تھا۔ میں دبے قدموں چلتا ہُوا گھر سے نکل گیا۔

چاند ابھی طلوع ہو رہا تھا۔ میں اُس کی مدھم روشنی میں پہاڑی سے اُترا اور اُسی راستے پر چل پڑا، جدھر سے دیپا کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ دُور سے شمشان کے شعلے بھی میری رہبری کر رہے تھے۔ میں جلد ہی شمشان کے قریب پہنچ گیا اور تقریباً سو گز کے فاصلے پر چھپ کر کھڑا ہو گیا اور اُسی لمحے میں نے اپنی زندگی کا وہ حیرت انگیز اور سنسنی خیز منظر دیکھا جس سے میری رُوح تک کانپ گئی۔

اس سلسلے وار
کہانی کے باقی
واقعات
آئندہ شمارے میں
ملاحظہ کیجیے!

ش. م جمیل

اُس قاتل کی گرفتاری پر بے شمار زندگیوں کا انحصار تھا۔ فرض کی راہوں پر بھٹکنے والے ایک فرض شناس پولیس افسر کا قصّہ

سہ پہر کے وقت، آگے کہیں سے بادلوں کی سی گرج سنائی دی اور دریائے بورنیو کا پانی تیز دھارے میں تبدیل ہونے لگا۔ پولیس لانچ کئی گھنٹوں سے بہاؤ کے مخالف رُخ چل رہی تھی اور اب پانی کی مزاحمت میں زبردست اضافہ ہو گیا تھا۔ اس لیے کیپٹن جونی کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنا سفر جاری نہیں رکھ سکیں گے لیکن کچھ ہی دیر بعد دریا گھوم گیا تو ایک خستہ حال گودی دکھائی دینے لگی جس پر نگاہ پڑتے ہی جونی کے حلق سے اطمینان کی ایک طویل سانس نکل گئی۔ بالآخر وہ منزلِ مقصود پر پہنچ ہی گئے تھے۔

ڈائیک نامی، لانچ چلانے والے نے بڑی ہوشیاری اور مہارت سے لانچ حفاظتی بند تک پہنچا کر روک دی اور اُچھل کر اپنے کیبن نما حصے سے باہر آ گیا۔

"تم یہیں ٹھہرو۔" کیپٹن جونی نے کہا اور حفاظتی بند کے تختوں پر پہنچ گیا۔

وہ چھوٹے قد لیکن مضبوط جسم کا ایک بھورا سا آدمی تھا، اس کے جسم پر بے داغ سفید کپڑے تھے اور اس کے سفید بوٹوں کی تازہ پالش چمک رہی تھی۔ کچھ دور بانسوں کا ایک جھنڈ تھا۔ کیپٹن تیزی سے اس طرف چلنے لگا۔

قریب پہنچ کر، اُسے سبز پتوں سے، گھاس پھوس کی چھت والی ایک ایسی عمارت دکھائی دی جس کی پیشانی پر ایک چوبی صلیب لگی ہوئی تھی۔ اچانک اس عمارت کے برآمدے کا دروازہ کھلا اور ایک دراز قامت شخص باہر آ گیا۔ اس کی کھوپڑی بالوں سے بے نیاز تھی۔ وہ، کیپٹن جونی کی پذیرائی کے لیے آگے بڑھا اور بولا۔ "ابدی رحم و کرم کے گھر آپ کو خوش آمدید کہا جاتا ہے۔ میرا نام پارسن ہے۔"

جونی نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے اپنا تعارف کرایا۔ "میں کیپٹن جونی ہوں اور میرا تعلق ملائشیا پولیس سے ہے۔ کیا آپ نے کوئی ایسا شخص تو نہیں دیکھا جو گزشتہ چند گھنٹوں کے دوران یہاں سے گزر کر کہیں آگے جا رہا ہو؟"

پارسن نے سنہرے فریم والا چشمہ، ٹھیک سے ناک پر بٹھاتے ہوئے جواب دیا۔ "تین آدمی ادھر آئے تھے اور وہ اس وقت بھی اندر موجود ہیں۔ کیا کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے؟"

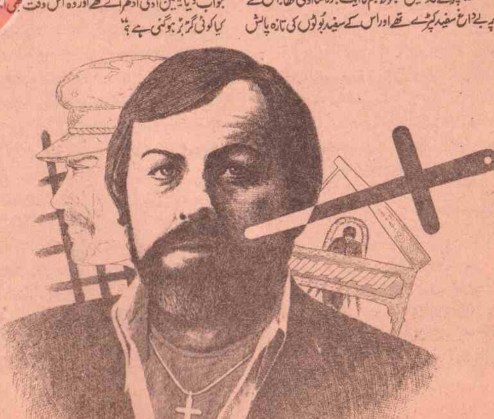

جونی نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں اُن تینوں سے ملنا چاہتا ہوں۔"

پادری کے ماتھے پر جھرّیاں تیزی سے سمٹ گئیں۔ "خدا کرے کہ کوئی مصیبت نازل نہ ہو۔ ایک طویل عرصے بعد مجھے کسی کی رفاقت میسّر آئی ہے۔" یہ کہہ کر وہ برآمدے میں چلتا ہوا اُن سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا جو ایک بڑے سے کمرے تک جاتی تھیں۔

جونی بھی اُس کے پیچھے چل دیا اور اس دوران میں دانستہ طور پر اُس کا دایاں ہاتھ اپنے کوٹ کی اس جیب میں رینگ گیا جس میں کسی وزنی چیز کی موجودگی کا احساس ہوتا تھا۔

اُس کمرے میں تین آدمی تھے۔ اُن میں سے دو، کرسیوں پر نیم دراز تھے جبکہ تیسرا ایک میز پر بیٹھا ہوا تھا۔ کرسیوں پر براجمان دونوں آدمیوں نے اپنے نام بتائے۔ ان میں سے ایک کیلر تھا اور دوسرے کا نام لائمین تھا۔ کیلر ایک جسیم آدمی تھا اور اس کے سر پر گھنے بالوں کا ٹوکرا ایک کھیت محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی بھویں بھی گھنی اور بھاری تھیں اور دہانے کے بائیں کونے پر زخم کا ایک خفیف سا نشان تھا۔ لائمین بڑی بڑی مونچھوں والا آدمی تھا جس کی رنگت دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے دھوپ کی تیزی نے اُسے جلا ڈالا ہو۔

"ہم دریائے بوہ کے قصبے کی طرف جا رہے ہیں۔" کیلر نے کہا... "بسٹرفی گارڈنز سے ہمارا حال ہی میں معاہدہ ہوا ہے اور ہم اُن کے لیے تین زندہ چیتے فراہم کرنے جا رہے ہیں۔ اگر دریا طغیانی پر نہ ہوتا تو ہمیں یہاں ہاتھ پر ہاتھ دھرے ہرگز نہ بیٹھنا پڑتا۔" آخر میں اُس کا لہجہ ناخوش گوار ہو گیا تھا۔

تیسرا آدمی آسٹریلیا کا باشندہ تھا۔ گرارڈ۔

اس نے جونی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "ملائشیا پولیس۔ ہے نا؟ تمھیں یہاں دیکھ کر عجیب سا احساس ہو رہا ہے۔ میرا تو خیال تھا کہ تم لوگ اپنے دفتر سے قدم بھی باہر رکھنے کے عادی نہیں ہو۔"

"عام حالات میں ایسا ہی ہوتا ہے۔" جونی نے جواب دیا۔ "لیکن کبھی کبھی ایسے واقعات بھی ہو جاتے ہیں، جن پر فوج کی بجائے ہمیں ہی کام کرنا پڑتا ہے۔ کیا تم بھی شکاری ہو؟"

گرارڈ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں... میں ایک مصنف ہوں اور آج کل قدیم تہذیب پر ایک کتاب میں مصروف ہوں۔"

اس کے بعد کمرے میں گہرا سکوت چھا گیا۔ جونی نے سرسری نگاہ سے، کمرے میں ادھر اُدھر دیکھنا شروع کر دیا۔ مخالف سمت میں واقع دیوار کے سامنے تختوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ جب مقامی لوگ یہاں عبادت کے لیے آتے تھے تو انھیں اُن کی نشست کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ جونی کی نگاہ کمرے کے کونے میں موجود ایک چیز پر رک گئی۔ پادری نے اُس کی آنکھوں میں تجسس کی جھلک دیکھی تو خاموش نہ رہ سکا۔

"اس دور افتادہ مقام پر یہ پیانو دیکھ کر تمھیں حیرت ہو رہی ہے، کیپٹن! لیکن میں اسے چھ سال قبل شہر سے اپنے ساتھ ہی لایا تھا... ان دنوں دریا کا پانی اس قدر باغی نہیں ہوتا تھا، اس لیے ایک لانچ والا اسے یہاں تک لانے کے لیے آمادہ ہو گیا تھا۔"

جونی آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور پیانو کے سامنے بیٹھ گیا۔

اس کی انگلیاں پیانو پر تھرکنے لگیں... پھر اچانک ہی اس نے دونوں ہاتھ پیانو سے اُٹھا لیے اور کمرے میں موجود آدمیوں کی طرف پلٹ گیا۔ پیانو کی آواز ختم ہوتے ہی سنّاٹا چھا گیا تھا جس میں جونی کی آواز گونجتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی۔

"میرا خیال ہے، تم لوگ میری یہاں آمد پر حیران ہو رہے ہو۔ میں بتاتا ہوں کہ میری آمد کا مقصد کیا ہے۔ حضرات! کالیوس کے سلطان کا بیٹا قتل کر دیا گیا ہے۔"

اس ڈرامائی انداز پر اگر جونی کو یہ توقع تھی کہ کمرے میں موجود چاروں افراد بُری طرح اُچھل پڑیں گے یا اُن کے حلق سے عجیب عجیب سی آوازیں نکلیں گی... تو اُسے اس سلسلے میں شدید مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ کیلر اور لائمین محض ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر رہ گئے تھے جبکہ گرارڈ نے اپنی سگریٹ نہایت آہستگی سے ایش ٹرے میں مسل دی تھی۔

"قتل کر دیا گیا ہے!" کافی دیر بعد پارسن نے دُہرایا۔ "لیکن یہ ناممکن سی بات ہے۔ تنگرانگ کا محل اگرچہ لکڑی کا بنا ہوا ہے لیکن وہ کسی قلعے کی طرح مضبوط ہے۔"

جونی نے تائید میں سر ہلا دیا۔ "جس کسی نے بھی یہ جرم کیا ہے، وہ بے حد مضبوط اعصاب کا مالک ہے۔ اُس نے تنگرانگ محل سے وہ پانچ زمرد چرائے، جنھیں 'کلیدِ کائی' کی حیثیت حاصل ہے۔ ان متبرک پتھروں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ جنت کی چابیوں سے کم نہیں۔ چور یہ زمرد چرا کر واپس جا رہا تھا کہ راستے میں اچانک سلطان کے بیٹے سے آمنا سامنا ہو گیا۔ چور نے اُسے قتل کر دیا اور محل سے فرار ہو گیا۔"

کمرے میں ایک بار پھر سکوت طاری ہو گیا۔

"ہم جانتے ہیں کہ یہ کسی ایسے شخص کی حرکت ہے جو یورپ کا باشندہ ہے۔" قدرے توقف کے بعد جونی دوبارہ بولنے لگا۔ "یہ بات ہمیں محل کے باغ میں ملنے والے جوتے کے ایک نشان سے معلوم ہوئی ہے۔ سلطان کو ہماری حکومت سے انصاف کی توقع ہے۔ اگر قاتل

گرفتار نہ ہُوا تو بغاوت کا اندیشہ ہے جو مولو جیسے دُور افتادہ علاقے تک بھی پھیل سکتی ہے۔"

وہ خاموش ہُوا تو کسی نے کوئی تبصرہ نہ کیا اور سناٹے نے اپنے بال و پر پھیلانے شروع کر دیے۔

جونی نے باری باری ان سب کی طرف دیکھا اور مُنہ پر ہاتھ رکھ کر کھانسا۔ یہ زبردستی کی کھانسی تھی... پھر اُس نے تحکمانہ لہجے میں کہا: "مجھے آپ سب لوگوں کی انگلیوں کے نشانات درکار ہیں۔ میرا خیال ہے، کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

دس منٹ بعد جونی نے اپنے کوٹ کی اندرُونی جیب سے ایک محدب شیشہ نکالا۔ اس کے سامنے کاغذ کے تین ورق تھے جن پر فنگر پرنٹ اُتارے گئے تھے۔ وہ کلاں نُما سے ان اوراق پر جُھک کر انگلیوں کے نشانات کا جائزہ لینے لگا۔ اس کی جیب میں ایک فوٹوگراف بھی تھا۔ اس فوٹوگراف میں قاتل کی انگلیوں کے نشانات نمایاں تھے۔ اُنھیں سُلطان کی تجوری سے حاصل کیا گیا تھا۔ جونی ان نشانات کا دیر تک جائزہ لیتا رہا... پھر اس نے منفی انداز میں سر ہلاتے ہوئے اعلان کیا: "نہیں... ان میں سے کوئی بھی، قاتل کے فنگر پرنٹس کے مطابق نہیں۔"

جونی حیران تھا۔ اس نے اب تک کئی قصبوں میں رُک کر لوگوں سے باز پرس کی تھی اور اسے ہر جگہ سے ایک ہی خاص بات معلوم ہُوئی تھی کہ یورپ کے تین باشندے وہاں سے گزرے ہیں۔ بالآخر وہ مشن کی اس عمارت میں اُن تینوں تک پہنچ گیا تھا لیکن اُن میں سے کسی کی انگلیوں کے نشانات . . . . . قاتل کے فنگر پرنٹس سے مماثل نہیں تھے۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ سُلطان کی تجوری پر پائے جانے والے نشانات کسی اور کے تو نہیں تھے؟... لیکن سُلطان نے بڑے وثوق سے بتایا تھا کہ تجوری کو کئی ماہ سے نہیں چھُوا گیا کہیں ایسا تو نہیں کہ قاتل مولو کی حدود سے نکل کر بارٹیو چلا گیا ہو؟ ایسا ہو تو سکتا تھا لیکن یہ پُوری طرح ممکن نہیں تھا۔ اتنا دشوار گزار علاقہ بے سروسامانی میں اور تنہا طے کرنا عملی طور پر ایک ناممکن سی بات تھی۔

کیپٹن جونی ایک طویل سانس لے کر اُٹھ کھڑا ہُوا۔

اس نے دروازہ کھولا اور باہر آ کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا... پھر وہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہُوا دریا کے اُس حصّے کی طرف بڑھ گیا جہاں پولیس لانچ اس کی منتظر کھڑی تھی۔ پادری پارسن نے اسے بتایا تھا کہ مشن کی عمارت کے عقب میں ایک جھونپڑی ہے جہاں اس کا لانچ ڈرائیور قیام کر سکتا ہے۔ لانچ کے پاس پہنچ کر جونی نے اپنا اکلوتا بیگ اُٹھا لیا اور ڈائیک سے کہا کہ اُس کے ساتھ چلے۔

ڈائیک کو جھونپڑی میں چھوڑ کر وہ ایک بار پھر مشن کی عمارت کی طرف بڑھ گیا۔ ابھی اُس نے آدھا راستہ ہی طے کیا تھا کہ اسے ٹھٹک جانا پڑا۔ اس کا پاؤں کسی گرم سی چیز سے ٹکرا گیا تھا۔ اس نے کینوس کے بُوٹ پہن رکھے تھے جن کے پتلے تلووں سے حرارت اچانک ہی اس کے پیروں تک پہنچنے لگی تھی۔

وہ جُھک کر دیکھنے لگا تو اس کے ہونٹ سیٹی بجانے کے انداز میں سُکڑ گئے۔ تقریباً تین گھنٹے قبل اس جگہ کسی نے آگ جلائی تھی۔ اب وہاں راکھ کا ڈھیر تھا لیکن اس میں سُرخ سُرخ انگارے اب بھی موجُود تھے تاہم ان سے زیادہ دلچسپی کی اشیا وہ بھُورے بھُورے ٹکڑے تھے جنھیں آگ پُوری طرح جلانے میں ناکام رہی تھی۔ یقیناً یہ چمڑے کے ٹکڑے تھے۔

"یقیناً میرا یہ خیال غلط نہیں ہو سکتا۔" وہ زیرِ لب بولا۔ "اگر کسی کے جُوتے پُرانے یا ناکارہ ہو جاتے ہیں تو وہ اُنھیں جلا کر ہرگز ضائع نہیں کرتا۔ اُنھیں پھینک دیا جاتا ہے یا پھر کسی غریب مقامی کے حوالے کر کے اُس کی دُعائیں لی جاتی ہیں۔"

□

ایک گھنٹے بعد شام کے کھانے سے فارغ ہو کر جونی اپنے کمرے میں لیٹا سوچ رہا تھا۔ اس کی انگلیوں میں دبے ہُوئے سگار سے دھوئیں کا مرغولہ اُٹھ کر فضا میں گویا معلق ہو گیا تھا۔ اس کے کانوں سے پیانو کی آواز ٹکرا رہی تھی جسے یقیناً پادری ہی بجا رہا تھا جونی نے ایک طویل عرصے تک پیانو کی مشق کی تھی اور اُسے تمام سُرگم اچھی طرح یاد تھے۔ تنہائی میں وہ ان سُروں کو ذہن ہی ذہن میں بجا کر بھی محظوظ ہو لیا کرتا تھا۔

کیلر، لائیسن اور گرارڈ ایک میز کے گرد بیٹھے تھے اور تاش کا کھیل جاری تھا۔ کھیل کے آغاز پر کیلر نے کچھ ناک بھُوں چڑھائی تھی کیونکہ وہ صرف پوکر پسند کرتا تھا لیکن جب کھیل ایک بار شروع ہو گیا تو وہ پُورے جوش و خروش کے ساتھ داؤ لگانے میں مصروف ہو گیا۔

جونی بھی اُسی کمرے میں آ گیا۔

وہ ایک طرف نیم دراز ہو کر ان کا کھیل دیکھنے لگا۔

اس نے دیکھا کہ لائیسن بھی کچھ زیادہ اچھا کھلاڑی نہیں ہے جبکہ گرارڈ کے انداز ہی سے مہارت ٹپکتی تھی۔ وہ بار بار جیت رہا تھا اور اس کی ہر چال کامیاب ہو رہی تھی۔ کھیل طویل ہوتا چلا گیا حتیٰ کہ گرارڈ اُٹھا اور باہر برآمدے میں نکل گیا۔ جونی نے چند لمحوں کا وقفہ دیا، پھر وہ بھی اُٹھ کر باہر آ گیا۔ جب وہ اس کمرے سے کچھ دُور پہنچے تو جونی نے عقب سے اس کا کندھا تھام لیا۔

"ہاں اب بتاؤ۔ تم اس کے بارے میں کیا کہتے ہو؟" جونی غرّایا۔

آسٹریلین اس کی گرفت سے چونک کر پلٹا تو یُوں ساکت ہو گیا جیسے وہ ایک پتھر کا ہو گیا ہو۔ "تت... تمھارا... کیا مطلب ہے؟" وہ ہکلا کر رہ گیا۔

"میرا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی شخص محض پتنگے پکڑنے کے لیے اتنی دُور نہیں آ سکتا۔ بتاؤ، تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

گرارڈ کے ہونٹوں پر کپکپاہٹ پھیل گئی۔

"مم... مَیں نے تمھیں سیدھے سادے انداز میں بتا دیا تھا۔ مَیں تاریخ مَوالید کا ماہر ہُوں۔ مَیں یہاں ایک نیلگوں تتلی کی ایک خاص قسم کی تلاش میں آیا ہُوں۔ تمھیں جس شخص کی تلاش ہے، وہ کیلر ہے۔"

جونی کی پیشانی سلوٹ آمیز ہو گئی۔

"کیلر... لائیسن اس کا رفیقِ کار ہے۔" گرارڈ نے وضاحت کی۔ "وہ مجھ سے پہلے یہاں آئے تھے۔ راستے میں بھی اُنھوں نے انھی گاؤں میں قیام کیا جہاں میں رُکتا ہُوا یہاں تک پہنچا ہُوں۔ ان کے انداز میں وہ عجلت ہے جو عموماً شکاریوں سے متوقع نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ کیلر کے ایک کالر پر خُون کا دھبّہ ہے اور وہاں پر کالر میں خراش جیسا شگاف بھی موجُود ہے۔ غالباً یہ چاقو کے وار سے پیدا ہُوا ہوگا۔"

جونی نے نچلا لب دانتوں میں دبا لیا اور سوچ میں ڈُوب گیا۔ "ٹھیک ہے..." اس نے کچھ دیر بعد کہا: "مَیں دیکھوں گا لیکن یاد رکھو، اگر تمھاری بات جھُوٹ نکلی تو..." دھمکی آمیز جملہ ادھورا ہی چھوڑ کر وہ واپس چل دیا۔

مرکزی کمرے میں آ کر جونی نے دیکھا کہ دونوں شکاری اپنے اپنے کمرے میں جا چکے تھے۔ گرارڈ نے ایک سگریٹ سُلگائی اور اس کا کش لینے کے بعد دُھواں اُگلتے ہُوئے ایک طویل جماہی لی۔ کچھ دیر بعد وہ بھی اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اب اس وسیع و عریض کمرے میں جونی پادری پارسن کے ساتھ بیٹھا رہ گیا تھا۔ پادری کھجور کے پتّوں سے بنا ہُوا ایک پنکھا مرمت کرنے میں مصروف تھا۔

"بہت گرمی ہے۔" جونی نے اپنے کالر کے اندرُونی رُخ اُنگلی گھُماتے ہُوئے کہا۔

پادری نے جواباً اثبات میں سر ہلا دیا۔ پنکھا مرمت کر کے اُس نے میز پر رکھ دیا اور کہنیاں ٹاپ پر جما کر جونی کی طرف جُھک گیا۔

"کیپٹن جونی!" اس نے تشویش آمیز لہجے میں کہا۔ "تم نے کہا تھا کہ سُلطان کے بیٹے کا قاتل نہ پکڑا گیا تو شدید سماجی قسم کا مسئلہ لاحق ہو جائے گا۔ کیا یہ بات واقعی دُرست ہے؟"

جونی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "بلاشبہ یہی ہوگا۔ کیوں؟"

"بات دراصل یہ ہے..." پادری نے بولتے بولتے رُک کر اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرا۔ "مَیں اس علاقے میں زیادہ مقبول شخصیت نہیں ہُوں۔ ایک آدھ گاؤں کے باشندے تو میری تبلیغ پر یقین کرتے ہیں جبکہ دُوسرے گاؤں کے لوگوں کا خیال ہے کہ مَیں کوئی جادُوگر ہُوں۔ ایسی حالت میں بغاوت میری تمام محنت پر بھی پانی پھیر سکتی ہے۔ مَیں ایک مبلغ ہُوں اور ایسے لوگوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرنا چاہتا جنھوں نے اس مقدس عمارت کی چھت کے نیچے پناہ لے رکھی ہو۔"

جونی کی ریڑھ کی ہڈی سنسنانے لگی۔

"دراصل..." پارسن نے قدرے تذبذب سے کہا: "مجھے ایک چیز ملی ہے، جسے مَیں تمھارے علم میں لائے بغیر نہیں رہ سکتا۔" اُس نے اپنے لبادے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کاغذ کا ایک پُرزہ نکالا اور جونی کی طرف بڑھا دیا۔ "یہ کاغذ گرارڈ کی جیب سے گر گیا تھا۔"

جونی نے کاغذ کا جائزہ لیا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگی تھیں۔ اس کاغذ پر کسی عمارت کا اندرونی نقشہ بنا ہُوا تھا اور اس کے نیچے یہ عبارت تھی۔ "کیبنٹ دائیں طرف کے پہلے کمرے میں ہے، بالائی منزل پر... جیل ٹون میں پانچ تاریخ کو ملاقات ہوگی۔" اسے پڑھ کر جونی نے اپنی جیب میں ٹھونس لیا۔ "بہت بہت شکریہ، فادر۔" اُس نے پُرسکون لہجے میں کہا اور اُٹھ کھڑا ہُوا۔

⊕

صُبح ہوتے ہی ڈھول کی آوازوں سے ماحول کانپ اُٹھا۔

ایک گھنٹے کے اندر اندر یہ آوازیں اتنی شدّت اختیار کر گئیں کہ مشن کی عمارت کی دیواریں تک لرزنے لگیں۔ دروازے بجنے لگے اور کھڑکیاں کانپ کانپ گئیں۔

"موت... موت کی رسم منائی جا رہی ہے۔" کیپٹن جونی نے کہا۔

"کس کی موت؟"

"سُلطان کے بیٹے کی..." جونی کا لہجہ بھی غم میں ڈُوب گیا۔

دوپہر تک یہ خوفناک آوازیں آتی رہیں اور پھر اچانک ہی سناٹا چھا گیا... لیکن پھر بھی دیر تک ان کے کان بجتے رہے۔ یُوں لگ رہا تھا جیسے ڈھول کی یہ پُرشور آوازیں فضا میں رچ بس گئی ہوں۔

جب کچھ سکون ہُوا تو گرارڈ اپنے کمرے سے باہر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لمبی چھڑی تھی جس کے کنارے ایک گول جال بندھا ہُوا تھا۔ یہ جال پتنگے پکڑنے کے کام آتا تھا۔ اس کے کندھے پر تنکوں کی بنی ہُوئی ایک ٹوکری بھی تھی۔

"اگر مَیں چند تتلیاں پکڑتے چلا جاؤں تو کوئی حرج تو نہیں؟" اس نے دھیمی آواز میں سوال کیا۔

"نہیں..." جونی نے اپنا جبڑا سہلاتے ہُوئے جواب دیا۔ "لیکن اگر تمھیں کوئی اعتراض نہ ہو تو مَیں بھی تمھارے ساتھ چلنا چاہتا ہُوں۔"

گرارڈ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

دونوں مشن کی عمارت سے نکلے اور جنگل میں چلے گئے۔ گرارڈ آگے آگے تھا۔ وہ جھاڑیوں میں بغیر کسی رکاوٹ کے راستہ بناتا چلا جا رہا تھا۔ جونی اس کے پیچھے چلتا رہا۔ ابھی وہ زیادہ دُور نہیں گئے تھے کہ جونی پسینے میں نہا گیا۔ وہ تقریباً ایک میل گئے ہوں گے کہ یکایک آسٹریلین پُرجوش دکھائی دینے لگا۔

ایک بڑی سی تتلی آگے آگے اُڑتی جا رہی تھی۔

اچانک ہی تتلی نے ایک غوطہ لگایا اور جھاڑیوں میں جا کر غائب ہو گئی۔

"وہی ہے... وہی جس کی تلاش میں میں مارا مارا پھر رہا ہوں۔" گرارڈ نے پُرجوش انداز میں کہا اور جال اُٹھا کر تیزی سے اُسی سمت میں لپکا جدھر تتلی گئی تھی۔

جونی نے ایک طویل سانس لی اور ایک گرے ہوئے درخت کے تنے پر بیٹھ گیا۔ اس کی سماعت سے جھاڑیاں ٹوٹنے کی آوازیں ٹکرا رہی تھیں۔ گرارڈ تتلی کے پیچھے دوڑتا پھر رہا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ آوازیں دُور ہوتی محسوس ہونے لگیں۔ کیپٹن جس جگہ بیٹھا تھا، وہاں بے پناہ گرمی تھی۔ سورج کی جھلسا دینے والی کرنیں براہِ راست اُس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ فضا میں کیڑے مکوڑے پرواز کر رہے تھے اور ان کی بھنبھناہٹ بڑی عجیب محسوس ہو رہی تھی۔ جونی کی پلکیں بوجھل ہونے لگیں۔ وہ ٹھنڈی بیئر کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس خیال نے اسے ٹھنڈک پہنچائی تو وہ خُنک ساحلوں اور برفانی چوٹیوں کے بارے میں سوچنے لگا... اور پھر اچانک ہی اُس کی آنکھیں کھُل گئیں۔

اُس کی چھٹی حس بتا رہی تھی کہ کوئی اُسے دیکھ رہا ہے۔

دفعتاً خاموشی کے قالب میں ایک آواز کا خنجر اُتر گیا۔

جونی نے فوراً ہی خود کو زمین پر گرا دیا۔ کوئی چیز سنسناتی ہوئی اُس کے سر سے گزر گئی اور کچھ فاصلے پر ایک درخت کے تنے سے جا ٹکرائی۔

وہ خاموش لیٹا رہا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کی ٹھنڈی ٹھنڈی بوندیں تیرنے لگی تھیں۔ جب کوئی اور آواز نہ سنائی دی تو وہ آہستہ آہستہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ گھنے پتوں کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا لیکن آس پاس کوئی بھی دکھائی نہیں دیا۔ اس کی نگاہ اطراف میں چکراتی ہوئی اُس درخت کے تنے کی طرف چلی گئی جس سے کوئی سنسناتی ہوئی چیز ٹکرائی تھی۔ وہ چونک پڑا۔ درخت کے تنے میں ایک تیر پیوست تھا اور اس کے عقبی سرے پر لگے ہوئے کسی پرندے کے پر دھوپ میں جھلمل جھلمل کر رہے تھے اور ہوا کے نرم و لطیف جھونکوں میں انہیں متحرک دیکھا جا سکتا تھا۔ جونی کا دل سینے میں دھک دھک کر رہا تھا اور اُسے ان دھڑکنوں کی چوٹیں محسوس ہو رہی تھیں۔

وہ درخت کے تنے کی طرف بڑھ گیا۔ دس منٹ بعد گرارڈ نمودار ہوا۔ اس کا چہرہ پسینے میں یوں بھیگا ہوا تھا جیسے وہ کہیں سے مُنہ دھو کر آ رہا ہو۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ قریب آ کر اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "بھاگ گئی... افسوس۔"

جونی نے اثبات میں سر ہلا دیا اور خاموش رہا۔

"بہت ہی نایاب تتلی تھی۔ کاش! ہاتھ آجاتی۔"

جونی نے اس مرتبہ بھی کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ گرارڈ نے اپنی پتلون کے پائنچوں میں چبھے ہوئے جھاڑیوں کے کانٹے نکالے پھر اپنا جال اور ٹوکری سنبھالتا ہوا واپس چل دیا۔ کیپٹن جونی بھی خاموشی سے اس کی تقلید کرنے لگا۔ اس نے آسٹریلین سے اُس تیر کے بارے میں کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا۔

▲

پانچوں آدمی، مرکزی کمرے میں، ایک بڑی سی میز کے گرد بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ کھانے کے بعد پادری پارسن اُٹھا اور پیانو پر جا بیٹھا۔ اس کی انگلیاں پیانو سے کھیلنے لگیں اور کمرے میں موسیقی کی لہریں منتشر ہونے لگیں۔ جونی ٹہلتا ہوا باہر برآمدے میں چلا گیا۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

قاتل کون ہے؟ کیلر...؟ لائیسن یا گرارڈ؟ اگر منطقی لحاظ سے دیکھا جائے تو پادری کو ملنے والے کاغذی پُرزے کے مطابق تتلیوں کے شکاری کو گرفتار کر لینا چاہیے تھا کیونکہ وہ کاغذ اُسی کی جیب سے گرا تھا... لیکن اس میں سب سے بڑی قباحت یہ تھی کہ اُس کی انگلیوں کے نشانات قاتل کی فنگر پرنٹس سے مماثل نہیں تھے۔ دُوسرے مشتبہ شخص کیلر کے کالر پر خراش اور خون کے دھبے کی سینکڑوں وجوہ ہو سکتی تھیں۔ محض اس وجہ سے اُسے قاتل قرار نہیں دیا جا سکتا تھا کہ اس کے کالر پر کسی تیز دھار شے سے خراش پڑ گئی تھی اور وہاں خون کے دھبے اُبھر آئے تھے۔ کیلر کی انگلیوں کے نشانات بھی ان فنگر پرنٹس سے مختلف تھے جنہیں سُلطان کی تجوری پر پایا گیا تھا۔ لائیسن اور کیلر کی غیر معمولی تیز رفتاری کا بھی یہ جواز ممکن تھا کہ انہیں اپنا کام نمٹانے کی جلدی ہو گی۔ بارشیں شروع ہونے کا موسم آنے والا تھا اور مون سون ہواؤں کا بھی آغاز ہونے میں زیادہ دن باقی نہیں تھے اس لیے انہیں جلد بازی کا مظاہرہ کرنا ہی چاہیے تھا۔ یکایک وہ خیالوں سے چونک اُٹھا۔

اس کی نگاہ اچانک ہی ایک جگہ جم کر رہ گئی تھی۔

برآمدے کے کاربائیڈ لیمپ کی سفید روشنی، اسکریننگ سے گزر کر ایک درخت کے تنے پر پڑ رہی تھی جس پر زمین سے پانچ فٹ بلندی پر ایک سفید سا نشان نظر آ رہا تھا۔ یہ تین انچ مربع نشان تھا جیسے کسی نے تیز دھار آرے سے درخت کے تنے کا یہ ٹکڑا کاٹ کر نکال لیا ہو۔

جونی اس حصّے کو غور سے دیکھتا رہا۔ پھر وہ سیڑھیاں اُتر کر باہر آ گیا اور اس درخت کی طرف بڑھنے لگا۔ قریب پہنچ کر اُس پر انکشاف ہوا کہ درخت کے تنے سے نکالے ہوئے مربع ٹکڑے کے درمیان ایک سوراخ ہے جس سے درخت کا رس آہستہ آہستہ اُبل رہا تھا۔

وہ دیر تک کھڑا اسے دیکھتا رہا... پھر واپس برآمدے کی طرف آ گیا۔ اُسی لمحے مشن کی عمارت میں مقیم باقی چاروں آدمی بھی آ کر برآمدے کی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ جونی بھی بیٹھ گیا اور نیم وا آنکھوں سے باری باری سب کا جائزہ لینے لگا۔

"بڑا ہی خوفناک علاقہ ہے۔" کیلر نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ "یہاں کیڑوں مکوڑوں اور گرمی کے سوا کچھ بھی تو نہیں ہے۔ جیسے ہی ہیرے حاصل کرنے میں کامیاب ہوا یہاں اپنا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کروں گا۔"

جونی نے ایک سگار سلگایا اور گرارڈ کی طرف دیکھنے لگا۔ "کیا تم بھی واپس جا رہے ہو؟"

آسٹریلین نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "میرا خیال ہے کہ مجھے بھی جلد ہی یہاں سے فارغ ہو جانا چاہیے۔ اگر مجھے یہ توقع نہ ہوتی کہ وہ نایاب تتلیاں یہاں دستیاب ہیں تو شاید میں اتنی دُور آنے کا تصور بھی نہ کرتا۔ میں سمجھتا ہوں، ایک دو روز میں میری کتاب کا مواد مکمل ہو جائے گا۔ میں واپس جا کر جیلونگ میں ایک بنگلہ کرائے پر لوں گا اور تحریری کام کی تکمیل میں مصروف ہو جاؤں گا۔"

پادری ایک پنکھا جھل رہا تھا۔ "اوہ! اس کا مطلب ہے کہ میں ایک بار پھر یہاں تنہا رہ جاؤں گا۔" وہ جونی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "بہرحال، جتنا وقت بھی ہے ہمیں بہت خوش و خرّم انداز میں گزارنا چاہیے۔ کیوں کیپٹن۔ کیا تم پیانو پر کوئی دُھن سُنانا پسند کرو گے؟ برسوں سے میں اپنی ہی دُھنیں سُن سُن کر بیزار ہو چکا ہوں۔ تم تو پیانو بجانے میں کافی ماہر ہو، نا؟"

جونی کے انداز سے تذبذب کا احساس ہونے لگا۔ "میں زیادہ نہیں جانتا... بس سرسری سا بجا لیتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور اندرونی کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ پیانو کے سامنے رکھے ہوئے ایک قدیم اسٹول پر بیٹھ گیا۔

پارسن اُٹھا اور اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔

"کوئی بے حد خوش گوار دُھن ہونی چاہیے کیپٹن۔" پادری نے فرمائش کی۔

جونی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا جیسے کوئی گم شدہ دُھن یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو... پھر اُس کی انگلیاں متحرک ہو گئیں۔ پیانو سے سُر نکل نکل کر فضا میں منتشر ہونے لگے۔

جونی پیانو کے "کی بورڈ" پر جھکا ہوا تھا۔ اچانک ہی اس کے ہاتھ تھم گئے اور پیانو خاموش ہو گیا لیکن مرکزی کمرے میں آخری سُر دیر تک دیواروں سے سر ٹکراتا رہا۔ بالآخر وہ بھی دم توڑ گیا اور مکمل خاموشی چھا گئی۔ اس خاموشی پر ٹھوس ہونے کا گمان ہو رہا تھا۔

پولیس افسر آہستہ آہستہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا ایک ہاتھ کوٹ کی اندرونی جیب میں گیا اور واپسی میں اس کے ہاتھ میں ایک خوفناک ریوالور چمک رہا تھا۔ "پارسن... یا پھر جو کوئی بھی تمھارا نام ہے۔" وہ بھاری آواز میں بولا۔ "تم زیرِ حراست ہو۔"

پادری ہکا بکا اُسے دیکھتا رہ گیا۔

"تم بے حد ذہین ہو۔" جونی کہہ رہا تھا۔ "لیکن تم سے ایک غلطی ہو گئی۔ تم درخت کے تنے سے کاٹے ہوئے ٹکڑے کو دوبارہ وہاں چپکانا بھول گئے۔ باہر یوپاس نامی جو درخت ہے، میں اُسی کی بات کر رہا ہوں۔"

"معلوم نہیں تم کیا کہہ رہے ہو؟" پادری کے لہجے میں حیرت تھی۔

"نہیں سمجھے؟" جونی کے ہونٹوں پر پہلی بار مسکراہٹ آ گئی۔ "ادھر دیکھو۔" اُس نے "کی بورڈ" کی طرف اشارہ کیا۔ "یہاں تم نے کیا لگا رکھا ہے۔ مجھے اس کا کیمیاوی تجزیہ کروانے کی ضرورت نہیں کیونکہ میں یوپاس نامی درخت کے زہر سے واقف ہوں۔"

پادری ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"اینٹی جار..." کیپٹن جونی کے انداز میں سنجیدگی آ گئی۔ "اگر میری انگلی اُس 'کی' سے چھو جاتی تو یہاں خفیف سا جو اُبھار ہے، وہ میری پور میں چبھ جاتا۔ تب اس پر لگا ہوا اینٹی جار نامی زہر میرے جسم میں سرایت کر جاتا۔ اس زہر کی معمولی سی مقدار بھی ایک ہاتھی تک ہلاک کر سکتی ہے اور..."

اچانک پادری نے کسی درندے کے سے انداز میں جست لگائی۔ اس کی پھُرتی قابلِ دید ہی نہیں، قابلِ داد بھی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ جونی کے ریوالور والے ہاتھ پر پڑا جس سے ریوالور نکل گیا اور دُوسرا ہاتھ جونی کے جبڑے سے ٹکرایا۔ وہ لڑکھڑا گیا۔ چوٹ بے حد شدید تھی۔ اس کے ہونٹوں سے خون کی ایک پتلی سی لکیر بہہ نکلی۔ اس سے پہلے کہ جونی سنبھلتا، پارسن نے بڑی پھُرتی سے ایک چاقو نکال لیا۔ یہ ایک چھوٹا سا بھونڈا سا چاقو تھا لیکن اس کے بلیڈ کی چمک دمک اور دھار بتا رہی تھی کہ وہ بے حد خطرناک اور مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔

جونی کے حواس ابھی تک قابو میں نہیں آئے تھے۔ اس کے باوجود وہ خود کو پارسن کے حملوں سے بچانے کی زبردست کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اُوپر تلے دو بار محسوس کیا کہ چاقو اس کے کوٹ پر گہری خراشیں ڈالتا ہوا نکل گیا ہے۔ دونوں ہی مرتبہ وہ جھکائیاں دے کر بروقت خود کو بچا گیا تھا ورنہ یہ گہری خراشیں کوٹ کے کپڑے کی بجائے اس کی جلد میں مہلک زخموں کی صورت میں بھی تبدیل ہو سکتی تھیں۔ اس کے ابروؤں پر پسینے کی خفیف سی تہہ چمکتی دکھائی دینے لگی۔

دفعتاً اسے ایک راہ سجھائی دے گئی اور اسے ایک لمحے کی مہلت بھی مل گئی تھی۔ اس نے ان دونوں سے بروقت استفادہ کیا۔ اس نے بڑی مہارت اور تیزی سے حملہ کیا۔ باہر بیٹھے ہوئے تینوں شکاری اندر آ چکے تھے۔ اُنھیں جونی کی لگائی ہوئی چوٹ بادی النظر میں بے حد ہلکی سی محسوس ہوئی لیکن جب اُس کا ہاتھ ہدف سے ٹکرایا تو زبردست آواز پیدا ہوئی۔ پارسن کا سر دائیں بائیں گھوم گیا۔ اسی ساعت اس کی ٹھوڑی کے نیچے ایک زوردار گھونسہ پڑا جس نے اسے چاروں شانے چت کر دیا۔ اس کے گرنے کا منظر بڑا ہی قابلِ دید تھا۔ کھڑے کھڑے وہ کسی بدمست شرابی کی طرح جھومتا ہوا اچانک ہی ڈھیلا ڈھالا ہو گیا تھا اور پھر آہستہ آہستہ عقب میں، فرش تک جا پہنچا تھا۔

° °

صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی مشن کی عمارت سے ان کا مختصر سا قافلہ باہر آیا اور اس پگڈنڈی پر چل دیا جو دریا کی طرف جاتی تھی جونی نے کیلر، لاہین اور گرارڈ سے مصافحہ کیا اور پولیس لانچ چلانے والے کی طرف بڑھ گیا۔ چلتے چلتے وہ رُکا اور پلٹ کر بولا۔ "جب تم لوگ واپس آؤ تو مجھ سے ضرور مل کر جانا۔" اس نے دعوت دینے کے انداز میں کہا۔

گرارڈ نے لانچ میں جھانک کر دیکھا۔

لانچ میں، ترپال پر ایک بے حس و حرکت سا جسم پڑا تھا۔ اس کے ہاتھ، پاؤں رسی کے ٹکڑوں سے بندھے ہوئے تھے۔ یہ وہی شخص تھا جو خود کو پادری پارسن کہلواتا تھا۔

"میں یہ پوچھنا چاہتا تھا، کیپٹن کہ تمھیں اس پر کیسے شبہ ہوا؟"

کیپٹن جونی نے مسکرا کر اُس کی طرف دیکھا۔ "پہلے پہل مجھے اس پر کوئی شبہ نہیں ہوا تھا بلکہ تم تینوں ہی میرے نزدیک مشتبہ افراد تھے۔ دراصل یہ پیانو ہی تھا جس نے مجھے صحیح راستے پر ڈالا... تنگرانگ محل میں سلطان کے ہاں ڈاکا ڈالنے والا شخص دراصل کسی مقامی آدمی کے بھیس میں وہاں تک گیا تھا اور واپسی میں بھی اس نے کسی گاؤں میں رُکنے کی کوشش نہیں کی یا پھر کسی نے اس کی طرف توجہ ہی نہیں دی تھی کیونکہ یہ غیر ملکی نہیں بلکہ ایک مقامی آدمی لگ رہا تھا جب یہ مشن کی عمارت تک پہنچا تو اسے خالی پایا... غالباً اصل پارسن تبلیغ کے سلسلے میں کہیں جا چکا ہو گا۔ یہ جانتا تھا کہ اس کا پیچھا ضرور کیا جائے گا اس لیے مشن کی عمارت سے زیادہ اچھی پناہ گاہ اور کون سی ہو سکتی تھی۔ جب میں معاملے کی گہرائی میں جا رہا تھا تو اس نے تم تینوں کی طرف سے میرے ذہن میں شک کا بیج بو دیا لیکن اس نے جو زہریلا تیر مجھ پر پھینک کر تتلیوں کے شکاری کو پھنسانے کی کوشش کی، وہی تیر خود اس کے لیے تباہی کا باعث بن گیا۔ میں باری باری تم سب کی تلاشی لے چکا تھا اس لیے یہ بات مجھ سے چھپی ہوئی نہیں تھی کہ 'بلوگن' تم لوگوں کے پاس نہیں ہے۔ ظاہر ہے صرف پارسن ہی باقی رہ جاتا تھا۔ جس کے پاس 'بلوگن' کی موجودگی یقینی تھی۔ اس نے وہ زہریلا تیر 'بلوگن' سے ہی مجھ پر پھینکا تھا۔

یہ کہہ کر اُس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر نکالا اور جب مُٹھی کھولی تو صبح کی اوّلین روشنی میں اُس کی ہتھیلی پر پانچ زمردیں چمک اُٹھے جیسے اُس کی ہتھیلی پر قندیلیں روشن ہو گئی ہوں۔ "کائی کی کلیدیں۔" وہ بڑبڑایا اور اُنھیں دوبارہ جیب میں رکھ لیا۔

"مجھے اصل پادری پارسن سے ملنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا لیکن ساحل کے بیشتر لوگ اسے جانتے تھے۔ اچانک ہی پیانو کے متعلق مجھے ایک بات یاد آ گئی۔ چونکہ مجھے پیانو کا ہمیشہ ہی سے شوق رہا ہے اس لیے یہ بات کسی دوست نے خاص طور سے بتائی تھی کہ پیانو موسیقی کا ایک ایسا آلہ ہے جس سے دُور دراز کے لوگ بھی دل بہلاتے ہیں۔ اسی دوست نے بتایا تھا کہ پارسن نامی ایک پادری کی بیوی کے لیے پیانو بھیجا گیا تھا لیکن دو سال قبل پادری کی بیوی انتقال کر گئی۔"

"لیکن پیانو نے آپ کی رہنمائی کیسے کی؟"

"بات یہ ہے گرارڈ۔" کیپٹن جونی نے مسکرا کر کہا۔ "اس دوست نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ پادری پیانو بجانا بالکل نہیں جانتا اور نہ ہی اسے پیانو سے کوئی دلچسپی تھی۔ وہ تو بس اپنی بیوی کی فرمائش پر مجبور ہو گیا تھا۔"

تینوں شکاری قہر آلود نظروں سے اس شخص کی طرف دیکھنے لگے جس کی وجہ سے پورے علاقے میں بغاوت کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا اور اس بغاوت میں اَن گنت آدمیوں کی موت متوقع تھی۔

* * *

فوزیہ ناہید

سرگزشت

ماحول پر زہر آلود سناٹا طاری تھا اور وہ شعلے برساتی ہوئی آنکھوں سے اپنے مقابل بیٹھے انسانی ہیولے کو گھور رہا تھا۔ اس کے باریک ہونٹ بھنچے ہوئے تھے اور جسم شدتِ غیظ سے یوں لرز رہا تھا جیسے اس کے اندر مسلسل برقی رو دوڑائی جا رہی ہو۔ "وہ آ رہی ہے!" اس کی کھنکدار آواز نے سناٹے کا سحر توڑ دیا۔ اس کے سامنے براجمان انسانوں کے مُنہ سے آہیں سی نکل گئیں۔ "وہ لڑکی آ رہی ہے جس نے خط لکھا تھا۔ اب یہ بات یقینی ہو چکی ہے۔" یہ کہہ کر وہ چُپ ہو گیا اور ایک بار پھر کرے

پاکستان پوائنٹ ڈاٹ کام

کی فضا سناٹے کی خوفناک چادر میں لپٹ گئی۔ یہ الفاظ کبھی دن میں اور کبھی رات میں کچھ اور لوگوں نے بھی کہے تھے مگر ایک ... ہستی تھی جس نے اپنی زبان پر تالے ڈال رکھے تھے وہ شب گرفتہ ہستی رات کی تاریکی میں کسی سیاہ کرن کی طرح جنگل سے نکلتی، اندھیرے میں ڈوبے ہوئے بستی کے مکانوں کے سامنے سے گزر کر آخری حصے تک جاتی اور پھر اسی طرح لوٹ کر جنگل کی تاریکی میں اُتر جاتی۔ اس رات وہ بڑے مکان کی کھلی کھڑکی سے اندر آئی۔ کمرے کے وسط میں ایک میز تھی۔ کھڑکی سے آتی چاند کی کرنیں میز پر رکھے ایک کاغذ پر پڑ رہی تھیں۔ سیاہ کرن نے کاغذ اُٹھا کر چاند کی روشنی میں تحریر پر نظر ڈالی۔ اس کے خشک ہونٹوں میں حرکت پیدا ہوئی اور حلق سے ایک بے آواز فاتحانہ نعرہ بلند ہوا۔ چند ثانیوں کے بعد وہ پھر رینگتی ہوئی کھڑکی سے باہر آئی اور درختوں میں بکھرے ہوئے اندھیرے میں تحلیل ہو گئی۔

⬤

جین موریسن کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کی شعلہ بار آنکھیں سامنے کھڑے آدمی پر جمی ہوئی تھیں۔ موٹی گردن اور بجھی بجھی سی آنکھوں والے اس آدمی کے انداز سے بے چینی مترشح تھی۔ لگتا تھا جیسے اسے خود بھی اپنی بات کا اعتبار نہ ہو۔ "کیا تمھیں اس وقت اپنی بوٹ کا انجن خراب کرنے کے لیے کسی نے رشوت دی ہے؟" جین نے ترش روئی سے دریافت کیا۔

"نہیں۔ نہیں میڈم۔" وہ شخص اٹک اٹک کر بولا۔ "میں نے بتایا نا کہ کل شام میری کشتی کا انجن خراب ہو گیا تھا۔ دو تین روز میں ٹھیک ہو جائے گا۔"

جین نے ساحل سے بندھی ہوئی کشتی کی طرف دیکھا۔

... یہ کشتی سمندر میں ایک میل دُور اُبھرے ہوئے جزیرے تک پہنچنے کا واحد ذریعہ تھی اس نے مڑ کر اپنی چھوٹی سی فیاٹ کار پر نظر ڈالی، جس میں اس کا سامان بھرا ہوا تھا۔ سورج غروب ہونے سے پہلے یہاں پہنچنے کے لیے وہ بڑی تیزی سے کار دوڑاتی ہوئی آئی تھی اور اب یہ شخص اُسے کشتی خراب ہونے کی منحوس خبر سنا رہا تھا۔ اچانک ہی جارجیا کے اس دُور افتادہ گرد آلود ساحل پر وہ خود کو بے حد تنہا تنہا محسوس کرنے لگی۔ یہی وجہ تھی کہ اس شخص کی احمقانہ صورت پر نظر پڑتے ہی اُسے پھر غصہ آگیا۔ "آخر کوئی شخص مجھے ہیرون آئی لینڈ جانے سے کیوں روکنا چاہتا ہے؟" وہ چیخ پڑی۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا، میڈم۔" وہ حیرت سے بولا۔ "وہ شخص غلطی پر ہے۔ میں نے یہ طویل سفر یہاں سے ناکام واپس جانے کے لیے نہیں کیا ہے۔" وہ پیر پٹختی ہوئی بولی تو ساحل کی دُھول ... اس کی پنڈلیوں سے لپٹنے لگی۔

"کل تک کشتی ٹھیک ہو جائے گی۔" کشتی والا جین کے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

جین نے کھلے گلے کی شرٹ اور بھوری جینز پہن رکھی تھی۔ وہ ایک صحت مند اور حسین لڑکی تھی۔ اس نے سمندر میں تین تین چار چار میل کے فاصلے پر بکھرے ہوئے جزیروں کی طرف دیکھا انھیں 'بحری جزیرے' کہا جاتا تھا۔ انھی میں سے ایک ہیرون آئی لینڈ تھا جہاں میری ایلین رہتی تھی ... میری ایلین۔ جو اسے ہمیشہ نصف شب کے بعد فون کیا کرتی تھی ... پھر واقعات کچھ ایسے موڑ پر آگئے کہ جین اس سے ملنے یہاں دوڑی چلی آئی۔ اس نے کشتی والے پر ایک تیز نظر ڈالی اور اپنی کار کے اسٹیئرنگ وھیل پر آ بیٹھی۔ آتے وقت راستے میں اسے کوئی ہوٹل یا موٹل قسم کی جگہ بھی نظر نہیں آئی تھی صرف چند کیبن تھے جو وہاں سے دس میل کے فاصلے پر تھے۔

'فی الحال وہیں ٹھیک رہیں گے' جین نے دم توڑتے ہوئے اُجالے کی طرف دیکھ کر سوچا۔ 'وہاں سے آدھی رات کے بعد وہ میری ایلین کو فون کر دے گی۔' گزشتہ تین سال سے وہ اسی وقت میری ایلین سے فون پر بات کرتی رہی تھی۔ اس نے کئی بار دوسرے اوقات میں بھی اس سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ یہاں آنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ اس راز سے پردہ ہٹانا چاہتی تھی۔ اس نے انجن اسٹارٹ کیا اور دُھول اُڑاتی ہوئی کار سڑک پر ڈال دی۔ اس کا ذہن میری ایلین کے بارے میں سوچ رہا تھا اچانک ایک موڑ پر اسے ایک دھماکا سنائی دیا۔ کار لہرانے لگی تو اس نے اسٹیئرنگ وھیل پر گرفت مضبوط کر لی پھر وہ ڈھلان میں اُتر کر لڑھکنے لگی۔ اچانک دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور وہ باہر جا گری۔ اس کی آنکھوں کے سامنے نیلے پیلے ستارے چمکے اور پھر ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔

دوبارہ جب آنکھ کھلی تو اسے یہ دیکھ حیرت ہوئی کہ وہ بالکل صحیح سلامت ہے۔ صرف سر میں ہلکا سا درد ہو رہا تھا۔ سڑک پر ایک بھاری ٹرک کھڑا تھا۔ یکایک اسے محسوس ہوا کہ کوئی اس کے قریب کھڑا ہے۔ "تم بہت خوش قسمت ہو مس۔" ایک آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

جین نے سر گھما کر دائیں جانب دیکھا ایک بوڑھا متفکر نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ "زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟" بوڑھے نے ہمدردی سے پوچھا۔

"نہیں۔" جین نے دھیمی آواز میں کہا۔

ایک نوعمر حسینہ کو پیش آنے والے پُراسرار واقعات سے لبریز کہانی "برائے کرم کمزور دل اصحاب اسے رات کی تنہائی میں نہ پڑھیں"

"ہم تمھارے پیچھے ہی تھے۔ وہ دھماکا ہم نے بھی سنا تھا۔ میرا لڑکا سام آٹو شاپ پر گیا ہے۔ تمھارا ٹائر پھٹ گیا تھا سام اسے ٹھیک کر دے گا۔"

"شکریہ۔ لیکن ہُوا کیا تھا۔ میری کار کے ٹائر تو بالکل نئے ہیں۔" جین اُٹھتی ہوئی بولی "یہاں آنے کے لیے میں نے خاص طور پر انھیں تبدیل کرایا تھا۔"

"کوئی کیل یا نوکیلا پتھر چُبھ گیا ہوگا۔" بوڑھے نے کہا۔ "کیا تم نیویارک سے آرہی ہو مس؟" اس نے کار کی نمبر پلیٹ دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔ مجھے ہیرون آئی لینڈ پر مقیم اپنی ایک دوست سے ملنے جانا تھا۔" جین نے بتایا۔ "مگر ملاح نے بتایا کہ کشتی خراب پڑی ہے۔"

"برسوں میں پہلی بار ایسا ہُوا ہے ورنہ کشتی تو ..."

"یقیناً ..." وہ سوچتی ہوئی بولی۔ اسی وقت ایک بھاری گاڑی سڑک پر ان کے قریب آکر رُک گئی اور ایک نوجوان کے ساتھ مستری کے لباس میں ایک بھاری بھرکم آدمی اُتر کر ان کی طرف بڑھا پھر اس کی فیاٹ بھاری گاڑی کے ساتھ ہک سے منسلک کر دی گئی اور وہ سب سام کے گیراج کی طرف چل دیے۔ "آپ کل مجھے فون کر لیں مس۔" سام نے کہا۔ "میرا خیال ہے کام زیادہ نہیں ہوگا۔"

جین نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنی کار سے صرف ایک بیگ نکال لیا۔

"یہاں سے ایک میل دُور مسز ڈریڈی کا گھر ہے۔" سام نے بتایا۔ "وہ کمرے کرائے پر دیتی ہے۔ اگر آپ چاہیں تو رات وہاں گزار سکتی ہیں۔"

"شکریہ، میں وہیں چلی جاتی ہوں۔" اس نے بیگ شانے سے لٹکایا اور ایک بار پھر ان لوگوں کا شکریہ ادا کرتی ہوئی سنسان سڑک پر چل دی۔ اس کے دائیں طرف تاحدِ نظر سمندر پھیلا ہُوا تھا۔ وہاں سے ہیرون آئی لینڈ کسی سیاہ نقطے کی طرح دکھائی دے رہا تھا یا شاید یہ اس کا واہمہ تھا۔ چاند نکل آیا تھا۔ وہ سڑک سے اُتر کر ڈھلان کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ سڑک پر کبھی کبھار ایک دو کاریں گزر جاتیں اس کے علاوہ ماحول پر سناٹا طاری تھا۔ اچانک وہ رُک گئی۔ ساحل سے ایک چھوٹی سی کشتی بندھی ہوئی تھی۔ اس نے دُور جزیرے کی طرف دیکھا اور اس کے ہونٹ سختی سے بھنچ گئے۔

میری ایلین نے اس رات دو بجے فون کیا تھا اور اس کی آواز بے حد عجیب لگ رہی تھی۔ اسی وقت جین نے فیصلہ کر لیا کہ وہ جزیرہ ہیرون جا کر ایلین سے ملے گی ... پھر اگلے روز ڈاک سے ایک پھولا ہُوا لفافہ موصول ہُوا۔ اس لفافے میں دستاویزات تھیں۔ میری ایلین نے اپنا ہیرون آئی لینڈ والا خاندانی مکان "اسٹار لیسٹ" جین کے نام کر دیا تھا۔ یہ کاغذات اسی جائداد سے متعلق تھے۔ رات کو اس نے فون کیا مگر میری ایلین سے رابطہ قائم نہ ہو سکا۔ یہاں آنے سے ایک رات قبل اس نے پھر فون کیا تو ایک مردانہ آواز سنائی دی۔ اس شخص نے کہا کہ وہ ہیرون آئی لینڈ نہ آئے۔ جین کو اس کی آواز بڑی غیر انسانی سی لگی اور اس کا تجسس دوچند ہو گیا چنانچہ صبح ہوتے ہی اس نے مکان کے کاغذات ضروری کارروائی کے لیے اپنے وکیل کے حوالے کیے اور اپنی دوست سے ملنے روانہ ہو گئی۔

جین اور ایلین دُور کی رشتے دار تھیں اُنھوں نے ایک ساتھ تعلیم حاصل کی تھی اور مزاجاً مختلف ہونے کے باوجود ایک دوسرے کو بے حد پسند کرتی تھیں پھر ایلین اپنے آبائی مکان میں چلی گئی اور جین اپنی مصروفیات میں کھو گئی۔ ان کے درمیان کبھی کبھی خطوط کا تبادلہ ہو جاتا پھر یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا اچانک ایک عرصے بعد اسے فون کالز ملنے لگیں۔ جین ساحل پر کھڑی یہ سب سوچتی رہی۔ آخر اس نے ایک فیصلہ کر لیا اور اپنا بیگ اُتار کر کشتی میں پھینک دیا پھر کشتی کھول کر پانی میں دھکیلی اور اس میں سوار ہو کر چپو سنبھال لیے۔ کشتی دھیرے دھیرے جزیرے کی طرف بڑھنے لگی میری ایلین نے اپنے مکان کے کاغذات کیوں بھیجے تھے؟ مختلف خیالوں نے اس کے ذہن پر حملہ کر دیا۔ فون پر کسی نے اسے جزیرے پر آنے سے کیوں منع کیا؟ وہ شخص کون ہے؟ یہ سب کچھ ایک سربستہ راز تھا اور وہ اسے بے نقاب کرنے کے لیے بے چین ہو رہی تھی۔

تاریکی میں ڈوبا جزیرہ قریب آتا جا رہا تھا کہ اچانک اس نے ایک موٹر بوٹ کی آواز سُنی۔ وہ چونک کر بائیں طرف دیکھنے

لگی تو دُور ایک برقی لالٹین چمک رہی تھی۔ شاید کوئی مچھیرا تھا۔ لالٹین کی روشنی پانی پر یوں لہرا رہی تھی جیسے کوئی شخص کسی کو تلاش کر رہا ہو... "شاید اُسے ہی تلاش کیا جا رہا ہے"۔ روشنی قریب آتی جا رہی تھی... پھر وہ جزیرے پر چکرانے لگی۔ اچانک اس کی کشتی کو ایک جھٹکا لگا اور وہ دلدل میں پھنس گئی۔ اس نے بڑی مشکل سے کشتی پیچھے ہٹائی اور دوبارہ اس طرف کھینے لگی جہاں جزیرے کے کنارے بڑے بڑے درخت جھوم رہے تھے۔ جلد ہی کشتی سمندری گھاس میں پہنچ گئی یہاں درختوں کی شاخیں زمین تک جھکی ہوئی تھیں۔ جین کے چہرے پر مکڑی کے تار سرسرانے لگے۔ کشتی پھر رُک گئی اور اس بار جین کوشش کے باوجود اُسے حرکت میں نہ لا سکی۔

وہاں سے کنارہ دُور نہیں تھا اس لیے وہ اپنا بیگ کندھے پر ڈال کر پانی میں اُتر گئی۔ اس کے پیر کیچڑ میں دھنس گئے۔ پانی اس کی کمر تک پہنچ رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر جسمی توازن برقرار رکھتے ہوئے آگے بڑھی لیکن چوتھے ہی قدم پر پانی اس کے سینے تک آ گیا۔ اس نے متفکر نظروں سے کنارے کی طرف دیکھا درختوں کے نیچے گہری تاریکی تھی اور ماحول پر حشرات الارض کے ابدی راگوں کا سحر طاری تھا۔ جین نے پھر ہمت کی اور قدم آگے بڑھانے لگی۔ وہ قدرے اونچی جگہ پہنچ گئی۔ اب پانی اس کی کمر تک آ گیا تھا لیکن جب اس نے آگے بڑھنے کے لیے پیر اُٹھایا تو ناکام رہی۔ اس نے زور لگایا اور پھر اس کے جسم میں دہشت کی ایک سرد لہر دوڑ گئی اس کا پیر تیزی سے دھنسنے لگا تھا۔ اس نے پھر زور لگایا... مگر وہ دلدل میں پھنس گئی تھی۔ اُس نے بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ دُور دُور تک کوئی متنفس نظر نہیں آ رہا تھا۔ نہ جانے وہ لالٹین والا بھی کدھر نکل گیا تھا اس نے ایک بار اور آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر یہ کوشش اُسے بڑی مہنگی پڑی۔ حرکت کرنے سے اس کے پاؤں تیزی سے دھنسنے لگے تھے۔ رہ ساکت ہو گئی۔ وہ آہستہ آہستہ دلدل میں اُترتی جا رہی تھی۔ پانی بتدریج سینے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بے اختیار اس کے حلق سے ایک چیخ نکل گئی۔ "مدد...!" وہ پوری قوت سے چلائی۔ "مدد کرو۔" لیکن کہیں سے کوئی آواز نہ آئی۔ "آہ!" وہ کراہ اُٹھی اور قدرے توقف سے پھر چیخنے لگی۔ "مدد! مدد!" اس کا دماغ چکرانے لگا اور شانے سے لٹکا ہوا تھیلا بھیگ کر من بھر کا محسوس ہونے لگا۔ مجبوراً اس نے بیگ اُتار کر اسے پانی میں چھوڑ دیا... لیکن اس سے بھی کوئی فرق نہ پڑا۔ اندر کی مٹی اس کے پیروں پر چڑھتی جا رہی تھی۔ "مدد!" وہ ایک بار پھر پوری قوت سے چلائی تو اس بار جواباً اُسے موٹر بوٹ کی آواز سنائی دی... پھر دُور ایک روشنی کی کرن لہرا گئی۔ "مدد! مدد!" وہ چیخنے کے ساتھ ساتھ ہاتھ بھی لہرانے لگی۔ تاریکیاں تیزی سے اس کے ذہن میں اُترتی جا رہی تھیں۔

"خدا غارت کرے!" معاً کسی کی بڑبڑاہٹ سُنائی دی۔ انجن بند ہو گیا اور پھر سناٹا پھیل گیا۔

"مدد!" جین چلائی۔ "خدا کے لیے! جلدی!" اس کے پیروں میں آگ سی لگ رہی تھی۔ جو بتدریج اوپر کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔ "کیچڑ!"

"میں جانتا ہوں۔" ایک بھاری مردانہ آواز گونجی۔ "خاموش رہو اور اپنی سانسیں مت ضائع کرو... لو... اسے پکڑ لو۔"

کسے پکڑ لوں؟ جین نے پوچھنا چاہا مگر زبان ساتھ نہ دے سکی۔ اچانک ایک موٹا سا رسّہ اُڑتا ہوا آیا اور اس کی کمر کے گرد پھیل گیا۔ جین نے جلدی سے اُسے دونوں ہاتھوں میں جکڑ لیا... پھر اُسے جھٹکا لگا اور وہ ساحل کی طرف کھنچتی چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے غنودہ ذہن سے محسوس کیا کہ دو ہاتھ اسے پکڑ کر خشک گھاس پر گھسیٹ رہے ہیں۔ "شکریہ...!" وہ بڑبڑائی اور اس کا ذہن بے ہوشی کی دُھند میں ڈوب گیا۔

○

جب اُسے ہوش آیا تو وہ ٹانگیں پھیلائے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ جین گردن تک چادر اوڑھے بستر پر دراز تھی اور اس کا بیگ فرش پر کھلا پڑا تھا۔ کپڑے اور دوسرا سامان سوکھنے کے لیے آتش دان کے سامنے رکھا ہوا تھا۔ کمرے کا جائزہ لے کر جین اپنے اجنبی محسن کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ دلکش نقوش والا ایک نوجوان تھا مگر اس کی آنکھیں بے حد سرد اور جذبات سے عاری لگ رہی تھیں۔ "میں... میں تمھاری بے حد احسان مند ہوں۔" جین نے دھیمی آواز میں کہا۔ "سمجھ میں نہیں آتا کہ تمھارا شکریہ کیسے ادا کروں؟"

"میرے دو تین سوالوں کے جواب دے کر..." نوجوان کے لہجے میں تلخی گھلی ہوئی تھی۔ "تم کیا کر رہی تھیں اور وہاں کیسے پہنچی تھیں؟"

"میں کشتی پر ہیرون آئی لینڈ آ رہی تھی۔" اس نے جواب دیا۔

"میرا نام جین موریسن ہے۔"

"میں ڈیوڈ ریان ہوں۔ نیچرلسٹ... اور ان جزیروں میں حشرات الارض کے مطالعے اور تحقیق میں مصروف ہوں۔ مگر کیا تمھارا دماغ خراب ہے جو اس اندھیری رات میں ادھر آ نکلی تھیں؟ کس لیے آئی ہو یہاں؟"

"اپنی دوست میری ایلین ٹوڈ سے ملنے۔" اس نے بتایا۔

"اسٹار لیسٹ مینشن والی لڑکی... اس نے مجھے بلایا ہے۔"

ڈیوڈ کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"کیا تمھیں میری بات پر یقین نہیں آ رہا ہے۔" جین نے حیرت سے کہا۔

"میں عورتوں سے بحث نہیں کیا کرتا۔" وہ بدستور سرد لہجے میں بولا۔

"اس نے دو روز قبل مجھ سے بات کی تھی۔ کل میں تمھیں اس سے تصدیق کرا دوں گی۔"

ڈیوڈ کی بھویں سکڑ گئیں۔

"کیا تم کبھی کسی بات پر یقین نہیں کرتے۔" جین جھنجلا کر بولی۔

"کبھی کبھی کر لیتا ہوں۔" وہ بھاری آواز میں بولا۔ "یوں سمجھ لو کہ اس وقت میں بے یقینی کے موڈ میں ہوں۔"

"میرے کپڑے خشک ہو گئے ہوں گے۔" وہ چادر لپیٹ کر اُٹھنے لگی۔ "میرا خیال ہے اب مجھے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔"

ڈیوڈ نے اثبات میں سر ہلایا اور شراب کی کیبنٹ کی طرف بڑھ گیا۔ جین نے آتش دان کے قریب لٹکے ہوئے کپڑے اُٹھا لیے اور ڈیوڈ کی طرف دیکھا۔ وہ پیٹھ موڑے کھڑا تھا وہ جلدی جلدی کپڑے پہننے لگی۔

"کیا تم جانتی ہو کہ تم کہاں جا رہی ہو؟" اس نے بے گانگی سے پوچھا۔

"نہیں... لیکن میں کسی نہ کسی طرح منزل پر پہنچ ہی جاؤں گی۔" وہ سُلگ کر بولی اور سوچنے لگی کہ عجیب بے حس آدمی ہے۔

"شاید اُسی طرح جیسے اس جزیرے پر پہنچ گئی تھیں۔" وہ طنزیہ بولا تو جین اُسے گھور کر رہ گئی۔ "اسٹار لیسٹ یہاں سے دو میل دور ہے۔" ڈیوڈ بتا رہا تھا۔ "یہ ایک بہت بڑا مکان ہے اس کے سامنے پُرانے زمانے کا ایک شاہ بلوط بھی ہے۔ بہرحال اگر تم گھڑسواری کر سکو تو میرے پاس ایک فالتو گھوڑا ہے۔"

"شکریہ۔ گھوڑا میں صبح واپس کر جاؤں گی۔ ایلین کے پاس کوئی نہ کوئی سواری ضروری ہو گی۔" وہ ایک طویل سانس لے کر بولی اور چیزیں سمیٹ کر بیگ میں رکھنے لگی۔

"ہیرون آئی لینڈ پر اس اندھیری رات اور تنہائی میں دو میل بہت لمبے ہوتے ہیں۔" ڈیوڈ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "چاہو تو رات یہیں گزار لو۔ تم بالکل محفوظ رہو گی۔"

جین نے ایک جھٹکے سے اس کی طرف دیکھا۔ یہ شخص لوگوں کو غصہ دلانے کا ماہر معلوم ہوتا تھا۔ "نہیں، شکریہ۔" وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"میں نے آج پہنچنے کا تار دے دیا تھا۔ ایلین میری منتظر ہو گی۔"

ڈیوڈ کی بھویں تن گئیں۔ "جیسے تمھاری مرضی۔ آؤ میرے ساتھ۔" اس نے کہا اور دونوں باہر آ گئے۔

احاطے میں ڈیوڈ نے جگہ جگہ گڑھے کھود کر ان میں پانی بھر رکھا تھا۔ ان گڑھوں میں چھوٹے کیکڑے اور رنگ برنگی مچھلیاں بھری ہوئی تھیں۔ "میں ان چیزوں کی اسٹڈی کرتا ہوں۔" اس نے بتایا۔ "ہیرون آئی لینڈ میں سیّاح آتے ہیں اور اپنی تفریح کی خاطر نادر سمندری جانوروں کو تباہ کر دیتے ہیں۔ میں ان کی نسلوں کی حفاظت کرنا چاہتا ہوں۔" جین خاموشی سے اس کے ساتھ اصطبل کی طرف بڑھتی رہی۔ "آدمی بھی خوب ہے اپنے سوا کسی کو جینے کا مستحق ہی نہیں سمجھتا۔" اس نے ایک گھوڑا کھولا اور اس پر زین کسنے لگا۔

"میں صبح یہ گھوڑا واپس کر دوں گی۔ ایلین کے پاس..." جین نے کہنا چاہا۔

ڈیوڈ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "کیا ایلین، ایلین لگا رکھی ہے۔" وہ منہ بنا کر بولا۔ "اگر تم مذاق نہیں کر رہی ہو تو مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ بہرحال، تم ایک حسین لڑکی ہو۔"

"کیا؟" وہ پلٹ کر غرّائی۔ "کیا ہوں، میں؟" اس کی مُٹھیاں بھنچ گئیں۔ "گدھے کا بچہ جانے خود کو کیا سمجھتا ہے!" وہ دل ہی دل میں بولی۔

ڈیوڈ نے اس پر کوئی توجہ نہ دی اور گھوڑے کی لگام اُسے تھما کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا مکان کی طرف چل دیا۔

جین گھوڑے پر سوار ہو کر احاطے سے نکل آئی اور اسے سڑک پر ڈال دیا۔ راستہ گھوڑے کے لیے مانوس تھا اس لیے جین نے لگام ڈھیلی کر کے اُسے اُس کی مرضی پر چھوڑ دیا۔ ڈیوڈ سچ ہی کہتا تھا۔ دو میل کا یہ راستہ بہت لمبا ثابت ہو رہا تھا پتلی سی سڑک پر کئی موڑ تھے اور دو رویہ درختوں کی شاخیں خاصی نیچے تک جھکی ہوئی تھیں۔ کہیں کہیں چاند کی کرنیں پتوں سے چھن چھن کر زمین پر روشن دھبے بنا رہی تھیں۔ کافی دیر بعد اُسے دُور سے ایک مکان نظر آ گیا۔ یہ دو منزلہ سفید سی عمارت تھی جو چاندنی میں بے حد پُراسرار نظر آ رہی تھی۔ مکان کے سامنے پہنچ کر جین گھوڑے سے اُتری اور اُسے ایک درخت سے باندھ دیا پھر اس

نے دروازے پر پہنچ کر اطلاعی گھنٹی کی زنجیر کو جھٹکا دیا۔ مکان تاریک نظر آرہا تھا اور اندر چھائی ہوئی خاموشی بتاتی تھی کہ وہ ویران ہے اس نے دوبارہ زنجیر کھینچی مگر اسے مایوسی ہوئی اس نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے گھمایا تو ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔ ایک لمحے تذبذب کا شکار رہ کر وہ اندر داخل ہوگئی۔

یہ ایک تاریک ہال تھا۔ اس نے دیوار پر ہاتھ پھیر کر سوئچ بورڈ ٹٹولا اور پھر بٹن دبادیا۔ ہال میں ایک مدھم سا بلب روشن ہوگیا۔ وہ آگے بڑھ گئی سامنے ہی زینہ تھا جو دوسری منزل تک جارہا تھا۔ "کوئی ہے؟" وہ ہال کے وسط میں کھڑی ہوکر بلند آواز میں بولی مگر جواباً اسی کی آواز گونج کر رہ گئی۔ "میری ایلین۔ میں آگئی ہوں۔" وہ دوبارہ چیخی لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ یوں محسوس ہورہا تھا جیسے پورا مکان خالی پڑا ہو۔

اس نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ سامنے کی دیوار پر سنہرے فریم میں ایک بڑی سی تصویر آویزاں تھی۔ ایک جانب بھاری صوفے تھے۔ دوسری طرف آتشدان تھا وہ اسی طرف بڑھ گئی... آتش دان پر اسے ماچس کی ڈبیہ نظر آئی تو اس نے ایک تیلی جلائی اور آتش دان میں رکھی لکڑیوں کو شعلہ دکھادیا۔ ہال کے دونوں جانب کئی دروازے تھے مگر اس نے ان میں داخلے کا کام صبح کے لیے چھوڑ دیا۔ ایک بھاری صوفہ آگ کے قریب کھینچ کر اس نے اپنا بیگ فرش پر رکھ دیا۔ ہال کے وسط میں فانوس جھول رہا تھا اور کونے میں ایک بڑا سا لیمپ رکھا ہوا تھا۔ جین نے دیوار پر لگے سارے بٹن دبادیے مگر روشنی نہ ہوئی۔ شاید تمام بلب ہی ناکارہ ہوچکے تھے ایک کونے میں رکھی تپائی پر اسے ٹیلی فون نظر آیا تو وہ تیزی سے اس طرف بڑھی اور ریسیور اٹھا کر کان سے لگالیا۔ ذرا دیر بعد اسے ڈائل ٹون سنائی دینے لگی۔ اس نے ریسیور کریڈل پر رکھا اور آتش دان کے پاس آکر صوفے پر بیٹھ گئی۔

'کیا کرنا چاہیے؟' اس نے سوچا۔ 'کیا واپس ڈیوڈ کے پاس چلی جاؤں؟' مگر اس نے فوراً ہی یہ خیال اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ اس نے صوفے کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کرلیں۔ اچانک ہی اس پر تھکاوٹ غالب آگئی۔ 'نہ جانے میری ایلین کہاں تھی؟' اسے ہال کی ہر چیز پر گرد کی تہ جمی نظر آئی جیسے برسوں سے یہ مکان خالی پڑا ہو۔ 'شاید میری ایلین اپنی جاگیر پر کسی چھوٹے سے مکان میں رہتی ہو۔ اتنا بڑا مکان اور وہ تنہا...' سوچتے سوچتے نہ جانے کب اسے نیند آگئی۔

کافی دیر بعد کسی آہٹ سے اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔

اس نے ادھر ادھر دیکھا تو اس کی نظر سمندر کی طرف کھلنے والی کھڑکی پر جم گئی۔ کوئی وہاں کھڑا تھا وہ اٹھ کر تیزی سے کھڑکی کی طرف لپکی تو وہ سایہ غائب ہوگیا کھڑکی کے پاس جاکر اس نے گرد آلود شیشے پر ہاتھ پھیرا اور باہر دیکھنے لگی۔

ایک سایہ درختوں کی طرف بھاگ رہا تھا۔

اس نے آتش دان کے پاس پڑا بھاری چمٹا اٹھایا اور دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔

"اے؟" اس نے چیخ کر کہا۔ "کون ہے؟"

سایہ لان پار کررہا تھا۔ وہ اس کی طرف دوڑ پڑی مگر سایہ درختوں میں گھس گیا۔ جین دوڑتی ہوئی درختوں تک پہنچی وہاں گہری تاریکی تھی۔ وہ کچھ دیر کھڑی کچھ سننے کی کوشش کرتی رہی... مگر جھینگروں اور مینڈکوں کے شور کے سوا وہاں کوئی آواز نہیں تھی۔

وہ سر جھٹک کر واپس گھر میں آگئی اور دروازہ اندر سے اچھی طرح بند کرکے کرسی پر گر گئی۔ 'نہ جانے کون تھا؟' اس نے سوچا... 'مگر کوئی تھا ضرور...' کچھ دیر بعد اسے پھر نیند آگئی۔

اس کی آنکھ کھلی تو کھڑکی سے دھوپ اندر اتر آئی تھی۔ اجالے میں مکان نسبتاً کم ویران لگ رہا تھا۔ جین نے خود کو بے حد ترو تازہ محسوس کیا وہ اٹھی اور ہال سے ملحق باتھ روم میں گھس گئی۔ سنک کی ٹونٹی کھولی تو ٹھنڈا پانی ابل پڑا۔ اس نے منہ ہاتھ دھویا اور مکان سے باہر آگئی۔

صبح کی دھوپ میں ماحول نکھرا نکھرا سا لگ رہا تھا۔

مکان سے ذرا فاصلے پر ایک اصطبل بنا ہوا تھا۔ جین گھوڑا لے کر اس طرف بڑھی تو دیکھا کہ اصطبل خالی پڑا ہے۔ اس میں سوکھی گھاس کا ڈھیر لگا ہوا تھا اس نے گھوڑا وہاں باندھا اور لان پر نکل آئی۔ مکان کے عقب میں کھنڈر پھیلے ہوئے تھے۔ شاید کبھی وہ ملازمین کے کوارٹر ہوا کرتے تھے۔ ان کے پاس ہی ایک ابھرے ہوئے قطعے پر کتبے لگے ہوئے تھے۔ جین ٹہلتی ہوئی اس قطعے پر آگئی۔ کتبے بے حد قدیم تھے اور ان پر وہاں دفن لوگوں کے کوائف کندہ تھے۔ معاً اس کی نظر ایک چھوٹے سے کتبے پر پڑی۔ یہ الگ تھلگ دکھائی دے رہا تھا۔

جین نے کتبے کی تحریر دیکھی تو اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس پر لکھا تھا: "میری ایلین ٹوڈ۔ ۱۹۴۴-۱۹۷۹۔"

"نہیں۔" وہ بڑبڑائی۔ "یہ ناممکن ہے۔ میری ایلین مری نہیں بلکہ زندہ ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اسے مرے تین سال گزر چکے ہوں۔ اس نے تین راتیں قبل ہی تو اس سے فون پر گفتگو کی تھی۔ اوہ میرے خدا۔" اس کے منہ سے ایک بے ساختہ سانس نکلی۔ "نہیں..."

اگلے ہی لمحے وہ عزم کررہی تھی کہ چاہے کچھ بھی کیوں نہ ہو وہ اس کتبے کا راز جان کر رہے گی۔ مکان کی حالت ایسی تھی جیسے وہ برسوں سے ویران پڑا ہو لیکن اس میں بجلی بھی تھی اور فون بھی کام کررہا تھا۔ اس کے ذہن میں ان گنت سوال کلبلانے لگے۔

وہ واپس مکان میں آگئی اور ریسیور اٹھا کر کان سے لگالیا۔ (فون) کام کررہا تھا۔ دوسری طرف سے آپریٹر نے نمبر دریافت کیا تو اس نے سام کے گیراج کا نمبر بتادیا۔ ذرا ہی دیر بعد وہ سام سے اپنی کار کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔

"اس کا فریم مڑ گیا تھا مس!" سام نے بتایا۔ "اور ٹائر... لگتا ہے جیسے اس پر کسی نے گولی چلائی ہو۔"

"کیا؟" وہ چیخ پڑی۔ "گولی؟"

"ہاں مس... ممکن ہے مجھے غلط فہمی ہوئی ہو لیکن نشان سے یہی پتہ چلتا ہے۔"

"بہرحال تم اسے ٹھیک کردو اور ہوسکے تو اس کا سامان یہاں بھیج دو۔ میں ہیرون کے اسٹارلیٹ میں ٹھہری ہوئی ہوں۔"

"ٹھیک ہے مس میں نے اسٹارلیٹ دیکھا ہے۔ آپ کا سامان آج ہی پہنچ جائے گا اور کار ٹھیک ہوتے ہی فون پر آپ کو اطلاع دے دی جائے گی۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا اور صوفے پر گر گئی۔ 'تو کوئی شخص ہر قیمت پر اسے یہاں آنے سے روکنا چاہتا تھا۔ مگر کون اور کیوں؟' اسے یقین تھا کہ ایلین زندہ ہے اور اسے مدد کی ضرورت ہے۔ اسے آخری ٹیلی فون کال یاد آگئی۔ ایلین نے اس سے کہا تھا۔ "اب مجھے یہاں تمہاری ضرورت ہے۔ تم آجاؤ۔ جلدی آجاؤ۔" اس سے اگلے ہی روز مکان کے کاغذات ملے تھے اور پھر وہ یہاں چلی آئی تھی۔ اچانک اسے یاد آیا کہ ڈیوڈ اسے پاگل سمجھ رہا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ اسے ایلین کی موت کا علم تھا۔ کچھ سوچ کر وہ اصطبل کی طرف گئی اور پھر گھوڑے پر سوار ہوکر ڈیوڈ کے گھر کی طرف چل دی۔

یہ خاصا گرم اور سرسبز و شاداب جزیرہ تھا۔ درختوں کی شاخوں سے سمندر کا پانی جھانک رہا تھا۔ گھوڑا مانوس راستے پر چلتا رہا اور جلد ہی منزل پر پہنچ گیا۔ ڈیوڈ مکان کے عقب سے نکل کر اس کی طرف بڑھا۔ وہ کسرتی بدن کا ایک وجیہہ نوجوان تھا اس نے جین پر ایک تیز نظر ڈالی اور اس کی بھویں تن گئیں۔ "تنہا ہی آئی ہو؟" اس نے ملائمت سے کہا۔

جین گھوڑے سے اترتے ہوئے بولی۔ "کچھ کہنے سے پہلے میری بات سن لینا۔"

"اندر چلو..." اس نے استہزائیہ انداز میں کہا اور جین منہ بناتی ہوئی اس کے ساتھ اندر چلی گئی۔ دن کی روشنی میں وہ کمرہ خاصا کشادہ اور نفیس دکھائی دے رہا تھا۔ ڈیوڈ اس کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ جین نے محسوس کیا کہ وہ پرشوق نظروں سے اس کا جائزہ لے رہا ہے۔

"میں سمجھ گئی ہوں کہ تم مجھے احمق کیوں سمجھ رہے تھے۔" وہ دھیمی آواز میں بولی۔

"گویا تم نے وہ قبر دیکھ لی ہے۔"

"مگر میں نے رات کو جو کچھ بھی کہا تھا وہ حرف بہ حرف درست ہے۔ ٹھہرو! میں تمہیں شروع سے بتاتی ہوں۔ میں اور ایلین کالج میں ساتھ پڑھتے تھے وہیں اتفاقی طور پر معلوم ہوا کہ ہم دور کے رشتہ دار بھی ہیں۔ ہم دونوں میں گہری دوستی ہوگئی۔ وہ بے حد موڈی لڑکی تھی، جادو اور مافوق الفطرت چیزوں پر بھی اسے یقین تھا۔ پھر ہم جدا ہوکر اپنی اپنی مصروفیات میں کھوگئیں لیکن کبھی کبھار ہمارے درمیان خطوط کا تبادلہ ہوجاتا تھا۔ پھر مجھے اس کا ایک خط ملا کہ وہ شادی کرنے والی ہے۔ یہ تین سال پہلے کی بات ہے اس کے بعد ایلین نے کبھی اس کا تذکرہ نہیں کیا۔" یہ کہنے کے بعد اس نے ڈیوڈ کو آدھی رات کو ملنے والی فون کال، اسٹارلیٹ کے کاغذات اور گمنام آدمی کی دھمکی کے بارے میں بتایا۔

"میں نہیں مانتا۔" ڈیوڈ نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "یہ سب یا تو تمہارا واہمہ ہے یا پھر کسی نے ایلین کے نام پر تمہیں بے وقوف بنایا ہے۔"

"یہ ناممکن ہے۔ خود ایلین نے فون پر مجھ سے باتیں کی ہیں کالج کے زمانے کی، جن سے ہم دونوں کے سوا کوئی بھی واقف نہیں ہوسکتا۔"

"اس نے یہ باتیں کسی اور سے کی ہوں گی اور اس نے..."

"وہ ایلین ہی تھی، مسٹر ڈیوڈ۔" جین سختی سے بولی۔ "اس نے مجھے یہاں آنے کی درخواست کی تھی اور کہا تھا کہ اسے میری ضرورت ہے۔ پھر اس نے مجھے اسٹارلیٹ کے کاغذات بھی بھجوائے تھے۔"

"تمہاری باتیں میری سمجھ میں تو نہیں آرہیں۔ تم مجھے رات کی تاریکی میں، دلدل میں پھنسی ہوئی ملیں اور اب ایسی کہانی سنا رہی ہو جس کا میرے خیال میں کوئی سر پیر ہی نہیں ہے۔ کیا تمہارے خیال میں یہ باتیں پراسرار نہیں ہیں؟"

جین چند لمحوں تک خاموش بیٹھی زمین تکتی رہی پھر بولی۔

"پُراسرار ہیں یا نہیں لیکن میں اس بات کی تہ تک پہنچ کر رہوں گی۔ مجھے یہاں سواری کی ضرورت پڑے گی۔ کیا تم مجھے اپنا گھوڑا کرائے پر دے سکتے ہو؟"

"اوہ۔۔۔" ڈیوڈ نے آنکھیں سکیڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ "میں نے یہ کام پہلے کبھی نہیں کیا، ویسے تمہارے خیال میں گھوڑے کا کیا کرایہ ہونا چاہیے؟"

"دس ڈالر فی ہفتہ۔" وہ بولی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ٹھیک ہے، لے جاؤ۔" وہ بھی اس کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور دونوں باہر آ گئے۔

"اگر ایسی چھوٹی سی جگہ بھی کوئی مرتا ہے تو اس کا ریکارڈ وغیرہ تو رکھا جاتا ہو گا۔" اس نے گھوڑے کے پاس رک کر دریافت کیا۔

"ہاں۔" ڈیوڈ بھاری آواز میں بولا۔ "اس سڑک پر جاؤ تو میناائی نام کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ وہاں بین کولہان نامی ایک وکیل ہے۔ میرے خیال میں بیرون آئی لینڈ پر قانونی نوعیت کے سارے کام وہی کرتا ہے۔ تمہاری دوست ایلین کی طرح وہ بھی بنیادی طور پر اسی جزیرے کا باشندہ ہے۔"

"شکریہ مسٹر ڈیوڈ۔" وہ بولی اور دوبارہ اس کی طرف دیکھے بغیر گھوڑے پر سوار ہو گئی۔

ڈیوڈ اپنے گھر کی طرف مڑ گیا۔

○ ○

یہ سڑک پہلی سڑک کے مقابلے میں زیادہ کشادہ تھی۔ اس کے ایک جانب دور سمندر کا پانی موجیں مار رہا تھا اور دوسری جانب شاداب جنگل سر اٹھائے کھڑا تھا۔ پھر جنگل پیچھے ہٹنے لگا اور وہ ایک میدانی جگہ پہنچ گئی۔ جہاں ایک پرانے گرجے کی عمارت تھی۔ اس کے سنہرے کلس دھوپ میں چمک رہے تھے۔ سڑک کے قریب ہی پادری کے لباس میں ایک بوڑھا آدمی ایک دراز قد نیگرو سے باتیں کر رہا تھا۔

"صبح بخیر!" جین نے ان کے قریب پہنچ کر کہا۔

پادری کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ "تو وہ تم ہو۔" پادری زہریلے لہجے میں بولا اور سرخ سرخ آنکھوں سے جین کو گھورنے لگا۔

"میرا نام جین مورلسین ہے۔" اس نے جلدی سے اپنا تعارف کرایا۔

"تم اسٹارلیٹ میں آئی ہو اور تم نے ہی وہ بے ہودہ کیبل گرام بھیجا تھا۔" پادری بدستور تلخی سے کہہ رہا تھا۔ "یہاں کوئی نہیں چاہتا کہ اسٹارلیٹ دوبارہ آباد ہو۔ تم نے شاید کیبل گرام بھیج کر خود کو بہت ذہین سمجھا ہو مگر یہ تمہاری بھول ہے۔"

"میرے کیبل گرام میں کیا خرابی ہے؟" جین نے نرمی سے دریافت کیا۔ "کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ایلین مر چکی ہے؟"

"یقیناً اسے مرے ہوئے تین سال کا عرصہ گزر گیا ہے۔ اس کی آخری رسوم میں نے ہی ادا کی تھیں۔" وہ بُری طرح چلّایا۔۔۔ پھر مڑ کر گرجا کی طرف بڑھ گیا۔

"ریورنڈ ہالڈ بین کچھ سنکی قسم کے آدمی ہیں۔" دراز قد نیگرو نے کہا۔

"تو یہ ریورنڈ ہالڈ بین ہے!" جین نے ایک لمبی سانس لے کر کہا۔ "اور یہ چرچ انہی کا ہے؟ کیا یہاں کے لوگ چرچ میں آتے ہیں؟"

"ہاں۔ جب سے یہ پادری آئے ہیں، لوگ چرچ میں آنے لگے ہیں لیکن میں نے آج تک انہیں اتنے غصے میں کبھی نہیں دیکھا"

"نہ جانے کیوں مجھے دیکھتے ہی وہ برہم ہو گیا تھا۔ کیا تمہیں بھی میرے کیبل گرام کا علم ہے؟"

"ہاں۔ مسٹر سوم یہاں کے پارٹ ٹائم پوسٹ ماسٹر ہیں۔ کیبل گرام انہی کے پاس آیا تھا۔ وہ ذرا باتونی قسم کے آدمی ہیں انہوں نے یہ بات پورے قصبے میں پھیلا دی۔"

"کیا تم بھی یہیں رہتے ہو؟" جین نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔ میرا نام ہنری کارٹر ہے۔ آپ مجھے یہاں کی سیاہ فام آبادی کا غیر سرکاری میئر بھی کہہ سکتی ہیں۔" کارٹر مسکرا کر بولا۔

"پھر تو تم بڑے اہم آدمی ہوئے۔ کیا تمہیں بھی یقین ہے کہ ایلین مر چکی ہے؟"

"میں خود اس کی تدفین میں شریک ہوا تھا۔"

"اوہ، کارٹر۔ کیا تم کل کسی وقت اسٹارلیٹ آنا پسند کرو گے؟"

"بڑی خوشی سے۔"

"اس وقت میں میناائی کی طرف جا رہی ہوں۔ اگر چلنا ہو تو آ جاؤ۔"

"نہیں شکریہ۔ مجھے کچھ کام ہے۔" نیگرو نے کہا اور الوداعی الفاظ کہہ کر گرجے کی مخالف سمت چل دیا۔

▲

قصبے کے آثار نظر آنے لگے۔ سارے ہی مکانات بڑی ترتیب سے بنے ہوئے تھے۔ وہ چوراہے میں پہنچ گئی اور پھر ایک عمارت کے سامنے رک گئی۔ عمارت کی ایک کھڑکی پر "بین کولہان۔ اٹارنی، ٹاؤن کلرک، نوٹری پبلک" کی تختی لگی ہوئی تھی۔ قریب ہی دوسرے دروازے پر "ڈاکٹر ڈی کریڈش" کے نام کا بورڈ چمک رہا تھا۔ وہ آگے بڑھ گئی۔ ذرا دور دائیں جانب ایک چھوٹی سی عمارت پر پوسٹ آفس لکھا ہوا تھا۔ وہ گھوڑے کو گیٹ پر چھوڑ کر اندر گھس گئی۔ ڈیسک کے پیچھے ایک بوڑھا بیٹھا ہوا تھا اس نے متجسس نظروں سے جین کی طرف دیکھا۔

"کیا آپ ہی مسٹر سوم ہیں؟" اس نے پوچھا۔ بوڑھے نے اثبات میں سر ہلایا۔ "میرا نام جین مورلسین ہے۔ میں نے ایک کیبل گرام بھیجا تھا۔ جو شاید تم نے ڈیلیور نہیں کیا۔"

"اوہ۔ ہاں ہاں یقیناً۔" بوڑھا قدرے گھبرا گیا۔ اس نے دراز کھولی اور ایک لفافہ نکال کر جین کی طرف بڑھا دیا۔ یہ اسی کا کیبل گرام تھا۔

وہ لفافہ کھول کر پڑھنے لگی۔

"میری ایلین، پچھلی رات سے تمہاری فون کال
کے بارے میں سوچتی رہی ہوں۔ میں آ رہی ہوں
جمعرات کی شام تک پہنچ جاؤں گی پھر تفصیل سے
گفتگو کریں گے۔ تمہاری جین۔"

"بڑی عجیب بات ہے۔ ہے نا؟" بوڑھا بولا۔ "تمہیں شاید اس کے بارے میں معلوم نہیں ہو سکا تھا۔" وہ قدرے گھبرا رہا تھا۔

جین بغیر کچھ کہے دروازے کی طرف مڑی۔۔۔ پھر دہلیز پر رک کر اس نے بوڑھے پر ایک نظر ڈالی اور باہر آ گئی۔ اب اس کا رخ ڈاکٹر کریڈش کے دواخانے کی طرف تھا۔ کلینک کی حالت بتا رہی تھی جیسے ساٹھ سال سے اس میں کوئی تبدیلی نہ کی گئی ہو۔ انتظار گاہ میں کچھ پرانی سی کرسیاں اور بنچیں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ بیٹھ گئی۔ شیشے کے دروازے سے ایک نرس اندر آئی اور ایک مریض کو بلا کر اندر لے گئی۔ اپنی باری آنے پر جین اندر گئی تو ایک کشادہ میز کے پیچھے ڈاکٹر بیٹھا دکھائی دیا۔ وہ دبلا پتلا اور جھکے ہوئے شانوں والا آدمی تھا۔

"میرا نام جین مورلسین ہے۔" وہ بولی۔ "مجھے کچھ معلومات درکار ہیں۔"

"کس قسم کی معلومات؟" وہ چونک پڑا اور اس کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ "میرے پاس وقت نہیں ہے۔ آج میں بے حد مصروف ہوں۔" وہ ہاتھ لہرا کر بولا۔

"میں تمہاری فیس ادا کر دوں گی اور بہت تھوڑا وقت لوں گی۔ میں میری ایلین ٹوڈ کی فرضی موت کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔"

"فرضی موت؟" ڈاکٹر چلّایا۔ "کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"مطلب بعد میں بتاؤں گی۔ کیا تم نے ہی اس کی موت کی تصدیق کی تھی اور سرٹیفکیٹ جاری کیا تھا؟"

"ہاں۔" ڈاکٹر بولا اور دراز کھول کر کاغذات الٹ پلٹ کرنے لگا۔۔۔ پھر ایک سرٹیفکیٹ نکال کر جین کی طرف بڑھا دیا۔ "یہ دیکھو یہ رہا اس کی موت کا سرٹیفکیٹ۔"

جین نے سرٹیفکیٹ دیکھا۔ اس پر موت کی تاریخ ۱۸ جولائی ۱۹۶۹ء پڑی ہوئی تھی۔ وہ ڈاکٹر کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ "تم نے اس کا پوسٹ مارٹم بھی کیا ہو گا۔" وہ نرمی سے بولی۔ "اس کا ریکارڈ بھی ہو گا اور لاش محفوظ رکھنے کی دوا بھی لگائی ہو گی۔"

"نہیں۔ ان باتوں کی کوئی ضرورت نہیں تھی کیونکہ نہ تو وقت تھا اور نہ ہی اتنے اخراجات کی گنجائش تھی۔ چنانچہ اسے ویسے ہی دفن کر دیا گیا۔"

"ایلین کی تدفین حادثے کے کتنی دیر بعد ہوئی تھی؟"

"ٹھیک سے یاد نہیں۔۔۔" ڈاکٹر کسمسا کر بولا۔ "دوسرے دن کسی وقت۔۔۔"

جین نے سرٹیفکیٹ کی طرف دیکھا اور بولی۔ "اس پر موت کا وقت رات ڈیڑھ بجے لکھا ہوا ہے۔" یہ کہہ کر وہ خاموشی سے ان حروف کو گھورنے لگی۔ اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے تھے۔ رات کو ڈیڑھ بجے گھڑسواری کا حادثہ۔۔۔ وہ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔۔۔ پھر ڈاکٹر کی طرف دیکھا تو اس کے ہونٹ کچھ کہنے کے لیے لرز رہے تھے۔

"تین سال بعد ایلین کی موت سے تمہاری دلچسپی کا سبب میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔" ڈاکٹر بولا۔

"جلد ہی اس کا سبب بھی بتا دوں گی ڈاکٹر۔ کتنی فیس ہوئی؟" اس نے اپنا پرس کھولتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔ کچھ نہیں۔۔۔" ڈاکٹر جلدی سے بولا اور خود بھی کھڑا ہو گیا۔

جین نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کلینک سے باہر آ گئی اور کچھ ہی دیر بعد وکیل بین کولہان کے دروازے کے سامنے کھڑی تھی۔ جین نے کواڑ دھکیلنے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ دروازہ اندر کی طرف کھلا اور وہ مسکراتی ہوئی آنکھوں، دراز قامت اور دلکش نقوش والے ایک آدمی کی گرفت میں پہنچ گئی۔

"میرا خیال ہے تم مجھ ہی سے ملنے آ رہی تھیں؟"

"ہاں۔ بشرطیکہ تم بین کولہان ہو۔" وہ سنبھل کر بولی۔ اس کی شخصیت اور چمکدار آنکھیں اسے مسحور کر رہی تھیں۔

"خوش قسمتی سے میں ہی بین کولہان ہوں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اندر آ جاؤ۔" وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

جین دفتر میں داخل ہو گئی اور پھر اس کا اشارہ پا کر ایک

کُرسی پر بیٹھ گئی۔ بین نے اس کے سامنے والی کُرسی سنبھالی۔ "تمھارا کیبل گرام میں نے بھی پڑھا تھا۔" وکیل بولا۔ "اگر مجھے علم ہوتا کہ تم اس قدر حسین ہو تو میں اور بے چینی سے تمھارا انتظار کرتا۔"

"شکریہ۔" وہ دھیرے سے مسکرا دی۔ "تم یقیناً مجھے پاگل سمجھ رہے ہو گے لیکن میں تمھیں بتاؤں گی کہ کن حالات کے تحت میں نے وہ کیبل گرام بھیجا تھا۔" ... پھر اس نے نہایت اطمینان سے بین کو آدھی رات کی فون کال اور اسٹار لیٹ کے کاغذات کی داستان سُنا دی۔

"اوہ... تو اسی وجہ سے وہ دستاویز تمھیں نہیں مل سکی تھیں۔" بین نے کہا۔ "مگر..." اس کی آنکھوں میں اُلجھنیں اُتر آئیں۔ "میری ایلین مر چکی ہے۔ حادثے کے بعد سب سے پہلے میں ہی اس کے پاس پہنچا تھا اور میں نے ہی ڈاکٹر کریڈش کو بلوایا تھا۔ میں اس کی تدفین کے وقت بھی موجود تھا۔"

"اسے بڑی جلدی میں دفن کر دیا گیا اور اُسے جسم کی حفاظت کے لیے دوائیں بھی نہیں لگائی گئی تھیں؟" جین نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"ہاں..." وہ اداس ہو گیا۔ "میری ایلین میرے لیے ایک خاص اہمیت رکھتی تھی۔ میں بے حد پریشان ہو گیا تھا اور چاہتا تھا کہ جلد از جلد اس المناک کام کو سرانجام دے دیا جائے۔ اس کی موت کے بعد کی قانونی کارروائی بھی مجھے ہی کرنی پڑی تھی۔" وہ اُٹھا اور الماری سے ایک فائل نکال لایا... پھر اس نے فائل کھول کر جین کے سامنے رکھ دی۔ "یہ اس کی موت، تدفین اور اس کے بعد کی کارروائی کے سرکاری کاغذات ہیں۔"

جین انھیں پڑھنے لگی۔ میری ایلین کو اگلی صبح ساڑھے سات بجے دفن کیا تھا... اس کی موت کے صرف چھ گھنٹے بعد... اس کے ذہن میں ہزاروں سوالات کلبلانے لگے اس نے کاغذات سے نظریں ہٹا کر بین کی طرف دیکھا اور بولی۔ "لیکن وہ میری ایلین ہی تھی جو مجھے راتوں کو فون کیا کرتی تھی۔"

بین کے چہرے پر اداسی کی تہ کچھ اور گہری ہو گئی۔ وہ اس کے قریب آیا اور آہستگی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "نہیں... یہ ناممکن ہے۔" اس نے بھاری آواز میں کہا۔ "میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ میری ایلین مر چکی ہے اور ہم نے اسے دفن کر دیا تھا۔ بہرحال، میں ہر طرح سے تمھاری مدد کرنے کو تیار ہوں۔"

"شکریہ۔" جین دھیرے سے بولی۔ "میں اس معاملے پر غور کروں گی۔ فی الحال میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔"

"ایک اچھا ڈنر اور گہری نیند تمھارے دماغ کو پُرسکون کر دے گی۔" وہ بولا اور پھر آہستگی سے مسکرا دیا۔ "آج رات میرے ساتھ ڈنر کے بارے میں کیا خیال ہے؟ میں سات بجے آ کر تمھیں لے جاؤں گا۔"

جین ایک لمحے کے لیے ہچکچائی پھر بولی۔ "میں انتظار کروں گی۔" یہ کہہ کر وہ کھڑی ہو گئی۔

بین اس کے ساتھ باہر آ گیا۔ دونوں اس طرف بڑھے جہاں جین کا گھوڑا کھڑا تھا۔

"تو یہ تم تک بھی پہنچ گئی۔" ان کے عقب سے ایک بھاری آواز سُنائی دی۔

دونوں ٹھٹک گئے اور پلٹ کر دیکھنے لگے۔ پادری ہالڈین اپنی زہریلی آنکھیں جین پر گاڑے کھڑا تھا۔ اس کے قریب ہی ایک موٹی سی عورت کھڑی تھی۔ عورت کے چہرے پر بھی پادری کی طرح خشونت بکھری ہوئی تھی۔

"ہیلو ریورنڈ اور مسز ہالڈین۔" بین نے بلند آواز میں کہا اور ان کی طرف بڑھ گیا۔ "ہاں، مس جین مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتی تھیں۔"

"بکواس۔ بالکل فضول۔" پادری مُنہ بنا کر بولا۔

"آخر آپ میری آمد سے اس قدر کیوں پریشان ہو رہے ہیں؟" جین پادری سے یہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

"جیسے تمھیں معلوم ہی نہیں ہے۔" پادری تلخی سے بولا۔ "میری ایلین کو مرے ہوئے تین سال ہو چکے ہیں اور تم گڑے مُردے اکھاڑنے آئی ہو۔"

"پلیز ریورنڈ۔" بین ہاتھ اُٹھا کر بولا۔ "اتنی تلخی کی ضرورت نہیں۔ جلد ہی معاملات صاف ہو جائیں گے لگتا ہے جیسے کسی نے اس بے چاری سے بھیانک مذاق کیا ہے۔ یہ کسی پر کوئی الزام لگانے تو نہیں آئی ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ دیکھیں گے یہ کیا کرتی ہے۔" پادری نے کہا اور اپنی بیوی کا ہاتھ تھام کر پوسٹ آفس کی طرف بڑھ گیا۔

"بھول جاؤ جین۔" بین نے اُسے تسلّی دی۔ "خود ہی چُپ ہو جائے گا۔ دراصل اسے مافوق الفطرت باتوں اور بھوت پریت وغیرہ سے نفرت ہے۔ تم تو آج رات کے ڈنر کے بارے میں سوچو۔"

جین نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو گئی اور ہاتھ لہرا کر قصبے سے باہر جانے والی سڑک پر مُڑ گئی۔ پادری ہالڈین کا غصّہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس کی کیفیت ہسٹریائی تھی یا وہ کسی بات سے بے حد خوفزدہ تھا۔

اسٹار لیٹ آ کر اس نے نچلی منزل کا جائزہ لیا اور پھر وہیں ایک کمرہ اپنے لیے درست کر لیا۔ دوپہر کے وقت سام اس کا سامان لے آیا تو وہ خوش ہو گئی۔ سام ہی سے اس نے تھوڑا بہت کھانے پینے کا سامان بھی منگوا لیا اور لنچ کے بعد کچھ دیر کے لیے لیٹ گئی۔ شام کو اُٹھ کر اس نے غسل کیا اور دوسرا جوڑا پہن لیا۔

اچانک اس نے باہر کسی کار کے رُکنے کی آواز سُنی۔ بین کو لہان اسے ڈنر پر لے جانے کے لیے آ گیا تھا۔ اس نے دوڑ کر دروازہ کھول دیا۔ بین اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ اس نئے لباس میں پہلے سے کہیں زیادہ حسین نظر آ رہی تھی۔ "تم... تم نے تو اس ویران مکان کی بھی قسمت جگا دی ہے۔"

"اوہ۔ نہیں۔" وہ ہنس پڑی۔ "آؤ چلیں۔" اس نے بین کا ہاتھ تھام لیا۔

"ایک بات مسلسل میرے ذہن میں چُبھ رہی ہے۔" وہ اسٹیرنگ کے پیچھے بیٹھتے ہوئے بولا۔ "تم کہتی ہو کہ تمھیں صرف چند روز پہلے اسٹار لیٹ کے کاغذات ملے ہیں۔ آخر وہ کاغذات اتنے عرصے تک کہاں تھے؟"

"میرے ذہن میں تو اس جیسے درجنوں سوالات ہیں، جو مجھے پریشان کیے ہوئے ہیں۔" جین یکایک سنجیدہ ہو گئی۔

بین نے کار اسٹارٹ کی اور اسے سڑک پر لے آیا۔ "اسٹار لیٹ کے بارے میں اب تمھارے کیا ارادے ہیں؟" اس نے پوچھا۔ "کیا تم اپنے خاندان کے ساتھ مستقلاً یہیں قیام کرنا چاہتی ہو؟"

"میرا خاندان۔" وہ ایک طویل سانس لے کر بولی۔ "میں بھی ایلین کی طرح دُنیا میں تنہا ہوں۔ باپ چند سال پہلے ایک حادثے کا شکار ہو گیا تھا اور ماں میرے بچپن ہی میں مر گئی تھی۔ اب جب تک شادی نہیں کر لیتی میرا خاندان کیسے بن سکتا ہے۔"

"تم جیسی لڑکی کے لیے شادی کون سا مشکل کام ہے۔" وہ اس کی طرف شوخ نظروں سے دیکھنے لگا تو جین بھی مسکرا دی۔

"میرے خیال میں تم نے اسٹار لیٹ تو خوب اچھی طرح دیکھا ہو گا؟" جین نے قدرے توقف سے پوچھا۔ بین نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "میں آج اس کی نچلی منزل کا جائزہ لے رہی تھی۔ وہاں ہر طرف گرد جمی ہوئی تھی اور مین ہال کے پاس چھوٹی سی اسٹڈی میں اس قسم کے نشانات تھے جیسے وہاں سے کوئی بھاری چیز ہٹائی گئی ہو۔ کیا تم اس کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہو؟"

"ہاں۔ وہاں ٹوڈ خاندان کی ایک قدیم تجوری رکھی ہوئی تھی۔" بین نے بتایا۔ "میں عدالت کی اجازت سے وہ تجوری وہاں سے اُٹھوا لے گیا تھا۔ اسے کھلوایا تو اس میں پُرانے کاغذات، چند بل، کچھ رقم اور ایسی ہی دو چار ناقابلِ ذکر چیزیں تھیں۔ رقم تو کفن دفن کے اخراجات میں کام آ گئی۔ اس میں مکان کے کاغذات نہیں تھے، جنھیں اس تجوری میں ہونا چاہیے تھا۔"

جزیرے کے دوسری جانب ایک دو منزلہ عمارت استادہ تھی جسے ہوٹل میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ وہ جین کے ساتھ وہاں پہنچا اور کھڑکی کے قریب ایک میز پر بیٹھ کر کھانے کا آرڈر دے دیا۔ کھانے کے بعد آرکسٹرا شروع ہو گیا۔ چند جوڑے فرش پر اُتر گئے۔ جین بھی اس کے ساتھ اُٹھی اور رقص میں شامل ہو گئی۔ بین کے ہاتھ کے لمس سے اُسے اپنے جسم میں سنسنی آمیز لہریں دوڑتی محسوس ہونے لگیں۔

رات گئے وہ واپس اسٹار لیٹ آ گئے۔ جین کار سے اُتری اور بین کی طرف جھک گئی۔ "اس حسین رفاقت کا شکریہ۔" وہ گنگنائی اور پلٹ کر دروازے کی طرف چل دی۔

"کل آؤں گا جین۔" اس نے بلند آواز میں کہا اور کار موڑ کر قصبے کی جانب روانہ ہو گیا۔

جین نے دروازہ اچھی طرح بند کیا اور اس کمرے میں آ گئی جسے اس نے دن میں استعمال کے لیے درست کیا تھا۔ ذرا ہی دیر بعد وہ بین اور ایلین کے خیالوں میں اُلجھی ہوئی، نیند کی آغوش میں پہنچ گئی۔ آخری بات جو اس کے ذہن میں پھانس کی طرح چبھ رہی، یہ تھی کہ اگر ایلین زندہ ہے تو سامنے آ کر ان لوگوں کی غلط فہمی دُور کیوں نہیں کر دیتی؟

ابھی اُسے سوئے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اچانک اس کی آنکھ کھُل گئی۔ اس کا بدن پسینے میں شرابور تھا۔ وہ چند لمحوں تک ساکت لیٹی رہی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کمرے میں تنہا نہیں ہے۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا اندر کی کنڈی چڑھی ہوئی تھی۔ اس نے کُہنی کے بل اُٹھ کر کھڑکی پر نظر ڈالی تو کوئی چیز پرندے کی طرح پھڑپھڑاتی ہوئی نیچے غائب ہو گئی۔

جین اُچھل کر بستر سے اُتری اور کھڑکی کی طرف لپکی۔ اس نے باہر کی تاریکی میں دیکھا۔ بادلوں سے ڈھکے ہوئے چاند کی مدھم روشنی میں ایک سایہ سا متحرک تھا کوئی گھاس سے گزرتا ہوا جھاڑیوں اور درختوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے جھٹکے سے کھڑکی کھول دی۔ "رُک جاؤ!" وہ چلّائی۔ "ادھر آؤ۔"

سایہ درختوں کے قریب پہنچ گیا تھا جین کھڑکی پر چڑھی اور دوسری جانب کُود گئی۔ اس کے ننگے پیر بھیگی ہوئی گھاس پر پڑے اور وہ تیزی سے اس سائے کی طرف دوڑتی ہوئی درختوں تک پہنچ گئی

یکایک چاند، بادلوں کی اوٹ سے نکل آیا۔ فضا میں جھینگروں نے اپنا ابدی راگ چھیڑ رکھا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی آواز یا کوئی آہٹ نہیں تھی اور نہ ہی وہ سایہ کہیں دکھائی دے رہا تھا۔ وہ مایوس ہو کر کھڑکی کے ذریعے واپس اپنے کمرے میں آئی اور کھڑکی بند کر کے بستر پر دراز ہو گئی۔ نہ جانے کون تھا آخر یہ کیا اسرار ہے؟ وہ دیر تک ان سوالوں کے گرداب میں پھنسی رہی... پھر اس کی آنکھ لگ گئی۔ صبح اُس کی آنکھ کھلی تو دھوپ کمرے میں آ گئی تھی۔ وہ کاہلی سے اُٹھی اور مُنہ ہاتھ دھو کر ہال میں آ گئی اور پھر جیسے ہی اس کی نگاہ ہال کے ایک دروازے پر پڑی، وہ بُری طرح چونک پڑی۔ ہال کا وہ دروازہ نیم وا تھا۔

اس نے دروازہ کھولا اور اندر دیکھا۔ یہ تہ خانے کا دروازہ تھا۔ لکڑیوں کا زینہ نیچے تک جا رہا تھا۔ چند لمحوں تک وہ وہیں کھڑی نیچے تاریکی میں دیکھنے کی کوشش کرتی رہی... پھر زینے اُترنے لگی۔ پانچ چھ زینوں کے بعد ایک موڑ آ گیا۔ اس نے نیچے کی طرف دیکھا۔ باہر کی دھوپ کھڑکی پر پڑ کر اندر مدّھم سا اجالا پھیلا رہی تھی۔ وہ اور نیچے اُتری... پھر اس کے حلق سے ایک بے ساختہ چیخ نکل گئی۔

اس کے پیروں سے نیچے والا تختہ ٹوٹ گیا تھا اور وہ نیچے گر رہی تھی۔

اس نے پاگلوں کی طرح ہاتھ لہرائے تو اچانک ایک تختہ اس کے ہاتھ آ گیا اور وہ اس سے لٹک گئی۔ اس نے سانس روک کر نیچے دیکھا تو پھر چیخ پڑی۔ اس کے ٹھیک نیچے فرش پر نوکیلے اوزار رکھے ہوئے تھے اور ایک فولادی دھار سوراخ سے آنے والی مدّھم روشنی میں چمک رہی تھی۔ پھاوڑے، کُدالیں اور نہ جانے کیا کیا وہاں رکھا ہُوا تھا۔

لٹکے لٹکے اس کے بازو دُکھنے لگے۔ ان میں آگ سی بھرنے لگی جو بتدریج پورے جسم میں پھیلتی جا رہی تھی۔ اس نے تختے پر انگلیوں کی گرفت مضبوط کر کے اوپر اٹھنا چاہا مگر جلد ہی اسے احساس ہو گیا کہ وہ ایسا نہیں کر سکتی۔ اس کے ذہن میں آندھیاں سی اُٹھنے لگیں۔ یقیناً کوئی تھا جس نے اُسے پہلے تو یہاں آنے سے روکنے کی کوشش کی تھی لیکن اب اس کو قتل کرنے کے درپے تھا۔ اس نے سر جھٹک کر آنکھوں تلے پھیلتے اندھیرے کو دُور کیا لیکن وہ اس طرح کب تک لٹکی رہ سکتی تھی۔ اس کے بازو شل ہونے لگے تھے اور انگلیاں چیخ رہی تھیں۔

"خدایا!" اس کے مُنہ سے ایک سسکی نکلی۔

معاً اس نے خواب کی سی کیفیت میں ایک آواز سُنی۔

"کوئی ہے!"

اس کا غنودہ ذہن ایک دم سے بیدار ہو گیا وہ اس لہجے کی کھنک سے مانوس تھی۔ "اوہ۔ ادھر" وہ پوری قوت سے چیخ پڑی "نیچے... تہ خانے میں... پلیز جلدی..." اور پھر وہ اس وقت تک چیختی رہی جب تک کہ قدموں کی آواز تہ خانے کے دروازے تک نہیں آ گئی۔

وہ ڈیوڈ ہی تھا۔ اس نے فوراً ہی صورت حال کا جائزہ لیا اور اوپر والے تختے پر گھٹنا ٹکا کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ پھر وہ کھنچتی ہوئی اوپر چلی آئی۔ اس نے اپنا سارا وزن ڈیوڈ پر ڈال دیا تھا۔ وہ اُسے اُٹھا کر ہال میں لے آیا اور آہستگی سے ایک صوفے پر لٹا دیا۔

"شکریہ..." اس کے مُنہ سے ایک سسکی نکل گئی۔ "لگتا ہے جیسے دُنیا کے سارے حادثات مجھ ہی پر پیش آئیں گے۔"

وہ بدستور غیر جذباتی آواز میں بولا۔ "تمھیں ہر وقت ایک نگران کی ضرورت ہے۔"

"یہ منظّم حادثے ہیں جو میری جان لینے کے لیے ترتیب دیے جا رہے ہیں۔"

"ڈیوڈ مُنہ بنا کر رہ گیا۔ "وہم کا کسی کے پاس کوئی علاج نہیں۔"

جین اس بے حسی پر دل ہی دل میں رو پڑی۔ "یہ واہمہ نہیں ہے۔" وہ تیز لہجے میں بولی۔ "کوئی مجھے اس راز کی تہ تک پہنچنے سے روکنا چاہتا ہے۔ میری کار کا ٹائر گولی سے پھاڑ دیا گیا تھا۔ کنارے پر کشتی جان بوجھ کر باندھی گئی تھی تاکہ میں دلدل میں دھنس جاؤں۔ پھر یہ تہ خانے کا دروازہ کھلا ہُوا تھا۔ ظاہر ہے میں تجسس کی ماری اندر جاتی اور پھر... بہر حال، میں تمھاری شکر گزار ہوں۔ پچھلی رات میری کھڑکی کے باہر کوئی کھڑا مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کا تعاقب بھی کیا مگر وہ جنگل میں جا کر غائب ہو گیا۔"

"کوئی جانور ہو گا۔" ڈیوڈ نے سادگی سے کہا۔

"تم... تم کیسے آدمی ہو؟" وہ جھلا گئی۔

"میں ایک ایسا آدمی ہوں جو بھوت پریت کا قائل نہیں ہے۔ بہر حال، ان واہموں سے پیچھا چھڑا لو تو مجھ سے بات کر لینا۔ تم مجھے اچھا آدمی پاؤ گی۔ اس وقت میں تمھاری خیریت معلوم کرنے آیا تھا۔" یہ کہہ کر وہ اُٹھا اور دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

جین بھی اُٹھ کر اس کے ساتھ ہی باہر آ گئی۔ "میں ایک بار پھر تمھاری شکر گزار ہوں۔"

ڈیوڈ جیپ پر آیا تھا۔ وہ وہیل پر بیٹھا اور ہاتھ لہراتا ہُوا جیپ کو آگے بڑھا لے گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد نیگرو ہنری کار جنگل سے نکل کر لان پار

کرتا ہوا اُسے اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ جین کے چہرے پر تلخی بکھری ہوئی تھی لیکن ہنری کو دیکھتے ہی اس کی فطری خوش مزاجی عود کر آئی۔

"اس آمد کے لیے بے حد شکریہ ہنری۔" وہ مسکرا کر بولی اور دونوں ہال میں آکر صوفوں پر بیٹھ گئے۔ "دراصل مجھے اس مکان میں کچھ کام کرانا ہے اس لیے چند آدمیوں کی ضرورت ہے۔ میں نے سوچا کہ تم اس سلسلے میں کچھ مدد کر سکو تو...!"

"یقیناً مس جین۔ میں ابھی دو آدمی اور ایک عورت بھیج دوں گا۔ وہ آپ کی مرضی کے مطابق یہ جگہ ٹھیک ٹھاک کر دیں گے۔"

"مجھے ایک بڑھئی کی بھی ضرورت ہے۔ تہ خانہ کا زینہ ٹوٹا ہوا ہے۔"

"بڑھئی بھی آجائے گا... مگر یہ لوگ سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے یہاں سے چلے جائیں گے۔ آپ جانتی ہیں کہ ہم ابھی تک اپنے پرانے خوف اور بھوت پریت کے خیالوں سے چھٹکارا نہیں پا سکے ہیں۔ مس ایلین کی موت کے بعد سے لوگ اس مکان کو آسیب زدہ سمجھنے لگے ہیں۔"

"اوہ...!" وہ سنجیدہ ہوگئی۔ "مس ایلین کی موت کے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے، ہنری؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتا مس۔" نیگرو بھاری لہجے میں بولا۔ "بہت سی باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کے جواب ہمیں فوری طور پر نہیں ملتے۔ اچھا اب مجھے اجازت دیجیے۔ کام کے لیے آدمی ایک گھنٹے بعد یہاں پہنچ جائیں گے۔"

ہنری کے جاتے ہی جین نے لباس تبدیل کیا اور گھوڑے پر بیٹھ کر قصبے کی طرف روانہ ہوگئی۔

راستے میں ایک پرانی بیوک نے اسے اوورٹیک کیا۔ یہ کار گرجا کی طرف سے آئی تھی۔ جین نے دیکھا کہ اس کے اسٹیرنگ پر ڈاکٹر کریڈش بیٹھا ہوا تھا۔ قصبے میں پہنچ کر اس نے وہی کار ڈاکٹر کے کلینک کے سامنے کھڑی دیکھی۔ وہ جنرل اسٹور میں گھس گئی اور جلدی جلدی کچھ خریداری کر کے تھیلا گھوڑے کی زین سے لٹکا دیا اور بین کولہان کے دفتر میں جا پہنچی۔

"میری خوش قسمتی...!" بین کولہان اسے دیکھتے ہی خوشی سے جھوم اٹھا۔

جین نے اسے بتایا کہ وہ کچھ خریداری کے سلسلے میں آئی تھی۔ واپس جاتے وقت خیال آیا کہ اسے بھی ملتی جائے... پھر اس نے بین کو تہ خانے میں گرنے کا احوال سنایا تو وہ تڑپ اٹھا۔

"پھر کیا ہوا؟" اس نے بے تابی سے پوچھا۔

"بس بال بال بچ گئی۔ اتفاق سے ڈیوڈ ریان بروقت وہاں پہنچ گیا تھا... مگر بین یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں تھا۔" وہ سوچتی ہوئی بولی۔ "اس کے علاوہ بھی کچھ باتیں ہو رہی ہیں۔"

"تمھارا خیال ہے کوئی شخص تمھاری یہاں موجودگی کو پسند نہیں کرتا؟" اس نے نرمی سے پوچھا۔ "اور ایلین کے بارے میں کیا خیال ہے؟ کیا اب بھی تمھیں یقین نہیں آیا کہ اُسے مرے ہوئے تین سال گزر چکے ہیں؟"

"نہیں... میں اس بات سے متفق نہیں ہوں۔" جین نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "کیا ڈاکٹر کریڈش اور ریورنڈ ہالڈین آپس میں دوست ہیں؟ میں نے کچھ دیر قبل اسے چرچ سے آتے دیکھا تھا... کیوں، تم اس قدر حیران کیوں ہو رہے ہو؟"

"اوہ تو ڈاکٹر اب آیا ہے حالانکہ اس کا کلینک مریضوں سے بھرا ہوا ہے۔" بین نے کہا۔ "آج سے پہلے اس نے کبھی اتنی دیر نہیں کی۔ وہ وقت کا بے حد پابند ہے۔"

⊕

جین گھر واپس آئی تو ایک سیاہ فام عورت اور تین مرد اس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ ان سے بڑی فراخ دلی سے ملی اور سارا کام سمجھا کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس نے سوچا کہ ان کی اجرت وہ ہنری ہی سے طے کر لے گی... ہنری... وہ ایلین کی موت پر دوسروں کی طرح بضد نہیں تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ آئندہ ملاقات پر وہ اس سے تفصیلی گفتگو کرے گی۔ وہ بہت سارے بلب بھی خرید لائی تھی۔ اس نے لائبریری، ہال اور بالائی منزل میں بلب لگا دیے۔

سورج غروب ہونے سے پہلے مزدور چلے گئے۔ جین نے کافی بنائی اور آتش دان کے قریب بیٹھ کر پینے لگی... پھر اس نے باہر فورڈ کی آواز سنی۔ یہ بین کولہان کی گاڑی تھی۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو بین نے مسکرا کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "کس قدر حسین شام ہے۔" اس نے ادھر ادھر دیکھے بغیر ہی کہا۔

"یقیناً... مگر میرے ذہن پر بادل چھائے ہوئے ہیں۔" جین بڑبڑائی۔

"اوہ جین۔ تم بے فکر رہو ہم ضرور اس راز کی تہ تک پہنچ جائیں گے۔" اس نے یقین دلاتے ہوئے کہا اور دونوں صوفوں پر بیٹھ گئے۔

جین نے کافی کی پیالی بھر کر اس کے سامنے رکھ دی۔ "میں نے شام کو بجلی اور فون کمپنیوں کو فون کیا تھا۔" جین نے کہا۔ "انھوں نے بتایا ہے کہ ایلین کی موت سے تین ہفتے پہلے انھیں ایک بڑی رقم ملی تھی جو تین سال کے بلوں سے کچھ زیادہ ہی ہے۔"

بین نے حیرت آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ "یہ کس کا کام ہو سکتا ہے، جین؟" وہ بے یقینی سے بولا۔

"میرے خیال میں تو تمھیں علم ہونا چاہیے تھا۔" وہ شانے اچکا کر بولی۔

"میں بھی تاریکی میں ہوں جین۔" اس نے کہا اور سوچ میں پڑ گیا۔ "جین یہاں تمھاری جان کو خطرہ لاحق ہے تو تم واپس کیوں نہیں چلی جاتیں۔ یہ معاملات مجھ پر چھوڑ دو جیسے ہی مجھے کچھ علم ہوگا میں تمھیں مطلع کر دوں گا۔"

"نہیں... میں نہیں جا سکتی۔ میں نے ایلین سے مدد کا وعدہ کیا ہے اور میں اس وعدے کو ہر حال میں نبھاؤں گی۔"

"وعدہ؟ ایک ایسی ذات سے وعدہ جو تین سال پہلے قبر میں جا سوئی ہے۔ جین تم بڑی ہی عجیب لڑکی ہو۔"

"اب جیسی بھی ہوں تمھارے سامنے ہوں۔" وہ دھیرے سے بولی۔ "میں یہ کام ادھورا چھوڑ کر بھاگنا نہیں چاہتی۔"

بین نے کافی ختم کی اور کھڑا ہو گیا۔ "اچھا جین جیسے تمھاری مرضی مگر میری ایک درخواست ہے۔ مجھ سے رابطہ منقطع نہ کرنا۔ میں تمھاری طرف سے بے حد فکر مند ہوں۔" وہ باہر آکر اپنی فورڈ میں بیٹھ گیا اور تھوڑی ہی دیر بعد اس کی کار سڑک پر دوڑ رہی تھی۔

جین نے دروازہ بند کر لیا اور اندر آکر صوفے پر بیٹھ گئی۔ "اگر ایلین مر گئی ہے تو پھر مجھے فون کون کیا کرتا تھا؟" اس نے سوچا۔ "کالج کے زمانے کی خفیہ باتیں ایلین کسے بتا سکتی تھی؟ وہ کس پر اتنا اعتماد کر سکتی تھی؟" اسے پادری کی سخت چہرے والی بیوی یاد آگئی۔ "شاید ایلین نے اس بڑھیا پر اعتماد کیا ہو اور اس کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا ہو۔ شاید اتنے عرصے تک مکان کے کاغذات اسی نے دبا رکھے ہوں... پھر جب وہ ان سے فائدہ نہ اٹھا سکے تو مجھے ارسال کر دیے ہوں۔" انھی خیالوں میں ڈوبی وہ اپنے کمرے میں آگئی اور لباس بدل کر بستر پر لیٹ گئی۔

باہر رات کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ جلد ہی وہ نیند کی وادی میں کھو گئی لیکن پچھلی راتوں کی طرح آج رات بھی اچانک ہی آنکھ کھل گئی۔ اسے احساس ہوا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ اس نے کھڑکی پر نظر ڈالی۔ وہی پُراسرار ہیولا وہاں موجود تھا۔

وہ اٹھی تو فوراً ہی وہ سایہ نیچے پھسل گیا اور درختوں کی طرف بھاگ اٹھا۔ جین ہال میں آگئی اور اس نے دروازے کے ساتھ والی کھڑکی سے آنکھیں لگا دیں۔ سائے کا تعاقب بیکار تھا۔ وہ دوبارہ پہلے بھی ناکام ہو چکی تھی۔ اندھیرے میں پرانا شاہ بلوط جھوم رہا تھا۔

اس نے دور احاطے کے اس پار سڑک کی طرف دیکھا تو اس کے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ یقیناً کوئی آدمی ہی تھا جو ڈرائیو پر جھکا کچھ کر رہا تھا۔

جین نے دوڑ کر آتش دان کے قریب رکھا ہوا بھاری چمٹا اٹھا لیا... پھر آہستگی سے دروازہ کھولا اور باہر نکل گئی۔ وہ ننگے پیر تھی۔ پنجوں کے بل دوڑتی ہوئی شاہ بلوط تک پہنچی۔ وہ آدمی ابھی تک سڑک پر جھکا ہوا تھا۔ جین نے غور سے دیکھا تو اس کے ہاتھ میں ایک تار تھا جسے وہ زمین پر پھیلا رہا تھا۔ وہ کوئی جال بچھا رہا تھا یا پھر کسی بم کا تار تھا۔ آدمی کی پشت اس کی طرف ہوئی تو وہ چمٹے کو تولتی ہوئی بے آواز اس کی طرف دوڑی۔

آخری وقت میں وہ شخص اس کی چاپ سن کر پلٹا مگر جین چمٹا اس کی کنپٹی پر مار چکی تھی۔ وہ ایک کراہ کے ساتھ زمین پر دراز ہوگیا۔ تار کھینچنے کی وجہ سے دور جھاڑی میں اٹکا ہوا کیمرہ گرا اور اس کا خودکار فلیش جل اٹھا۔ جین کی سانس رک گئی۔ اس کی آنکھیں حیرت وخوف سے ابل پڑیں۔ اس کے سامنے ڈیوڈ ریان پڑا تھا۔ اس نے آہستگی سے اپنا سر اٹھایا۔ اس کی کنپٹی سے خون نکل رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے کہنیوں کے بل اٹھ کر آنکھیں کھولیں اور جین کی طرف دیکھنے لگا۔

جین چمٹا پھینک کر اس پر جھک گئی۔ "میں... مجھے افسوس ہے... میں شرمندہ ہوں۔" وہ بری طرح ہکلا رہی تھی۔ "تم کیمرہ فکس کر رہے تھے۔ میں سمجھی کہ کوئی آدمی میرے مکان کو اڑانے کی کوشش کر رہا ہے۔"

"تم عجیب لڑکی ہو۔" ڈیوڈ بڑبڑایا۔ "اپنے لیے تو عذاب ہو مگر لوگوں کے لیے بھی سزا سے کم نہیں ہو۔"

"میں نادم ہوں۔ کچھ دیر پہلے میری کھڑکی کے باہر کوئی موجود تھا۔ میں سمجھی کہ تم وہی ہو۔"

"اب تک تمھارا وہم نہیں ٹوٹا۔" وہ تلخی سے بولا۔ "میں یہاں جانوروں کی تصویریں لینے کے لیے کیمرہ لگا رہا تھا اور تم نے مجھے ہی بھوت سمجھ لیا۔ وہمی دماغ واقعی بے حد خطرناک ہوتا ہے۔"

"اوہ۔ اب تم ہی بتاؤ کہ اندھیرے میں اس طرح جھکے ہوئے آدمی کو میں اور کیا سمجھتی۔ آؤ اندر آجاؤ میں تمھاری مرہم پٹی کر دوں... پلیز۔"

"نہیں شکریہ۔ یہ کام میں خود بھی کر سکتا ہوں۔" وہ اٹھ کر اپنا سامان سمیٹنے لگا۔ "اپنا ذہن ٹھیک کرو لڑکی ورنہ کسی دن ماری جاؤ گی۔"

جین نچلا ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔ عجیب ضدی اور مغرور قسم کا آدمی تھا۔ کسی طرح پگھل ہی نہیں رہا تھا۔ "لعنت ہو!" ڈیوڈ کے جانے کے بعد وہ بڑبڑائی اور واپس اپنے گھر آ گئی۔

* * *

صبح ہوتے ہی وہ اس کے گھر پہنچ گئی۔ وہ جیسا بھی تھا دو بار اس کی جان بچا چکا تھا۔ اور اب اسی کے ہاتھوں زخمی بھی ہوا تھا اس نے دروازہ کھول کر جین کی طرف دیکھا۔ "کیا کوئی کسر رہ گئی تھی جسے پوری کرنے آئی ہو؟" اس نے سرد مہری سے کہا۔

جین کی کھوپڑی گھوم گئی۔ "میں تمھاری مزاج پرسی کے لیے آئی تھی اور سوچا تھا کہ تمھارے لیے ناشتہ بھی بنا دوں گی۔" وہ گڑبڑا کر بولی۔

"شکریہ۔ میں ناشتہ کر چکا ہوں۔ اندر آ جاؤ۔ کافی تیار ہے۔" وہ دروازے سے ہٹ گیا اور جین اندر آ گئی۔

"آخر تمھیں یقین کیوں نہیں آتا؟" وہ جھلا کر بولی۔

"تو تمھیں اعتماد کا ووٹ چاہیے۔" وہ استہزائیہ لہجے میں بولا جین اسے گھور کر رہ گئی۔ "قصبے کا ہر فرد کہتا ہے کہ ایلین کو دفن ہوئے تین سال گزر چکے ہیں مگر تمھیں کسی طرح یقین ہی نہیں آتا۔ تم بتاؤ کہ پھر اسے کیا ہوا ہے اور وہ کہاں ہے؟"

"یہ تو مجھے پتہ نہیں لیکن یہاں کا ڈاکٹر میری موجودگی سے خوف زدہ ہے اور کوئی شخص مجھ سے ہر قیمت پر پیچھا چھڑانا چاہتا ہے۔"

"یہ محض تمھارا وہم ہے۔" ڈیوڈ نے منہ بنا کر کہا۔ "تمھارے پاس کوئی ثبوت ہے تو پیش کرو۔"

"اوہ!" جین اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ "مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ تم اس قابل نہیں ہو کہ تم سے کوئی بات بھی کرے۔"

"ایسا مت کہو جین! تمھیں اپنے گھر پر دیکھ کر اور تم سے باتیں کر کے مجھے خوشی ہوتی ہے۔" اس کا انداز اب بھی غیر جذباتی تھا۔

"شکریہ۔ اب میں گھر واپس جاؤں گی۔"

وہ اسے چھوڑنے باہر تک آیا۔

جین گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے گھر کی طرف چل دی۔ ابھی وہ زیادہ دور نہیں گئی تھی کہ ایک موڑ پر اسے ایک گھوڑا گاڑی نظر آئی۔ اس میں پادری اور اس کی بیوی بیٹھے ہوئے تھے۔ پادری نے اپنی گاڑی روک لی اور اسے گھورنے لگا۔ "تمھاری شیطانی حرکتیں آخر رنگ لے ہی آئیں۔" جین قریب پہنچی تو وہ حلق پھاڑ کر بولا۔

جین نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔ "میں نے کون سی حرکت کی ہے جناب؟"

"گزشتہ منگل کی رات اجتماعی دعا ہوا کرتی تھی... مگر ایک آدمی بھی نہیں آیا۔ سنا تم نے ایک بھی آدمی نہیں آیا۔ یہ سیاہ فام لوگ پہلے ہی خاصے توہم پرست ہوتے ہیں۔ میں نے بڑی محنت سے انھیں راہ پر لگایا تھا... مگر تمھاری شیطانی باتوں نے میری ساری محنت پر پانی پھیر دیا۔"

"آپ کی محنت میں کوئی کمی رہ گئی ہوگی۔" جین تلخی سے بولی۔

پادری کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ "تم مجھ سے اس لہجے میں گفتگو کر رہی ہو۔" وہ جھاگ اڑاتا ہوا دھاڑا۔ "کتیا کی بچی!" اس نے جین کی طرف چابک لہرائی۔

"نہیں چارلس!" بیوی نے پادری کا ہاتھ روک لیا۔

پادری کی پیشانی پر ایک نیلی رگ پھڑک رہی تھی۔ وہ اسے بڑی خونخوار نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ "تمھیں اس کی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔" وہ پھنکارا۔ "اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ سمجھیں!" یہ کہہ کر اس نے گھوڑے کو چابک ماری اور تیزی سے گاڑی آگے بڑھا لے گیا۔

جین سناٹے میں کھڑی سوچتی ہی رہ گئی۔

اس نے سنا تھا کہ پادری مافوق الفطرت باتوں اور بھوت پریت سے نفرت کرتا ہے لیکن یہ غصہ اس نفرت کی وجہ سے نہیں تھا۔ پادری کسی وجہ سے اس سے خوفزدہ تھا۔ یہ محض خوف ہی تھا جس نے اسے غصے سے پاگل کر دیا تھا... مگر کس بات کا خوف؟

اس نے گھوڑے کا رخ سیاہ فاموں کی بستی کی طرف کر دیا جو قصبے کے دائیں جانب ساحل کے کنارے چند کیبنوں پر مشتمل تھی۔ سیاہ فام ننگ دھڑنگ بچے مٹی میں کھیل رہے تھے۔ کچھ عورتیں گھر کے کام کاج میں مصروف تھیں۔ سب لوگ پلٹ پلٹ کر اسے دیکھنے لگے پھر ایک بڑے سے کیبن سے ہنری کارٹر بھی نکل آیا۔

"مس جین کیسے مزاج ہیں؟" اس نے قریب آ کر پوچھا۔ "کیا آپ ان آدمیوں کے بارے میں کچھ کہنے آئی ہیں جو آپ کے مکان پر کام کرنے گئے تھے؟"

"نہیں۔ میں تم سے ملنے آئی تھی۔" اس نے کہا اور پھر ہنری کو پادری سے اپنی مڈبھیڑ اور اس کے غصے کا احوال سنا دیا۔

"ہمارے لوگ ابھی تک پرانی روایات کے اسیر ہیں۔" وہ کھسیا کر بولا۔ "اس کے علاوہ اسٹار لیٹ کی بددعا سے تو ہمارا بچہ بچہ واقف ہے۔"

"کیسی بددعا؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

ہنری اسے اپنے کیبن میں لے گیا اور ایک کرسی پر بٹھا کر خود باہر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ کافی کی دو پیالیاں لایا اور اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ "سترھویں صدی میں ان جزیروں پر اسپینیوں کا قبضہ تھا۔" وہ کافی کا گھونٹ لے کر بولا۔ "ان میں ہیرون آئی لینڈ بھی شامل تھا۔ برطانوی، امریکا میں پھیلتے جا رہے تھے اور اپنی نوآبادیاں قائم کر رہے تھے۔ اسٹار لیٹ اس وقت نیا نیا بنا تھا اور اس میں جیکب ٹوڈ اپنی اکلوتی بیٹی تھباٹا ٹوڈ کے ساتھ رہتا تھا۔ تھباٹا کی ماں اسپینی تھی اس لیے نہ تو انھیں اسپینیوں سے غرض تھی اور نہ ہی انگریزوں سے کوئی تعلق تھا... پھر اسپینیوں اور انگریزوں میں جنگ چھڑ گئی۔ اس دوران میں جیکب ٹوڈ کا انتقال ہو گیا اور تھباٹا اس عظیم الشان مکان میں تنہا رہ گئی... پھر اسے ایک شخص سے دیوانگی کی حد تک محبت ہو گئی۔ تھباٹا کے دوستوں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اس سے شادی کر لے۔ دونوں کی منگنی کا اعلان کر دیا گیا لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد اسے معلوم ہوا کہ وہ شخص اس سے صرف اس مکان کی خاطر شادی کرنا چاہتا ہے اور پھر اس مکان کو انگریزوں کے ہاتھ فروخت کر دینا چاہتا ہے۔ تھباٹا کا دل ٹوٹ گیا۔ ایک رات وہ گھوڑے پر سوار اپنے گھر سے نکل گئی اور پھر وہ حادثہ ہو گیا جس نے تھباٹا کو نہ صرف اپاہج کر دیا بلکہ اس کا حسن بھی تباہ کر دیا۔ وہ اس مکان میں قید ہو کر رہ گئی۔ اس کے بعد سوائے چند ملازمین کے کسی نے اسے نہیں دیکھا.. لیکن اس نے اپنے محبوب اور اس کے دوستوں کو معاف نہیں کیا۔ اس نے اسپینیوں سے ساز باز کر کے اس شخص کو مع دوستوں کے انگریزوں کا جاسوس ہونے کا الزام لگا کر قتل کروا دیا۔ مرنے سے پہلے تھباٹا نے اس مکان سے ایک بددعا وابستہ کر دی کہ بے وفائی اس مکان کی خصوصیت ہے اور کوئی انسان یہاں کبھی خوش نہیں رہ سکتا۔"

جین بت بنی یہ کہانی سن رہی تھی۔ ہنری خاموش ہوا تو وہ چونک پڑی۔ "بہت بہت شکریہ، ہنری۔ تم نے ایک بڑی الجھن دور کر دی۔ اچھا اب مجھے اجازت دو۔ تمھارے آدمی بڑے مددگار ثابت ہو رہے ہیں۔"

* * *

جین گھر پہنچی تو دیکھا کہ مکان کے سامنے بین کولہان کی فورڈ کھڑی ہے اور وہ خود اس کے فینڈر پر جھکا ہوا ہے۔ جین کو دیکھتے ہی وہ کھل اٹھا۔ "میں نے کئی بار فون کیا مگر جواب نہ ملا تو تمھاری خیریت دریافت کرنے چلا آیا۔"

"بہت اچھا کیا۔" وہ گھوڑے سے اترتے ہوئے بولی پھر اسے ایک طرف باندھ دیا۔ "میں ہنری کارٹر سے ملنے چلی گئی تھی۔ اس نے مجھے مکان سے وابستہ ایک بددعا کی داستان سنائی ہے۔"

"تو تم نے وہ کہانی سن لی۔ میں تمھیں مزید پریشانیوں سے بچانا چاہتا تھا اس لیے اب تک اس سلسلے میں خاموش ہی رہا تھا۔"

"کیا تم بتا سکتے ہو کہ ایلین اتنی رات گئے گھوڑے پر سوار ہو کر کیوں بھاگی تھی؟" جین نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تمھیں معلوم ہوگا کہ جب کبھی اس کا موڈ خراب ہوتا تھا تو وہ پاگل ہو جاتی تھی۔ ایسے ہی ایک دورے کی حالت میں نکل بھاگی تھی۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور زمین تکنے لگا۔ "میں اس سے شادی کرنے والا تھا..." کافی دیر بعد اس نے دھیمی آواز میں انکشاف کیا۔

"تم...؟" جین چیخ ہی تو پڑی۔ "تو وہ خط اس نے تمھارے ہی بارے میں لکھا تھا کہ وہ شادی کر کے..."

"ہاں... لیکن ہم نے یہ بات خفیہ رکھی تھی... پھر وہ گھوڑے پر نکل بھاگی اور حادثے کا شکار ہو گئی۔ میں بے حد پریشان ہو گیا تھا اس لیے میں نے اسے جلد از جلد دفنا دیا۔" بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی۔

جین ہمدردی سے اسے دیکھنے لگی۔ "اس کے بعد میں نے کسی عورت کی صورت تک نہیں دیکھی... پھر تم آ گئیں۔ میں، تمھیں یقین دلاتا ہوں جین کہ ایلین مر چکی ہے۔ تم یہاں سے چلی جاؤ اور یہ کام مجھ پر چھوڑ دو۔ میں اس راز سے پردہ اٹھانے کی کوشش کروں گا اور اس شخص کو بھی ڈھونڈ نکالوں گا جو تمھاری جان کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ میں تمھاری طرف سے بے حد پریشان رہنے لگا ہوں۔"

"نہیں بین!" وہ اسے محبت پاش نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی۔ "میں یہاں سے بزدلوں کی طرح نہیں بھاگ سکتی۔ میں کوئی بھی کام ادھورا چھوڑنے کی عادی نہیں ہوں۔"

"تمھاری مرضی جین... مگر غور کرتی رہنا۔ شاید میری بات تمھاری سمجھ میں آ ہی جائے۔ کل رات میں تمھیں اپنے گھر لے چلوں گا۔ میرا گھر ہیرون آئی لینڈ کے دوسرے کنارے واقع ہے۔ وہاں میں اپنے ڈیڈی کے ساتھ رہتا ہوں۔"

"مجھے تمھارے گھر جا کر خوشی ہوگی۔" وہ مسکرا کر بولی۔

بین کولہان اپنی کار میں بیٹھ گیا۔ وہ چلا گیا تو جین اندر آ گئی اور نہا کر لباس تبدیل کر لیا۔ شام کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔

رات کو وہ اپنے بستر پر لیٹی تو اس نے ایلین کی طرف سے اپنے ذہن کے سارے دریچے بند کر لیے۔ وہ بین کے خوش گوار تصور میں کھو جانا چاہتی تھی۔ یکایک دور کہیں بادل گرجے تو اس نے کروٹ بدلی اور آنکھیں موند لیں۔ ذرا ہی دیر بعد وہ سپنوں کی دنیا میں پہنچ گئی... لیکن پھر اچانک ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔

وہ بستر پر لیٹی آوازیں سننے کی کوشش کرتی رہی۔ باہر بڑے زور کی بارش ہو رہی تھی ان آوازوں میں بادلوں کی گھن گرج اور بجلی کی کڑک بھی شامل تھی... پھر اسے وہی احساس ہونے لگا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ اس نے کہنی کے بل اٹھ کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔

گہری تاریکی کی وجہ سے اُسے وہاں کچھ نظر نہ آیا۔

اچانک بجلی چمکی اور جین کے دل کی دھڑکنیں بگڑ گئیں۔ باہر کھڑکی کے شیشے سے کوئی سیاہ چیز چپکی ہوئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا چیز تھی... کوئی انسان تھا یا...؟ پھر فوراً ہی اندھیرا پھیل گیا۔

جین اُٹھ کر کھڑکی کی طرف دوڑی اور باہر دیکھنے لگی۔ معاً بجلی پھر چمکی تو ایک سایہ اچھلتا ہوا درختوں کی طرف دوڑتا دکھائی دیا... ایک بار اور بجلی نے ایک ثانیے کے لیے ماحول کو منور کیا تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

جین نے ایک طویل سانس لی اور واپس آکر بستر پر گر گئی۔

اگلی رات... اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس راز سے پردہ اُٹھا کر رہے گی۔

صبح گھر کی صفائی کرنے کے لیے نیگرو مرد اور عورتیں آگئیں۔ جین نے ناشتہ کیا اور گھر سے نکل آئی۔ اس کا رُخ جنگل کے اس حصے کی طرف تھا جہاں وہ سایہ غائب ہو جاتا تھا۔ وہ اونچی اونچی جھاڑیوں میں راستہ بناتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔ یہ ایک بے حد خوبصورت جنگل تھا۔ درختوں پر طرح طرح کے پرندے چہچہا رہے تھے خرگوش گلہری اور دیگر چھوٹے چھوٹے جانور پھدکتے پھر رہے تھے۔ ایک جگہ اس نے جھاڑیوں میں سرسراہٹ سُنی تو چونک کر وہ رُک گئی اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس طرف دیکھنے لگی۔

یکایک ڈیوڈ ریان ایک چھوٹے سے جانور کو لٹکائے اس کے سامنے آگیا اور جین پر نگاہ پڑتے ہی مسکرانے لگا۔ "تم اس جگہ کیا کر رہی ہو؟ کسی بھوت کی تلاش ہے کیا؟" یہ کہہ کر وہ سنجیدہ ہو گیا۔

"یہی سمجھ لو۔ تمھارے سر کا کیا حال ہے؟" جین نے منہ بنا کر کہا۔ اسے حیرت تھی کہ اس قدر دلکش اور وجیہہ نوجوان میں اتنی تلخیاں کہاں سے بھر گئیں؟ وہ اس کا محسن تھا اس لیے جین اس سے میٹھی میٹھی باتیں کرنا چاہتی تھی... مگر اس کا رویہ... "یہ کیا پکڑ لائے؟" اس نے پوچھا۔

"یہ ایک نادر قسم کا سوٴر ہے۔ ابھی بچہ ہے۔ اس قسم کا بڑا سوٴر بے حد خطرناک ہوتا ہے۔ ان جزیروں پر یہ نسل ختم ہوتی جا رہی ہے اور میں ان مٹتی ہوئی نسلوں کی بقا کے لیے کوشاں ہوں۔" وہ بے خیالی میں اس کے ساتھ چلنے لگی۔ "میں اپنے گھر جا رہا ہوں۔ چاہو تو تم بھی چلو۔"

"نہیں شکریہ۔" جین نے کہا۔ "مجھے ایک کال کا انتظار ہے۔" وہ مُڑی اور اپنے گھر کی طرف چل دی۔

ڈیوڈ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

جین نے پلٹ کر دیکھنا چاہا پھر اس نے یہ خواہش سختی سے کُچل دی۔

گھر آنے کے بعد اس نے ہلکا سا لنچ تیار کیا اور بالائی منزل پر پہنچ گئی۔ دو عورتیں خاصا کام نمٹا چکی تھیں۔ وہ ایک چکر لگا کر نیچے اپنے کمرے میں واپس آگئی۔ شاید آج رات وہ اس پُراسرار سائے کو پکڑ سکے۔ اس کی اصلیت معلوم کر سکے۔ وہ بستر پر دراز ہو گئی اور آنکھیں بند کر کے سوچنے لگی اور سوچتے سوچتے ہی اُسے نیند آگئی۔

اس کی آنکھ کُھلی تو جزیرے پر رات اُتر چکی تھی۔

اس نے اُٹھ کر پتلون پر بلاؤز پہنا اور ماچس کی ایک ڈبیا جیب میں رکھ کر باہر آگئی۔ آسمان پر بادل، چاند سے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ اس نے دوڑ کر لان پار کیا اور درختوں کی قطار کے پاس پہنچ کر ایک تناور درخت کے پیچھے چھپ گئی۔

یہاں سے اس کے کمرے کی کھڑکی صاف نظر آرہی تھی۔

رات دبے قدموں گزرنے لگی۔

اس کے پیچھے دُور تک جنگل پھیلا ہوا تھا اور رات کی مخلوق نے اپنا فطری راگ چھیڑ دیا تھا۔ اس راگ میں لوری کی سی تاثیر تھی مگر وہ جاگتی رہی۔ اس کے سامنے وسیع لان اور سفید مکان سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بوجھل ہونے لگیں اور وہ کوشش کے باوجود اُونگھ گئی۔ پھر شاید کسی اُلّو کی چیخ سُن کر اس کی آنکھ کُھلی تو وہ چوکنا ہو گئی۔ معاً اُسے ایک سایہ دکھائی دیا۔

سایہ مکان کی طرف حرکت کر رہا تھا۔ جین کے جسم میں سنسنی سی پھیل گئی۔ وہ درخت کے تنے سے چپک گئی۔ سایہ بڑے عجیب سے انداز میں کھڑکی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جین اُٹھی اور اس کی طرف دوڑتی ہوئی ایک جھاڑی کے پاس رُک گئی۔

"کون ہو تم؟" وہ بولی تو سناٹے میں اُسے اپنی آواز بے حد عجیب محسوس ہوئی۔ "تم کیا چاہتے ہو؟"

سایہ ٹھٹکا پھر جھک کر گیند کی طرح گول مول ہو گیا۔ اچانک وہ اچھلا اور لڑھکتا ہوا انتہائی تیزی سے درختوں کی طرف بڑھنے لگا۔

"رُک جاؤ۔" جین چیخ پڑی۔ "میں تم سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ رُک جاؤ۔" وہ اس کے پیچھے دوڑی لیکن سایہ جنگل میں گھس کر تاریکی کا حصہ بن گیا۔ تاہم جھاڑیوں کی سرسراہٹ جین کی رہنمائی کر رہی تھی۔

وہ قریب پہنچ کر اب پیچھے نہیں ہٹنا چاہتی تھی۔ آواز سامنے سے آرہی تھی اور فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ وہ آگے بڑھتی رہی۔

پھر گھاس کے بجائے اس کے پیروں تلے پتھریلی زمین آگئی۔ سایہ اس سے بیس گز آگے دوڑ رہا تھا۔

"رُک جاؤ۔" وہ پھر چلائی۔ "میں صرف تم سے بات کرنا چاہتی ہوں۔"

وہ دوڑتی رہی۔ اس کے پھیپھڑوں میں آگ سی بھر گئی تھی... پھر سرسراہٹ رُک گئی اور ماحول پر ایک پُراسرار سناٹا پھیل گیا۔ جین جُھک کر دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگی۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کیا وہ اسے کھو بیٹھی ہے؟ اس نے دائیں بائیں دیکھا... مگر خودرو جھاڑیوں کے سوا اسے کچھ نظر نہ آیا۔ یکایک سامنے ایک اُبھرے ہوئے قطعے پر وہ سایہ لمحے بھر کے لیے نظر آیا اور فوراً ہی غائب ہو گیا۔

جین کو معلوم تھا کہ اس طرف غار تھے۔ یقیناً وہ کسی غار ہی میں اُتر گیا ہوگا۔

جین دوڑتی ہوئی وہاں جا پہنچی۔

غار کے تنگ دہانے کے سامنے پہنچ کر وہ ٹھٹکی پھر پیٹ کے بل رینگتی ہوئی اندر اُتر گئی۔ اچانک وہ دم سادھ کر زمین سے چپک گئی۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ غار کے اندر اس کے علاوہ کوئی اور بھی ہے۔ اس کی ہتھیلیاں پسینے میں بھیگ گئیں۔ اس نے دونوں ہاتھ پتلون سے رگڑے اور ماچس نکال لی... پھر وہ پیچھے کھسک کر غار کی دیوار سے جالگی اور اس کے سہارے بیٹھ گئی۔

اس نے اچانک تیلی جلائی اور شعلے کو آگے کر دیا۔ تب جین کے حلق سے ایک چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ اس کا جسم لرز اُٹھا اور آنکھیں دہشت سے پھٹ گئیں۔ وہ ایک ایسی ہی چیز تھی جو غار کی دوسری دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ اس کی رنگت بالکل سیاہ تھی۔ کھوپڑی پر ایک میلی کچیلی پھٹی ہوئی ٹوپی تھی منہ کی جگہ ایک ٹیڑھا میڑھا سا سوراخ بنا ہوا تھا۔ ناک کی بجائے کھال سی لٹکی ہوئی تھی۔ چہرے پر انتہائی بدنما داغ تھے اور رخساروں کی کھال نیچے تک لٹک رہی تھی۔ اس کریہہ چہرے پر دو گول گول آنکھیں تھیں جو جین پر جمی ہوئی تھیں... لیکن ان آنکھوں میں بھی زندگی کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔

"میرے خدا!" جین کے منہ سے ایک گہری سانس نکل گئی پھر اس نے ایک جھرجھری سی لی اور یوں اُس طرف دیکھنے لگی جیسے ہوش میں آگئی ہو۔ "چڑیل!" وہ بڑبڑائی۔

معاً سوراخ نما دہانے میں حرکت ہوئی۔ وہ سانس لے رہی تھی۔ شاید اس نے کچھ بولنے کی کوشش کی تھی مگر آواز نہ نکل سکی۔

پھر اس نے استخوانی ہاتھ پھیلائے تو شعلہ بُجھ گیا۔

جین دوسری تیلی نکالنے لگی۔

اسے اپنے قریب ہی سرسراہٹ سنائی دی تو اس نے جلدی سے تیلی جلائی مگر وہ غائب ہو چکی تھی۔ جین نے تیلی دائیں بائیں گُھما کر غار میں دُور تک دیکھا لیکن شاید وہ ہستی باہر جا چکی تھی۔

تیلی پھر بُجھ گئی۔

جین دیر تک ساکت بیٹھی رہی اس کے ذہن میں وہ خوفناک چہرہ گھوم رہا تھا۔ اس نے ایک اور تیلی جلا کر غار کا جائزہ لیا۔ دیوار کے ساتھ خشک میوے اور خشک گوشت پڑا تھا قریب ہی چند لکڑیاں اور موم بتی کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ "نہ جانے یہ کون ہے؟" جین نے سوچا... "اور یہاں کیوں رہتی ہے؟ وہ اس کی کھڑکی پر کیوں آتی ہے؟ اسٹارلیٹ سے اس کا کیا تعلق ہے؟ ایلین سے کیا تعلق ہے؟" اس کی آنکھوں کے سامنے پھر وہی کریہہ صورت گھوم گئی۔

"خدایا!" وہ خوف سے لرز اُٹھی۔

اس نے نئی تیلی جلائی اور اس کی روشنی میں غار سے باہر آگئی۔

جانے وہ کہاں غائب ہو گئی تھی۔ اس کے چاروں طرف گھنا جنگل پھیلا ہوا تھا اور طرح طرح کی آوازیں آرہی تھیں اس نے دل مضبوط کیا اور اندازے سے ہی ایک طرف چل پڑی چاند نکل آیا تھا لیکن درختوں کی وجہ سے اب بھی تاریکی تھی۔ وہ بالآخر ایک پگڈنڈی پر آگئی۔

جانے کتنی رات گزر گئی تھی۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ وہ راستہ بھول گئی ہے لیکن چلتے رہنے کے سوا اب کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔

اچانک اس نے جھاڑیوں میں سرسراہٹ کی آواز سنی تو رُک گئی... پھر ایک غراہٹ سُنائی دی۔ ایک بھاری بھرکم جانور نکل کر اس کے سامنے آگیا۔ اس کے پیچھے اور بھی کئی جانور تھے جین نے انھیں پہچان لیا یہ جنگلی سوٴر تھے جو اسے گھیرے میں لے رہے تھے۔

وہ دو قدم آگے بڑھی تو ایک شاخ اس کے پیروں تلے آگئی۔ اس نے جھک کر اُسے اُٹھا لیا اور شاخ قریب ترین سوٴر کی طرف گُھمائی۔ سوٴر اُچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ ان کے حلقوم سے بڑی خوفناک آوازیں نکل رہی تھیں۔ جین کا دل لرز رہا تھا اور جسم کے ہر مسام سے پسینہ بہہ نکلا تھا... مگر اس کا ذہن تیزی سے کام کر رہا

تھا۔ وہ حوصلہ ہارنے والی لڑکی نہیں تھی۔ اسے یاد آیا کہ سؤر صرف آگ سے ڈرتے ہیں اس نے اپنا بلاؤز پھاڑا اور شاخ کے سرے پر باندھ کر اسے تیلی دکھا دی۔

سؤر اپنا حلقہ تنگ کر رہے تھے۔ جین نے مشعل ایک سؤر کی طرف لہرائی تو وہ پیچھے ہٹ گیا... پھر وہ مشعل چاروں طرف گھمانے لگی۔ سؤر پیچھے ہٹنے لگے مگر ایک بھاری بھر کم سؤر اپنی جگہ ڈٹا ہوا تھا۔ بلاؤز نے لکڑی کے سرے پر پوری طرح آگ پکڑ لی تھی، جین لکڑی سیدھے کیے اس کی طرف دوڑی۔

سؤر غرایا... پھر پلٹ کر بھاگ اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی دوسرے سؤر بھی دوڑ پڑے۔ وہ اپنے سردار کی تقلید کر رہے تھے۔

جین پھر آگے چل دی۔ اس کی حالت نیند میں چلنے والوں جیسی ہو رہی تھی۔ اس کے جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا اور سر بری طرح گھوم رہا تھا۔ وہ ایک دریا کے کنارے نکل آئی اور ریت پر گر پڑی۔ صبح کی سرد ہوائیں اس پر نیند طاری کرنے لگیں۔

کچھ دیر بعد وہ اٹھی اور دریا کے ساتھ ساتھ چل دی۔

صبح ہوتے ہوتے وہ ایک سڑک پر پہنچ گئی۔ وہاں سے اس کا گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ اسے اپنی خوش قسمتی کا احساس تھا کہ وہ اس قدر خوفناک جنگل میں رات گزار کر سلامت نکل آئی تھی۔

وہ اسٹارلیٹ پہنچی تو ایک نیگرو مرد اور ایک عورت گھر کے سامنے والا حصہ صاف کر رہے تھے۔ جین کی حالت دیکھ کر دونوں کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔

"اگر کوئی فون آئے تو تم سن لینا۔" وہ تھکے ہوئے لہجے میں نیگرو مرد سے بولی۔ "میں فی الحال کسی سے بات کرنا نہیں چاہتی۔ کوئی مجھے پریشان نہ کرے۔ میں سونا چاہتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اندر آگئی اور کمرے میں گھس کر اسی حالت میں بستر پر ڈھیر ہو گئی۔

◆

سوتے میں وہ یوں اچھل پڑی جیسے کسی نے اس کے منہ پر گھونسہ دے مارا ہو۔ اس کا پورا بدن کانپ رہا تھا اور وہ پسینے میں شرابور تھی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ چیخ روکنے کے لیے ایک ہاتھ اپنے منہ میں گھسیڑنے کی کوشش بھی کر رہی تھی۔ بستر پر بیٹھ کر اس نے متوحش نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ کمرے میں اس کے سوا کوئی نہیں تھا۔ تو اس نے خواب میں اس چڑیل کو دیکھا تھا۔ وہ اس پر جھکی ہوئی کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھی اور جین ڈر گئی تھی۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور دوبارہ بستر پر لیٹ گئی۔

... پھر سورج غروب ہونے کے بعد ہی اس کی آنکھ کھلی۔

اس نے نہا کر لباس تبدیل کیا۔ سیاہ فام واپس جا چکے تھے۔ باورچی خانے میں جا کر اس نے سوپ تیار کیا اور اسے پی کر پھر اپنے کمرے میں آگئی۔ وہ بتی جلائے بغیر بستر پر لیٹ گئی۔ اس کے دماغ میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ بین نے دن میں یقیناً اسے فون کیا ہوگا اور اب اس کی کال کا انتظار کر رہا ہوگا۔

اس نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔

اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ اسے یقین تھا کہ آج وہ آنکھیں اسے دیکھنے نہیں آئیں گی۔

اس چڑیل کا تعاقب کرنا اور پھر غار میں جا گھسنا اس کی حماقت ہی تھی۔ جین اس کے تصور سے ہی لرز اٹھی۔ لیکن کم از کم ایک بات تو واضح ہو گئی تھی کہ کھڑکی پر کسی سائے کی موجودگی محض اس کا تصور نہیں بلکہ ایک حقیقت تھی۔ لیکن وہ کسی اور کو اس بات کا یقین کیسے دلا سکتی تھی۔ اس کے جسم میں سنسنی کی لہریں دوڑنے لگیں، 'وہ چہرہ۔ یقیناً وہ چہرہ اس نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کس قدر خوفناک اور مکروہ چہرہ تھا وہ... لیکن اس کی آنکھیں... گہری، گول گول اور بھوری تھیں'۔ اس نے جو چادر اوڑھ رکھی تھی اس کے نیچے جین کے ہاتھ بری طرح کانپ رہے تھے، 'وہ آنکھیں، گول بھوری آنکھیں...' وہ آنکھیں اس کے لیے اجنبی نہیں تھیں۔ وہ ان آنکھوں میں پہلے بھی کئی بار جھانک چکی تھی کیونکہ وہ ایلین کی آنکھیں تھیں۔

جین کا دم گھٹنے لگا۔ غار کی چڑیل ایلین تھی۔

وہ چادر پھینک کر اٹھ بیٹھی۔

"میرے خدا..." وہ سسک پڑی۔ "اوہ۔ خدایا۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ اسی وجہ سے وہ اس کی کھڑکی پر آتی تھی اسی وجہ سے اس نے کبھی خوفناک چہرے سے خوف محسوس نہیں کیا تھا۔ شاید وہ اپنی شناخت کرانا چاہتی تھی۔ اس حادثے نے آنکھوں کے سوا ایلین کا سب کچھ بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔

'تو کیا یہ لوگ... کیا ڈاکٹر کو معلوم ہے کہ ایلین زندہ ہے؟ کیا ریونڈ ہالڈ مین اسی وجہ سے خوفزدہ ہے کہ کہیں کسی کو ایلین کے وجود کا علم نہ ہو جائے؟... اور بین... نہیں بین اس معاملے سے بے تعلق ہے۔ اسے پکا یقین ہے کہ ایلین مر چکی ہے...' لیکن بے شمار سوالات ایسے تھے جو ابھی تشنۂ جواب تھے تاہم واقعات کی کڑیاں اس کے ذہن میں ملتی جا رہی تھیں۔

وہ اٹھی اور فون کے قریب جا کھڑی ہوئی... پھر اس نے بین کے نمبر ڈائل کیے۔

"اوہ جین! میں تمھاری طرف سے بے حد پریشان ہو رہا تھا۔" اس نے بین کی بے تاب آواز سنی۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں، ڈیئر!" وہ بڑے پیار سے بولی۔ "لیکن میری بات غور سے سنو۔ ایلین مری نہیں بلکہ زندہ ہے۔"

ایک پل دوسری طرف سناٹا رہا... پھر بین کی پریشان آواز سنائی دی۔ "اوہ جین خدا کے لیے یہ باتیں اپنے ذہن سے نکال دو۔ ایلین مر گئی ہے اور اسے دفن کر دیا گیا ہے۔ تم آخر میری بات کا اعتبار کیوں نہیں کرتیں؟"

"بین۔ میں نے پچھلی رات اسے دیکھا ہے۔"

"تمھارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" وہ ناراضگی سے بولا۔

"نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ وہ ایلین ہی تھی۔" جین نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں ایک دو باتیں جاننا چاہتی ہوں بین، تم نے کہا تھا کہ وہ حادثے میں ہلاک ہوئی تھی۔ کس قسم کا حادثہ تھا وہ؟ کیا ہوا تھا؟"

"میں نے بتایا تو تھا کہ وہ ناراض ہو کر گھوڑے پر نکل بھاگی تھی۔ رات کے بارہ یا ساڑھے بارہ کا عمل تھا۔ میں نے اپنی کار میں اس کا تعاقب کیا تھا۔ مشرقی ساحل پر اس وقت سڑک بن رہی تھی۔ مزدور بڑے بڑے کڑھاؤ میں تارکول گرم کر رہے تھے اور رات کی وجہ سے انھیں وہیں چھوڑ کر اپنے خیموں میں جا سوئے تھے۔ ایلین کا گھوڑا اس سڑک پر نکل گیا پھر اس نے پتھروں کے ڈھیر سے ٹھوکر کھائی اور ایلین اچھل کر ایک کڑھاؤ میں جا گری۔ اوہ میرے خدا... وہ بری طرح جل گئی تھی... بہت ہی بری طرح۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ فوراً ہی اس کا دم نکل گیا تھا ورنہ..."

"لیکن وہ ہلاک نہیں ہوئی تھی۔" جین نے کہا۔ "میں نے اسے کل رات خود دیکھا ہے۔"

بین کا احتجاج رد کر کے اس نے اسے گزشتہ رات کی مکمل سرگزشت سنا دی... پھر بڑی دیر بعد اس نے بین کی آواز سنی۔

"اگر تم نے رات کو واقعی یہ سب کچھ دیکھا ہے تو ضرور دیکھا ہوگا مگر میری بات سنو جین۔ وہ کوئی اور ہوگی۔ جو اپنی بدصورتی کی وجہ سے اس غار میں زندگی گزار رہی ہے۔ ایلین مر چکی ہے، جین۔ وہ تمھارے ذہن پر سوار ہو چکی ہے اس لیے تم ایسی باتیں کرتی ہو خدا کے لیے جین میری بات مان لو۔ تم صبح ہوتے ہی یہاں سے نکل جاؤ ورنہ پاگل ہو جاؤ گی۔"

"نہیں، میں نہیں جاؤں گی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ایلین ہی ہے۔"

"نہیں جین نہیں، تم غلطی پر ہو۔ یہاں سے چلی جاؤ جین، خود کو یہاں سے نکال لے جاؤ۔"

"نہیں..." جین چیخ پڑی اور اس نے زور سے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا... پھر دوڑ کر اپنے کمرے میں پہنچی اور بستر پر گر گئی۔

"نہیں،" وہ بڑبڑائی۔ "یہ میرا واہمہ نہیں ہو سکتا۔ میں نے یقیناً وہ چڑیل نما مخلوق دیکھی ہے۔ شاید تارکول میں گرنے کے بعد ایلین اتنی ہی بدل گئی ہو۔ اگر یہ بات نہیں ہے تو پھر وہ غار والی چڑیل کون ہے؟" اس سوال کا جواب شاید مجھے ہنری کارٹر سے مل سکے۔ اس نے سوچا اور بستر چھوڑ دیا۔ باہر آ کر اس نے گھوڑے پر زین ڈالی اور اندھیرے ہی میں سیاہ فاموں کی بستی کی طرف روانہ ہو گئی۔

◆

ہنری کارٹر اسے اپنے کیبن میں ہی مل گیا۔

"نہیں مس۔" وہ اس کی بات سن کر بولا۔ "ہم میں سے کسی نے کبھی کوئی چڑیل نہیں دیکھی۔ آپ کہتی ہیں کہ وہ ایلین ہے مگر اس کی تدفین کے وقت میں خود وہاں موجود تھا۔ ممکن ہے ایلین کی روح آگئی ہو اور اس نے یہ صورت اختیار کر لی ہو۔ روحیں پہلے بھی آتی رہی ہیں، مس۔"

"چلو مان لیتی ہوں کہ وہ ایلین کی روح ہے جو کسی طرح تجسیم میں ڈھل گئی ہے مگر وہ کیوں آتی ہے؟ کیا کسی سے انتقام لینے؟"

"ممکن ہے مس۔" نیگرو سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ "میرا خیال ہے کہ تھباٹا ٹوڈی کی بددعا کا اثر ہے۔ یہ مکان اسی کی بددعا کے زیر اثر ہے۔ مس۔"

"اوہ۔" جین بڑبڑائی۔ "خیر... میں اس زحمت دہی کے لیے معذرت خواہ ہوں، ہنری! شکریہ۔ اب میں چلوں گی۔"

وہ رات کے سناٹے میں اپنے گھر لوٹ آئی۔

وہ جب یہاں سے گئی تھی تو اسے ایلین کے زندہ ہونے کا یقین تھا مگر یہ یقین متزلزل ہو رہا تھا۔ کیا وہ واقعی ایک روح ہی ہے جو جسمانی صورت میں گھوم رہی ہے؟ کیا ایسا ممکن ہے؟ کیا نفرت میں اتنی قوت ہوتی ہے کہ روحیں یوں جسمانی حالت میں لوٹ آئیں؟

یہی سوچتے ہوئے نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

نہ جانے کتنی دیر بعد دروازے پر دستک سن کر وہ جاگ اٹھی۔

اس نے میز پر رکھی گھڑی میں وقت دیکھا۔ صبح کے ساڑھے چھ بج رہے تھے۔ 'اس وقت کون ہو سکتا ہے؟' اس نے سوچا۔

دستک اس بار بڑے زور سے سنائی دی۔ اس نے اٹھ کر گاؤن

پہنا اور ہال میں آگئی "آرہی ہوں" وہ چلائی اور بڑھ کر دروازہ کھول دیا... مگر سامنے کوئی نہیں تھا۔

"ہیلو... میں یہاں ہوں" اس نے پکار کر کہا... مگر اب بھی کوئی سامنے نہ آیا۔ اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے "کیا یہ دستک بھی میرا واہمہ ہے" اس نے چند لمحوں تک انتظار کیا پھر واپس اپنے کمرے میں آکر بستر پر لیٹ گئی۔

اچانک وہ چونک پڑی اور اس کی رگوں میں خون منجمد ہونے لگا۔

اس نے سانپ کی پھنکار سُنی تھی جیسے کسی بند کیتلی سے بھاپ نکل رہی ہو۔ وہ کہنیاں ٹکا کر اوپر کھسکی اور بستر پر بیٹھ گئی۔ چادر اس کی پنڈلیوں تک اُتر گئی۔ پھر چادر کے نیچے پیر سے ذرا فاصلے پر اسے کوئی چیز متحرک دکھائی دی اور ایسی آواز آئی جیسے بھاپ کیتلی کا ڈھکن بجا رہی ہو۔

وہ سمجھ گئی کہ چادر کے نیچے سانپ ہے۔ اس کا حلق خشک ہوگیا اور خوف کے مارے آنکھیں پھیل گئیں۔

سانپ چادر کے نیچے تلملا رہا تھا اور اس کے پاؤں کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس کے سامنے یقینی موت تھی لیکن وہ آخری دم تک لڑنا چاہتی تھی۔ اس نے لرزیدہ ہاتھوں سے چادر پکڑ لی۔ اس کی کوشش تھی کہ پیروں میں ذرا بھی حرکت نہ ہو... پھر اس نے ایک جھٹکے سے چادر کھینچ کر ٹانگیں سکیڑ لیں۔

وہ ایک بے حد خوفناک سانپ تھا۔ چادر ہٹتے ہی وہ زبان نکالتا ہوا تن گیا۔ جین نے چادر کا گولا بنالیا۔ ہاتھوں کے علاوہ اس کا پورا جسم ساکت تھا۔ سانپ اسے ڈسنے پر آمادہ تھا کہ جین نے چادر کا گولا سانپ پر پھینک مارا اور اس کے ساتھ ہی بستر سے چھلانگ لگادی لیکن خوف اور گھبراہٹ کی وجہ سے وہ بستر سے پھسل گئی۔ اس کا سر بستر کی پٹی سے ٹکرایا اور اس کی آنکھوں کے سامنے نیلے پیلے ستارے رقص کرنے لگے... پھر اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

* * *

جانے کتنی دیر بعد اس کی آنکھ کھلی۔

وہ زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ سانپ غائب ہوچکا تھا اور اس کے پاؤں سے خون جاری تھا۔ زخم ایسا ہی تھا جیسے سانپ نے وہاں دانت گاڑے ہوں۔

"اوہ خدایا!" وہ سسک پڑی اور بمشکل کھڑی ہوسکی۔ سانپ نے اسے ڈس لیا تھا۔ اگر فوری طور پر اسے تریاق نہ ملا تو وہ مرجائے گی۔ اس نے کرسی سے گاؤن اُٹھا کر بدن پر ڈالا اور لڑکھڑاتی ہوئی باہر آگئی۔ شاید ڈیوڈ ریان کے پاس سانپ کے کاٹے کا کوئی علاج ہو۔

اس نے گھوڑا کھولا اور بدقت تمام اس پر سوار ہوکر ڈیوڈ کے گھر کی طرف باگ موڑ دی۔

وہ اپنے دروازے پر کھڑا تھا۔ جین آگے کی طرف جھکی ہوئی تھی۔ ڈیوڈ دوڑتا ہوا اس کے قریب آیا تو وہ پھسل گئی... پھر گرنے ہی لگی تھی کہ ڈیوڈ نے اسے تھام لیا۔ "کیا ہوا؟" اس نے بے تابی سے پوچھا۔

"سانپ نے ڈس لیا ہے۔" اس نے پیر کی طرف اشارہ کیا اور اس کے ہاتھوں میں جھول گئی۔

ڈیوڈ اسے اُٹھا کر اندر لے آیا اور آہستگی سے بستر پر لٹادیا۔

"آرام سے لیٹی رہو۔" وہ بولا اور الماری کی طرف بڑھ گیا۔

جین غنودگی سی محسوس کرنے لگی۔

"تم بے حد خوش نصیب ہو۔" کچھ دیر بعد اس نے ڈیوڈ کی آواز سُنی۔ "یہ سانپ کے ڈسنے کا زخم نہیں ہے۔"

"کیا تمھیں یقین ہے؟" اس نے پلکیں اُٹھا کر سرگوشی کی۔

ڈیوڈ نے اثبات میں سر ہلادیا۔

"اوہ خدایا، تیرا شکر ہے۔" وہ بڑبڑائی۔

"اگر تمھیں سانپ نے ڈس لیا ہوتا تو اب تک مارے تکلیف کے تمھاری چیخیں نکل رہی ہوتیں اور پھر ذرا ہی دیر بعد تم ہلاک ہوجاتیں... مگر یہ ہوا کیسے؟"

"میں سو رہی تھی کہ دستک سُن کر بیدار ہوگئی اور جب میں نے دروازہ کھولا تو باہر کوئی نہیں تھا۔ میں دوبارہ آکر بستر پر دراز ہوگئی۔ بس اسی وقت میں نے اپنے بستر میں سانپ کی آواز سُنی پھر میں نے چادر کا گولا بنا کر سانپ کو مارا اور بستر سے کُود پڑی۔ شاید میرا سر اور پیر بستر کی پٹی سے ٹکرا گیا تھا۔ پھر میں بے ہوش ہوگئی تھی۔"

"تم رات بھر وہ چادر اوڑھے سوتی رہی تھیں اور پھر اُٹھ کر دروازہ کھولا تھا؟" ڈیوڈ نے پوچھا۔

جین نے اثبات میں سر ہلادیا۔

وہ چند لمحوں تک سوچتا رہا پھر بولا۔ "مجھے تم سے بہت سی معذرتیں کرنی ہیں، جین۔"

"میں سمجھی نہیں۔ کس بات کی معذرت؟" اس نے پوچھا۔

ڈیوڈ کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"تم ایک عرصے سے مجھے قائل کرنے کی کوشش کر رہی ہو کہ تمھیں کوئی قتل کرنا چاہ رہا ہے مگر مجھے یقین نہیں آرہا تھا۔ آج مجھے تمھاری تمام باتوں پر یقین آگیا۔ یہ سانپ کسی نے تمھاری جان لینے کے لیے بستر میں چھوڑا تھا۔ ظاہر ہے، وہ پہلے سے بستر میں نہیں تھا اور اگر خود ہی اندر آگیا تھا تو بستر پر چڑھنے کے بجائے کسی تاریک کونے میں چلا جاتا۔ اگر سانپ تمھیں ڈس لیتا تو اسے حادثہ ہی سمجھا جاتا۔ تم سچ کہتی تھیں، جین۔ اب مجھے تمھاری دوسری باتوں پر بھی یقین آتا جارہا ہے۔"

وہ کچن میں جا کر چائے بنا لایا۔ جین بستر پر بیٹھ گئی اور دونوں خاموشی سے چائے پینے لگے۔

"اب تم کیا سوچ رہے ہو؟" جین نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

"تمھاری باتوں پر غور کر رہا ہوں۔ ریورنڈ ہالڈین کی شدید نفرت اور ڈاکٹر کریڈش کا خوف بلاوجہ نہیں ہوسکتا۔ میرے خیال میں تو وہ اسٹارلیٹ کی جاگیر ہتھیانے کے چکر میں ہیں۔"

"تمھارا مطلب ہے کہ وہ..." جین بولتے بولتے سوچ میں کھوگئی۔ "تو وہ اس کی پیز حاصل کرنے کے خواہش مند ہیں اور اس کے لیے مجھے راستے سے ہٹانا چاہتے ہیں۔"

"ہاں۔ یہی چکر لگتا ہے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ایلین نے یہ جاگیر تمھارے نام کردی ہوگی۔"

"تو پھر میرا خیال درست ہے نا؟"

"ایلین کے بارے میں؟... کہ وہ زندہ ہے؟"

"ہوسکتا ہے، وہ زندہ ہو۔ میں نے تمھیں بتایا تھا کہ کوئی....... راتوں کو میری کھڑکی سے اندر جھانکتا رہا ہے۔ میں نے رات اس کا تعاقب کیا تھا اور غار میں ایک خوفناک چڑیل دیکھی تھی۔ میں نے اس سلسلے میں ہنری کارٹر سے بات کی تھی وہ کہتا ہے کہ رُوحیں، جسمانی صورت میں آسکتی ہیں۔ یہ ان کا عقیدہ ہے۔"

"تمھارا مطلب ہے کہ ایلین کی رُوح اس رُوپ میں گھوم رہی ہے؟" ڈیوڈ نے کہا مگر اس کے لہجے میں طنز نہیں تھا۔ "میرے خیال میں ہنری کارٹر کسی حد تک درست ہی کہتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ہم نے انسان کے پُرانے عقائد کو نئے نام دے دیے ہیں۔ روح اور اس کے وجود کے سلسلے میں آج کل بڑے تجربات ہو رہے ہیں۔"

"اس طرح تو تم بھی ہنری کارٹر کے عقیدے کے آدمی ہوگئے بس تاویلیں مختلف ہیں۔"

"یہی سمجھ لو۔" ڈیوڈ ہنس پڑا۔ "اس ضمن میں بھی سائنس آگے بڑھ رہی ہے۔ آؤ، دوسرے کمرے میں چل کر بیٹھیں۔ میں کچھ اور چائے بنا لیتا ہوں۔ اب تم کیسا محسوس کر رہی ہو؟"

یونانی طریقۂ علاج کیلئے

خدمت مطب

فون
213197

اوقات مطب
• صبح دس بجے سے دوپہر دو بجے تک
• شام چار بجے سے شام ۶ بجے تک
(بروز جمعہ دواخانہ بند رہتا ہے)

بیرونی حضرات
خط و کتابت کے ذریعے
استفادہ کرسکتے ہیں

اکسیری دواخانہ

موسیٰ والے بلڈنگ بالمقابل ڈسٹرکٹ کورٹ
ایم اے جناح روڈ۔ کراچی۔

"بس سر میں تھوڑا سا درد ہے لیکن وہ خوف تو ختم ہوگیا ہے۔" جین نے کہا اور کھڑی ہوگئی۔ ڈیوڈ کے ہاتھ کا سہارا لے کر وہ دوسرے کمرے میں آئی اور میز کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گئی جس پر بے شمار کاغذات، نقشے اور گراف پھیلے ہوئے تھے۔

"آرام سے بیٹھو۔" ڈیوڈ نے کہا۔

"میں اب چلوں گی۔ کوئی جیکٹ ہو تو دے دو، بعد میں لوٹا دوں گی۔"

"جیکٹ ہے تو سہی۔" اس نے الماری کھولی اور جین کو جیکٹ دے دیا۔ "اب ایلین کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟" اس نے پوچھا۔

"مجھے ابھی تک یقین ہے کہ وہ زندہ ہے۔" جین نے کہا اور جیکٹ پہن لیا۔

ڈیوڈ چائے بنانے چلا گیا اور جین میز پر پڑے کاغذات اُلٹنے لگی۔ پھر ایک ٹائپ شدہ کاغذ پر اس کی نظر جم گئی۔ "درخواست اور کلیم فارم۔" جین پڑھنے لگی۔

"ہم ذیل میں دستخط کنندگان، درخواست گزار ہیں کہ اسٹارلیٹ کی عمارت اور اس سے ملحقہ عمارت جو ایلین ٹوڈ (آنجہانی) کی ملکیت تھی ہمیں لیز پر دے دی جائے تاکہ ہم اسے حیوانات کی بقا اور تحقیقات کے لیے استعمال کر سکیں۔ قانون کے مطابق ہم یہ کلیم فارم داخل کر رہے ہیں اور آرٹیکل چھ کے مطابق ہمیں تمام شرائط منظور ہوں گی۔

ڈیوڈ ریان

برائے دی سی آئی لینڈ وائلڈ لائف ریسرچ پراجیکٹ۔"

جین خوف زدہ نظروں سے اپنے قریب کھڑے ڈیوڈ کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ نہ جانے کب اندر آگیا تھا۔ "ذرا تحمل سے کام لو۔" ڈیوڈ بولا۔ "کوئی فوری نتیجہ مت نکال لینا۔"

"میں نتیجہ نہیں نکال رہی ہوں۔" وہ دھیمی آواز میں بولی۔ "البتہ سوچ ضرور رہی ہوں کہ میری یہاں موجودگی سے اسٹارلیٹ کے بارے میں تمہارے منصوبے بھی غارت ہو کر رہ گئے ہیں۔"

"یہ سچ ہے... اور میں جانتا ہوں کہ اب تمہارے ذہن میں کیا کھچڑی پک رہی ہوگی لیکن کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے میری بات ضرور سن لو۔ اگر میں ہی تمہیں قتل کرنے کے درپے ہوں تو پھر میں نے تمہیں دلدل ہی میں کیوں نہیں مرجانے دیا تھا؟ تمہیں تہ خانے سے کیوں نکالا؟ سمجھنے کی کوشش کرو جین۔ ہم نے یہ درخواست اس وقت دی تھی جب ہمیں بتایا گیا تھا کہ اس جائداد کی وراثت کا دعوا دائر کرنے کا ایک سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ وارث نہ ہونے کی صورت میں حکومت اس بات کی مجاز ہے کہ تین سال بعد وہ جاگیر کسی کو بھی لیز پر دے دے۔ اس طرح دعوے دار کا دو سال تک مزید انتظار کیا جاتا ہے... اور اسی مہینے وہ تین سال مکمل ہو رہے ہیں۔"

"تو..." جین بڑی تیزی سے سوچ رہی تھی۔ "جس کسی نے بھی مجھے کاغذات بھیجے ہیں، وہ چاہتا ہے کہ تمہیں اس کی لیز نہ ملے۔ اگر میں اپنا یہ حق ظاہر کر دوں تو تمہاری درخواست رد ہو جائے گی۔ ہے نا؟"

"ہاں... یا پھر تمہیں کوئی حادثہ پیش آجائے۔ جیسے کہ یہاں آنے کے بعد تمہیں پیش آتے رہے ہیں اور تم ہلاک ہو جاؤ۔" وہ تلخی سے بولا۔

جین نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہاں پھر وہی سنہری اُتر آئی تھی جو ان آنکھوں کا خاصہ تھی۔ "مجھے افسوس ہے، ڈیوڈ۔" وہ نرمی سے بولی۔ "مجھے اتنی جلدی نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے تھا بہرحال میں غور کرنا چاہتی ہوں۔" وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "لیکن اس وقت میرے سر میں تکلیف ہے۔"

"چلو میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔"

"نہیں، میں ٹھیک ہوں۔ خود ہی چلی جاؤں گی۔ کچھ دیر آرام کر کے میں بین کولہان سے بات کروں گی۔ پچھلی بار جب وہ مجھے یہاں سے چلے جانے کے لیے کہہ رہا تھا تو میں اس پر خوب چیخی چلائی تھی۔ وہ میرے لیے کچھ زیادہ ہی فکر مند ہے اور بڑا اصرار کر رہا ہے کہ میں یہاں سے چلی جاؤں کہ اسی میں میری بہتری ہے۔"

"ضرور بات کرنا۔" ڈیوڈ نے کہا اور اس کے ساتھ گھر سے باہر آگیا... پھر وہ اُسے گھوڑے پر سوار جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

تمام راستے وہ یہی سوچتی رہی کہ آخر مکان کے کاغذات اسے کس نے بھیجے تھے۔ اس کا ذہن کسی طرح بھی یہ تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھا کہ یہ کاغذات ایلین کی بجائے کسی اور نے بھیجے تھے۔ "تو کیا واقعی ایلین زندہ ہے؟ تبھی تو اس سے باتیں کرتی رہی ہے... یقیناً وہ ایلین ہی کی آواز تھی۔"

"کاغذات!" اس نے تلخی سے سوچا تو اس کی نظروں کے سامنے ڈیوڈ کا کلیم فارم گھوم گیا۔

گھر آتے ہی اس نے لباس بدلا اور لائبریری میں جا کر فون کے قریب بیٹھ گئی۔ دوسری طرف سے آپریٹر کی آواز سن کر اس نے ایک نمبر بتایا اور رابطہ ملتے ہی کسی سے باتوں میں مصروف ہوگئی۔ وہ شام تک مختلف نمبروں پر گفتگو کرتی رہی۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا شام کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے اس کے اندر کا بھی یہی حال تھا کیونکہ فون کالوں کی وجہ سے ایک انتہائی خوفناک حقیقت سامنے آگئی تھی۔ اس کا دل ڈوب رہا تھا لیکن اسے بہرحال حقائق کا سامنا کرنا تھا۔

* * *

وہ رات کی چائے پی کر بیٹھی ہی تھی کہ باہر بین کی فورڈ کا شور سنائی دیا وہ دوڑتی ہوئی باہر آگئی بین کار سے اُتر رہا تھا اس نے جین کو دیکھ کر بازو پھیلا دیے مگر جین اس سے دُور ہی رُک گئی۔

"کیا بات ہے جین؟" اس نے نرمی سے دریافت کیا۔

وہ محسوس کر رہی تھی کہ اب وہ اس کی آنکھوں میں پھیلی سرد مہری اور بے چینی دیکھ لے گا۔ "بین... ایلین آدھی رات کو گھر سے کیوں نکل کر بھاگی تھی؟" اس نے اپنی آواز پر قابو پاتے ہوئے سادگی سے پوچھا۔

بین کی پیشانی پر لکیریں پڑ گئیں۔ "میں نے تمہیں بتا تو دیا تھا، اس کا موڈ ایک دم سے خراب ہوگیا، تم خود بھی تو اس کی فطرت سے واقف تھیں۔"

"اچھا تو یہ وجہ تھی یا یہ کہ اُسے تمہارے منصوبے کا علم ہوگیا تھا کہ تم اسٹارلیٹ کو ایک تفریحی ہوٹل میں تبدیل کرنا چاہتے ہو؟"

بین کی آنکھوں میں حیرت اُبھر آئی اور اس کا مُنہ لٹک گیا۔

"تم نے کاونٹی لینڈ آفس میں اس کے لیے درخواست دے رکھی ہے اور تم اس جاگیر پر جوئے کے لیے ایک کیسینو بھی تعمیر کرانا چاہتے ہو۔"

"تو تم یہ کرتی پھر رہی ہو؟" وہ خفگی سے بولا پھر اس کے جبڑے بھنچ گئے۔ "تم میرے بارے میں معلومات حاصل کر رہی ہو؟"

"ہاں..." وہ بولی۔ "اور کسی طرح، شاید اتفاقاً ایلین کو تمہارے اس منصوبے کا علم ہوگیا اور پھر اس رات اُسے احساس ہوا کہ تم اس سے محض اس جاگیر کی وجہ سے شادی کرنا چاہ رہے تھے۔ نتیجتاً وہ جذباتی ہو کر گھوڑے پر اندھیرے ہی میں نکل پڑی۔"

"اس طرح اُس کا نکل بھاگنا ایک احمقانہ فعل تھا۔" اس نے جین کو گھورتے ہوئے کہا اس کے لہجے میں ہلکی سی غراہٹ تھی۔ "پھر اسے حادثہ پیش آگیا اور وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔"

"تم اس کے قاتل ہو بین۔ بالکل اسی طرح جیسے تم نے اسے گولی ماری ہو۔ تم نے اسے دھوکا دیا اس کی محبت کا مذاق اڑایا تھا۔ اب تم سمجھتے ہو کہ تم نے اسے مار ڈالا اور راسے دفن کر دیا... لیکن وہ زندہ ہے، بین۔"

"وہ مرچکی ہے۔" بین دانت پیس کر بولا۔ اس کے چہرے سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ "ہم نے اسے دفن کر دیا تھا۔ تمہارا دماغ چل گیا ہے۔"

"تم نے اسی وجہ سے اسے جلدی دفن کر دیا تھا۔ اس کی موت کے بعد ہی تمہارے خواب پورے ہو سکتے تھے۔ میں تمہارے ریورنڈ کا مقصد بھی جان گئی ہوں۔ وہ اس عمارت کو ٹیکس فری خانقاہ بنا کر مذہب کے نام پر دولت سمیٹنا چاہتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم دونوں نے خفیہ طور پر یہ جاگیر تقسیم کرنے کا معاہدہ کر لیا ہوگا۔ اور وہ ڈاکٹر... تم نے اسے بھی لالچ دیا ہوگا کہ ایک حصّہ اسے بھی مل جائے گا تم تینوں ایک خفیہ مشن کے تحت کام کر رہے ہو اسی وجہ سے تم لوگ مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتے تھے۔ تم جانتے ہو کہ میں اب اس جاگیر کی وارث ہوں۔ مجھے راستے سے ہٹائے بغیر تم اس پر قبضہ نہیں کر سکتے۔"

"تم ہمارے ساتھ تعاون کرو گی۔ اس کے سوا تم کچھ نہیں کر سکتیں۔" وہ دانت پیستا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ جین نے جھکائی دے کر بچنا چاہا مگر بین نے اس کے بال مٹھی میں جکڑ لیے اور ایک زوردار جھٹکا دے کر چہرہ اپنے سامنے کر لیا۔ "ایلین مرچکی ہے کتیا کی بچی۔" وہ غرایا۔ "گڑے مُردے اکھاڑنے سے کوئی فائدہ نہیں مکان کے کاغذات میرے حوالے کر دو۔"

جین ساکت کھڑی رہی۔ ایک لمحے کے لیے اس نے اپنے بالوں پر گرفت ڈھیلی محسوس کی تو فوراً ہاتھ بڑھا کے اور ناخنوں سے بین کا مُنہ نوچ ڈالا۔ بین نے ایک چیخ مار کر بال چھوڑ دیے۔ آزاد ہوتے ہی جین جھاڑیوں کی طرف دوڑ پڑی۔

"رُک جاؤ۔ لعنت ہو تم پر۔" وہ گرجتا ہوا اس کے پیچھے لپکا۔ جین درختوں کی قطار تک پہنچی اور اس نے ایک جھاڑی میں بیٹھ کر دَم سادھ لی۔ بین دیر تک گالیاں بکتا اور اُسے ڈھونڈتا رہا۔ بالآخر وہ چیخ کر بولا۔ "احمق مت بنو جین۔" اس کے لہجے میں غصے کی بجائے التجا تھی۔ "وہ حادثے میں ہلاک ہوئی ہے اس کے علاوہ تم کچھ ثابت نہیں کر سکتیں۔ میں نے تمہیں قتل کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔"

جین خاموش پڑی رہی۔

"آجاؤ جین۔ ہم سے تعاون کرو، میں معلوم کر لوں گا کہ تم پر یہ حملے کس نے کیے تھے۔"

اس پر بھی وہ خاموش رہی تو چند لمحے بعد اسے جھاڑیوں کی سرسراہٹ سُنائی دی پھر قدموں کی چاپ دُور ہوتی محسوس ہونے لگی وہ اپنی کار کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے چند لمحوں تک انتظار کیا پھر کار میں سوار ہو کر گاؤں کی طرف چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی جین

اُٹھی اور دوڑتی ہوئی اصطبل میں پہنچی پھر گھوڑے پر زین ڈال کر اس پر سوار ہوگئی۔ اور اس کا رُخ ڈیوڈ ریان کے گھر کی طرف تھا۔

وہ اسے دروازے ہی پر مل گیا شاید گھوڑے کی ٹاپیں اسے جبین کی آمد کا پتہ دے چکی تھیں۔ جبین گھوڑے سے اُتری اور اس کے قریب پہنچ گئی۔ "میرا خیال ٹھیک تھا۔" وہ ہانپتی ہوئی بولی۔ "ایلین ہلاک نہیں ہوئی۔ اُنھوں نے اُسے دفن کردیا تھا مگر وہ زندہ ہے۔"

"ذرا صبر سے کام لو اور ذرا آہستہ آہستہ بتاؤ۔ میرا دماغ اتنا تیز نہیں ہے۔"

"میں اسٹارلیٹ کی بیز کے بارے میں سوچتی رہی کہ کس کس کو اس سے دلچسپی ہوسکتی ہے۔ میں نے پراپرٹی ریکارڈ آفس فون کیا پھر مختلف متعلقہ دفتروں میں فون کرکے حیرت انگیز معلوات حاصل کیں۔" یہ کہہ کر اس نے بین سے ملاقات اور جھگڑے کی تفصیل بھی سُنادی۔

ڈیوڈ بے تعلق سا بیٹھا، اس کی باتیں سُنتا رہا۔ بالآخر اس نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ "اور تم سمجھتی ہو کہ ایلین زندہ ہے؟ اور انھوں نے اسے دفن نہیں کیا؟"

"اُنھوں نے یقیناً اسے دفن کردیا تھا مگر وہ زندہ ہے۔ اس بات کا انھیں بھی یقین ہے۔ انھوں نے اسے بڑی افراتفری میں دفن کیا تھا۔ ڈاکٹر نے معائنہ کے بغیر ہی اس کی موت کا سرٹیفکیٹ جاری کردیا تھا۔"

"ایسا پہلے بھی کئی بار ہو چکا ہے تصدیق کیے بغیر ہی لاشیں دفن کردی گئیں۔" ڈیوڈ بھاری آواز میں بولا۔ "مگر قبر سے نکلنا کوئی آسان کام تو نہیں۔"

"ناممکن بھی نہیں ہے۔ تازہ قبر سے نکلنا دقت طلب ضرور ہوسکتا ہے مگر یہ ناممکن نہیں ہے۔ وہ باہر آگئی اور بدصورتی کی وجہ سے غار میں رہنے پر مجبور ہوگئی پھر اس نے تھاٹا نوڈ کی روایت کو زندہ رکھنے کے لیے انتقام کا منصوبہ بنایا۔ اس نے رات کی تاریکی میں مکان میں گھس کر کاغذات نکال لیے اور اتنی رقم بھی ساتھ لے لی کہ بجلی اور ٹیلی فون کا تین سال کا بل ادا کرسکے... پھر جب تین سال پورے ہونے کو آئے تو اس نے وہ کاغذات مجھے پوسٹ کردیے۔ اس عرصے میں وہ راتوں کو گھر میں آکر مجھے فون کرتی رہی تھی۔" وہ یہ کہہ کر سانس لینے کے لیے رُکی پھر بولی۔ "اب میری سمجھ میں آگیا ہے کہ اس کی کال ہمیشہ آدھی رات کے بعد ہی کیوں آتی تھی۔ ان سے انتقام لینے کے لیے، وہ مجھ سے کام لینا چاہتی تھی اسی لیے اس نے مجھ سے رابطہ قائم رکھا تھا۔"

ڈیوڈ کے مُنہ سے ایک گہری سانس نکل گئی۔ "بڑی حیرت انگیز کہانی ہے۔"

"میں نے اسے دیکھا ہے اور میں جانتی ہوں کہ وہ زندہ ہے۔"

"اوہ نہیں، وہ چڑیل کوئی بدصورت سی بڑھیا ہوگی... یا ہوسکتا ہے تمھارا واہمہ ہی ہو۔ خیر اب تمھارا کیا ارادہ ہے؟"

"میں اسٹارلیٹ جارہی ہوں۔"

"لیکن بین کولہان اور دوسرے لوگ تمھیں...؟"

"وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ اب وہ فرار کے منصوبے بنارہے ہوں گے۔" یہ کہہ کر وہ گھوڑے پر سوار ہوگئی۔

"اس وقت نہ جاتیں تو اچھا تھا۔ کہیں وہ لوگ تمھیں کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کریں۔ بہرحال! میں تمھیں ایک گھنٹے بعد فون کروں گا۔ اس دوران میں ایک اور جگہ کال کرنا چاہتا ہوں۔"

جبین نے گھوڑے کو اپنے گھر کی طرف دوڑانا شروع کردیا۔

راستے میں وہ سوچتی رہی کہ ایلین اسی جزیرے پر موجود ہے۔ میں اس کی تلاش میں پورا جزیرہ چھان ماروں گی۔ بے چاری ایلین... لیکن اگر وہ مجھے کہیں نہ ملی تو...؟ یہ سوال اس کے ذہن کو پریشان کرنے لگا۔

گھر آکر بھی یہی ایک بات اس کے ذہن میں کھٹکتی رہی۔ وہ کہتے ہیں کہ ایلین کو دفن کردیا گیا تھا۔ سب ہی نے اسے دیکھا تھا۔ پھر کیا وہ واقعی وہ اپنی قبر سے نکلنے میں کامیاب ہوگئی؟ اگر کامیاب ہوتی تو اسے فون کس نے کیے تھے؟ غار میں کون تھی؟ یقیناً وہ ایلین ہی تھی۔ وہ ان گول گول بھوری آنکھوں کو کبھی نہیں بھول سکتی تھی۔ "قبر" اس نے سوچا اور بستر سے اُٹھ بیٹھی۔ اس سے بہتر تصدیق اور کسی طرح نہیں ہوسکتی تھی۔

وہ ہال میں آگئی پھر تہ خانے سے ایک پھاوڑا نکال کر عمارت کے عقب میں واقع قبرستان پہنچ گئی اور وہی قبر کھودنے لگی جس پر ایلین کا کتبہ لگا ہوا تھا۔ مٹی نرم ہی تھی۔ وہ بڑی آسانی سے تابوت تک پہنچ گئی۔

تابوت معمولی لکڑی کا بنا ہوا تھا اس نے پھاوڑے کی مدد سے ڈھکنا ہٹادیا اور آگے کی طرف جھکنے لگی۔

اچانک عقب میں آہٹ پیدا ہوئی اور اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے اس نے مُڑنا چاہا لیکن اگلے ہی لمحے کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بڑی بے دردی سے موڑا اور اس کی کمر سے لگادیا۔ وہ بُری طرح چیخ پڑی... تب اسے گردن گھمانے کا موقع مل گیا اس نے دیکھا کہ وہ ریورنڈ ہالڈ مین تھا جو بڑی خونخوار نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

اس نے گردن سیدھی کرنی چاہی مگر ایک زنّاٹے دار تھپڑ نے اس کا مُنہ پھیر دیا۔ جبین کا ہونٹ پھٹ گیا اور خون کی لکیر اس کی ٹھوڑی پر بہہ نکلی۔ اس نے مدھم چاندنی میں تھپڑ مارنے والے کو پہچان لیا وہ بین کولہان تھا اس کے ساتھ ہی منحنی سا ڈاکٹر کریڈش بھی کھڑا تھا۔

"ہم تینوں مل گئے تھے اور تم ہمارے خلاف کوئی بات ثابت نہیں کرسکتی تھیں۔" بین غرّایا۔ "لیکن اب ہم نے فیصلہ کرلیا ہے کہ تمھارا کام ہی تمام کردیا جائے۔"

"تم نے پہلے بھی مجھے ختم کرنے کی کوششیں کی ہیں اور مُنہ کی کھائی ہے۔" جبین نے غصّے سے تلملا کر کہا۔ "اور اس بار بھی تمھیں ناکامی ہی ہوگی۔"

"تم واقعی خوش قسمت تھیں، لڑکی۔" پادری بولا۔ "ہر بار ہم نے یہی کوشش کی تھی کہ تمھاری موت محض حادثہ دکھائی دے۔"

"تو وہ سانپ بھی تم نے ہی میرے بستر میں رکھا تھا؟"

"یقیناً... لیکن اس بار ہم تمھیں بالکل ہی غائب کردیں گے۔" پادری نے کہا۔ "ایک تابوت میں دو لاشیں بھی رکھی جاسکتی ہیں۔"

"ڈیوڈ ریان خاموش نہیں بیٹھے گا۔" جبین نے کہا۔ "میں نے اسے ساری باتیں بتادی ہیں۔" وہ باری باری ان کی طرف دیکھنے لگی۔ صرف ڈاکٹر ہی قدرے گھبراہٹ میں مبتلا دکھائی دے رہا تھا۔ باقی دونوں آدمیوں کے چہروں سے درندگی ٹپک رہی تھی۔

"ہم تمھاری طرف سے گھر میں ایک پرچہ رکھ دیں گے کہ تم واپس چلی گئی ہو۔" بین نے کہا۔ "پھر چاہے وہ کتنی ہی تفتیش کرلے ہمارے خلاف کوئی ثبوت فراہم نہیں کرسکے گا۔"

"چلو...!" پادری اس کا ہاتھ زور سے موڑ کر غرّایا اور اسے قبر کی طرف دھکیلنے لگا۔

"ہمّت نہ ہارنا، جبین!" اچانک تاریکی سے ایک آواز سُنائی دی اور پھر ڈیوڈ دکھائی دیا جو دوڑتا ہوا انھی کی طرف آرہا تھا۔

"اسے چھوڑنا نہیں۔" بین کولہان چلّایا اور ڈیوڈ کی طرف جھپٹ پڑا۔ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے تو ڈاکٹر بھی بین کی مدد کے لیے آگے بڑھا اور موقع پاکر ڈیوڈ کو ٹھوکر ماردی۔ دونوں نیچے گر پڑے اور ایک دوسرے کا گلا گھونٹنے کی کوشش کرنے لگے۔

پادری، جبین کا ہاتھ موڑے انھیں دیکھ رہا تھا کہ اچانک جبین نے ایڑی سے اس کی پنڈلی پر چوٹ لگائی۔ پادری کے حلق سے ایک چیخ نکل گئی اور وہ جبین کو چھوڑ کر اپنی پنڈلی پکڑنے پر مجبور ہوگیا۔

جبین نے پھاوڑا بلند کرکے پوری قوت سے دستہ بین کے سر پر دے مارا۔ بین دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے ایک طرف لڑھک گیا تو ڈیوڈ فوراً ہی اُٹھا اور اس نے پستول نکال لیا۔ اس کی طرف بڑھتا ہوا پادری رُک گیا۔ ڈاکٹر بھی چوہے کی طرح سکڑ کر رہ گیا۔ بین کراہتا ہوا اُٹھا اور اس نے ڈیوڈ کی طرف بڑھنے کی کوشش کی۔ ڈیوڈ نے پستول کی نال آسمان کی طرف اُٹھائی اور دو تین فائر کردیے۔ بین ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا پھر مڑا اور جنگل کی طرف بھاگ نکلا۔ ڈاکٹر اور پادری بھی جس طرف مُنہ اُٹھا، دوڑ پڑے۔ جبین ڈیوڈ کی طرف بڑھی اور اس کی بانہوں میں جھول کر بے ہوش ہوگئی۔

• •

جب اسے ہوش آیا تو ڈیوڈ اس پر جھکا ہوا تھا۔ "میں تو پریشان ہوگیا تھا۔" وہ نرمی سے بولا۔ "تم بہت دیر بعد ہوش میں آئی ہو۔"

"شاید لاشعوری طور پر میں ہوش میں آنے سے خوف زدہ تھی۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"میں نے پولیس کو فون کرکے صورتِ حال سے آگاہ کردیا تھا۔ اُنھوں نے تینوں آدمی گرفتار کرلیے ہیں اور اب انھیں تمھارے بیان کی ضرورت ہے۔" ڈیوڈ کہہ رہا تھا۔ "میں نے ایک گھنٹے بعد تمھیں فون کیا اور جب تمھاری طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو میں فوراً یہاں چلا آیا۔ تب میرے خدشات درست ہی ثابت ہوئے۔"

"کیا مطلب؟" جبین چونک پڑی۔

"میں نے تمھیں بتایا تھا نا کہ مجھے ایک فون کرنا ہے۔ لہٰذا میں نے واشنگٹن میں اپنے ایک دوست کو فون کیا تھا۔ وہ ایک سائنسداں ہے اور اس کا تعلق سائنس کی اس جدید ترین شاخ سے ہے جسے 'بایو فیڈ بیک ٹریننگ' کہتے ہیں۔"

جبین اُٹھ بیٹھی اور توجہ سے اس کی باتیں سننے لگی۔

"اس شاخ کا تعلق دماغ کی اُن لہروں سے ہے جنھیں الفا ویوز کہا جاتا ہے۔ سائنسی تجربات سے معلوم کیا گیا ہے کہ ان لہروں پر قابو پاکر آدمی محیّر العقول حرکات کرسکتا ہے۔ ایسے لوگوں نے تربیت کے بعد اپنے جگر، گردے، دل، غدود اور شریانوں وغیرہ کی حرکات اور افعال کو اپنی مرضی کے تابع کرلیا تھا۔ اپنے دماغ کی ان الفا لہروں پر قابو پانے کا ماہر ایسے کام کرنے پر قادر ہوجاتا ہے جو انسانی فہم و ادراک سے بعید ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ اپنی دھڑکن کو طویل عرصے تک سست کرکے اپنی زندگی بڑھا سکتا ہے۔ نہ جانے وہ اور کیا کیا کرسکتے ہیں، بالکل مشرقی جادوگروں کی طرح..."

"کیا تمھارا مطلب ہے کہ ایلین نے یہی کیا ہے؟"

"شدید نفرت یا انتقام کا جذبہ نامعلوم طریقے پر آدمی میں یہ قوت پیدا کر دیتا ہے۔ ایلین کے ساتھ یہی ہوا تھا۔ اس میں واقعی اتنی قوت پیدا ہو گئی لیکن وہ نفرت کے باوجود ان سے خود انتقام نہیں لے سکتی تھی مگر وہ سمجھ گئی کہ انھیں اُلجھا کر قتل کرنے پر آمادہ کیا جاسکتا ہے اور اس طرح انھیں سزا ہو سکتی ہے اس نے تمھارے ذریعے یہی کام کیا ہے۔"

"تو اس نے مجھے محض چارے کے طور پر استعمال کیا ہے۔"

"وہ خود کسی قابل کہاں رہ گئی تھی۔ اس کا جسم تباہ ہو چکا تھا۔ اس کی روح ایک عظیم کرب میں مبتلا تھی اور اس کا ذہن... بس یہی ایک قوت اس کے پاس باقی رہ گئی تھی۔"

"تو تمھیں یقین ہے کہ ایلین زندہ ہے، وہ اپنی قبر سے انتقام لینے کے لیے نکلنے میں کامیاب ہو گئی ہے اور تین سال سے وہ اس انتقام کے لیے سرگرداں رہی ہے۔"

"میں نے یہ کہا ہے کہ سائنسی طور پر ایسا ممکن ہے اور اگر واقعی یہ اُسی نے کیا ہے میرا مطلب ہے، تمھیں راتوں کو فون کرنا، کاغذات بھیجنا اور یہ سب کچھ تو محض اس کی ذہنی قوت کا کارنامہ ہے جو نفرت اور شدید غصّے نے اسے عطا کی تھی۔ کیا تم اس کا حتمی جواب چاہتی ہو جین؟" ڈیوڈ نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر پوچھا۔ "کیا تم اس کام کو اختتام تک پہنچانے کی خواہش مند ہو؟"

"ہاں... میں آخر تک جانا چاہتی ہوں۔"

"تو اُٹھو۔ میرے ساتھ آؤ۔" ڈیوڈ نے کہا۔

جین اُٹھی اور دونوں باہر آگئے۔

ڈیوڈ اس کا ہاتھ تھام کر اُسے قبرستان کی طرف لے جا رہا تھا۔ جین کا حلق خشک ہونے لگا اس کے ہونٹوں پہ پپڑیاں سی جم گئیں وہ بار بار ان پر زبان پھیر کر انھیں تر کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

وہ ایلین کی کھُدی ہوئی قبر پر پہنچ گئے۔

تابوت کا ڈھکنا بند تھا۔ 'یقیناً تابوت خالی ہوگا۔' جین نے دھڑکتے دل سے سوچا۔

ڈیوڈ نے جُھک کر ڈھکنا اُٹھا دیا اور پیچھے ہٹ آیا۔ "اندر دیکھو جین۔"

جین نے ڈرتے ڈرتے اندر دیکھا تو ایک چیخ ماری اور پلٹ کر ڈیوڈ کا انتظار کیے بغیر مکان کی طرف دوڑ پڑی۔

ڈیوڈ جب تابوت بند کر کے اس کے گھر پہنچا تو جین ایک کُرسی پر سردی کھائی ہوئی کسی بلّی کی طرح سکڑی بیٹھی تھی۔ "تمھاری طبیعت تو ٹھیک ہے، جین!" اس نے قریب آکر پوچھا۔

"وہ... وہ وہی تھی۔ میں نے اسی کو غار میں دیکھا تھا۔ یہی کریہہ چہرہ۔ دہانے جیسا مُنہ، لٹکی ہوئی ناک اور خوفناک دھبے... " جین کہہ رہی تھی اور اس کا جسم بُری طرح کانپ رہا تھا۔

"ہنری کارٹرج کہتا تھا، مرنے کے بعد بھی پریشاں روحیں اپنے جسموں کے ساتھ آوارہ پھرتی رہتی ہیں۔"

"ممکن ہے جین... اور یہ بھی ممکن ہے کہ نفرت اور انتقام کی شدید خواہش کی وجہ سے پیدا ہونے والی الفاہروں نے اسے مرنے نہ دیا ہو اور وہ قبر سے باہر آگئی ہو۔ صرف گھنٹہ بھر پہلے کی تو بات ہے۔ اگر یاد رہی تمھیں پکڑ کر کھینچ نہ لیتا تو تم دیکھ لیتیں کہ تابوت خالی پڑا تھا۔ ایلین اندھیرے میں، کسی درخت سے لگی یہ ساری کارروائی دیکھ رہی تھی۔ اسے اطمینان ہو گیا کہ اب اس کے تینوں دشمن کسی طرح نہیں بچ سکتے۔ گویا اس کا انتقام پورا ہو گیا تھا۔ ان لوگوں کے بھاگ جانے کے بعد جب تم بے ہوش ہو گئیں اور میں تمھیں لے کر اندر آگیا تو وہ موقع پا کر تابوت میں جا لیٹی تھی۔ اب چونکہ اس کا انتقام پورا ہو چکا ہے، اس لیے الفاہروں کی قوت ختم ہو گئی اور وہ واقعی مر گئی... یہ اس کی ایک سائنسی تاویل ہے جین... اور میرے خیال میں یہی درست ہے۔"

"ممکن ہے۔ ممکن ہے ڈیوڈ۔" اس نے بڑبڑا کر آنکھیں بند کر لیں۔

ڈیوڈ دیر تک اسے دیکھتا رہا پھر بولا۔ "اب اسٹار لیٹ کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے جین؟"

"تم اس میں اپنا پراجیکٹ شروع کر سکتے ہو ڈیوڈ۔" وہ بولی۔ "میں اسے اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتی اس میں کوئی بھی خاندان خوش نہیں رہ سکتا۔"

"اور میرے گھر کے بارے میں کیا خیال ہے؟" ڈیوڈ نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ جین نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر نظریں جھکا لیں ڈیوڈ کچھ اور قریب آگیا۔ "مجھے ایک ساتھی کی ضرورت ہے۔" اس نے جین کے ہاتھ تھام کر اُسے دھیرے سے اُٹھا دیا۔ جین نے غنودہ سی آنکھوں سے دوبارہ اس کی طرف دیکھا اور اس کے کندھے پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔

سامنے کے حقائق سے چشم پوشی کا شاخسانہ
ایک ایسے شخص کی رُوداد جو دُور اندیش
تھا اور اس نے کمال کی منصوبہ بندی کی تھی

عمران احمد

جیسا کہ میں نے عرض کیا کبھی کبھی حالات بڑے عجیب و غریب انداز میں پیش آتے ہیں۔ آپ کوئی شے تلاش کرتے ہیں اور وہ آپ کو نہیں ملتی پھر یکایک آپ کی نظر اُس پر پڑتی ہے اور آپ چیخ پڑتے ہیں۔ "وہ رہی!"... کبھی آپ اپنے دوستوں کے ساتھ اُن کی بیویوں کے رویے پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں... اور پھر آپ خود کسی پیاری سی لڑکی سے

شادی کر لیتے ہیں۔ شروع شروع میں آپ اُس کی ہر بات کے جواب میں کہتے ہیں ”ہاں جان... نہیں... جان... جیسا تم کہو جان ...وغیرہ وغیرہ... لیکن پھر محبت کی گرمی کم ہونے لگتی ہے اور آپ اُنھی دوستوں کی صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور دوسرے دوست آپ کے حال پر ہمدردی کا اظہار کرنے لگتے ہیں۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا... کبھی کبھی حالات بڑے عجیب اور ناقابلِ یقین ہوتے ہیں۔ جیسا کہ پچھلے اکتوبر میں میرے ساتھ پیش آیا۔ میں بذریعہ ٹرین لندن جا رہا تھا کہ ایک شخص میرا ہم سفر بن گیا اور ہم دونوں نے اس طرح گفتگو چھیڑ دی گویا نہ جانے کتنے پرانے دوست ہوں۔ کتنی عجیب بات ہے۔ ایک شخص جسے آپ نے پہلے کبھی دیکھا تک نہیں، وہ اتفاقیہ مُلاقات پر آپ سے اس طرح گھُل مل جاتا ہے، گویا یہ شناسائی نہ جانے کتنی پرانی ہو حالانکہ آپ اُس سے اُس کا نام تک پوچھنے کی زحمت بھی نہیں کرتے لیکن میں نے یہ زحمت کی تھی۔ اُس کا نام کرسٹوفر جونز تھا۔ ایک عام سا نام... اور وہ ایک عام سا ہی آدمی تھا۔

کتنی حیرت کی بات ہے کہ میں اُس رات اُسی کے بارے... میں سوچ رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا، کیا ہم دوبارہ بھی مل سکیں گے؟ اور ساتھ ہی یہ بھی سوچ رہا تھا کہ آج این کے بغیر یہ گھر کتنا سُونا سُونا سا لگ رہا ہے... کہ... اچانک ہی دروازے کی اطلاعی گھنٹی بج اُٹھی۔ میں نے اُسے زیادہ اہمیت نہیں دی اور اِک شانِ استغنا سے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

سامنے دو افراد کھڑے تھے۔ دونوں خوب لحیم شحیم تھے... اُن میں سے ایک نسبتاً قوی ہیکل تھا۔ اُس نے مجھے مخاطب کیا۔

”کیا تمھارا ہی نام آرتھر اسٹریکر ہے؟“

”ہاں...؟“ میں نے اُس سے اتفاق کیا اور اُنھیں اندر آنے کی دعوت دی۔

وہی قوی ہیکل دوبارہ مخاطب ہُوا۔ ”میرا نام سارجنٹ ڈان ہے اور یہ سارجنٹ اسمتھ ہے۔ ہم اسکاٹ لینڈ یارڈ سے تعلق رکھتے ہیں۔“

میں اُس کی تردید کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا تھا لہٰذا سر کو اثبات میں جنبش دے کر رہ گیا۔

” میں تم پر یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہم تمھاری بیوی کی موت کے سلسلے میں تفتیش کرنے نہیں آئے۔ مقامی پولیس اس کیس کی تحقیقات کر رہی ہے۔“ وہ خاموش ہو گیا اور کافی دیر تک خاموش رہا پھر اپنے پھیپھڑوں میں ڈھیر ساری ہَوا بھر لینے کے بعد گویا ہُوا۔ ”ہم دراصل کرسٹوفر جونز کی موت کے سلسلے میں آئے ہیں۔“ اُس نے انکشاف کیا۔

”موت...؟“ میں حیرت سے گنگ ہو گیا۔

”قتل۔“ اُس نے تصحیح کی اور قدرے سفّاکی سے بولا... ”جس رات تمھاری بیوی کا انتقال ہُوا تھا، اُس رات تم نے لندن کا سفر اختیار کیا تھا تو اُسی ٹرین اور اُسی اپارٹمنٹ میں سفر کیا تھا جس میں کرسٹوفر سفر کر رہا تھا۔ اس بات کا تم پہلے ہی اعتراف کر چکے ہو۔“

اُن سے بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

وہ مجھے اپنے ساتھ لندن لے گئے۔ تمام وقت میں یہی سوچتا رہا کہ یہ ناممکن ہے لیکن یہ ناممکن نہیں تھا کیونکہ حقیقت میرے سامنے تھی۔ تفتیش کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ چل نکلا۔ سب سے پہلے شناخت پریڈ ہُوئی۔ ایک گھبرائی گھبرائی سی عورت لائی گئی جسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ مجھے دیکھ کر اثبات میں سر ہلا رہی تھی۔ اس کے بعد ایک اور عورت حاضر کی گئی۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا تھا تو وہ میری طرف غور سے دیکھنے لگی تھی۔ اُس وقت وہ ہمارے اسٹیشن پر بوفے ٹرالی دھکیل رہی تھی۔ مجھے پہچانتے ہی اُس کے ہونٹ بھنچ گئے پھر اُس نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے بعد ٹکٹ کلکٹر آیا۔ اُس نے مجھے اتنی افسردہ نگاہوں سے دیکھا گویا میں کوئی ایسی بوڑھی سی غریب عورت ہوں جس کے پاس ٹکٹ نہ ہو اور جس کا دُنیا میں کوئی دوست، کوئی ہمدرد اور کوئی غم گسار نہ ہو پھر اُس نے بھی بڑی اُداسی اور بڑی ہی سوگواری کے ساتھ دھیرے سے اپنا سَر اثبات میں ہلا کر میرے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔

اس کے بعد قانونی کارروائیوں کا آغاز ہُوا اور میں نے اُس قوی ہیکل سارجنٹ ڈان کو بیان دیتے سُنا جو کہہ رہا تھا۔ ”مُلزم نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ جس رات اُس کی بیوی ہلاک ہُوئی تھی، اُس رات وہ مسٹر کرسٹوفر جونز کے ساتھ اُسی ٹرین اور اُسی کمپارٹمنٹ میں سفر کر رہا تھا۔“ اُس نے مزید بتایا کہ جونز جب گھر واپس نہ پہنچا تو اُس کی بیوی نے وہ رات کس پریشانی کے عالم میں گزاری کیونکہ گزشتہ شام ہی اُس کی آمد متوقع تھی... اور پھر اُنھوں نے کس طرح کرسٹوفر کی لاش، ریڈنگ اور میڈن لینڈ کے درمیان، ریلوے کے پُشتے پر مسخ شدہ حالت میں دریافت کی... اور پھر بوفے ٹرالی والی اُس بوڑھی عورت نے

کٹہرے میں کھڑے ہو کر بیان دیا کہ اُس نے مجھے ٹرین میں سوار ہوتے اور کمپارٹمنٹ میں جونز سے باتیں کرتے دیکھا تھا اور اُسے یقین تھا کہ یہ وہی رات تھی اور یہ بھی یقین تھا کہ وہ شخص میں ہی تھا۔ اس کے بعد وہی ٹکٹ کلکٹر نمودار ہُوا... اور اُس نے حلف اُٹھانے کے بعد میری جانب اپنی افسردہ اور سوگوار نظروں سے دیکھتے ہُوئے بیان دیا کہ یقیناً اُس نے مجھے کمپارٹمنٹ میں جونز کے ساتھ گفتگو کرتے دیکھا تھا اور پھر ریڈنگ گزرنے کے بعد میڈن لینڈ کے قریب پہنچنے تک اُس نے دوبارہ مجھے اُسی کمپارٹمنٹ میں تنہا دیکھا تھا۔ اُس نے یہ اقرار بھی کیا کہ میں بے حد گھبرایا ہُوا نظر آ رہا تھا لیکن اُس وقت اُسے کسی قسم کا شبہ نہیں ہُوا تھا... لیکن جب مسٹر جونز کی لاش دریافت ہُوئی تو اُسے میری گھبراہٹ یاد آئی اور ساتھ ہی اُس کی وجہ بھی سمجھ میں آ گئی... اور ہاں... اُسے یقین تھا کہ یہ سانحہ اُسی رات پیش آیا تھا پھر نہ جلنے میں نے اُسے یا ڈان کو یہ کہتے سُنا کہ کرسٹوفر جونز سے جو ٹکٹ حاصل ہُوا تھا، اُس پر میرا فون نمبر تحریر تھا۔ جونز نے یہ فون نمبر لکھا تھا اس طرح وہ تاریخ پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی۔ ٹکٹ کلکٹر نے دوبارہ زور دے کر کہا کہ میں ریڈنگ اسٹیشن پر تو جونز کے ساتھ تھا لیکن میڈن لینڈ اسٹیشن پر تنہا دکھائی دیا تھا۔ میں دراصل اپنے اندازِ گفتگو کی وجہ سے اُسے یاد رہ گیا تھا۔ اُس نے کہا۔ ”میں لوگوں کی حرکات و سکنات کا مشاہدہ کرنے میں دلچسپی رکھتا ہوں۔ اگر ایسا نہ کروں تو بلا ٹکٹ سفر کرنے والے مجھے آسانی سے غچہ دینے میں کامیاب ہو جائیں۔ بہرحال یہ مشاہدہ ایک طرح سے میری فطرتِ ثانیہ بن گیا ہے اور میں نے اس ذاتِ شریف کے اندازِ گفتگو میں خصوصی دلچسپی لی تھی۔“

”اس کے اندازِ گفتگو میں ایسی کیا خاص بات ہے؟“ اُس سے سوال کیا گیا۔

”یہ ہر جملے کے آغاز میں کہتا ہے! جیسا کہ میں نے عرض کیا۔“

چلیے صاحب چھُٹی ہُوئی۔ میرا یہ اعتراف بھی اس سلسلے میں معاون ثابت ہُوا تھا کہ میں نے اُس رات لندن کا سفر اختیار کیا تھا۔ وہ لوگ قتل کے محرّک کا سُراغ لگانے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے لیکن جُرم بہرحال جُرم ہی تھا۔ بھلا میں کیا کہہ سکتا تھا؟ البتہ میں یہ ضرور جانتا تھا کہ بوفے ٹرالی والی بڑھیا کو مغالطہ ہو گیا تھا اور ٹکٹ کلکٹر سفید جھوٹ بول رہا تھا اور میں اس کی وجہ بھی خوب اچھی طرح جانتا تھا۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ بعض اوقات بڑے عجیب و غریب واقعات رُونما ہوتے ہیں اور یہ بھی اپنی نوعیت کا عجیب و غریب ہی واقعہ تھا۔ دراصل کرسٹوفر جونز سے میری مُلاقات پچھلے اکتوبر میں لندن کے سفر کے دوران ہُوئی تھی اور میں نے اُسے اپنی بیوی کو قتل کرنے کے منصوبے سے آگاہ کرتے ہُوئے موقعِ واردات سے اپنی عدم موجودگی ثابت کرنے کے لیے بطور گواہ تیار کیا تھا اور اس کے لیے ایک ہزار پونڈ کی پیش کش کی تھی۔ وہ رضامند ہو گیا تھا اور ہم نے تاریخ مقرر کر لی تھی لیکن ہمیں یہ معلوم نہیں تھا کہ ٹکٹ کلکٹر نے ہماری یہ باتیں سُن لی ہیں اور وہ ہمارے منصوبے سے آگاہ ہو گیا ہے ...نہ صرف یہ بلکہ اُس نے وہ تاریخ بھی نوٹ کر لی ہے جس روز مجھے اپنی بیوی کا قصّہ پاک کرنا تھا۔ لہٰذا اُس نے کرسمس سے دو روز قبل کرسٹوفر کو طے شُدہ دن، لندن کے سفر کے دوران ہلاک کر کے گاڑی سے نیچے پھینک دیا اور وہ ایک ہزار پونڈ اُس سے حاصل کر لیے جو میں نے اُسی روز کرسٹوفر جونز کو ادا کیے تھے لیکن میں نے اُس کے ساتھ لندن کا سفر نہیں کیا تھا۔ بھلا میں اُس رات ٹرین پر اُس کے ساتھ کس طرح موجود ہو سکتا تھا جس رات میں نے اپنی بیوی کو قتل کیا تھا؟... لیکن اگر میں یہ کہتا کہ میں نے اُس رات کرسٹوفر جونز کے ساتھ لندن کا سفر نہیں کیا تھا تو ظاہر ہے یہ ثابت کرنا کوئی مشکل کام ہوگا کہ میں ہی اپنی بیوی کا قاتل ہوں...

شمیم امان

مسٹر 5×5

مٹاپے سے نجات حاصل کرنے والوں کے لیے لمحۂ فکریہ! اُس شخص کا فسانۂ عجیب جو اپنی جسامت کم کرکے ناقابلِ شناخت بننا چاہتا تھا

جارج نے انگلیوں کی مدد سے چھو کر محسوس کیا کہ نرس اس کے لیے جو سوٹ لائی ہے وہ کارڈ رائی کا بنا ہوا ہے اور پھر یہ کپڑے اس کے اپنے نہیں ہیں۔

"تم سے غلطی ہو گئی ہے۔ نرس یہ کپڑے میرے نہیں ہیں۔" اُس نے جھلائی ہوئی آواز میں کہا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو یہ کپڑے واقعی تمھارے نہیں ہیں کیونکہ تمھارے کپڑے حادثے میں بُری طرح خراب ہو چکے تھے۔" نرس کے لہجے میں ہمدردی کا جذبہ نمایاں تھا۔

"اوہ! اور میری آنکھوں کی پٹیاں کب کُھلیں گی؟" جارج نے پُرسکون ہوتے ہوئے پوچھا۔

"ڈاکٹر آنے ہی والا ہے، جیسے ہی وہ آیا پٹیاں کھول دی جائیں گی۔"

"میرا خیال ہے مجھے اس کا انتظار کر لینا چاہیے کیونکہ پٹیاں کھُلنے کے بعد ہی میں کپڑے پہن سکوں گا۔" اس نے آہستہ سے اپنا سر تکیے پر ٹکا دیا۔ وہ حادثے کی تفصیل پر غور کرنے لگا جس کی وجہ سے وہ اسپتال تک آ پہنچا تھا۔

برتھا کے فارم ہاؤس کے پیچھے وسیع میدان عبور کرکے جنگل کے قریب واقع خشک کنویں کی تہ میں پوشیدہ تیس ہزار ڈالر کی خطیر رقم اس کی منتظر تھی۔ رقم اس نے ایک برتن میں رکھ کر کنویں میں ڈال دی تھی۔ برتن کو کنویں سے باہر نکالنے کے لیے اس نے کوٹ کے ... ہینگر کو ایک ڈوری سے باندھا تھا اور ہینگر کے ہک میں برتن کا ہینڈل پھنسا کر اوپر کی طرف کھینچ لیتا تھا لیکن وہاں جانے سے پہلے جارج نے رائی کی تیز شراب کے تین بڑے پیگ اپنے حلق میں انڈیلے تھے تاکہ اس کے حواس منتشر نہ ہوں لیکن بدقسمتی سے اس کا ناتواں جسم تیز شراب اور سخت دھوپ برداشت نہ کر سکا اور جب وہ اس وسیع میدان کو عبور کرکے کنویں تک پہنچا تو جسم کے ساتھ اس کا دماغ بھی جواب دے چکا تھا۔ ٹھوکر لگنے کی وجہ سے اس کا سر کنویں کی پتھریلی منڈیر سے ٹکرایا اور اُس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا تھا۔

"تمھارے پاس گھڑی تو ہو گی؟" جارج نے نرس سے پوچھا۔

"ہاں۔ تقریباً پانچ بجے ہیں۔"

"اُس کا مطلب ہے چھ گھنٹے ضائع ہو چکے ہیں۔" جارج نے دل ہی دل میں سوچا۔ "برتھا پام رائے اسٹیشن پر پہنچ گئی ہو گی اور یقیناً بے چینی سے میری منتظر ہو گی۔ ممکن ہے اُسے شک ہو گیا ہو کہ میں نے اس کے ساتھ دھوکا کیا ہے اور تیس ہزار ڈالر کی رقم لے کر فرار ہو چکا ہوں۔ ہو سکتا ہے، وہ انتقام لینے کے لیے پولیس کو فون پر سب کچھ بتا دے۔" جارج کو طرح طرح کے خیالات پریشان کر رہے تھے۔ "جتنی جلدی ممکن ہو سکے مجھے برتھا کے پاس پہنچ جانا چاہیے۔" جارج نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا۔

"میں یہاں کیسے پہنچا تھا؟" اس نے نرس سے پوچھا۔

"جب تم کنویں کے قریب اُس ویران علاقے میں بے ہوش پڑے ہوئے تھے تو ایک شکاری کی نظر تم پر پڑ گئی اور وہ ازراہِ ہمدردی تمھیں یہاں چھوڑ گیا ... وہ تمھیں بمشکل تمام گھسیٹتے ہوئے اپنی کار تک لے گیا تھا اسی لیے تمھارے کپڑے خراب ہو گئے۔ اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں تمھیں داخل کر لیا گیا تھا۔"

"اس کا مطلب ہے تیس ہزار ڈالر ابھی تک کنویں میں محفوظ ہیں۔" اس نے اپنے دل میں شکاری کو سلواتیں سنائیں جس کی بے جا مداخلت نے سارا پروگرام چوپٹ کر دیا تھا۔

◆

کئی ماہ پیشتر وہ آوارہ گردی کرتا ہوا نیویارک سے اس چھوٹے سے قصبہ ایپلٹن میں وارد ہوا تھا۔ اس وقت رات کے دس بجے تھے۔ قصبے کے لوگ جلد سو جانے کے عادی تھے اس لیے قصبے تک آنے والی واحد سڑک سنسان پڑی تھی۔ سڑک سے تقریباً سو گز کے فاصلہ پر فارم ہاؤس میں روشنی نظر آئی تو وہ اسی طرف چل پڑا۔ دستک کے جواب میں برتھا نے دروازہ کھولا اور اسے اندر آنے کو کہا۔ جب جارج نے اسے بتایا کہ وہ نیویارک سے سیر و تفریح کی غرض سے یہاں تک آ پہنچا ہے تو برتھا نے نہ صرف اُسے کھانے پر اپنے ساتھ شریک کر لیا بلکہ رات کو قیام کرنے کی اجازت بھی دے دی۔ دوسری صبح برتھا نے اسے بتایا کہ وہ ایک تنہا اور غریب بیوہ ہے اور اس کے پاس سوائے اس خستہ حال فارم ہاؤس کے اور کچھ نہیں ہے۔

جارج کو برتھا کے ساتھ رہتے ہوئے ایک ہفتہ گزر گیا تو دونوں ایک دوسرے کو خوب سمجھ چکے تھے اور آپس میں اعتماد کی فضا قائم ہو چکی تھی۔

ایک روز برتھا نے اسے بتایا کہ اس نے ایک نہایت سادہ اور آسان منصوبہ ترتیب دے رکھا ہے۔ اسے صرف ایک قابلِ اعتماد ساتھی کا انتظار تھا اگر جارج اس منصوبے میں شامل ہو جائے تو بڑی آسانی سے اور بغیر کسی خطرہ کے ایک بڑی رقم ہاتھ لگ سکتی ہے۔ منصوبے کے مطابق فارم ہاؤس کے قریب سے جو سڑک گزرتی ہے اس پر کوئی دو فرلانگ کے فاصلے پر ایک کچا راستہ میکلن ٹول کمپنی تک جاتا ہے، اس علاقے میں سوائے اس کمپنی کے اور کوئی کارخانہ یا دکان نہیں ہے۔ ہر جمعہ کی سہ پہر کو تین بجے کمپنی کا مالک میکلن یہاں سے گزرتا ہے جس کے پاس ہفتہ واری تنخواہ کا تھیلا ہوتا ہے۔ یہ بوڑھا ہمیشہ تنہا ہوتا ہے اور اپنے ساتھ کسی قسم کا ہتھیار بھی نہیں رکھتا کیونکہ اس علاقے میں کبھی کوئی چوری یا ڈکیتی کی واردات نہیں ہوئی۔

برتھا نے منصوبے کی تفصیلات بتاتے ہوئے کہا کہ اُسے صرف اتنا کرنا پڑے گا کہ جب میکلن اپنی کار میں تنخواہ کا تھیلا لے کر گزرنے جو وہ ہر ہفتے بینک سے لے کر آتا ہے تو جارج کچی سڑک پر لیٹ جائے، میکلن جو کسی زمانے میں چرچ سے وابستہ رہ چکا ہے اُسے دیکھ کر گاڑی ضرور روک لے گا اور جیسے ہی وہ گاڑی سے اُتر کر قریب آئے اس پر قابو پانا مشکل نہ ہوگا۔ برتھا نے اسے ایک پُرانا ریوالور بھی دیا تاکہ بوڑھے کو خوف زدہ کرکے رقم کا تھیلا چھین لیا جائے۔ اس دوران وہ خود پام رائے اسٹیشن پر جارج کا انتظار کرے گی جہاں سے وہ دونوں نیویارک جانے والی بس پکڑ لیں گے۔

"منصوبہ بہت سادہ اور آسان ہے۔" برتھا نے کہا اور جارج نے اس سے اتفاق کیا تھا۔

لیکن جب منصوبے پر عمل کا وقت آیا اور بوڑھے میکلن نے جارج کو سڑک کے درمیان پڑے دیکھ کر اپنی کار روکی اور جارج کے قریب آ کر اس کا جائزہ لینے کے لیے جھکا تو جارج نے اچھل کر بوڑھے کو دھکا دیا اور پستول نکال کر اس سے رقم کا مطالبہ کیا تو بوڑھے میکلن نے جارج کے پستول کی پروا کیے بغیر پھرتی سے اپنا ریوالور نکالا اور ایک فائر جھونک مارا، جواباً جارج نے بھی گولی چلا دی۔ بوڑھے کی گولی جارج کے کان کے قریب سے گزر گئی تھی جبکہ جارج نے بوڑھے کے سینے میں دائیں طرف ایک سوراخ بنا دیا تھا۔ گولیوں کے اس غیر متوقع تبادلے نے جارج کو اس حد تک حواس باختہ کر دیا تھا کہ وہ بوڑھے کی حالت کا اندازہ کیے بغیر کہ وہ زندہ ہے یا مر چکا ہے رقم کا تھیلا گاڑی سے نکال کر فرار ہو گیا۔ اُسے یقین تھا کہ اس نے بوڑھے کو قتل کر دیا ہے اور وہ ایک قاتل بن چکا ہے۔ قاتل ہونے کے احساس نے اسے اتنا خوف زدہ کر دیا کہ وہ منصوبے کے مطابق پام رائے اسٹیشن جانے کے بجائے جہاں برتھا اس کا انتظار کر رہی تھی، فارم ہاؤس میں جا کر چھُپ گیا۔ تاہم رقم کا تھیلا اس نے جنگل کے قریب اندھے کنویں میں چھپا دیا ... اسے معلوم تھا کہ جب تک رقم پوشیدہ رہے گی برتھا اُسے پناہ دینے پر مجبور ہو گی۔

بعد میں انھیں ریڈیو کی خبروں سے معلوم ہوا تھا کہ بوڑھا میکلن مر چکا ہے لیکن مرنے سے پہلے اس نے قاتل کا حلیہ اتنی تفصیل سے ... بیان کر دیا تھا کہ ایک اندھا بھی جارج کو آسانی سے تلاش کر سکتا تھا۔ اس نے اپنے نزاعی بیان میں کہا تھا۔ "ڈاکو ایک بہت

ہی موٹا آدمی تھا اتنا موٹا آدمی زندگی میں، میں نے نہیں دیکھا۔ اس کا قد پانچ فٹ اور چوڑائی بھی پانچ فٹ کے قریب ہوگی۔ اُسے مسٹر ۵ x ۵ کہہ سکتے ہیں اس کی رانیں چلتے وقت آپس میں ٹکراتی ہیں اس کی توند باہر کو نکلی ہوئی ہے آپ اُسے لوگوں کی بھیڑ میں آسانی سے شناخت کر سکتے ہیں۔"

ان دونوں نے خبریں ایک ساتھ سُنی تھیں اور یہ سوچ سوچ کر ان کا خون خشک ہو رہا تھا کہ جیسے ہی جارج نے گھر سے قدم نکالا قصبے کا ہر شخص اسے پہچان لے گا۔

اچانک جارج کو ایک انوکھا خیال آیا۔ وہ مکان کے بالائی کمرے میں دو ماہ کے لیے قید ہو گیا۔ اس دو ماہ کے عرصے میں اس نے صرف اتنا کھانا کھایا کہ جسم اور روح کا رشتہ قائم رہ سکے۔ ربرتھا اس کے ناشتہ میں ایک توس ایک کپ چائے لاتی تھی۔ دوپہر اور رات کے کھانے میں بھی صرف ایک توس اور ٹماٹر کی چٹنی ملتی تھی۔ دو ماہ کے اس طویل فاقے نے اس کا مجرب جسم ہڈیوں کے ڈھانچے میں تبدیل کر دیا تھا۔ وہ ایک مدقوق اور منحنی سے انسان کے روپ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ اب باہر نکلنے میں کوئی قباحت نہیں ہے اب کوئی شخص اسے مسٹر ۵x۵ کی حیثیت سے شناخت نہیں کر سکتا تھا۔

* * *

اسپتال کے نرم بیڈ پر کروٹ لیتے ہوئے جارج نے سوچا، 'دو ماہ کا طویل فاقہ، رائی کی تیز شراب اور شدید گرمی! اسے بے ہوش کرنے کے لیے کافی تھی لیکن برتھا اس حادثے سے بے خبر ہام رائے اسٹیشن پر بے چینی سے اس کی منتظر ہوگی۔ اگر میں وقت پر وہاں نہ پہنچ سکا تو وہ میری طرف سے بدگمان ہو سکتی ہے ممکن ہے پولیس کو فون کر کے سب کچھ بتا دے۔' جارج اس سے زیادہ نہ سوچ سکا۔

"کیا اسپتال سے جاتے وقت مجھے دستخط وغیرہ کرنا ہوں گے؟" اس نے نرس سے پوچھا۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔ تمھاری صحت اب بالکل ٹھیک ہے اور دماغ بھی ٹھیک کام کر رہا ہے وہ ایک عارضی دورہ تھا۔ لو وہ ڈاکٹر بھی آگیا۔" نرس نے دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

جارج تکیے پر کہنیاں ٹکائے نرس سے باتیں کر رہا تھا ڈاکٹر کی آمد پر سیدھا ہو کر لیٹ گیا۔

"ہیلو۔" شائستہ اور نرم آواز کے ساتھ ہی اُسے اپنے شانوں پر ڈاکٹر کے ہاتھوں کے مس کا احساس ہوا۔

"ڈاکٹر۔۔۔ میں آپ کا اور اسپتال کا بہت مشکور ہوں کہ آپ نے میری دیکھ بھال کے علاوہ مفت میں کپڑے بھی مہیا کیے ہیں لیکن یہ کپڑے میرے لیے بہت زیادہ ڈھیلے نہیں ہیں؟" جارج نے کارڈ رائے کے سوٹ کے بارے میں سوچتے ہوئے سوال کیا۔

"میرا خیال ہے یہ آپ کے جسم پر بالکل فٹ آئیں گے۔" ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"شاید آپ مذاق کر رہے ہیں یہ تو کسی شامیانے کی طرح لمبے چوڑے ہیں۔"

"اوہ شاید تمھیں اندازہ نہیں جب سے تم اسپتال آئے ہو بے تحاشہ کھاتے رہے ہو۔"

"لیکن میں تو آج صبح ہی یہاں لایا گیا تھا۔" اس نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر بہت احتیاط سے اس کی پٹیاں کھول رہا ہے۔

"اب میں تم سے پوچھتا ہوں کہ کون کس سے مذاق کر رہا ہے؟ آج ستمبر کی سترہ تاریخ ہے اور تم اگست کے پہلے ہفتہ میں یہاں لائے گئے تھے۔ حادثے کی وجہ سے تمھاری آنکھوں اور دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ تم بالکل خالی الذہن ہو گئے تھے۔ بار بار پوچھنے کے باوجود تم نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ شکر ہے کہ اب تم بالکل صحت مند ہو چکے ہو۔"

پٹیاں کھل چکی تھیں۔ جارج آہستہ آہستہ پلنگ سے زمین پر کھڑا ہو گیا پھر سست روی سے چلتا ہوا قدِ آدم آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا اپنا سراپا دیکھ کر وہ حیران رہ گیا گرد و پیش سے بے خبر کافی دیر تک آئینہ ہی دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئی تھیں۔

وہ ایک مرتبہ پھر مقتول میکلن کے بیان کے مطابق مسٹر ۵x۵ بن چکا تھا اس کی توند باہر نکل آئی تھی اور رانیں موٹی ہو گئی تھیں اور شانوں پر گوشت لٹک رہا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ جیسے ہی اس نے اسپتال سے باہر قدم نکالا پوشیدہ رقم تک پہنچنے سے قبل ہی گرفتار کر لیا جائے گا۔

"تم اب بالکل صحت یاب ہو چکے ہو اور جہاں جانا چاہو جا سکتے ہو۔" اس نے عقب سے ڈاکٹر کی آواز سُنی۔

جارج نے کچھ کہنا چاہا لیکن آواز اس کے حلق ہی میں گھٹ گئی۔ اس کے ذہن میں صرف ایک لفظ گونج رہا تھا۔ "نہیں، نہیں، نہیں! میں کہیں نہیں جا سکتا۔"

* * *

چارہ قارہ

ایک بے ضرر سا چوہا، پہاڑوں سے ٹکرا گیا
اس کی زندگی کا انحصار اس بات پر تھا کہ
وہ زندگی کو زیادہ سے زیادہ خطرات میں ڈال دے

محبوب اظہر

یہ رات بھی ہر منگل کی رات کی طرح آہستہ آہستہ گزر رہی تھی۔ بار کے کونے میں میز پر رکھے ٹی وی پر آخری شو چل رہا تھا۔ بڑی ہی دلچسپ فلم تھی۔ غالباً اسی لیے بار میں موجود دونوں گاہک شراب سے زیادہ فلم کی طرف متوجہ تھے میں خود بھی ٹی وی دیکھ رہا تھا کیونکہ ڈیوٹی کے اوقات میں شراب کو ہاتھ بھی نہیں لگاتا۔ میرا ارادہ تھا کہ شو ختم ہوتے ہی بار بند کر دوں گا اور بار کے اوپر واقع اپنی خواب گاہ میں جا کر آرام کی نیند سو جاؤں گا۔ رات کا ڈیڑھ بجتے ہی میں نے ٹی وی بند کیا اور اپنے گاہکوں سے کہا۔ "دوستو! اپنے جام خالی کرو اور رخصت ہو جاؤ۔ میں اب سونا چاہتا ہوں۔"

دونوں مستقل گاہک تھے اور اچھے آدمی تھے۔ انھوں نے اپنے گلاسوں کے آخری گھونٹ حلق میں انڈیلے اور کھڑے ہو گئے۔ "شب بخیر۔۔۔ چارلی۔" وہ بولے اور ہاتھ لہراتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ میں دروازہ مقفل کرنے بڑھا لیکن ابھی ایک ہی پٹ بند کیا تھا کہ اچانک دو آدمی اندر گھس آئے۔ "معذرت خواہ ہوں جناب۔" میں نے ادب سے کہا۔ "میں بار بند کر رہا ہوں۔"

"کوئی بات نہیں، بھتیجے۔" ایک آدمی بولا۔ "کچھ دیر بعد سہی۔" وہ اندر آکر اسٹولوں پر بیٹھ گئے اور میں اُن کی صورتیں دیکھنے لگا۔ وہ مضحکہ خیز انداز میں ہنس رہے تھے۔ میں انھیں پہچان گیا۔ دونوں تنظیم کے آدمی تھے اور پیکٹ یا کوئی پیغام دینے کے لیے یہاں آتے رہتے تھے۔۔۔

"اوہ۔ معاف کرنا میں نے تمھیں پہچانا نہیں تھا۔" میں نے کہا۔

"اب تو پہچان گئے نا بھتیجے؟" اُن میں سے ایک جو زیادہ ہی ننگا تھا طنزیہ لہجے میں بولا۔

لفظ "بھتیجا" شروع میں تو مجھے گراں گزرتا تھا لیکن رفتہ رفتہ میں اس کا عادی ہو گیا تھا۔ دراصل اُن کی تنظیم سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔ بار کی یہ ملازمت میرے چچا نے دلائی تھی کیونکہ وہ مجھے بھوکا مرتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ "یقیناً میں تم لوگوں کو پہچانتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم لوگ یہاں آتے رہتے ہو۔ بہر حال، بتاؤ میں اس وقت کیا خدمت کروں؟" میرا خیال تھا کہ پہلے کی طرح اس بار بھی وہ مجھے کوئی پیکٹ دیں گے اور ایک ایک جام پی کر اپنا راستہ لیں گے۔ مجھے آج تک علم نہیں ہو سکا تھا کہ ان پیکٹوں میں کیا ہوتا تھا پھر اُنھی کا کوئی آدمی آتا اور وہ پیکٹ مجھ سے لے جاتا تھا۔

"ضرور بھتیجے، ضرور بتائیں گے۔" بھاری جُثے والا ہنس کر بولا اور اُس نے اپنی جیب سے ایک کارڈ نکال کر میرے سامنے کر دیا۔

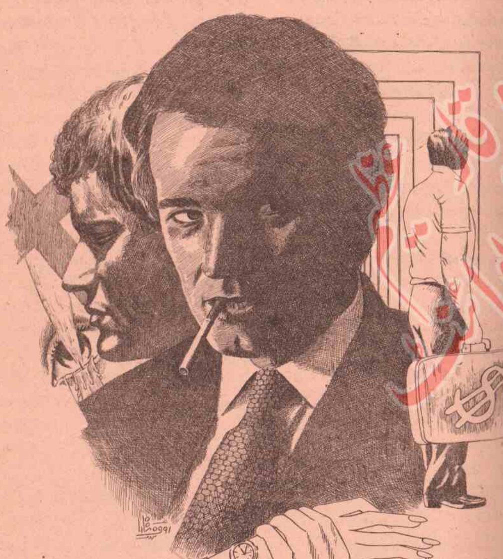

کارڈ پر میرا پورا نام چارلی پول لکھا ہوا تھا اور نیچے ایک سُرخ دھبا دکھائی دے رہا تھا۔

مَیں نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔ "مَ مَ ... مَیں ... سمجھا نہیں۔" مَیں نے سادگی سے کہا۔ "اس کا کیا مطلب ہے؟"

"یہ مطلب نہیں سمجھا۔" اُس نے استہزائیہ انداز میں اپنے ساتھی سے کہا اور اگلے ہی لمحے اُن دونوں کے قہقہے گونج اُٹھے۔

"ابھی سمجھ جائے گا۔" دوسرے نے کہا اور پستول نکال کر نال میرے سینے کی طرف اُٹھا دی۔ "دراز میں جتنی بھی رقم ہے، وہ سب ہمارے حوالے کر دو۔"

"کک ... کیا تم مذاق کر رہے ہو؟" مَیں ہکلا کر رہ گیا۔

"مذاق نہیں بھتیجے، یہ حقیقت ہے۔ جلدی سے مال نکالو۔"

مَیں نے لرزتے ہاتھوں سے سارے نوٹ نکال کر کاؤنٹر پر رکھ دیے۔ نوٹ زیادہ نہیں تھے کیونکہ اس بار میں زیادہ بکری نہیں ہوتی تھی۔ بار کی آمدنی سے تو میری تنخواہ بھی پوری نہیں ہوتی تھی لیکن میرے خیال میں تنظیم کا مقصد بار چلانا نہیں تھا بلکہ وہ اس جگہ کو محض پردے کے طور پر چلا رہے تھے اور اُس کی آڑ میں وہ اپنی ناجائز آمدنی چھپانا چاہتے تھے۔

"کیا تم مجھے قتل کرنا چاہتے ہو؟" مَیں نے خوف زدہ ہو کر پوچھا۔

"یقیناً ..." بھاری جبڑے والا غرّایا۔ "تمھارے نام کے نیچے اس سُرخ نشان کا یہی مطلب ہے کہ تمھارا وقت پورا ہو گیا ہے۔"

"لیکن ... لیکن میرا قصور؟"

"قصور گولی مارنے کے بعد بتائیں گے، تمھاری لاش کو ..." وہ بولا اور نوٹ اُٹھا کر اپنے کوٹ کی جیب میں ٹھونس لیے۔ اسی لمحے بار کا دروازہ کھلا اور گشتی پولیس مین زکوٹا اندر آ گیا۔ "تم اب تک کیا کر رہے ہو چارلی؟" اُس نے دوستانہ انداز میں پوچھا۔

اُسے دیکھ کر میری جان میں جان آئی۔ جی چاہا کہ اُسے بتا دُوں یہ بدمعاش مجھے لُوٹ رہے ہیں اور قتل کرنا چاہتے ہیں لیکن بچا ایل کا خیال آتے ہی مَیں لرز اُٹھا۔ اس شکایت پر وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا ... ورنہ کم از کم مجھے یہ مُلازمت، یہ بار اور اس کے اُوپر بنی تین کمروں کی رہائش گاہ سے ضرور ہاتھ دھونا پڑیں گے اور پھر وہی دَر دَر کی ٹھوکریں ہوں گی اور فاقہ مستی میں شب و روز گزریں گے۔

"یہ دو گاہک آ گئے تھے۔" مَیں نے کہا۔ "اس لیے رُک گیا تھا۔ دوستو!" مَیں نے اُن دونوں سے کہا۔ "اب بار بند ہونے کا وقت ہو گیا ہے آپ لوگ تشریف لے جا سکتے ہیں۔"

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور خاموشی سے اُٹھ کر باہر چلے گئے۔ مَیں جانتا تھا کہ وہ ڈیوٹی کانسٹیبل کو مارنے کی جرأت نہیں کر سکتے ... "باہر بہت سردی ہے، چارلی۔" زکوٹا نے ایک جھرجھری لے کر کہا۔

"ہاں ... مَیں ابھی تمھیں ایک جام دیتا ہُوں۔ تمھارے بدن سے سردی خارج ہو جائے گی۔" مَیں نے کہا اور ایک گلاس میں چار انگل شراب انڈیل کر اُس کے سامنے رکھ دی۔

"تم یہیں ٹھہرنا، مَیں ابھی آیا۔" یہ کہہ کر مَیں کاؤنٹر کے عقب سے نکل کر چھوٹے کمرے کی طرف بڑھا اور عقبی سیڑھیوں کا دروازہ اور کھڑکیاں بند کر دیں۔

"اچھا دوست، جام کا شکریہ، اب مَیں بھی چلا۔" زکوٹا نے گلاس خالی کر کے کہا۔ "اب تم بھی آرام کرو۔"

"آرام ..." مَیں نے دروازے کی طرف دیکھ کر سوچا۔ شیشے کے اُس پار وہ مجھے سڑک کے کنارے ایک کھمبے کے نیچے کھڑے نظر آ گئے۔ وہ شاید زکوٹا کے جانے کا انتظار کر رہے تھے ... پھر مَیں نے اُس کے جاتے ہی دروازہ مقفّل کیا اور بالائی منزل پر آ گیا۔ میری نشست گاہ میں فون موجود تھا۔ مَیں نے جلدی جلدی اپنے بچا ایل کا نمبر ڈائل کیا۔ اُس طرف سے ہیلو کی غنودہ سی آواز سُنائی دی۔ یہ میرے چچا ایل کی آواز تھی۔ "انکل ایل!" مَیں نے بے تابی سے کہا۔ "مَیں چارلی بول رہا ہُوں ..."

"البرٹ گیٹلنگ گھر پر نہیں ہے۔" دوسری طرف سے میرے بچا نے بڑی نفاست سے جھوٹ بولا۔ البرٹ گیٹلنگ میرے چچا کا پُورا نام تھا۔

"انکل ایل، یہ مَیں ہُوں چارلی۔"

"کہہ تو دیا البرٹ گھر پر نہیں ہے۔" دوسری بار غصّے بھری آواز آئی ... "وہ فلوریڈا گیا ہُوا ہے۔"

"اوہ انکل ... اگر وہ نہیں ہیں تو آنٹ فلورنیس سے بات کرا دو۔"

"وہ بھی نہیں ہے۔ دونوں فلوریڈا گئے ہُوئے ہیں۔"

پھر مَیں پکارتا ہی رہا اور لائن ڈیڈ ہو گئی ... مَیں نے ریسیور رکھ کر دوبارہ رِنگ کیا مگر فون بالکل بند ہو گئی تھی۔ میرا دل دھڑک اُٹھا۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ ان بدمعاشوں نے باہر سے فون کے تار کاٹ دیے تھے۔

اب مَیں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ مَیں ریسیور رکھ کر اپنی ... خواب گاہ میں آ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ بند دروازے اُن کا راستہ نہیں روک سکیں گے۔ وہ آ جائیں گے اور مجھے گولی مار دیں گے

لیکن کیوں؟ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں نے کیا قصور کیا تھا۔ ایسی کون سی بھیانک غلطی مجھ سے سرزد ہو گئی تھی جو تنظیم نے مجھے قتل کرنے کے لیے اپنے غنڈے بھیج دیے تھے؟

یہ بات مجھے انکل ایل ہی بتا سکتا تھا۔ اچانک زینے پر قدموں کی دھمک سنائی دی۔ وہ آ گئے تھے۔ باہر جانے کا صرف یہی ایک راستہ تھا جو اب میرے لیے مسدود ہو چکا تھا۔ کھڑکی... اچانک میرے ذہن میں خیال آیا اور میں نے دوڑ کر خواب گاہ کی کھڑکی کھول دی نیچے گلی میں تاریکی تھی اور سرد ہوائیں چل رہی تھیں۔ میرے بدن پر صرف ایک قمیص اور پتلون تھی۔ جیکٹ اور کوٹ الماری میں لٹکے ہوئے تھے۔ باہر کا دروازہ ٹوٹنے کی آواز سنائی دی۔ اب میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں جیکٹ لے سکتا میں کھڑکی پر چڑھا۔ زمین تک کا فاصلہ دس بارہ فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ خواب گاہ کا دروازہ اُن کی ٹکر سے لرز اُٹھا اور میں نے چھلانگ لگا دی۔ میں غالباً پیروں کے بل گرا تھا چوٹ تو آئی تھی مگر یہ وقت زخم سہلانے کا نہیں تھا میں اُٹھا اور پوری قوت سے بھاگ اُٹھا۔ انکل البرٹ مین ہٹن میں رہتے تھے۔ میں سینکڑوں بار اُن کے گھر جا چکا تھا اور اب بھی میری منزل وہی گھر تھا۔ اس وقت صرف انکل البرٹ ہی میری مدد کر سکتے تھے۔ وہ تنظیم کے ایک سرگرم کارکن تھے۔ میں اُن سے دریافت کرنا چاہتا تھا کہ یک بیک یہ لوگ میری جان کے درپے کیوں ہو گئے ہیں؟ اب صرف انکل البرٹ ہی تھے جو میری گلو خلاصی کرا سکتے تھے۔ میں زیرِ زمین اسٹیشن پر آیا اور جلدی سے ایک ٹرین میں سوار ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ میرے تعاقب میں ہیں بس کسی طرح میں اُن سے پہلے انکل تک پہنچ جاؤں پھر تو وہ میری ڈھال بن ہی جائیں گے۔

انکل البرٹ ایک جدید طرز کی سات منزلہ عمارت کی تیسری منزل پر رہتے تھے۔ میں عمارت کے اندر داخل ہی ہوا تھا کہ سڑک پر ایک کار کا شور سنائی دیا۔ یہ وہی دونوں بدمعاش تھے جو اپنی کار کے ذریعے یہاں تک پہنچ گئے تھے۔ میں دوڑ کر لفٹ میں گھسا اور تین کے ہندسے والا بٹن دبا دیا۔ یقیناً شیشے کے دروازے سے انھوں نے مجھے لفٹ میں گھستے دیکھ لیا تھا۔ اب میرے پاس بہت کم وقت تھا۔ تیسری منزل پر لفٹ سے باہر آکر میں نے سات کا ہندسہ دبایا اور لفٹ اُوپر چڑھنے لگی۔ اس طرح کم از کم مجھے اتنا وقت مل گیا تھا کہ میں انکل البرٹ تک پہنچ سکوں۔ یہاں ہر منزل پر صرف دو ہی اپارٹمنٹ تھے میں نے انکل ایل کا دروازہ بجا دیا مگر اندر موت کا سا سناٹا طاری تھا۔ خدا جانے وہ واقعی فلوریڈا گئے ہوئے تھے یا... وہ بھی مجھ سے رُوٹھ گئے تھے۔ لفٹ اب نیچے جا رہی تھی۔ خدایا! میں نے ایک گہری سانس لی جو بالآخر سسکی میں بدل گئی... ذرا ہی دیر بعد لفٹ ان بدمعاشوں کو لے کر اُوپر آ جائے گی اور وہ مجھے گولی مار دیں گے۔

اس عمارت میں زینہ تھا تو سہی لیکن اسے کبھی استعمال کرنے کی نوبت نہیں آتی تھی۔ اس لیے اب وہ کسی کو یاد بھی نہیں رہا تھا۔ میری نظر لفٹ کے بدلتے ہندسوں پر جمی ہوئی تھی۔ دو کا ہندسہ چمکا تو میں لرز اُٹھا... اب عافیت اسی میں تھی کہ میں کہیں چھپ جاؤں... چنانچہ میں دوڑ کر زینے میں دبک گیا۔ یہاں سے مجھے انکل البرٹ کا دروازہ صاف نظر آرہا تھا۔ لفٹ تیسری منزل پر رُکی اور دونوں بدمعاش باہر آ گئے۔ اُن کے ہاتھوں میں سیاہ پستول دبے ہوئے تھے... انکل البرٹ کے دروازے پر پہنچ کر انھوں نے دستک دی۔ ایک مخصوص دستک۔ پہلے ایک پھر تین پھر ایک بار... دروازہ کھل گیا اور انکل البرٹ کا سر نظر آیا۔

"کیا تم نے اُسے پکڑ لیا؟" وہ بدمعاشوں کو دیکھتے ہی بولے۔

"نہیں۔ وہ تمھارے ہی پاس آیا ہے۔" بھاری جبڑے والا بولا۔ اُس کا مونچھوں والا ساتھی چوکنے انداز میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔

"پاگل ہو گئے ہو؟" انکل البرٹ برہمی سے بولے۔ "وہ میرے پاس کیسے آسکتا ہے؟"

"ہم نے خود اُسے عمارت میں گھستے دیکھا ہے۔ کیا تم ایجنسی کی نافرمانی کرنا چاہتے ہو؟"

"میں؟ میں سوچ بھی نہیں سکتا۔" میں نے انکل البرٹ کا چہرہ زرد ہوتے دیکھا۔ اُن کی آواز خوف سے لرز رہی تھی۔

"پھر ہٹ جاؤ، ہمیں اپنے اپارٹمنٹ کی تلاشی لینے دو۔"

"اوہ نہیں... میری بیوی اندر ہے۔ اُسے میرے بارے میں ان باتوں کا علم نہیں ہے۔ رات کے اس وقت تمھارے اندر آنے کا میں اُسے کیا جواز پیش کروں گا؟"

"ہمیں ہر حالت میں لڑکا چاہیے۔"

"شاید وہ نیچے چلا گیا ہو؟"

"لفٹ کے ذریعے ہم خود آئے ہیں۔ وہ جاتا تو ہماری نگاہوں سے نہیں بچ سکتا تھا۔"

"ممکن ہے سیڑھیوں سے اُتر گیا ہو۔"

"سیڑھیاں؟" مونچھوں والا حیرانگی سے بولا۔ "کہاں ہیں سیڑھیاں؟"

انکل البرٹ نے ہاتھ اُٹھا کر سیڑھیوں کا رُخ بتایا... اور میں بیک وقت دو دو سیڑھیاں پھلانگتا نیچے بھاگ گیا۔ آواز یا رفتار دو میں سے ایک ہی بات ہو سکتی تھی۔ میں نے رفتار کو ترجیح دی۔ جلدی ہی میں نیچے آ گیا اور تیر کی طرح دروازے میں سے نکل کر

پار کرتا ہوا سنٹرل پارک میں جا گھسا... وہ بھی باہر آ گئے اور کتوں کی طرح میری تلاش میں لگ گئے لیکن میں دم سادھے جھاڑی کے نیچے دبکا رہا۔ بڑی دیر بعد وہ مایوس ہو کر کار اور ہوا ہو گئے۔

جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ جا چکے ہیں تو میں باہر نکلا... پھر اور ویران گلیوں کا راہی بن گیا۔ میرے ذہن میں بس یہی کچوکے لگا رہے تھے کہ کہاں جاؤں؟ کیا کروں؟ تنظیم کے میں میں نے اخبارات میں پڑھا تھا کہ اُن کے ہاتھ بہت جو انھیں مطلوب ہوتا وہ اُسے پکڑ لاتے چاہے اس میں وقت لگے یا محنت کرنی پڑے۔ اُن کے پاس نہ دولت کی کمی اور نہ ہی ذرائع اور آدمیوں کی... میری واحد پناہ گاہ میرے چچا وہ بھی منہ موڑ چکے تھے لیکن میں انھیں الزام نہیں دے تھا۔ ان بے چاروں میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ تنظیم سے ٹکرا اور اُس کے خلاف میری پشت پناہی کرتے۔ ایک بات اور بھی میرے لیے بے حد پریشانی کا باعث بن رہی تھی کہ یہ تنظیم اچانک میرے دشمن کیوں بن گئے ہیں؟ میں تاریکیوں کا سہارا رل پارک ویسٹ سے نکل کر اسٹھویں اسٹریٹ پر آ گیا۔ قسمت تھی۔ اس وقت تو میں اپنے شاندار بستر میں دبکا خرگوش کے مزے لے رہا ہوتا لیکن مقدر میں تو یہ سرد تنہائی اور یہ خوف لکھا ہوا تھا۔ تھکن اور نیند کے مارے اُٹھانا دوبھر ہو رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ یہیں پر لیٹ جاؤں غم بھلا کر آنکھیں موند لوں لیکن سردی اور بدمعاشوں کا مجھے گھسیٹے لیے جا رہا تھا۔

اچانک مجھے آرٹی ڈیکسٹر یاد آ گیا۔ وہ میرا اسکول کا ساتھی تھا اسٹریٹ پر رہتا تھا... تھا وہ میرا ہم عمر اور دوست لیکن وں کی طرح مہربان تھا اور ہمیشہ مجھے بے بی کہا کرتا تھا۔ دراصل یہ ہے کہ بچپن ہی سے میں ایک سیدھا سادھا تھا میری اس سادگی کی وجہ سے لوگ مجھے بدھو سمجھنے لگے تھے انیس سال کا جوان تھا اور چچا البرٹ کی عنایت سے تنہا چلا رہا تھا۔ تاہم لوگ اب بھی مجھے بدھو ہی سمجھتے تھے۔

ہر حال آرٹی واحد آدمی تھا جو اس وقت مجھے شب بسری دے سکتا تھا۔ میں تیز قدموں سے پیری اسٹریٹ کی طرف کے گھر میں روشنی ہو رہی تھی اور اندر سے موسیقی اور کی آوازیں آرہی تھیں شاید کوئی پارٹی تھی لیکن مجھے کیا؟ بسیرا چاہیے تھا۔ میں نے کال بیل بجائی تو آرٹی ہی نے دروازہ کھولا۔ "اوہ بے بی۔" مجھے دیکھتے ہی وہ خوشی سے چلا پڑا۔ "آؤ، بڑے اچھے موقعے پر آئے ہو... یہ لو۔" اُس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا جام میری طرف بڑھایا جسے میں نے آہستگی سے دُور ہٹا دیا۔

"آرٹی... میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ مجھے نیند آرہی ہے... کیا کوئی جگہ..."

"اوہ چارلی بے بی۔ پارٹی ہو رہی ہے آؤ تم بھی شوق کرو۔"

"پلیز آرٹی۔" میں گڑگڑایا۔ "مجھے نیند آرہی ہے۔"

"گدھے ہی رہے آج تک... آؤ۔" میں اُس کے ساتھ کمرے میں آ گیا۔ اٹھارہ بیس مرد عورتیں خوش فعلیوں میں مگن تھے۔ دو ایک نے میری طرف دیکھ کر سر ہلایا مگر میں سر جھکائے آرٹی کی خواب گاہ کے دروازے پر آ گیا۔ "جاؤ... سو جاؤ۔ صبح ملاقات ہو گی۔"

وہ مجھے چھوڑ کر پھر پارٹی والے کمرے میں چلا گیا... اور میں تاریک خواب گاہ میں گھسا اور اندھوں کی طرح ہاتھ پھیلائے بستر کی طرف بڑھا لیکن بستر پر ایک نہیں شاید دو آدمی تھے اور جانے کیا کر رہے تھے۔ میں نے ایک مرد کی خمار آلودہ آواز سنی پھر کوئی زنانہ آواز میں ہنسا۔ میں بڑبڑاتا ہوا وہاں سے ہٹا اور ایک کونے میں لیٹ کر قالین اپنے اُوپر اوڑھ کر آنکھیں بند کر لیں۔

صبح بدن جلنے لگا تو میں نے آنکھ کھول دی۔ میں کھڑکی سے آتی دھوپ میں پڑا ہوا تھا اور بستر پر آرٹی پڑا خراٹے نشر کر رہا تھا۔ میں اُٹھ کر باہر آ گیا۔ باورچی خانے میں سے گرم گرم کافی کی خوشبو آرہی تھی۔ میں اُسی طرف مُڑ گیا۔

وہ بڑی طرحدار لڑکی تھی جو سفید ایپرن باندھے انڈے پھینٹنے میں مصروف تھی بولنے میں پہل اُسی نے کی۔ "تم فرش پر ہی سو گئے تھے؟"

"ہاں..." میں نے دھیرے سے جواب دیا... اور ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔

"رات زیادہ پی لی تھی کیا؟"

"میں نے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ میں پارٹی میں شریک نہیں تھا اور تھکا ہوا تھا۔ اس لیے جہاں جگہ ملی سو گیا۔"

"ناشتہ کرو گے؟" اُس نے ترحم آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ جانے وہ مجھے کیا سمجھ رہی تھی۔

"اگر کافی ہو تو ایک کپ دے دو۔" میں نے کہا۔ اُس نے کافی انڈیل کر کپ میری طرف بڑھا دیا۔ "شکریہ۔ یہ آرٹی کب تک اُٹھے گا؟" میں نے پوچھا۔

"جب ناشتہ تیار ہو جائے گا... کیوں؟ تمھیں اس سے کام

ہے...؟"

"ہاں۔ میں ایک مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔"

"اگر رقم کی ضرورت ہے تو اُس کے پاس ایک سینٹ بھی نہیں ہے۔"

"مجھے رقم نہیں اُس کا مشورہ چاہیے۔" میں نے کہا اور کافی کا گھونٹ بھرا... کپ خالی کر کے میں نے میز پر رکھا اور خواب گاہ کی طرف جانے لگا۔

"ہے...؟" وہ چلّائی۔ "کیا تم آرٹی کو جگانے جا رہے ہو؟"

"تم پروا مت کرو... وہ میرا دوست ہے۔" میں نے اُس کی طرف دیکھے بغیر کہا اور خواب گاہ میں آگیا۔ "آرٹی... ہے آرٹی..." میں نے اُسے جھنجوڑ دیا۔

"کون...؟" آرٹی کسمسا کر بولا۔ "پیگی؟"

"نہیں۔ میں ہوں چارلی پول... آرٹی اُٹھو۔ مجھے تم سے ایک ضروری مشورہ کرنا ہے۔"

"اوہ چارلی بے بی۔" اُس نے آنکھیں کھول دیں اور بستر پر بیٹھ گیا۔ "تمھیں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ ہم دونوں بہت دنوں بعد مِل رہے ہیں... ہے نا؟" وہ شاید بھول چکا تھا کہ ہم رات مِل چکے ہیں...

"آرٹی... میں ایک مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ مجھے تمھاری مدد کی ضرورت ہے۔" میں نے بے چارگی سے کہا۔ "کیا تم ایگری کولا نامی کسی آدمی کو جانتے ہو؟ شاید وہ تنظیم سے منسلک ہے... جرائم پیشہ تنظیم سے؟"

"ایگری کولا؟" آرٹی آنکھیں پھاڑ کر بولا۔ "فارمر ایگری کولا...؟"

"ہاں... کیوں؟"

"تم اُس کے بارے میں کیا جانتے ہو آرٹی؟"

"میں کیا سبھی جانتے ہیں اُسے... فارمر ایگری کولا لیکن اُس سے کبھی ملنے کا اتفاق نہیں ہوا... وہ بڑا آدمی ہے آج اسٹیشن آئی لینڈ میں اپنے فارم پر رہ رہا ہے... کیوں؟ کیا بار سے گزارا نہیں ہو رہا؟"

"نہیں یار... یہ بات نہیں ہے بلکہ اُس نے دو آدمی..."

... اُسی وقت دروازہ کھلا اور باورچی خانے والی حسینہ اِٹھلاتی بل کھاتی اندر آگئی...

"ناشتے کا وقت ہو گیا ہے۔" اُس نے اعلان کیا۔ آرٹی کی باچھیں پھٹ گئیں، اُس نے باہیں پھیلا دیں۔ "آؤ... آؤ... میری۔" لڑکی اُس کی طرف بڑھی اور میں نے مُنہ پھیر لیا۔ بڑا واہیات آدمی تھا یہ آرٹی... اور وہ لڑکی... میرا ذرا بھی لحاظ نہیں کیا انہوں نے... میں انھیں وہیں چھوڑ کر باہر آگیا اور نشست گاہ کے صو میں دھنس گیا۔ ابھی اُس کی صفائی نہیں ہوئی تھی اور رات کی پار کی وجہ سے وہ اچھا خاصا کچرا گھر بنا ہوا تھا پھر میں نے فون کی گھ بجنے کی آواز سُنی۔ ذرا دیر بعد دونوں باہوں میں باہیں ڈالے باہر آ

"اب بتاؤ چارلی... کیا بات ہے؟" وہ میرے قریب بیٹھتا ہوا بولا۔

"کافی لاؤں...؟" پیگی نے پوچھا پھر آرٹی کا اشارہ پا کر... باورچی خانے میں چلی گئی... "اور چارلی تمھارا چچا آئے تو اُس سے کہنا کہ وقت دیکھ کر فون کیا کرے۔" وہ وہیں سے چلّائی۔

"میرے چچا...؟" میں نے حیرت سے آرٹی کی طرف دیکھا۔

"اوہ۔ آخر عورت ہے بات برداشت نہیں ہو سکی۔" آرٹی ہنس کر بولا۔ "ہاں تمھارے چچا کا فون آیا تھا... انتہائی بے وقت۔ انھوں نے پوچھا کہ کیا تم میرے ہاں ہو۔ میں نے کہہ دیا کہ ہاں، اگر چاہیں تو کرادوں لیکن انھوں نے منع کر دیا کہ تم سے ذکر نہ کیا جائے وہ خود رہے ہیں اور تمھیں سرپرائز دینا چاہ رہے ہیں لیکن اس لڑکی سارا مزہ کِرکِرا کر دیا... اب پلیز جب وہ آئیں تو تم حیران ہونے ایکٹنگ کرنا۔"

ایکٹنگ کی کیا ضرورت تھی۔ میں تو ویسے ہی حیران ہو رہا میرے چچا کی یہ رازداری مجھے مشتبہ سی لگ رہی تھی کیا وہ بھی ا سے تو نہیں مل گئے ہیں؟

"بہت بُرا ہوا آرٹی۔" میں نے گھبرا کر کہا اور پھر جلدی جلد اُسے ساری باتیں بتا دیں اور اُس سے ایک جیکٹ اُدھار ما "آرٹی میں ایگری کولا سے ملنے جا رہا ہوں۔ خدا کے لیے میر کو مت بتانا۔" میں جیکٹ پہنتے ہوئے بولا۔

"مگر سُنو تو... تم کرنا کیا چاہ رہے ہو؟"

"ابھی وقت نہیں ہے آرٹی... بالکل وقت نہیں ہے۔ وا ہی میں تمھارے پاس آؤں گا لیکن خدا کے لیے کسی سے میر میں کچھ نہ کہنا۔"

پیگی کافی لے کر آگئی۔ اُس نے بھی ساری باتیں سُن لی اور اب متفکر سی میری جانب دیکھ رہی تھی... "بے فکر رہو" آرٹی نے کہا۔ "میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔"

"ہاں چارلی..." پیگی نے بھی ڈھارس بندھائی۔ وہ کچھ سنجیدہ دکھائی دے رہی تھی۔ "تم بالکل پروا مت کرو۔ ہم نہیں کھولیں گے۔"

میں جلدی سے رُخصت ہو کر گھر سے باہر آگیا اور ابھی

ر تھا کہ ایک سیاہ سیڈان آرٹی کے گھر کے سامنے آ کر رُکی۔ میں نے کر دیکھا اُس میں سے میرے چچا اُترے۔ اُن کے دائیں بائیں وہی بدمعاش تھے جو مجھے قتل کرنے کے لیے تڑپ رہے تھے۔ قسمت اچھی تھی جو اُن کی نظر مجھ پر نہیں پڑی۔ وہ سیدھے عمارت میں گھس گئے اور مجھے پختہ یقین ہو گیا کہ میرے چچا البرٹ بھی میری جان کے دشمن بن چکے ہیں۔

میں وہاں سے بھاگا اور سڑک پر آتے ہی "بیٹری" جانے والی بس میں سوار ہو گیا۔ مجھے علم تھا کہ بیٹری اور اسٹیشن آئی لینڈ کے درمیان موٹر بوٹس چلتی ہیں... میں اسی کے ذریعے اس جزیرے پہنچنا چاہتا تھا۔ دو گھنٹے بعد میں اسٹیشن کے ساحل پر تھا، صرف خوفزدہ تھا بلکہ اب بھوک نے بھی میرا بُرا حال کر رکھا تھا۔ جزیرے پر چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں بکھری ہوئی تھیں۔ ابھی دامن میں بستیاں آباد تھیں اور پہاڑیوں پر ہوٹل کلب اور دیگر گاہیں بنی ہوئی تھیں۔

ساحل کے قریب ہی سینٹ جارج کا قصبہ تھا۔ میں وہاں ل ہی آیا اور ایک ہوٹل میں گھس گیا۔ میں نے خوب پیٹ کھانا کھایا اور جب بل ادا کر کے باہر نکلا تو میری جیب میں سترہ ڈالر تھے۔ دروازے کے پاس ہی ایک فون بوتھ دیکھ لیا۔ اس کے اندر ایک ڈائریکٹری بھی رکھی ہوئی تھی... بوتھ میں جا کر ڈائریکٹری کھولی اور ایگری کولا کا پتہ تلاش جلد ہی مجھے یہ نام مِل گیا لیکن پتے کی جگہ صرف قصبے کا ہوا تھا۔ "اینا ڈیل"۔ میں نے کاؤنٹر پر آ کر ہوٹل والے سے جانے کا طریقہ پوچھا۔ اُس نے مجھے بس اسٹینڈ کا پتہ بتا دیا۔ جو اینا ڈیل جاتی تھی۔

ایک گھنٹے کے سفر کے بعد بس نے مجھے اینا ڈیل میں آرتھر روڈ یہ خاصا بڑا قصبہ تھا۔ میں بڑی دیر تک اُس کی سڑکوں آخر ایک گلف اسٹیشن میں گھس گیا اور وہاں موجود ایگری کولا فارم کا راستہ دریافت کیا۔ اُس نے بتایا کہ فارم قصبے کے مغرب میں چار میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ ل ہی اُس طرف روانہ ہو گیا۔

پہاڑی راستہ تھا۔ میں کچھ ہی دُور پہنچا تھا کہ میرے دے گئے۔ سڑک کے کنارے ایک درخت پڑا ہوا اُس پر بیٹھ گیا اور سستانے لگا۔ سڑک پر کار کی آواز نے سر اُٹھا کر دیکھا تو میرا دل اُچھل پڑا۔ وہ وہی سیاہ تھی جس میں میری موت کے ہرکارے سوار تھے۔ میرا جی چاہا کہ میں درخت کے پیچھے لیٹ جاؤں لیکن کار بڑی تیزی سے آ رہی تھی اور میری یہ حرکت مجھے مشتبہ بنا سکتی تھی۔ میں گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گیا اور دل ہی دل میں دُعائیں مانگنے لگا۔ کار تیزی سے میرے قریب سے گزر گئی۔ شاید قسمت ساتھ دے رہی تھی جو میں دونوں مرتبہ انھیں نظر نہیں آسکا... یقیناً یہ لوگ بھی ایگری کولا ہی کے پاس جا رہے تھے۔ صُورتِ حال بتانے یا مزید ہدایتیں لینے، میرا چچا بھی اُن کے ساتھ تھا۔ مجھے دل ہی دل میں اُس پر تاؤ آنے لگا...

جانے وہ وہاں کتنی دیر رہیں اور کب لَوٹ آئیں؟ میں نے سڑک چھوڑ دی اور گھاس میں اُتر گیا پھر کھیت اور خود رو جھاڑیوں کو پار کرتا ہوا ایگری کولا فارم کی طرف بڑھنے لگا۔ میرے دل میں طرح طرح کے وسوسے اُٹھ رہے تھے۔ اگر میں ایگری کولا کو قائل نہ کر سکا تو کیا ہوگا؟ اگر ایگری کولا نے میری بات سُننے سے انکار کر دیا تو؟ یہ محض وقت کی بات تھی۔ وہ جلد یا بدیر مجھے پکڑ لیں گے اور میرا کام تمام کر دیں گے۔ مگر میں زندہ رہنا چاہتا تھا اور اس کی واحد صورت یہی تھی کہ ایگری کولا سے مِل کر اپنی صفائی پیش کروں اور اُسے قائل کروں کہ میں بالکل بے قصور ہوں۔ میں نے تنظیم کے خلاف کچھ نہیں کیا۔... انھیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ خدا کے لیے میری... جان بخشی کی جائے...

شام کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ میرا حال بُرا ہو رہا تھا مگر جان کا خوف تھا کہ مجھے لیے چلا جا رہا تھا۔ سڑک پر پھر میں نے کار کی آواز سُنی۔ سیاہ سیڈان واپس جا رہی تھی۔ میں ایک جھاڑی کی اوٹ میں ہو گیا۔ پھر جب انجن کا شور معدوم ہُوا تو اُٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ دُور دُور تک سنّاٹا برس رہا تھا۔ میں پھر سڑک پر آگیا اور فارم کی طرف چل دیا۔

درختوں کے وسط میں... وہ مکان مجھے دُور ہی سے نظر آگیا یہ قدیم زمانے کی عمارت تھی۔ اب اُس کے اور میرے درمیان صرف ایک گھاس کا میدان تھا۔ میں درخت کے عقب میں چھپا اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ یقیناً ایگری کولا نے اس کی حفاظت کے لیے خاصا انتظام کر رکھا ہوگا۔ میں نے سوچا کہ اندھیرا ہو جائے تو مکان میں گھسنے اور ایگری کولا سے ملنے کی کوشش کروں، فوراً ہی خیال آیا کہ اُس نے لازماً حفاظت کے لیے سرچ لائٹس لگا رکھی ہوں گی اور کُتّے ہوں گے اور گارڈز ہوں گے۔ ایسی صُورت میں رات کا انتظار فضول ہی تھا۔ چنانچہ میں ہر ممکن احتیاط کے ساتھ مکان کی طرف بڑھا۔ ہر قدم پر یہی دھڑکا لگا رہا کہ اب گولی آئی۔ اب کوئی کُتّا

یا سنتری آیا لیکن چاروں طرف حیرت انگیز سناٹا تھا۔ آخر میں ایک عقبی دروازے کے سامنے پہنچ کر رُک گیا۔ میرا دماغ مجھ سے بھی دس قدم آگے تھا۔ جانے کیسے اس میں یہ خیال در آیا کہ دروازے کے پیچھے میرے چچا البرٹ، ایگری کولا، پٹرول مین زگوٹا اور وہ سیاہ سیڈان والے دونوں آدمی میرے استقبال کے لیے کھڑے ہیں۔ میرے اندر داخل ہوتے ہی وہ مجھے مبارک باد دیں گے اور تنظیم میں شمولیت کا مژدہ سُنائیں گے۔ جیسے میرے قتل کی دھمکی، یہ تعاقب وغیرہ سب کچھ میرا امتحان تھا۔

لیکن اس چھوٹے سے کمرے میں دیوار کے ساتھ بُوٹوں کی ایک قطار اور کھونٹیوں پر ٹنگے ہُوئے مختلف رنگ اور سائز کے سوئیٹروں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سامنے ہی ایک دروازہ اور تھا۔ میں۔۔۔ اُسے کھول کر باورچی خانے میں آ گیا جو اس کمرے ہی کی طرح خالی پڑا تھا۔۔۔ سامنے کا دروازہ نیم وا تھا۔ میں نے جھانک کر دیکھا وہ ایک ہال تھا۔ میں آہستگی سے اُس میں آ گیا پھر وہ مجھے نظر آ گئے۔ یہ تین آدمی تھے جو ہال کے دائیں جانب والے ایک کمرے میں بیٹھے ہُوئے باتیں کر رہے تھے۔ اُن سب کی پیٹھ میری طرف تھی۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا آگے بڑھا۔ اچانک سامنے ایک کمرے میں سے پیانو کی آواز سُنائی دی۔ میں نے قریب جا کر دروازے کی درز میں سے اندر دیکھا۔ ایک بے حد حسین لڑکی پیانو کے سُروں سے کھیل رہی تھی۔ اُس کی عمر اٹھارہ اُنیس سے زیادہ نہیں تھی اور پیانو بجانے کے معاملے میں اناڑی سی ہی تھی۔ میں دروازے کے سامنے سے ہٹ گیا۔ نچلی منزل میں شاید یہی لوگ تھے۔ ان میں ایگری کولا نہیں تھا۔۔۔

میں دبے قدموں سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر آ گیا۔ یہ ایک وسیع ہال تھا جس میں دبیز قالین بچھا ہُوا تھا۔ اُس کے دونوں طرف کمرے بنے ہُوئے تھے جن میں سے ایک کا دروازہ کسی قدر کھُلا ہُوا تھا۔ میں پُوری احتیاط سے وہاں پہنچا اور اندر دیکھا۔ یہ کوئی دفتر یا شاید اسٹڈی رُوم تھا۔ دیواروں کے ساتھ لگی الماریوں میں کتابیں اور فائلیں بھری ہُوئی تھیں۔ وسط میں ایک چمک دار میز تھی جس کے عقب میں چمڑے کی کُرسی پر ایک آدمی بیٹھا ہُوا تھا۔ وہ بھاری بھرکم بدن کا پچاس سالہ آدمی تھا۔ اُس کے چہرے سے طاقت اور امارت مترشح تھی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہی ایگری کولا ہے پھر اس سے پہلے کہ اُس کی نظر مجھ پر پڑتی میں نے اپنا حوصلہ بحال کیا اور کمرے میں گھُس کر جلدی سے اُس کے سامنے جا کھڑا ہُوا۔

"مسٹر ایگری کولا۔" میں اُسے موقع دیے بغیر جلدی سے بولا۔ "میرا نام چارلی پول ہے۔ میں آپ سے کچھ باتیں کرنے آیا ہوں۔ ا
صفائی پیش کرنے اور یہ بتانے کہ آپ میری طرف سے شدید غلط
میں مُبتلا ہیں۔"

اُس نے کوئی حرکت نہیں کی۔ نہ ہی اُس کے چہرے
تاثرات میں کوئی تبدیلی ہُوئی۔ بس وہ یُوں آنکھیں پھاڑے میری
دیکھ رہا تھا جیسے میں کوئی عجوبہ تھا۔ میرے اعصاب تن گئے۔ کیا کو
میرے پیچھے کھڑا ہُوا تھا؟ اُس کا کوئی آدمی جو اشارے کا منتظر

"مسٹر ایگری کولا؟" میں پھر تیزی سے بولا اور مُڑ کر دیکھا۔
میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ "میں آپ سے کچھ باتیں کرنے آیا ہوں
اس بار بھی اُس کے جسم میں کوئی جُنبش نہ ہُوئی۔ میں تیزی
اُس کی طرف بڑھا۔ میرے جسم میں سنسنی دوڑ رہی تھی۔ میں گھو
کر کُرسی کے قریب آ گیا اور تب اُس کے سکوت کا راز کھُل گیا۔ اُس
کی پُشت میں ایک خنجر دستے تک اُترا ہُوا تھا۔

میں نے اس سے پہلے اسکرین کے علاوہ زندگی میں کب
کوئی لاش نہیں دیکھی تھی۔ میں سکتے کے سے عالم میں کھڑا اُ
دیکھتا رہا پھر ایک آواز سُن کر اُچھل پڑا۔ "ہے۔ اپنے ہاتھ اُو
اُٹھاؤ۔۔۔؟"

میرے ہاتھ خود بخود سر سے بلند ہو گئے۔۔۔ میں اُس کی طر
مُڑا۔۔۔ "گولی مت چلانا۔" میں نے استدعا کی۔ اُس کے پستول کی
میرے سر کی طرف اُٹھی ہُوئی تھی۔ "میں نے اسے پکڑ لیا ہے۔ مسٹ
ایگری کولا۔" وہ کہہ رہا تھا۔۔۔

"اوہ۔۔۔" میرے مُنہ سے ایک کراہ نکل کر رہ گئی۔ سمجھ میں
نہیں آ رہا تھا کہ ایگری کولا کی موت کی خبر اُسے کیسے سُناؤں لیکن
پچکی ہُوئی ناک اور خوفناک صُورت والا آدمی مجھ سے زیادہ تجر
تھا۔۔۔

"اوہ۔۔۔" وہ حیرت سے چلّایا۔۔۔ "تو تم نے۔۔۔؟"

"نہیں۔۔۔" میں چیخ اُٹھا۔ "میں نے اسے قتل نہیں کیا ہے

"اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا۔" وہ غرّایا پھر پستول کا رُخ
طرف کر کے دروازے کی طرف بڑھا۔ "ہے۔ ٹم۔۔۔" وہ چلّایا۔ "جلد
اُوپر آؤ۔۔۔"

سیڑھیوں پر دوڑتے قدموں کی آواز سُنائی دی پھر ٹم اند
گیا۔۔۔ "کیا بات ہے جون؟" وہ بولا پھر صُورتِ حال دیکھ کر اُس
بھی اپنا پستول نکال لیا۔

"کیا بات ہے؟ کیا ہُوا جون؟" اُس لڑکی کی آواز تھی جو
بجا رہی تھی۔۔۔

"کچھ نہیں مس ایلیتھی۔۔۔ کوئی بات نہیں ہے۔" جون نے چلّا کر کہا۔

"آخر ہُوا کیا ہے؟" ٹم نے پُوچھا۔

"اس آدمی نے ایگری کولا کو قتل کر دیا۔"

"نہیں۔۔۔ خُدا کے لیے میری بات سُنو۔" میں گڑگڑایا۔ "اِسے میں نے قتل نہیں کیا ہے۔ میں جب اندر آیا تو یہ اسی حالت میں تھے۔۔۔"

"تمھارے سوا اور کوئی یہاں نہیں آیا؟"

"وہ دو آدمی بھی تو آئے تھے سیاہ سیڈان میں۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ ایگری کولا خود انھیں نیچے تک چھوڑنے آئے تھے پھر
ب وہ چلے گئے تو ایگری کولا اُوپر آ گئے۔ اس کے بعد سے کوئی اُوپر
نہیں آیا۔۔۔"

اُسی وقت لڑکی اندر آ گئی۔ "جون کیا ہُوا؟" وہ بولی پھر ایگری کولا
ر پڑتے ہی وہ چیختی ہُوئی اُس طرف دوڑی۔ "ڈیڈی۔۔۔"

تیسرا آدمی بھی کمرے میں آ گیا۔ مس ایلیتھی ہسٹریائی انداز میں
ڈیڈی۔۔۔ ڈیڈی۔۔۔" چلّا رہی تھی۔

"روبی۔۔۔" جون نے تیسرے آدمی سے کہا۔ "مس ایلیتھی کو نیچے
جاؤ۔۔۔" روبی اُس کی طرف بڑھا تو ایلیتھی چیخ مار کر اپنے باپ
لپٹ گئی پھر بے ہوش ہو کر زمین پر گر گئی۔ روبی نے بڑی آسانی
اُسے ہاتھوں پر اُٹھایا اور کمرے سے باہر لے گیا۔

میں مسحور سا کھڑا اس سارے ڈرامے کو دیکھتا رہا۔

"اس کی تلاشی لو۔" جون نے ٹم سے کہا۔ "میرے ہاتھ بُری طرح
لگے ہیں۔"

ٹم نے میری جیبوں سے سب کچھ نکال لیا۔ ان میں تھا ہی
بٹوہ، چابیاں، پال مال کا ایک پیکٹ، ایک ماچس۔۔۔ ٹم بٹوہ
لگا۔

"کیا میں اپنے ہاتھ گرا دوں پلیز؟" میں نے پُوچھا۔

"گرا دو۔۔۔" جون نے کہا پھر ٹم کی طرف دیکھا۔

"اس کا نام چارلی پول ہے اور یہ بروکلین میں رہتا ہے
والا بھتیجا۔۔۔ ہے نا؟" اُس نے میری طرف دیکھا۔

"ہاں۔۔۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "میں اپنی صفائی۔۔۔"

"تم تو ہماری توقع سے زیادہ چالاک نکلے بھتیجے۔" جون استہزائیہ
میں بولا۔۔۔ "اپنا سامان جیب میں رکھ لو۔۔۔"

میں نے ساری چیزیں جیب میں رکھ لیں۔

"آؤ چلیں۔۔۔" اُس نے دروازے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"اس کا کیا کریں جون؟" ٹم نے لاش کے بارے میں پُوچھا۔

"اسے یہیں رہنے دو اور مسٹر گروس کو فون پر بتا دو کہ کسان نے کھیت خرید لیا ہے۔ سمجھے؟"

"ہاں۔۔۔" ٹم بولا اور میں جون کے ساتھ ہال میں سے گزرتا ہُوا نیچے آ گیا۔

"میں نے۔۔۔ میں نے مسٹر ایگری کولا کو قتل نہیں کیا ہے۔" میں نے پھر احتجاج کیا۔ "میں تو اُسے یہ بتانے آیا تھا کہ میں بے گناہ ہُوں۔۔۔ میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔ اُس نے کیوں دو آدمی میرے قتل کے لیے میرے پیچھے لگا دیے ہیں؟"

"ٹھیک ہے۔ چلتے رہو۔"

ہم مکان سے باہر دھوپ میں آ گئے۔ "اس طرف۔۔۔" اُس نے احاطے میں بنے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ شاید غلّے کا گودام تھا۔۔۔ ہم اُدھر چلنے لگے۔

"میں نے ایگری کولا کو قتل نہیں کیا۔۔۔ میں ایسا آدمی نہیں ہُوں۔۔۔" میں نے پھر کہا۔

"ٹھیک ہے۔ اندر چلو۔" اُس نے مجھے اندر دھکیلا اور پھر باہر سے دروازہ مقفّل کر دیا۔ میں اندھیری کوٹھری میں تنہا رہ گیا۔

اب کیا کروں؟ میں نے سوچا۔ ظاہر سی بات تھی کہ جون اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتا تھا اور گروس کی ہدایات کا محتاج تھا۔ شاید ایگری کولا کو بھی اس سے ہدایات ملتی تھیں۔ چنانچہ اب ایگری کولا کی بجائے مجھے اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے مسٹر گروس سے ملنا تھا۔۔۔

میں نے دیوار کو آزمانے کے لیے اُس پر ٹھوکر ماری اور اپنا پَیر پکڑ کر بیٹھ گیا پھر میں نے دروازے پر ٹکّر ماری مگر وہاں سے بھی کندھے میں درد کے سوا کچھ نہ مل سکا۔ نہ جانے جون کو گروس سے ہدایات حاصل کرنے میں کتنی دیر لگے۔ گروس شاید سیاہ سیڈان والوں سے بھی اس سلسلے میں بات کرے گا اور اس تمام کام میں ایک دو گھنٹے سے کم وقت نہیں لگ سکتا تھا۔ چنانچہ میں سر پکڑ کر گرد آلود فرش پر بیٹھ گیا۔ اچانک ایک دھماکے سے دروازہ کھُلا۔ میں نے حیرت سے اُدھر دیکھا۔۔۔ اتنی جلدی؟ لیکن دروازے میں جون کے بجائے مس ایلیتھی کھڑی ہُوئی تھی بالکل کسی ڈزنی ہیروئن کی طرح اُس کی پیشانی پر تیوریاں پڑی تھیں اور آنکھوں سے غم و غصہ جھلک رہا تھا لیکن حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اُس کے نازک سے ہاتھ میں ایک سیاہ خوفناک پستول دبا ہُوا تھا جسے سنبھالنے کی وہ پوری کوشش کر رہی تھی۔

"ہے... کیا کر رہی ہو؟" میں چلا اٹھا...

"تم نے میرے باپ کو قتل کیا ہے!"

"نہیں... میں قاتل نہیں ہوں۔ میں نے تمھارے باپ کو قتل نہیں کیا ہے۔" میں ہاتھ لہراتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

"اب میں تمھیں قتل کر دوں گی۔" وہ دانت پیستی ہوئی غرائی پھر کوٹھری میں ایک خوفناک دھماکا گونج اٹھا...

میں سمجھا کہ کام تمام ہوا... لیکن نہ کہیں درد ہوا نہ خون نکلا... میں صحیح سالم کھڑا ہوا تھا۔ ایک دھماکا اور ہوا۔ خدایا۔ میں دونوں بار ہی بچ گیا تھا... ایلیتھی کے ہاتھ بری طرح کپکپا رہے تھے اور پستول کی نال دائیں بائیں لہرا رہی تھی۔ دونوں گولیاں دیوار کا پلاسٹر اکھاڑ گئی تھیں لیکن ضروری نہیں تھا کہ تیسری گولی بھی خطا جاتی۔ چنانچہ میں اچھلا اور اس کا پستول والا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے پستول چھین لیا لیکن اتنی ہی دیر میں وہ اپنے ناخنوں سے میرے چہرے پر نقش و نگار بنا چکی تھی اور کلائی میں دانت گاڑ دیے تھے...

"سنو... میں۔" میں نے اس کی طرف پستول تانتے ہوئے کہا۔ "میں نے تمھارے باپ کو قتل نہیں کیا ہے۔ میں قسم کھاتا ہوں۔"

"بکواس مت کرو۔ تم قاتل ہو۔" وہ چلائی۔

کھلے دروازے میں سے مجھے جون آتا نظر آیا۔ میں نے ایلیتھی کو گلے سے پکڑا اور اس کے سر پر پستول کی نال لگا دی پھر میں اسے لے کر باہر آگیا۔

"مسٹر جون دور رہنا۔" میں چلایا۔ "ورنہ میں اس لڑکی کو گولی مار دوں گا..."

"مگر... مگر...!" وہ ہکلا کر رہ گیا۔

"بکواس مت کرو۔" میں نے اسے جھڑکی دی۔ "چلو۔ مکان کی طرف چلو۔" میں نے اسے آگے کیا اور ایلیتھی کے سر سے پستول لگائے مکان کی طرف چلا... مکان کے سامنے پہنچتے ہی ایک اور منظر دیکھ کر میں ٹھٹک گیا۔ ٹم آرٹی کو زد میں لیے ہماری طرف آ رہا تھا۔

"آرٹی... تم؟" میں نے حیرت سے کہا پھر میں نے ٹم کی طرف گھور کر دیکھا۔ "اپنا پستول پھینک دو... ورنہ میں اس لڑکی کو گولی مار دوں گا۔"

ٹم نے جون کی طرف دیکھا۔ "پستول پھینک دو ٹم۔" جون بولا... "ہم مس ایلیتھی کی جان خطرے میں نہیں ڈال سکتے۔"

ٹم نے پستول پھینک دیا جسے میرا اشارہ پا کر آرٹی نے اٹھا لیا...

ذرا ہی دیر بعد ہم نے ان دونوں بدمعاشوں کو اسی کوٹھری میں بند کر دیا جس سے میں نکل کر آیا تھا۔ "اب یہاں سے فوراً نکل چلو آرٹی۔" میں نے کہا۔

"لیکن اس لڑکی کا کیا کریں؟"

"ہم اسے یرغمال کے طور پر ساتھ لے چلیں گے لیکن چارلی بے بی... تم تو بڑے جی دار نکلے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ..."

"یہ جی داری کی بات نہیں ہے آرٹی۔ میں یہاں اپنی صفائی پیش کرنے آیا تھا لیکن ایگری کولا کو مجھ سے پہلے ہی کوئی مار گیا۔"

"قاتل خونی تم نے میرے باپ کو قتل کیا ہے۔" ایلیتھی چلائی۔

"خاموش رہو... ورنہ تمھیں ضرور مار دوں گا۔" میں نے اسے دھمکی دی۔ "چلو آرٹی... ہم اسے ساتھ لے چلتے ہیں۔"

ہم درختوں میں سے نکل کر سڑک پر آئے جہاں ایک کنا پر کار کھڑی تھی... اور اسٹیرنگ پر پیگی بیٹھی تھی۔ میں نے پچھل سیٹ پر ایلیتھی کو دھکیلا اور خود اس کے برابر بیٹھ گیا۔ آرٹی نے پیگی کے برابر والی سیٹ سنبھال لی اور پیگی نے کار آگے بڑھا

راستے میں آرٹی نے بتایا کہ میرے آنے کے بعد سیاہ سیڈان والے دونوں بدمعاش اس کے پاس آئے تھے اور میرا پتہ پوچھ رہے تھے۔ آرٹی نے لاعلمی کا اظہار کیا پھر ان کے جا ہی وہ پیگی کو ساتھ لے کر میری خبرگیری کے لیے ایگری کولا کے فا پر آگیا جہاں ٹم نے اسے پستول دکھا کر بے بس کر دیا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اس نے فون پر جون اور گروس کی گفتگو سنی تھی گروس نے اسے حکم دیا تھا کہ مجھے قتل کر دیا جائے۔

جارج واشنگٹن پل پار کر کے ہم نیویارک پہنچ گئے۔ "اب کہاں چلیں؟" پیگی پہلی بار مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"مجھے ہر قیمت پر مسٹر گروس سے ملنا ہے۔ میں اسے بتا چاہتا ہوں کہ انھیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں بے گناہ ہوں۔ میں اک تنظیم سے نہیں لڑ سکتا۔"

"تم... تم قاتل ہو۔" ایلیتھی پھر چلائی... "تم نے میرے باپ کو قتل کیا ہے۔ میرا باپ ایک سیدھا سادھا کسان تھا... قاتل ہو..."

"اوہ۔" آرٹی نے منہ بنایا۔ "تو اسے اپنے باپ کی اصلیت کا علم نہیں ہے... بے چاری..."

"میں کس طرف چلوں؟" پیگی نے پوچھا۔ "کیا تمھیں مسٹر گر کا پتہ معلوم ہے؟"

"نہیں..." میں نے مایوسی سے کہا۔ "میں نے یہ نام ہی پہلی بار سنا ہے۔"

"تمھارے چچا البرٹ کو علم ہو گا۔ وہیں چلتے ہیں۔ کیا خیال ہے؟" آرٹی بولا۔

"چلو..." میں نے ہامی بھر لی۔

پیگی نے عمارت سے ایک بلاک دور کار روک دی۔ میں اتر گیا اور ایک پستول آرٹی کو دے کر انھیں ہوشیار رہنے کی ہدایت کر کے عمارت میں گھس گیا پھر انکل البرٹ کے دروازے کے سامنے جا کھڑا ہوا... مجھے وہ مخصوص دستک یاد تھی۔ جسے سن کر چچا البرٹ نے دروازہ کھولا تھا پہلے ایک پھر تین اور پھر بار...

دروازہ چچا البرٹ نے ہی کھولا تھا۔ مجھے دیکھ کر ان کی آنکھوں یں حیرت لہرائی اور وہ دروازہ بند کرنے لگے لیکن میں نے فوراً ہی اڑا دی...

"نہیں چچا... تم دروازہ نہیں بند کر سکتے۔" میں نے مضبوط لہجے کہا۔ "میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

اس وقت چچا البرٹ اگر ذرا بھی حوصلے سے کام لیتے... اور باہر نکل جانے کا حکم دیتے تو عادتاً میں فوراً ہی اس حکم کی کرتا کیونکہ میں زندگی بھر ان کی فرماں برداری کرتا آیا تھا لیکن چچا البرٹ کے چہرے پر خوف دیکھ کر میں جان گیا کہ وہ طاقت کی ان سمجھتے تھے اور وجہ محض یہ تھی کہ وہ بزدل تھے۔ میرے ہاتھ الا پستول دیکھ کر وہ پیچھے ہٹ گئے اور میں اندر آگیا اس ہی ہمارے درمیان چچا اور بھتیجے کا رشتہ ہمیشہ کے ہو گیا...

"تمھیں... تمھیں احساس ہے چارلی... کہ تم نے مجھے کس مصیبت میں پھنسا دیا ہے؟" وہ لرزیدہ آواز میں بولے...

"بکواس مت کرو چچا۔ وہ لوگ تمھیں نہیں مجھے قتل کرنے کے چکر ہیں۔" میں نے کہا۔ "آؤ ہم لونگ روم میں چل کر باتیں کریں گے۔"

"اوہ نہیں چارلی۔ وہاں تمھاری چچی ہے۔ اسے ان باتوں کا علم ہے۔"

"اب وقت آگیا ہے چچا کہ انھیں تمھارے بارے میں سب باتوں علم ہو جائے۔"

"نہیں چارلی... خدا کے لیے... میں تمھاری منت کرتا ہوں۔ میرے اسٹڈی میں آجاؤ۔" میں اس کے ساتھ اسٹڈی میں آگیا۔ "ارلی میں نے اور تمھاری چچی نے ہمیشہ تمھیں اپنی سگی اولاد کی طرح سمجھا ہے۔ میں نے تمھیں بار کی ملازمت دلوائی لیکن تنظیم تم سے ناراض ہو گئی۔ انھوں نے مجھے فون کیا تھا کہ تم نے گڑبڑ کی ہے اور وہ تمھیں سزا دینا چاہتے ہیں۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ میں ان کی مخالفت کر سکوں۔ تم سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"کس سے غلطی ہوئی ہے چچا البرٹ۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ میرا قصور کیا ہے؟ میں اپنی صفائی پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میں ایگری کولا کے پاس گیا تھا لیکن اسے کسی نے قتل کر دیا۔" چچا البرٹ کا منہ پھٹ گیا لیکن منہ سے کچھ نہ بول سکے۔ "اب میں مسٹر گروس سے ملنا چاہتا ہوں اور تم مجھے اس کا پتہ بتاؤ گے۔"

"میں؟ میں کیسے بتا سکتا ہوں۔ وہ مجھے فوراً گولی مار دیں گے۔"

"تم نہیں بتاؤ گے تو میں چچی فلورا سے پوچھ لوں گا۔" میں نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

"چارلی... چارلی۔ خدا کے لیے..." چچا البرٹ گڑگڑایا۔ "میں نے ہمیشہ تم سے اپنے بیٹے کی طرح پیار کیا ہے۔ تمھیں اتنی اچھی ملازمت..."

"تمھاری دلائی ہوئی ملازمت ہی نے مجھے آج یہ دن دکھائے ہیں کہ میں خوف زدہ چوہے کی طرح چھپتا پھر رہا ہوں۔ نہیں چچا البرٹ تمھارا احسان سر آنکھوں پر مگر میری جان اتنی سستی نہیں ہے۔ میں مسٹر گروس سے مل کر اپنی صفائی پیش کرنا چاہتا ہوں اور تم مجھے اس کا پتہ بتاؤ گے ورنہ میں چچی فلورا سے..."

"چارلی۔ تم نہیں سمجھ رہے ہو کہ تم مجھ سے کیا مانگ رہے ہو۔ اگر انھیں بھنک بھی پڑ گئی تو وہ مجھے گولی مار دیں گے۔"

"کم از کم میں تو انھیں نہیں بتاؤں گا۔ ظاہر ہے تم بھی نہیں بتاؤ گے۔ اس لیے انھیں خبر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بس اب جلدی سے مجھے پتہ بتا دو۔"

چچا البرٹ کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور آنکھوں میں خوف اور خدشات رقصاں تھے۔ انھوں نے بے چارگی سے میری طرف دیکھا پھر میرے چہرے پر عزم دیکھ کر وہ لکھنے کی میز پر جا بیٹھے اور ایک کاغذ پر مسٹر گروس کا پتہ لکھ دیا۔

"شکریہ چچا..." میں نے پرچہ لیتے ہوئے کہا۔ "لیکن اگر یہ غلط ہوا تو میں سیدھا چچی فلورا کے پاس جاؤں گا اور انھیں سب کچھ بتا دوں گا۔" چچا کی مسکین صورت دیکھ کر مجھے دل ہی دل میں ان پر ترس آنے لگا۔ بے چارے اپنی بیوی سے کچھ زیادہ ہی ڈرتے تھے۔

میں باہر آیا تو آرٹی پچھلی سیٹ پر مس ایلیتھی کے پہلو سے پستول لگائے بیٹھا تھا۔ "اس نے پھر بھاگنے کی کوشش کی تھی۔" وہ بولا۔ ایلیتھی کار کے ایک کونے میں سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔

"میرا خیال ہے اب اسے آزاد کر دو۔" میں نے کہا۔

"نہیں چارلی۔ یہ تو ہماری ضمانت ہے۔" وہ بولا۔ "اس کی وجہ سے وہ ہم پر ہاتھ ڈالتے ہوئے کترائیں گے۔"

میں نے سوچتے ہوئے سر ہلا دیا لیکن مجھے یقین نہیں تھا۔ بدمعاشوں کی یہ تنظیم اس لڑکی کی وجہ سے اپنی حرکتوں سے باز نہیں رہ سکتی تھی۔ اگر اس کا باپ ایگری کولا زندہ ہوتا تو شاید وہ کچھ سوچتے۔ بہرحال مجھے آرٹی پر اعتماد تھا اس لیے میں نے یہ معاملہ اُسی پر چھوڑ دیا۔

"کیا تم مسٹر گروسی کا پتہ لے آئے؟" اسٹیئرنگ وہیل کے پیچھے بیٹھی ہوئی پیگی نے دریافت کیا۔

"ہاں...۔" میں نے کہا اور پرچہ نکال کر انھیں دکھایا۔ "ایک سو بائیس، کالونیل روڈ۔ بے پارک لانگ آئی لینڈ۔" میں نے پتہ پڑھ کر سنایا۔

"کیا خیال ہے؟" پیگی نے پوچھا۔ "میرے خیال میں بے پارک لانگ آئی لینڈ کے جنوبی ساحل پر ہے۔"

"ہاں... چلو۔" میں پیگی کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ پیگی نے انجن اسٹارٹ اور ایکسیلیٹر دبا دیا۔

خاصا لمبا سفر تھا۔ ساڑھے سات بجے ہماری کار سُرخ سگنل دیکھ کر رُکی تو ایلتھی نے اپنا کرتب دکھا دیا۔ وہ بڑی دیر سے خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ کار رُکتے ہی اس نے اچانک اپنی جانب والا دروازہ کھولا اور باہر نکل کر ایک جانب دوڑ لگا دی۔

آرٹی چلّایا پھر وہ بھی باہر نکلا اور اس کے تعاقب میں بھاگ اُٹھا۔ ایلتھی دوڑتی ہوئی ایک ذیلی سڑک پر مُڑ گئی۔ پھر آرٹی بھی اس کے پیچھے غائب ہو گیا۔ میں اور پیگی حیرت سے مُنہ پھاڑے اسی جانب دیکھ رہے تھے کہ پیچھے کھڑی ہوئی کاروں کے سائرن چلّا اُٹھے۔ سُرخ بتی کی جگہ سبز سگنل جل اُٹھا تھا۔

"کیا کریں؟" پیگی نے گھبرا کر پوچھا۔

"یہاں سے آگے چلو۔ پھر کسی مناسب سی جگہ کار روک دینا۔" میں نے مشورہ دیا۔ آدھ میل دُور جا کر ہی ہمیں کار پارک کرنے کی جگہ مل سکی۔

"یہ تو بہت بُرا ہوا۔" پیگی نے کار روکتے ہوئے کہا۔ "اگر وہ اُسے نہ پکڑ سکا تو کیا ہوگا؟ اور اگر پکڑ بھی لیا تو وہ اسے گھسیٹ کر تو ہرگز نہیں لاسکتا۔ بڑی طرار لڑکی ہے۔ چیخ چیخ کر لوگوں کو جمع کر لے گی۔"

"آرٹی ذہین آدمی ہے۔ وہ اسے کسی نہ کسی طرح لے ہی آئے گا...۔" میں نے کہا لیکن دل میرا بھی ڈر رہا تھا۔ اتنے بڑے اور بارونق شہر میں ذہین سے ذہین آدمی بھی کسی لڑکی کو اس کی مرضی کے بغیر نہیں لاسکتا تھا۔ پندرہ منٹ گزر گئے۔ میں نے بے چینی سے پیگی کی طرف دیکھا۔ "میرے خیال میں وہ اس کے تعاقب میں دُور نکل گیا ہے۔" میں نے کہا۔ "یا پھر وہ اسے اس طرف نہیں لاسکا ہوگا۔ اسے علم ہے کہ میں مسٹر گروسی سے جلد از جلد ملنا چاہتا ہوں۔ اسے مسٹر گروسی کے پتے کا بھی علم ہے۔ شاید وہ وہیں پہنچ گیا ہو۔"

"اگر وہ وہاں نہ پہنچا ہوگا تو؟"

"تو پھر ہم اسی کے مکان پر ملیں گے۔ مسٹر گروسی سے ملتے ہی ہم وہاں چلے چلیں گے۔"

"کیا تم مسٹر گروسی سے اکیلے ہی ملنا چاہتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔ اگر آرٹی ہوتا تو بھی میں مسٹر گروسی کے مکان پر اسے ساتھ لے کر نہیں جاتا۔ اپنی وجہ سے میں اسے خطرے میں ڈالنا پسند نہیں کرتا۔"

"تم واقعی اچھے دل کے آدمی ہو چارلی۔" وہ ذرا دیر بعد بولی۔

"میرا خیال ہے کہ یہاں اُن کا انتظار کرنا فضول ہی ہے۔"

پیگی نے کار سڑک پر اُتار کر اس کا رُخ لانگ آئی لینڈ کی طرف کر دیا۔ جب ہم بے پارک پہنچے تو رات کے نو بج رہے تھے۔ ہم نے گروسی کے گھر کے دو تین چکر لگائے پھر میرے کہنے سے پیگی نے کار ایک بلاک دُور سڑک کے کنارے روک دی۔ میں کار سے باہر آیا۔ "اگر میں آدھ گھنٹے میں واپس نہ آؤں تو تم میرا انتظار مت کرنا۔" میں نے اس سے کہا۔ "تم آرٹی کے فلیٹ میں پہنچ جانا۔ میں وہیں آنے کی کوشش کروں گا۔"

"ہوشیار رہنا چارلی۔" وہ فکرمندی سے بولی۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور مسٹر گروس کے گھر کی طرف چل دیا۔ میرے جسم پر ابھی تک آرٹی کا جیکٹ تھا۔ میں نے اس کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کرُم والا پستول پکڑ لیا اور مکان کے سامنے پہنچ کر رُک گیا۔ یہ خاصی بڑی عمارت تھی اور تقریباً ساری ہی کھڑکیاں روشن تھیں۔ ڈرائیو میں پانچ چھ قیمتی کاریں کھڑی ہوئی تھیں۔ میں احتیاط سے چلتا ہوا مکان کے عقب میں آ گیا۔ اس طرف اندھیرا ہی تھا۔ ایک چھوٹا سا دروازہ دیکھ کر میں اس کی طرف بڑھا اور دروازے کے ناب پر ہاتھ رکھ دیا۔ دروازہ غیر مقفل تھا۔ میں اندر آ گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا ڈائننگ رُوم تھا۔ دیواروں پر چند تصویریں ٹنگی ہوئی تھیں اور وسط میں ایک طویل میز کے گرد آٹھ کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔

پھر اچانک ہی اندر والا دروازہ کھلا اور کمرہ منوّر ہو گیا۔ میرے سامنے تین آدمی کھڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں پستول، دُوسرے کے ہاتھ میں بیس بال کا بیٹ اور تیسرے کے ہاتھ میں گوشت کاٹنے کی چھری تھی۔ تینوں آدمی صورت ہی سے احمق نظر آ رہے تھے لیکن جب وہ اپنے اپنے ہتھیار لہراتے ہوئے میری طرف بڑھے تو میں چلّا اُٹھا۔ "مارنا مت... میں... میں چور نہیں ہوں۔" میں نے اپنے دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھا دیے۔ ایک آدمی جس کے بدن پر شوفر کی وردی تھی اور ہاتھ میں بیس بال کا بیٹ تھا، میری طرف بڑھا اور میری جیب سے کرُم والا پستول نکال لیا۔ پھر اُس نے بیٹ اپنی بغل میں دبایا اور میرا بازو پکڑ لیا۔ چھری والے آدمی نے جو یقیناً باورچی تھا، بڑھ کر میرا دُوسرا بازو پکڑ لیا۔ پھر وہ مجھے اندر لے آئے۔ کئی راہداریاں اور زینے پار کر کے وہ مجھے اُوپر لے آئے اور ایک کمرے میں بند کر دیا۔ اُن کے جاتے ہی میں نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ کمرے کی کھڑکیاں مکان کے سامنے والے حصّے کی طرف کُھل رہی تھیں۔ میں نے دُور سڑک پر دیکھا۔ پیگی کی کار وہاں نہیں تھی۔ شاید وہ آرٹی کے فلیٹ کے لیے روانہ ہو چکی تھی۔ میں کمرے کے فرنیچر کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ایک ڈریسنگ ٹیبل اور صوفہ سیٹ پر مشتمل تھا۔ یہ شاید مہمان خانہ تھا۔ میں مسہری پر جا بیٹھا لیکن فوراً ہی اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ دروازہ کُھلا اور وہی تینوں اندر آ گئے جو مجھے یہاں بند کر گئے تھے۔ وہ کمرے میں پھیل گئے۔ ان کے ہاتھوں میں ابھی تک پستول، بیٹ اور چھری دبی ہوئی تھی۔ ایک بار پھر دروازہ کُھلا اور مسٹر گروس اندر آ گیا۔ میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ آدمی سے زیادہ گوشت کا پہاڑ دکھائی دے رہا تھا اور اس کے جسم پر نفیس تراش کا سُوٹ تھا۔ اس کی نیلی آنکھیں ہر قسم کے جذبات سے عاری تھیں۔ چند لمحوں تک وہ اُلّوؤں کی طرح میری شکل دیکھتا رہا پھر اس کے موٹے موٹے ہونٹوں میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس کی آواز اس کے جسم سے بھی زیادہ حیرت انگیز تھی۔ انتہائی ملائم اور بچّوں کی طرح معصوم اور باریک...

"تم میرے مکان میں کیوں آئے ہو؟ کیا تم چور ہو؟"

میں نے حیرت سے ان تین آدمیوں کی طرف باری باری دیکھا جو مجھے گھیرے کھڑے تھے۔ ان کی آنکھوں میں حماقت آمیز دلچسپی جھلک رہی تھی۔ "نہیں جناب۔" آخر میں نے سیدھا اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا لیکن اس کا پھُولا ہُوا چہرہ اس قدر بدنما تھا کہ میں نے نظریں جُھکا لیں۔

"سُنو مسٹر...۔" وہ بولا۔ "مجھے اناڑی لوگ بالکل پسند نہیں ہیں۔ یہ گھر اس وقت آدمیوں سے بھرا ہوا ہے پھر تم نے کیسے سمجھ لیا تھا کہ تم چوری کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گے؟"

"میں چوری کرنے نہیں آپ سے ملنے آیا ہوں مسٹر گروس۔"

اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کرُم والا پستول نکالا اور میرے سامنے کر دیا۔ "یہ پستول لے کر تم مجھ سے ملنے آئے تھے؟"

"یہ... یہ میں اپنی حفاظت کے خیال سے لایا تھا جناب۔" میں نے کہا۔

"میرے پاس وقت نہیں ہے۔" وہ بولا۔ "میرا گھر میرے دوستوں سے بھرا ہوا ہے۔ آج میرے ہاں پارٹی ہے اور تم رنگ میں بھنگ ڈالنے آ گئے۔"

"مجھے افسوس ہے جناب مگر میں...۔"

"ہر... برٹ...۔" نیچے سے کسی خاتون نے پُکارا۔ موٹے گروس کے چہرے پر زلزلہ سا آ کر رہ گیا۔

"ابھی میں جا رہا ہوں۔" وہ جلدی سے بولا۔ "پھر آؤں گا۔ تم بھاگنے کی کوشش مت کرنا ورنہ یہ لوگ تمھیں قتل کر دیں گے۔" وہ باہر چلا گیا تو تینوں آدمی بھی سمٹ کر دروازے سے نکل گئے۔ کمرہ بند ہو گیا تو میں پھر مسہری پر بیٹھ گیا۔

پندرہ منٹ بعد چاروں آدمی پھر اندر آ گئے۔ "اگر تمھیں صرف مجھ سے ہی ملنا تھا تو سامنے کے دروازے پر کال بیل بجا کر کیوں نہیں آ گئے؟" مسٹر گروس نے پوچھا۔

"مجھے ڈر تھا کہ آپ مجھ سے ملنے سے انکار کر دیں گے۔" میں نے کہا۔ "جبکہ میں آپ سے ہر قیمت پر گفتگو کرنا چاہتا تھا کہ یہ موت اور زندگی کا سوال ہے مسٹر گروس۔"

"موت اور زندگی؟" اس کی آنکھوں میں حیرت لہرائی۔ "کس کی موت؟ میری؟"

"آپ کی نہیں جناب۔ میری...۔"

"تمھاری؟ مگر تم تو پستول لے کر آئے ہو خیر... کہو۔ کیا بات کرنی ہے؟"

"میرا نام چارلی پول ہے جناب۔" میں نے کہا۔ "دو آدمی...۔"

"چارلی پول...۔" وہ چونک کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ "تم... تم نے فارمر ایگری کولا کو قتل کیا ہے۔ ہے نا؟"

"نہیں جناب۔ میں نے مسٹر ایگری کولا کو قتل نہیں کیا ہے۔ میں یہی باتیں بتانے آیا ہوں۔ آپ کو غلط فہمی...۔"

"بکواس... بکواس...۔" وہ ہاتھ لہرا کر چلّایا۔ "تم نے فارمر کو قتل کیا اور اب مجھے قتل کرنے آئے ہو۔ مگر تم پاگل ہو۔ کیا تم ساری تنظیم کو قتل کر سکتے ہو؟"

"نہیں مسٹر گروس۔ میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔ میں قسم کھاتا ہوں...۔"

"تم ایگری کولا کے قاتل ہو۔ اسے اور کون قتل کر سکتا ہے؟ کس میں اتنی جرأت ہو سکتی ہے؟ یقیناً تمھیں علم ہو گیا ہو گا کہ اس نے ٹراسک اور ڈیوڈ کو تمھیں قتل کرنے کے لیے بھیجا ہے بس تم نے اسے قتل کر دیا۔ کیا اس طرح تمھاری جان بچ سکتی ہے؟"

"ہربرٹ...۔" اسی عورت نے پھر پکارا مگر گروس نے اس بار آواز پر دھیان نہیں دیا۔ "اب تم مجھے قتل کرنے چلے آئے؟" وہ کہہ رہا تھا۔ "کیا تم...۔"

"ہربرٹ ..." دروازے سے آواز آئی۔ میں نے اس جانب دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ جس طرح مسٹر گروس بے حد حیرت انگیز اور بدصورت آدمی تھا اسی طرح یہ عورت حیرت انگیز حد تک خوبصورت تھی۔ اس دراز قامتی پر اعضا کا اس قدر حسین تناسب میں نے کبھی نہیں دیکھا۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو ڈیئر ..." وہ مسٹر گروس کو محبت بھری نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی۔ "چلو نا ... کس قدر مزیدار کھیل ہو رہا ہے۔"

"نہیں۔ میں ابھی مصروف ہوں۔" مسٹر گروس نے کہا۔ "جوزف۔" وہ ہیٹ والے آدمی سے بولا۔ جس نے شوفر کی وردی پہن رکھی تھی۔ "تم چلے جاؤ ... تم ابھی برج کھیلتے ہو۔ میں بعد میں آؤں گا۔"

جوزف نے عورت کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں اور میں جان گیا کہ جوزف اس سے پہلے بھی عورت کے ساتھ مسٹر گروس کی جگہ لیتا رہا ہے۔ ان کے جانے کے بعد مسٹر گروس ایک صوفے میں دھنس گیا۔ "تم دونوں۔ دروازے کے پاس کھڑے ہو جاؤ۔ اگر یہ آدمی کوئی گڑبڑ کرے تو اس کے مزاج درست کر دینا۔" دونوں آدمیوں نے اثبات میں گردن ہلائی اور دروازے کے دائیں بائیں جانب کھڑے ہو گئے۔ پھر مسٹر گروس نے اپنی نیلی آنکھیں مجھ پر گاڑ دیں۔

"تم پر غداری کا الزام ہے۔" وہ بولا۔ "ٹراسک اور ڈیوڈ کو تمھیں ختم کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے مگر تم بھاگ نکلے پھر تم ایگری کولا کے فارم پر گئے اور اسے قتل کر دیا۔ اب تم یہاں مجھے قتل کرنے آئے ہو۔"

"نہیں جناب میں نے انھیں قتل نہیں کیا ہے۔ میں نے کوئی غداری ..."

"خاموش ..." اس نے پھولا ہوا ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "تمھیں ایگری کولا کے آدمیوں نے پکڑ کر ایک کوٹھری میں بند کر دیا تھا مگر اس کی بیٹی نے تمھاری مدد کی اور تم وہاں سے بھی بھاگ آئے۔"

"اس کی بیٹی نے میری مدد ..." حیرت سے میرا منہ پھٹ گیا۔ "جناب آپ کو غلط اطلاعات ملی ہیں۔ اس کی بیٹی تو مجھے اپنے باپ کا قاتل سمجھ کر گولی مارنے آئی تھی۔ وہ تو ... وہ تو مجھے قتل کرنا چاہتی تھی۔"

"مسٹر! جھوٹ بولنے کے لیے ذہانت کی ضرورت ہوتی جو تم میں بالکل نہیں ہے اس لیے بہتر ہو گا کہ سچ بولنے کی کوشش کرو۔"

"میں انتہائی سچ بول رہا ہوں مسٹر گروس۔ میری بات تو ..."

"خاموش۔ میں تمھارا معاملہ سمجھ گیا ہوں۔ ایگری کولا نے اپنی سرگرمیوں کو اپنی بیٹی سے چھپا رکھا تھا پھر کسی طرح اس کی بیٹی کو علم ہو گیا کہ اس کا باپ ہماری تنظیم میں شامل تھا اور وہ بھڑک اٹھی۔ اس نے اپنے باپ کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے اس تنظیم ہی کو تباہ کرنے کا تہیہ کر لیا۔ ادھر تم نے ہماری مخبری شروع کر دی اور پولیس کو خبریں دینے لگے۔"

"نہیں۔ یہ غلط ہے۔ میں نے کبھی ..."

"پہلے میری بات سن لو ..." گروس نے نرمی سے کہا۔ "میں تمھیں بولنے کا موقع دوں گا۔ پچھلی رات سے پہلے نہ جانے تمھارا کیا منصوبہ تھا لیکن اب میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ تم اچانک ہی کھل کر میدان میں آ گئے۔ پہلے تم نے اپنے چچا کو قتل کرنے کی کوشش کی، وہاں سے ناکام ہو کر تم اسٹیشن آئی لینڈ پہنچے اور ایگری کولا کو قتل کر دیا اور وہاں تمھاری حسین ساتھی بھی تم سے آ ملی۔ اس وقت بھی میرے خیال میں وہ باہر کہیں قریب ہی ہو گی۔ اب تم بولو کیا کہتے ہو؟"

"پہلی بات تو یہ ہے جناب۔ میں آپ کو قتل کرنے نہیں بلکہ ..." میں اچانک چپ ہو گیا۔ میرے ذہن میں کھچڑی سی پک رہی تھی۔ "کیا میں آپ سے ایک سوال کر سکتا ہوں؟" میں نے پوچھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "کیا ٹراسک اور ڈیوڈ کو اس وجہ سے مجھے قتل کرنے بھیجا گیا تھا کہ میں پولیس کی مخبری کر رہا ہوں؟"

"ظاہر ہے ..." وہ بولا۔ "یہ ایک بے حد سنگین جرم ہے۔"

"آپ نے یہ نتیجہ کس بات سے نکالا تھا کہ میں مخبری کر رہا ہوں؟"

"ظاہر سی بات تھی ہمارا جو سامان تمھارے ہاتھوں سے نکلتا تھا پولیس کو اس کا علم ہو جاتا تھا۔ پولیس میں ہمارا بھی مخبر ہے ہم نے بھاری معاوضے پر اس کی خدمات حاصل کر رکھی ہیں۔ اس کا نام ولیم ہے۔ میں نے خود اس سے بات کی ہے۔ اس کا کہنا ہے پولیس کو یہ معلومات بارٹینڈر فراہم کر رہا ہے۔"

"کیا آپ کا اشارہ ولیم ہارلے کی طرف ہے جناب؟"

"ولیم فریزر ..." اچانک اس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ جیسے وہ یہ نام بتا کر پچھتا رہا ہو۔

"اس نے غلط اطلاع دی ہے جناب۔ میں ایسی حرکت ہرگز نہیں کر سکتا۔ میں بار کی ملازمت سے بے حد مطمئن تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میں اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے مارا مارا پھر رہا ہوں۔" میں نے کھڑکی سے باہر نظر ڈالی۔ ڈرائیو میں ایک سیاہ سیڈان آ کر رکی اور اس میں سے وہی دونوں آدمی جن کے نام مسٹر گروس نے ٹراسک اور ڈیوڈ بتلائے تھے اترے۔ "آپ کے ٹراسک اور ڈیوڈ آ گئے ہیں۔" میں نے کہا۔

"جب تک میں نہیں بلاؤں گا، وہ نیچے ہی رہیں گے۔" مسٹر گروس نے کہا۔ "تم اپنا بیان جاری رکھو۔"

"میں یہاں آپ سے باتیں کرنے آیا تھا۔" میں نے کہا۔ "میں آپ کو بتانے آیا تھا کہ میں بے قصور ہوں۔ اس ولیم نے جھوٹ بولا ہے یا کسی اور مقصد کے تحت مجھ پر الزام لگایا ہے۔ میں آپ سے درخواست کروں گا کہ مجھے اپنی بے گناہی کا ثبوت پیش کرنے کے لیے کچھ مہلت دی جائے۔"

"گویا تم یہ چاہتے ہو کہ میں تمھیں یہاں سے زندہ نکل جانے دوں؟"

"جی ہاں جناب۔"

"سب لوگ ہاتھ اٹھا لیں۔" اچانک دروازے میں سے ایک عورت کی آواز سنائی دی۔ میرے ہاتھ خود بخود اوپر اٹھ گئے۔ باقی چار آدمیوں نے بھی ہاتھ بلند کر دیے۔ "تم نہیں بے وقوف۔" وہ عورت مجھ سے مخاطب تھی۔ میں اس کی طرف مڑا۔ وہ پیگی تھی جو چھوٹا سا ریوالور ہاتھ میں دبائے کھڑی تھی۔ میں نے ہاتھ گرا دیے۔

"آہ۔ مس ایلیتھی ..." مسٹر گروس نے کہا۔ "کیسے مزاج ہیں تمھارے؟"

"میں تمھاری باتیں سن رہی تھی۔" وہ بولی۔ "انھیں تمھاری کسی بات پر یقین نہیں آیا ہے۔"

"مس ایلیتھی ..." مسٹر گروس نے بھاری لہجے میں کہا۔ "مجھے حیرت ہے کہ تم اپنے باپ کے قاتل کا ساتھ دے رہی ہو۔"

"بکواس مت کرو۔" پیگی غرائی اور اس کے ہاتھ سے پستول چھین کر میری طرف بڑھا دیا۔

"مسٹر گروس ..." میں نے کہا۔ "اگر میں آپ کو قتل کرنے آیا ہوتا تو اس وقت آسانی سے آپ کو گولی مار سکتا ہوں لیکن مجھے بار کی ملازمت ... میں بے گناہ ہوں اور جلد ہی آپ کی خدمت میں ثبوت پیش کر دوں گا۔ میں اصل مجرم کو پکڑنے جا رہا ہوں لیکن اس سے پہلے میں آپ کو باندھنا چاہوں گا تاکہ ہم آسانی سے نکل سکیں۔"

مسٹر گروس نے حیرت سے میری طرف دیکھا پھر اپنے آدمیوں سے کہا۔ "تم دونوں مدد کے لیے چلاؤ۔"

"مدد ... مدد!" باورچی چلایا۔ اس کے ساتھ ہی دوسرے آدمی نے بھی حلق پھاڑنا شروع کر دیا۔ "مدد ... مدد!"

اب بھاگنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ میں اور پیگی پستول لہراتے ہوئے کمرے سے نکلے۔ سامنے کی سیڑھیوں سے دوڑتے قدموں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس لیے ہم عقبی زینے کی طرف لپکے۔ نیچے آ کر ہم طویل راہداریوں میں سے دوڑتے ہوئے ڈرائیو میں نکل آئے۔ مکان کے اندر سے چیخنے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں پھر میں نے ٹراسک اور ڈیوڈ کو دروازے میں کھڑے دیکھا۔ میں جلدی سے ایک کار کے پیچھے چھپ گیا مگر پیگی مجھے بازو سے پکڑ کر گھسیٹنے لگی۔ "چلو ... چارلی ... نکل چلو۔"

ہم کاروں کے پیچھے جھکے جھکے چلتے رہے پھر لہراتے ہوئے گیٹ کی طرف دوڑے اور سڑک پر آ گئے۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ انھوں نے ایک گولی بھی نہیں چلائی ... ہم اپنی کار میں آ گئے۔ پیگی نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ پیچھے سے دو تین کاروں کا شور سنائی دیا۔

"جلدی کرو پیگی۔" میں چلایا۔ اس وقت کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھی اور میرا سر ونڈ شیلڈ سے ٹکرا گیا۔

"بے فکر رہو ..." میں نے پیگی کی آواز سنی۔ "وہ ہماری گرد کو بھی نہیں پا سکیں گے۔"

میں نے سیٹ سے کمر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں اور دل ہی دل میں اپنی خیر و عافیت کی دعائیں مانگنے لگا۔

"میں نے انھیں غچہ دے دیا ہے۔" پیگی کی آواز سن کر میں نے آنکھیں کھول دیں۔ "اب کہاں چلوں؟" اس نے پوچھا۔

میں نے ایک گہری سانس لی اور مڑ کر دیکھا۔ سڑک دور تک سنسان پڑی تھی۔ "شہر چلو۔" میں نے کہا۔ "مجھے ولیم نامی ایک پولیس مین سے ملنا ہے۔"

"ولیم نام کے تو سینکڑوں پولیس مین ہوں گے۔" وہ بولی۔

"ولیم فریزر۔ اس نام کے شاید زیادہ آدمی نہ ہوں۔ میری ساری پریشانیوں کی جڑ یہی آدمی ہے۔ اس نے مسٹر گروس کو اطلاع دی ہے کہ میں پولیس کے لیے مخبری کرتا ہوں۔ اب اگر میں یہ ثابت کر دوں کہ میں مخبر نہیں ہوں تو اس سے مجھے یہ ثابت کرنے میں بھی مدد ملے گی کہ میں ایگری کولا کا قاتل بھی نہیں ہوں۔"

"یہ اتنی آسان بات نہیں ہے چارلی۔" پیگی نے دھیرے سے کہا۔ "تم بڑی الجھنوں میں پھنس گئے ہو۔"

"میں ابھی الجھنوں کو سلجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ معاملہ صاف ہوتے ہی میں اپنی پرانی زندگی میں لوٹ جاؤں گا اور ان تمام باتوں کو ذہن سے نکال دوں گا۔"

"محض تمھارا خیال ہے۔" وہ بولی۔ "بہرحال ... اوہ۔ تم نے ایک بات پر غور نہیں کیا۔ گروس نے تمھیں ولیم کا نام بتایا ہے۔ اس نے مجھے احمق سمجھا ہے۔ یقیناً وہ جان گیا ہو گا کہ اب ہم ولیم سے ملنے کی کوشش کریں گے۔ اگر ہم نے ولیم کو ڈھونڈ لیا تو تم دیکھ لینا کہ ٹراسک اور ڈیوڈ ہماری تاک میں وہاں موجود ہوں گے۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ پیگی کا خیال درست نظر آ رہا تھا۔ "لیکن پیگی۔" میں نے کہا۔ "اس سے ملے بغیر یہ معاملہ صاف نہیں ہو سکتا۔ میں ہر قیمت پر اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"تمھاری مرضی۔ تم انچارج ہو۔ لو ہم گرانڈ سنٹرل پہنچ گئے۔ اب کہاں چلیں؟"

"کینا رسٹی!" میں نے کہا۔ "میرا بار اسی علاقے میں تھا۔ ولیم کے بارے میں اس کے علاوہ مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ وہ پولیس مین ہے۔ سادہ لباس والا یا وردی والا۔ مجھے اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا نہ ہی میں یہ جانتا تھا کہ وہ کس علاقے میں متعین تھا۔ میرے ذہن میں

صرف ایک ہی نام تھا، پٹرول مین زکوٹا۔ جس سے مجھے ولیم کے بارے میں کچھ معلوم ہو سکتا تھا اور زکوٹا کی ڈیوٹی کینارسٹی میں تھی۔

"کینارسٹی ؟" وہ حیرت سے بولی۔ "کیا تم مذاق کر رہے ہو ؟"

"نہیں۔ میں وہاں پٹرول مین زکوٹا سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"تو پھر اسٹیئرنگ تم سنبھالو۔ وہ علاقہ میرے لیے اجنبی ہے۔" پیگی نے کہا اور کار ایک جانب روک دی۔ ہم نے جگہ بدل لی اور کار ایک بار پھر سڑک پر دوڑنے لگی۔

زکوٹا مجھے آٹھویں اسٹریٹ پر گشت کرتا نظر آ گیا۔ میں پندرہ منٹ تک ادھر اُدھر چکر لگاتا رہا۔ میرا بار بند پڑا تھا جب کہ میرے مقابل کے دو باروں میں خاصی رونق تھی۔ آخر میں نے کار زکوٹا کے قریب روک دی اور کھڑکی میں سے سر نکال کر اسے پکارا۔

"ارے چارلی..." وہ قریب آ کر بولا۔ "یہ تم ہو۔ بڑی شاندار کار ہے کب خریدی ؟"

"ایک دوست کی ہے۔ کیا حال ہے تمہارا ؟"

"میں تمہارے بار کی طرف بھی گیا تھا۔ میں سمجھا تم بیمار ہو گئے ہو یا شاید کہیں چلے گئے ہو۔" پھر اس نے پیگی کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔ "ہیلو مس..."

"ہیلو..." پیگی دلربائی سے مسکرائی۔ میں نے ان دونوں کا تعارف کرایا پھر کہا۔

"زکوٹا۔ مجھے تم سے ایک کام ہے۔"

"کیا کام ہے ؟ کہو۔ اگر میرے بس میں ہوا تو ضرور کروں گا۔"

"کیا پولیس فورس میں ولیم فریزر نامی کوئی آدمی ہے ؟"

"بے شمار ہوں گے لیکن کیا تم کسی چکر میں پھنس گئے ہو ؟"

"نہیں دوست بس اس آدمی سے ملنا ہے۔ ایک بہت ہی ضروری کام ہے مگر مہربانی کر کے وہ کام مت پوچھنا۔"

"اوہ نہیں لیکن مجھے ولیم فریزر کے بارے میں اسٹیشن ہاؤس سے معلوم کرنا پڑے گا۔ تم یوں کرو کہ کار بس جلین روڈ تک چلو اور میرا انتظار کرو۔ میں گشت مکمل کر کے واپس آ رہا ہوں۔" پھر وہ پیگی کی طرف مڑا۔ "اچھا مس... پھر ملیں گے۔" پیگی نے اپنا نازک سا ہاتھ لہرایا اور مسکرا دی۔

"شکریہ دوست۔" میں نے کہا اور کار آگے بڑھا دی۔ جلین روڈ دو بلاک دور تھا۔ میں نے پولیس اسٹیشن سے ذرا فاصلے پر کار روک دی اور زکوٹا کا انتظار کرنے لگا۔ "بڑا اچھا پولیس مین ہے۔" پیگی بولی۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "نہ جانے آرٹی کہاں ہو گا ؟" اس نے پھر کہا۔ وہ بے حد فکرمند تھی۔

"ہاں اور میں مس ایلیتھی کی طرف سے بھی متفکر ہوں۔"

"اس سے تو پیچھا چھوٹ جانا ہی اچھا ہے ورنہ وہ اور پریشانیاں پیدا کر دے گی۔" میں خاموش رہا تو ذرا دیر بعد وہ پھر بولی۔ "زکوٹا سے ملنے کے بعد میرا خیال ہے کہ ہم کہیں چل کر آرام کریں۔ میں بہت تھک گئی ہوں باقی کام ہم صبح کر لیں گے۔"

"لیکن چلیں گے کہاں ؟"

"آرٹی کے فلیٹ میں۔ میرے پاس اس کی چابی ہے۔"

"لیکن پیگی۔ تم میرے ساتھ مصیبت میں کیوں پڑتی ہو بہتر ہو گا کہ تم اپنے فلیٹ میں جا کر آرام کرو۔"

"احمقانہ باتیں مت کرو۔" پیگی نے ڈانٹا مگر اس کے لہجے میں پیار تھا۔ "میں تمہارے ساتھ ہی رہوں گی ورنہ خدا جانے تم کیا کر بیٹھو اب تک میں تمہارے لیے کارآمد ثابت نہیں ہوئی ؟" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "بس تو پھر... ہم ساتھ رہیں گے۔ میں تمہاری ہدایات پر عمل کروں گی اور تمہیں مناسب مشورے بھی دیتی رہوں گی۔" وہ محبت بھری نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے بھرپور نگاہوں سے اس کا جائزہ لیا۔ بلاشبہ وہ بے حد حسین لڑکی تھی مگر وہ میرے دوست آرٹی کی محبوبہ تھی اور میں دوستی میں غداری کا قائل نہیں تھا۔ میں نے نگاہیں جھکا لیں۔ پھر پولیس اسٹیشن کی طرف دیکھنے لگا۔ مجھے زکوٹا نظر آ گیا۔ وہ اندر جا رہا تھا۔ اسے واپس آنے میں دیر نہیں لگی۔

"ہے زکوٹا۔" میں نے دھیرے سے پکارا۔ وہ کار کے قریب آ گیا۔ "کچھ معلوم ہوا ؟"

"ہاں۔ لیکن شاید یہ مطلوبہ آدمی نہ ہو۔" زکوٹا نے کہا۔ "بہرحال ایک ولیم فریزر۔ ماب اینڈ ایکٹ اسکواڈ کا ڈپٹی چیف انسپکٹر ہے اور اس کی ڈیوٹی کوئنز والے ہیڈ کوارٹرز میں ہے۔"

"بہت بہت شکریہ دوست۔ شاید یہی ولیم ہے جس سے میں ملنا چاہتا ہوں۔ خدا حافظ۔" میں نے کہا اور انجن اسٹارٹ کر دیا۔

"خدا حافظ۔" وہ بولا پھر پیگی کی طرف دیکھ کر بولا۔ "خدا حافظ مس۔ شاید پھر کبھی ملاقات ہو۔"

"یقیناً..." پیگی بولی اور ہنس پڑی۔ میں نے کار آگے بڑھا دی۔

آرٹی کے فلیٹ کے سامنے وہی سیاہ سیڈان کھڑی تھی جس میں میری موت کے ہرکارے گھوم رہے تھے۔ میں اپنی کار کو سیدھی نکال لے گیا۔

"ہے چارلی..." پیگی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "پارکنگ اس طرف ہے۔"

"نہیں پیگی۔ وہ قاتل کھڑے ہیں سیاہ سیڈان میں ٹراسک اور ڈیوڈ۔"

"یہ لوگ یہاں تک کیسے پہنچ گئے؟"

"میرے چچا البرٹ کی وجہ سے۔" کچھ دُور جاکر کار میں نے ایک سائڈ میں روکی اور مُڑ کر دیکھا۔ کار میں صرف ایک آدمی بیٹھا ہُوا تھا۔ نہ جانے ٹراسک یا ڈیوڈ۔ "اب کیا کریں؟ کیا اس عمارت کا عقبی دروازہ ہے؟"

"مجھے علم نہیں ہے۔" پیگی پُرتشویش لہجے میں بولی۔ "چھت کے بارے میں کیا خیال ہے؟ ہم اس برابر والی عمارت کی چھت کے ذریعے آرٹی والی عمارت کی چھت پر چلتے ہیں۔ پھر آرٹی کے فلیٹ میں پہنچ جائیں گے۔"

"خطرناک بات ہے۔ تمھارے فلیٹ میں نہ چلیں۔"

"نہیں۔ میں تنہا نہیں رہتی۔ میرے ساتھ دو لڑکیاں اور ہیں جو آدھی رات کے وقت تمھیں ساتھ دیکھ کر طوفان کھڑا کردیں گی۔"

"کسی ہوٹل میں چلیں؟"

"مشکل ہے۔ ایک تو ہمیں دو کمرے لینے پڑیں گے۔ دُوسرے نہ تمھاری جیب میں اتنے پیسے ہیں اور نہ میری جیب میں۔ تیسرے یہ کہ اس طرح ہم آرٹی سے نہیں مل سکیں گے۔ یا تو وہ اسی وقت اپنے فلیٹ میں ہوگا یا شاید رات ہی میں کسی وقت آجائے۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ پھر کیا کریں؟"

"ایک ترکیب آئی ہے ذہن میں۔ ان دونوں آدمیوں نے مجھے گروس کے مکان میں نہیں دیکھا ہے۔ وہ مس الیتھی سے واقف ہیں اس لیے مجھے الیتھی بھی نہیں سمجھیں گے۔ گویا میں ان کے لیے اجنبی ہُوں۔ میں وہاں جاکر اسے اُلجھانے کی کوشش کرتی ہُوں۔ تم نظر بچاکر عمارت میں گھُس جانا۔ یہ لو چابی۔ پھر فلیٹ میں میرا انتظار کرنا۔ میں جلد ہی آجاؤں گی۔"

پیگی نے چابی مجھے دی اور ہم کار سے باہر آگئے۔ تاریکی کا سہارا لیتے ہُوئے ہم آرٹی والی عمارت کی طرف بڑھے۔ پھر میں اُس کے کونے پر رُک گیا اور پیگی شرابی کی طرح لڑکھڑاتی اور گیت گاتی سیاہ سیڈان کی طرف بڑھی۔ قریب پہنچ کر اس نے اپنا سوئیٹر اتارا اور کار کا ہڈ صاف کرنے لگی۔ وہ صرف برا پہنے ہُوئے تھی۔ میرا ذہن اس میں اُلجھ کر رہ گیا۔ "اب میں یہاں آرام کروں گی۔" میں نے پیگی کی آواز سُنی۔

"اے... بھاگو یہاں سے..." کار کے اندر بیٹھا ہُوا آدمی چلّایا۔ مگر پیگی نے اس پر کوئی توجہ نہ دی اور ہڈ پر چڑھنے لگی۔ آدمی دروازہ کھول کر باہر نکل آیا اور پیگی کو ڈانٹنے لگا۔ پیگی نے مغلظات بکنی شروع کردیں۔ اس کی اداکاری لاجواب تھی۔ دونوں ایک دُوسرے کو گالیاں بک رہے تھے۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور دوڑتا ہُوا عمارت میں گھُس گیا۔ ذرا ہی دیر بعد آرٹی کے فلیٹ میں تھا۔ پُورا فلیٹ تاریکی میں ڈُوبا ہُوا تھا۔ میں نے بھی بتی نہیں جلائی اور کھڑکی میں آکھڑا ہُوا۔ باہر ابھی تک پیگی اس آدمی سے جو ٹراسک ہی تھا، جھگڑ رہی تھی۔ پھر اس نے اپنا سوئیٹر اُٹھالیا گویا اس نے ہار مان لی۔ ٹراسک دوبارہ کار میں جاکر بیٹھ گیا اور پیگی عمارت کی طرف آنے لگی۔

"خواب گاہ میں چلو۔" وہ اندر آکر بولی۔ "وہ جگہ محفوظ ہے۔ ہم وہاں روشنی کرسکتے ہیں۔"

اس نے دروازہ مقفل کیا اور ہم خواب گاہ میں آگئے۔ پیگی نے بٹن دباکر روشنی کردی۔ میں نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ اس نے اپنا سوئیٹر پہن لیا تھا۔ "کیا خیال ہے؟" وہ میری آنکھوں میں جھانکتی ہُوئی بولی۔ میرے جسم میں سنسنی دوڑنے لگی۔

"تم خواب گاہ میں سوجاؤ۔" میں نے نظریں چُراتے ہُوئے کہا۔ "میں لونگ رُوم میں چلا جاتا ہُوں۔"

"نہیں..." اس کی پیشانی پر بل پڑگئے۔ "بیچارے بے بی، تم خواب گاہ میں سوجاؤ۔ میں لونگ رُوم میں چلی جاتی ہوں۔"

وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ "شب بخیر..." میں نے بند دروازے سے کہا اور بستر پر گر گیا۔ اس رات تھکا ہُوا ہونے کے باوجود مجھے بڑی دیر بعد نیند آئی۔

صبح آنکھ کھُلی تو فلیٹ میں تلے ہُوئے انڈوں کی اشتہا انگیز خوشبو رچی ہُوئی تھی۔ میں نے اُٹھ کر مُنہ ہاتھ دھویا اور باورچی خانے میں آگیا۔

"انڈے کھاؤ گے؟" پیگی نے غیر جذباتی آواز میں پُوچھا۔ میں جان گیا کہ رات کا خمار تھا لیکن میں اسے ہَوا دینا نہیں چاہتا تھا۔

"نہیں، صرف کافی..." میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ پیگی نے کافی کا کپ میرے سامنے رکھ دیا۔ "اب تمھیں کوئنز کے ہیڈ کوارٹر جانا ہے اور..."

"اور کیا؟"

"اور میں اپنے فلیٹ جاؤں گی۔ مجھے اپنی ڈاک دیکھنی ہے اور پھر کام پر جانا ہے۔" وہ یُوں بے تعلق ہو رہی تھی جیسے میں ایک اجنبی تھا لیکن اس کے لہجے میں ایک حسرت بھی تھی۔ میرا دِل دُکھنے لگا۔

"پیگی..." میں نے پیار سے کہا لیکن وہ نظریں جُھکائے ناشتہ کرتی رہی۔ "تم آرٹی کی ساتھی اور آرٹی میرا دوست ہے۔ میں شرمندہ ہُوں کہ..."

"میں آرٹی کی بیوی نہیں ہُوں۔ نہ ہمارے درمیان کوئی عہد و پیمان ہُوئے ہیں۔ اس سے اتفاقاً ملاقات ہُوئی تھی۔ پھر دوستی ہوگئی۔ میں اسے اچھا آدمی سمجھی تھی لیکن وہ تلوّن مزاج ہے۔ وہ کسی کے ساتھ زیادہ دن تک نباہ نہیں کرسکتا۔" وہ سر جُھکائے بولے جارہی تھی۔ "میں... مجھے یہ زندگی پسند نہیں ہے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں ایک بیس سالہ لڑکے کے ساتھ میں نے گھر چھوڑ دیا تھا۔ ہماری شادی ہوگئی تھی۔ میں نے بہت سپنے دیکھے تھے لیکن وہ مجھے چھوڑ کر بھاگ گیا۔ میں نے عدالت سے طلاق لے لی۔ چار سال میں نے آوارہ گردی میں گزار دیے۔ ایک آدمی کی تلاش میں۔ میں کئی آوارہ گردوں سے ملی۔ آرٹی ایک سال سے میرا دوست ہے مگر یہ میرے مطلب کا آدمی نہیں ہے۔ میں..."

وہ چپ ہوگئی اور میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پر اداسیاں بکھری ہُوئی تھیں۔ "تمھیں دیر ہو رہی ہے۔ تمھیں ولیم سے ملنا ہے۔ ہوشیار رہنا۔ یہ بڑے خطرناک لوگ ہیں۔" وہ اُٹھ کھڑی ہُوئی اور سنک پر جاکر برتن دھونے لگی۔ میں نے کافی ختم کی اور کپ لے کر اس کے قریب جاکھڑا ہُوا۔ "تم اچھے آدمی ہو..." وہ بڑبڑائی۔ "مگر..." وہ پھر چپ ہوگئی۔

"پیگی۔ اس پریشانی سے نجات پاتے ہی میں تم سے ملوں گا۔" میں نے کہا۔ "یہیں آرٹی کے فلیٹ میں۔ پھر ہم باتیں کریں گے۔" میں نے کپ سنک پر رکھ دیا۔ "اب میں جاتا ہُوں۔ میں پچھلی سیڑھیوں سے نکل جاؤں گا۔"

"نہیں، ٹراسک جاچکا ہے۔ تم کار لے جاؤ۔ میں... میں تمھارا انتظار کروں گی۔"

میں نے ایک نظر اس پر ڈالی اور باہر آگیا۔ واقعی سیاہ سیڈان جاچکی تھی۔ میں ایک بلاک دُور کھڑی کار میں بیٹھا اور اسے سڑک پر ڈال دیا۔

ایک گھنٹے تک میں ادھر اُدھر گھومتا رہا پھر گرانڈ سنٹرل کے ایک ریستوراں میں گھُس گیا اور ناشتہ کرنے لگا۔ بل ادا کرکے میں نے فون بک میں ولیم فریزر کے گھر کا پتہ دیکھا۔ وہ مین ہٹن میں رہتا تھا۔ میں نے اسے فون کیا تو دوسری طرف سے ایک عورت نے بتایا کہ وہ گھر پر نہیں ہے۔

تین بجے تک میں اس کے گھر کے چکر لگاتا رہا۔ آخر مایوس ہو کر کوئنز کی طرف روانہ ہوگیا۔ میں سمجھ گیا کہ چھ بجے سے پہلے وہ اپنے دفتر سے نہیں اُٹھ سکتا... کوئنز کے ہیڈ کوارٹر کی پانچ منزلہ عمارت کے سامنے میں نے کار روکی اور اپنی ہمّت کو مجتمع کرکے اندر گھُس گیا۔

"کیا بات ہے؟" ہال میں بیٹھے ہوئے ایک سارجنٹ نے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"میں ڈپٹی چیف انسپکٹر ولیم فریزر سے ملنا چاہتا ہُوں۔" میں نے کہا۔ "میرا نام چارلی پول ہے۔"

"ذرا دیر انتظار کرو۔" وہ بولا اور ڈیسک سے اُٹھ کر اندر چلا گیا۔

ذرا ہی دیر بعد وہ ہال میں آیا اور بولا۔ "مسٹر چارلی۔ میرے ساتھ آؤ۔" میں اس کے ساتھ کئی کمروں اور راہداریوں سے گزر کر سیڑھیوں کے ذریعے تیسری منزل پر آگیا۔ یہاں ایک دروازے پر ولیم فریزر کے نام کی تختی لگی ہُوئی تھی۔ "اندر چلے جاؤ۔" سارجنٹ نے کہا اور میں دھڑکتے دل سے دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

"آؤ۔ بھتیجے۔ کیا حال ہیں؟" کسی چابک کی طرح یہ الفاظ میری سماعت سے ٹکرائے۔ میں اُچھل پڑا۔ میرے سامنے ٹراسک اور ڈیوڈ کھڑے ہُوئے تھے۔ اُن کے ہونٹوں پر مضحکہ خیز مسکراہٹ پھیلی ہُوئی تھی۔ میز کے پیچھے ایک کرسی پر ولیم فریزر بیٹھا ہُوا میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔

"میں تم سے بات کرنے آیا ہُوں مسٹر ولیم۔" میں نے انھیں نظر انداز کرکے ولیم کو مخاطب کیا۔

"تو تم نے ابھی تک ہمّت نہیں ہاری بھتیجے۔ شاباش ہے تم پر..." ڈیوڈ بولا۔

"اسے لے جاؤ..." ولیم نے ہاتھ لہرا کر کہا۔ "یہ آدمی خطرناک ہے۔ اس کی زبان بند کردو۔"

"ہم اپنے کام کو اچھی طرح سمجھتے ہیں مسٹر ولیم۔ تم پروا مت کرو۔"

یوگا
جسمانی موزونیت، پرکشش شخصیت، مقناطیسی جسم
آؤ
حسن و صحت کیلئے
اُردو زبان میں پہلی بار
آسان مشقیں، باتصویر کتاب
مصنف نجم ...
احباب ادب
پوسٹ بکس نمبر ۲۱۴۷ کراچی ۱۸

"لیکن۔ میں تم سے بات کرنے آیا ہوں مسٹر ولیم..." میں نے احتجاج کیا اور اس کی میز کی طرف بڑھا۔

"رک جاؤ بھتیجے اور اپنے ہاتھ اُٹھا لو۔" ٹراسک نے پستول نکال کر میرے سر کا نشانہ لے لیا۔ میں نے ہاتھ سر سے بلند کر دیے۔ اس نے میری جیب میں پڑا ہوا پستول نکال لیا۔

"میری بات سنو مسٹر ولیم۔ ورنہ حالات تمھارے لیے بھی خطرناک ہو سکتے ہیں۔"

"بکواس بند کرو۔" ڈیوڈ غرایا مگر میرے الفاظ ولیم پر اثر کر چکے تھے۔ اس کا منہ اُتر گیا تھا اور وہ پریشان نظروں سے میری صورت تک رہا تھا۔ پھر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

"کیا مطلب ہے تمھارا؟" وہ بولا۔ "حالات میرے لیے کس طرح خطرناک ہو سکتے ہیں؟"

"اس طرح مسٹر ولیم..." ڈیوڈ بولا۔ "کہ یہ تمھیں قتل کرنے آیا تھا۔ اس نے ایگری کولا کو مار دیا ہے اور مسٹر گروس کو بھی قتل کرنے کی کوشش کر چکا ہے۔"

"یہ جھوٹ ہے انسپکٹر..." میں نے تیزی سے کہا۔ "میں تمھارے گھر کا پتہ جانتا ہوں۔ اگر قتل کرنے کا ارادہ ہوتا تو میں تمھارے دفتر میں ہرگز نہ آتا۔"

"میں نے کہا نا کہ اپنی زبان بند رکھو۔" ڈیوڈ میرے سینے میں انگلی گاڑتا ہوا بولا۔

"ٹھہرو... اسے بولنے دو۔" ولیم نے کہا۔ وہ خاصا نروس ہو رہا تھا۔

"ان لوگوں کا خیال ہے کہ میں پولیس انفارمر ہوں اور یہ سمجھتے ہیں کہ میں نے ہی ایگری کولا کو قتل کیا ہے جبکہ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ یہ کام کسی اور آدمی کے ہیں۔ اگر ان الزامات کی وجہ سے مجھے قتل بھی کر دیا گیا تو اصل مجرم آزاد رہے گا اور ممکن ہے مسٹر ولیم اس کا اگلا نشانہ تم ہی بن جاؤ۔"

"بہت خوب بھتیجے۔ پھر اس پستول کا کیا جواز ہے؟" ٹراسک نے میرا پستول سامنے کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہ میں اپنی حفاظت کے لیے لایا تھا۔" میں نے کہا۔ "تم لوگ میرے قتل کے درپے ہو رہے ہو۔"

"تمھاری صرف ایک بات میرے دل کو لگ رہی ہے۔" ولیم نے کہا۔ "کہ میرے گھر کا علم ہونے کے باوجود تم یہاں آئے ہو۔"

"بس اسی سے ساری باتیں سمجھ لو مسٹر ولیم۔" میں نے کہا۔ میں نے جلدی سے کہا۔ "میں نے کبھی کسی کی مخبری نہیں کی۔ مسٹر ایگری کولا اور مسٹر گروس کے پاس بھی میں صرف یہی بات کہنے گیا تھا کہ میں بے گناہ ہوں اور سنڈیکیٹ خواہ مخواہ میرے پیچھے پڑ گئی ہے۔ مسٹر گروس نے کہا کہ میں پولیس انفارمر ہوں۔ اُنھوں نے ہی مجھے تمھارا نام بتایا تھا۔ اب میں آپ سے یہ پوچھنے آیا ہوں کہ میں نے سنڈیکیٹ کے خلاف کس کو اطلاعات دی تھیں!"

"ماب اینڈ ریکٹ اسکواڈ کے لیفٹیننٹ ٹونی کو..." ولیم نے بتایا۔ "اس نے مجھے کہا تھا کہ یہ اطلاعات سنڈیکیٹ کا بار چلانے والے لڑکے نے دی ہیں۔"

"وہ جھوٹ بولتا ہے۔" میں چلا اُٹھا۔ "میں یہ نام پہلی بار سُن رہا ہوں۔ میں نے آج تک ٹونی کی صورت بھی نہیں دیکھی ہے۔"

"وہ میرا نائب ہے مسٹر چارلی۔ اس نے آج تک کبھی جھوٹی رپورٹ نہیں دی۔ وہ بے حد ایمان دار آفیسر ہے۔"

"میں نہیں مان سکتا انسپکٹر۔ یا تو ٹونی نے تم سے جھوٹ بولا ہے یا تم نے مسٹر گروس کو غلط اطلاع دی ہے۔"

"میں نے؟ میں کیوں جھوٹ بولوں گا؟"

"شاید تمھاری کسی غلطی کی وجہ سے سنڈیکیٹ کی باتیں کسی غلط آدمی تک پہنچ گئی ہیں اور اب تم اپنا الزام میرے سر تھوپنے کی کوشش کر رہے ہو۔"

میں نے التجا آمیز نگاہوں سے ٹراسک کی طرف دیکھا۔ "تم مسٹر گروس سے بات کر لو۔ اُنھیں ان حالات سے آگاہ کر دو اور یہ بھی کہہ دو کہ رات کو میرے ساتھ جو لڑکی تھی وہ مس ایلیتھی نہیں تھی۔ میرا اس سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔" سب حیرت سے میری شکل دیکھ رہے تھے۔ میں بغیر سانس لیے بولتا چلا گیا۔ "یہ کوئی اور ہے جو میرے خلاف سازش کر رہا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ مسٹر ولیم ہی ہو۔ شاید پولیس کو اس پر شک ہو گیا ہے کہ وہ سنڈیکیٹ کے ہاتھ بک چکا ہے اور اب یہ محض اپنی صفائی کے لیے میرا نام لے رہا ہے۔"

"کیا خیال ہے مسٹر ولیم؟" ٹراسک نے سر ہلاتے ہوئے ولیم سے پوچھا۔

"محض بکواس۔ یہ شخص اپنے جرم پر پردہ ڈالنا چاہتا ہے۔"

"ہم ابھی چیک کر لیتے ہیں۔" ٹراسک بولا۔ "کیا لیفٹیننٹ ٹونی اس وقت دفتر میں ہے؟"

"شاید ہو۔"

"ٹھیک ہے، ہم دونوں چھپ جاتے ہیں تم اسے بلا لو۔ یہ کہتا ہے کہ ٹونی نے اس کو آج تک نہیں دیکھا۔ اگر ٹونی اسے پہچان لیتا ہے تو پھر بات صاف ہو جائے گی کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے اور واقعی یہی انفارمر ہے اور ایگری کولا کا قاتل بھی ہے۔"

"ضرور بلاؤ..." میں نے پُرجوش آواز میں کہا۔ "مجھے یقین تھا کہ ٹونی مجھے ہرگز نہیں پہچان سکے گا کیونکہ واقعی آج تک میں نے اس کی صورت بھی نہیں دیکھی تھی۔"

ولیم نے فون اُٹھایا اور کسی سے باتیں کرنے لگا۔ ٹونی دفتر میں ہی تھا۔ اُس نے ریسیور رکھ دیا۔ "وہ ابھی آ رہا ہے۔" ولیم نے کہا۔

"بھتیجے۔ ٹونی کی اور اپنی خیریت چاہتے ہو تو اس سے زیادہ باتیں مت کرنا۔" ڈیوڈ نے آنکھیں نکال کر گھُرکی دی پھر دونوں آدمی سامنے والے دروازے کے پردے کے عقب میں جا چھپے۔

"کیا بات ہے انسپکٹر..." ایک دراز قامت نوجوان اندر آتا ہوا بولا۔ اس کے ہونٹوں پر دلکش مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

"یہ شخص تم سے ملنا چاہتا ہے۔" انسپکٹر ولیم نے میری طرف اشارہ کر کے کہا۔ ٹونی میری طرف مُڑا اور ہنس دیا۔

"اوہ چارلی ڈیئر۔" وہ کھِل اُٹھا اور میرا دم نکل کر رہ گیا۔ "اس بار تم سیدھے باس کے پاس آ گئے؟ یقیناً کوئی اہم بات بتلانے آئے ہو گے۔" میں گنگ کھڑا اس کی صورت دیکھتا رہا۔ میں نے بولنے کی کوشش کی مگر حلق سے آواز نہیں نکل سکی۔

"ٹھیک ہے چارلی۔" ٹونی خوش دلی سے بولا۔ "تم ہمارے لیے بے حد کارآمد ثابت ہوئے ہو۔ میں اجازت چاہوں گا جناب۔" وہ ہم سے بولا۔ "مجھے ایک دو ضروری کام کرنے ہیں۔" ولیم نے سر ہلایا اور ٹونی مجھے موت کے منہ میں دھکیل کر رخصت ہو گیا۔ دونوں آدمی پردے کے پیچھے سے نکل آئے۔

"اب کیا کہتے ہو بھتیجے؟" ڈیوڈ حقارت سے بولا۔

میں کیا کہہ سکتا تھا۔ دونوں نے میرے دونوں بازو پکڑ لیے۔ ولیم نے پھر فون اُٹھا کر کان سے لگایا اور کسی سے بولا۔ "اب کیا حال ہے؟ اچھا.. ٹھیک ہے۔ خیال رکھنا۔" اس نے ریسیور رکھ دیا۔ "راستہ صاف ہے عقبی دروازے سے نکل جاؤ۔" اس نے بدمعاشوں سے کہا اور وہ مجھے لیے پچھلے دروازے کی طرف بڑھے۔

ذرا ہی دیر بعد میں سیاہ سیڈان کی پچھلی نشست کے خلا میں پڑا ہوا تھا۔ ڈیوڈ نے میرے اوپر کمبل ڈال دیا تھا۔ "اگر ذرا بھی گڑبڑ کی تو بھتیجے تو بس سمجھ لو کہ وہی تمھاری زندگی کا آخری لمحہ ہو گا۔"

میں بے حس و حرکت پڑا رہا اور کار چلتی رہی۔ ایک گھنٹہ گزر گیا۔ میرے ذہن میں کھچڑی سی پک رہی تھی۔ بار بار یہی سوالات ذہن میں چکرا رہے تھے کہ ایگری کولا کو کس نے قتل کیا؟ کیسے قتل کیا؟ پولیس انفارمر کون ہے اور لیفٹیننٹ ٹونی نے اسے کیسے پہچان لیا؟

ٹراسک اور ڈیوڈ بھی ایگری کولا کے قاتل ہو سکتے تھے۔ مجھ سے پہلے وہ اس سے ملنے گئے تھے۔ ایگری کولا ان کو نیچے تک چھوڑنے آیا تھا۔ پھر جون سے بات کر کے دوبارہ اُوپر چلا گیا تھا۔ ممکن ہے۔ اس وقت ٹراسک اور ڈیوڈ چپکے سے اُوپر گیا ہو اور اسے قتل کر کے آ گیا ہو۔ مگر نہیں۔ ان دونوں میں سے کوئی بھی ایگری کولا کا قاتل نہیں تھا۔ اس بات کا مجھے یقین تھا۔ پھر کون ہے؟

اچانک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور میں جوش کے مارے اُٹھ بیٹھا۔ کمبل پھسل کر نیچے گر گیا۔ "سنو۔ تمھارے ساتھ کون تھا؟..." میں چلایا۔ ٹراسک نے مُڑ کر دیکھا۔

"لیٹ جاؤ بھتیجے..." وہ غرایا۔

"نہیں پہلے مجھے بتاؤ۔ جب ڈیوڈ ایگری کولا سے ملنے گیا تھا تو تم اس کے ساتھ نہیں تھے۔ تم اس وقت آرنی کے گھر کی نگرانی کر رہے تھے۔ پھر ڈیوڈ کے ساتھ کون تھا؟"

"کوئی بھی تھا۔ تمھیں اس سے مطلب؟ لیٹ جاؤ ورنہ بھیجہ توڑ دوں گا۔" اس نے پستول نکال لیا اور میں مجبوراً دوبارہ لیٹ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ قاتل وہی شخص تھا جو ڈیوڈ کے ساتھ ایگری کولا سے ملنے گیا تھا۔ وہ کسی بہانے سے دوبارہ اُوپر گیا تھا اور چاقو سے ایگری کولا کا کام تمام کر آیا تھا۔ مگر کون؟ کون؟ اور پھر میرے ذہن میں تصویریں واضح ہونے لگیں۔ میں قاتل کو پہچان چکا تھا۔

کار رُک گئی۔ اس کا اگلا دروازہ کھلا پھر پچھلا بھی کھل گیا۔ "آجاؤ بھتیجے۔" ٹراسک کہہ رہا تھا۔ "باہر آجاؤ۔ ہم تھوڑی سی چہل قدمی کریں گے۔" میں کمبل پھینک کر کار سے باہر آ گیا۔

"میں نے قاتل کو پہچان لیا ہے مسٹر ٹراسک۔" میں چلایا۔ "وہ... وہ..."

"رہنے دو بھتیجے۔ اپنے ننھے سے ذہن کو تکلیف مت دو۔ خاموشی سے ہمارے ساتھ چلو۔"

ہم لانگ آئی لینڈ کے جنگل میں کھڑے تھے۔ اُنھوں نے مجھے آگے کیا اور پھر ہم جنگل میں اُترنے لگے۔

جنگل کے کنارے پر آ کر اُنھوں نے مجھے رُکنے کا حکم دیا۔ نیچے ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا۔ میں نے ان کے تیور پہچان لیے۔ وہ مجھے قتل کر کے لاش کو سمندر میں بہانا چاہتے تھے۔ دونوں آدمی پستول نکال کر مجھ سے چند قدم دُور کھڑے ہو گئے۔

"سنو... رُکو۔ خُدا کے لیے میری بات سنو۔ میں قاتل نہیں ہوں۔ قاتل... جو... میں مسلسل بولتا رہا۔ ان کی اُنگلیاں ٹریگر پر جم گئیں۔ ڈیوڈ سے زیادہ ٹراسک میری باتوں پر توجہ دے رہا تھا۔

"چھوڑو یار۔ دیر ہو رہی ہے۔" ڈیوڈ بے زاری سے بولا۔

"نہیں سنو۔ یہ کیا کہہ رہا ہے۔"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔ مسٹر گروس سے میری بات کرا دو۔ اگر وہ نہ مانیں تو بلاشبہ تم مجھے گولی مار دینا۔ میں ذرا احتجاج نہیں کروں گا۔ لیکن پہلے خدا کے لیے... مسٹر گروس سے تم ہی بات کر لو۔ انھیں یہ باتیں بتا دو۔ یقیناً وہ سب کچھ سمجھ جائیں گے۔"

"آؤ... " ٹراسک نے کہا اور میری جان میں جان آئی۔ ڈیوڈ نے بُرا سا منہ بنایا لیکن کچھ نہیں کیا۔ ہم تینوں سیاہ سیڈان کے قریب آگئے۔

پھر پہلی بار مجھے پتہ چلا کہ اس میں پورٹیبل ٹیلی فون بھی تھا۔ ٹراسک نے فون اُٹھا کر مسٹر گروس کے نمبر ملائے۔ پھر ان سے ایک دو باتیں کر کے ریسیور میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے وہی ساری باتیں دُہرا دیں جو ٹراسک اور ڈیوڈ کو بتا چکا تھا۔ مسٹر گروس ہنکارا بھرتے رہے۔ میں نے اپنی بات ختم کی تو وہ بولے۔ "ریسیور ٹراسک کو دے دو۔"

میں نے ریسیور ٹراسک کو تھما دیا۔ "یس سر..." وہ بولا۔ پھر خاموشی سے سنتا رہا۔ "بہتر جناب۔" اُس نے کہا اور ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ "آؤ چلیں۔ مسٹر گروس نے تمھیں بلایا ہے۔"

اس بار میں فرنٹ سیٹ پر ان کے درمیان بیٹھا ہوا تھا اور دل ہی دل میں دُعائیں مانگ رہا تھا کہ میں اُنھیں قائل کرنے میں پُوری طرح کامیاب ہو جاؤں۔

مسٹر گروس کے کمرے میں ان کے علاوہ میرے چچا البرٹ، انسپکٹر ولیم، ایگری کولا کا باڈی گارڈ جون اور دو خوفناک صورت والے بدمعاش بھی موجود تھے۔

"آؤ مسٹر چارلی..." مسٹر گروس مجھے دیکھتے ہی بولے۔ "بیٹھو..." اُنھوں نے ایک خالی کُرسی کی طرف اشارہ کیا۔ "آرام سے بیٹھو۔ ہم سب تمھارا انتظار کر رہے تھے۔" میں کُرسی پر بیٹھ گیا لیکن آرام کے بجائے میں سخت بے چینی محسوس کر رہا تھا کیونکہ کمرے میں موجود سارے ہی آدمیوں کی آنکھیں مجھ پر گڑی ہُوئی تھیں۔ "میں نے ان لوگوں کو بھی بُلا لیا ہے۔" وہ بولے۔ "تاکہ یہ سب بھی تمھارا بیان سُن لیں۔"

"یہ ایک خطرناک اقدام ہے گروس۔" انسپکٹر ولیم بولا۔ "مجھے یہاں نہیں بُلانا چاہیے تھا۔ اس طرح میں تمھارے لیے کارآمد نہیں رہ سکوں گا۔"

"بیٹھے رہو ولیم۔" مسٹر گروس نے اپنا پھولا ہوا ہاتھ اُٹھا کر کہا۔ "خاموش بیٹھو اور سُنو کہ یہ لڑکا کیا کہتا ہے۔ ہاں شروع ہو جاؤ۔ مسٹر چارلی۔ وہ ساری باتیں دُہراؤ جو تم نے مجھ سے کہی تھیں۔"

"ہاں جناب..." میں نے بے چینی سے پہلو بدل کر کہا۔ "اب تک دو واقعات ہُوئے ہیں اور دونوں ہی کے لیے مجھ پر شک کیا جا رہا ہے۔ ایک یہ کہ لیفٹیننٹ ٹونی کو کسی نے سنڈیکیٹ کی باتیں بتائی ہیں اور دُوسری یہ کہ ایگری کولا کو قتل کر دیا گیا ہے۔ آپ کا خیال سچ ہے جناب کہ یہ دونوں کام ایک ہی آدمی کے ہیں۔" پھر میں انسپکٹر ولیم کی طرف مُڑا۔ "تمھیں ٹونی نے کہا تھا کہ اسے سنڈیکیٹ کے بارٹینڈر سے یہ معلومات حاصل ہُوئی ہیں۔ ہے نا؟" ولیم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اُس کی پیشانی پر لکیروں کا جال پھیلا ہُوا تھا جو اس کی ذہنی اُلجھن کا غماز تھا۔ "تم نے اس سے ایک سوال کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "اور ٹونی نے تمھیں جواب دے دیا لیکن تم اس کی بات کو سمجھ نہیں سکے۔ اس نے یہ نہیں کہا تھا کہ بارٹینڈر نے یعنی میں نے خود اسے یہ معلومات فراہم کی تھیں۔ اس کا مطلب صرف اتنا تھا کہ جس کسی نے بھی اسے یہ معلومات فراہم کی تھیں، اس نے یہ باتیں بارٹینڈر سے معلوم کی تھیں۔"

"گویا تم درمیانی آدمی کے طور پر کام کر رہے تھے؟" انسپکٹر نے سوال کیا۔

"نہیں۔ ایسا بھی نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "میں نے آج تک یہ باتیں ایک آدمی کے سوا کسی سے بھی نہیں کیں اور اس آدمی کے بارے میں بھی مجھے یقین تھا کہ وہ سنڈیکیٹ کا رکن ہے اور قابلِ اعتماد آدمی ہے۔"

چچا البرٹ اپنی جگہ سے اُچھل پڑے۔ "بکواس بند کرو۔"

"بیٹھ جاؤ البرٹ..." مسٹر گروس نے حکم دیا۔ "خاموشی سے اس کی باتیں سُنو۔ پھر جو چاہو کہہ لینا۔"

"لیکن یہ بکواس کر رہا ہے۔" چچا البرٹ چلائے۔ "میں کہتا ہوں کہ..."

مسٹر گروس نے دونوں بدمعاشوں کو اشارہ کیا۔ وہ چچا البرٹ کے قریب آئے اور اُنھیں شانوں سے پکڑ کر کُرسی پر دبا دیا۔ چچا البرٹ کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ وہ سر جُھکا کر بیٹھ گئے لیکن ان کا بدن لرز رہا تھا۔

"ٹونی نے کسی جُرم میں چچا البرٹ کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔" میں مسٹر گروس کا اشارہ پا کر پھر شروع ہو گیا۔ "اس نے انھیں جیل میں بند کرنے کے بجائے اس وعدے پر آزاد کر دیا کہ وہ اسے سنڈیکیٹ کی خبریں دیتے رہیں گے۔ چچا البرٹ اس بات پر راضی ہو گئے۔ مجھے جب کبھی وقت ملتا، میں چچا البرٹ کے گھر چلا جایا کرتا تھا اور یہ مجھ سے بار کے بارے میں مختلف سوالات کیا کرتے تھے۔ اس دوران میں وہ یہ بھی پُوچھ لیتے کہ میرے پاس کتنے پیکٹ آئے ہیں، کس کس کو دیے ہیں وغیرہ۔ مجھے علم تھا کہ چچا خود اس تنظیم کے رُکن ہیں۔ اس لیے میں بلا جھجک انھیں سب کچھ بتا دیا کرتا تھا۔ ان کے علاوہ میں نے کبھی کسی سے اس موضوع پر گفتگو نہیں کی۔"

"یہ محض تمھارا خیال ہے کہ البرٹ پولیس انفارمر ہے۔" انسپکٹر نے خشونت بھرے لہجے میں کہا۔ "البرٹ برسوں سے اس تنظیم کا قابلِ اعتماد رُکن ہے۔ وہ ایسی غلطی ہرگز نہیں کر سکتا۔"

"یہ اسی کا کام ہے انسپکٹر... اور ایگری کولا کا قاتل بھی یہی ہے۔" میں نے چچا کی طرف اشارہ کر کے نفرت سے کہا۔

"تم جھوٹ بولتے ہو۔" ایگری کولا کا باڈی گارڈ جون چلایا۔ "ایگری کولا کا قاتل تمھارے سوا کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔"

"نہیں میں اس کا قاتل نہیں ہوں۔ میں ٹراسک اور ڈیوڈ سے چھپ کر اپنے دوست آرٹی کے فلیٹ میں آ گیا تھا۔ چچا البرٹ کو اس کا علم ہو گیا۔ وہ ان دونوں کے ساتھ آرٹی کے فلیٹ پر آیا مگر میں ایگری کولا سے ملنے کے لیے اسٹیشن آئی لینڈ روانہ ہو چکا تھا۔ انھوں نے ٹراسک کو آرٹی کے فلیٹ کی نگرانی کے لیے وہیں چھوڑ دیا اور خود ایگری کولا کے فارم پر آ گئے۔ کیوں ڈیوڈ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"نہیں..." ڈیوڈ نے اثبات میں سر ہلاتے ہُوئے کہا۔ "میرے ساتھ البرٹ ہی آیا تھا۔"

"پہلے یہ بات میرے ذہن میں صرف اس لیے نہیں آئی کہ میں نے ہمیشہ ٹراسک اور ڈیوڈ کو ساتھ دیکھا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ کسی موقع پر الگ بھی ہو سکتے تھے۔ اس لیے میں نے یہی سمجھا کہ ڈیوڈ کے ساتھ ٹراسک ہی ہو گا مگر بعد میں جب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہُوا تو ساری بات صاف ہو گئی۔ چچا البرٹ، ڈیوڈ کے ساتھ ایگری کولا کے پاس میرے خلاف اس کے کان بھرنے آئے تھے۔ وہ سارا الزام مجھ پر ڈال کر خود صاف نکل جانا چاہتے تھے لیکن گفتگو کے دوران میں ان کے مُنہ سے کوئی ایسی بات نکل گئی جس کی وجہ سے انھیں اپنی جان خطرے میں نظر آنے لگی۔ باہر آ کر اُنھوں نے ڈیوڈ سے کوئی چیز بھول آنے کا بہانہ کیا اور دوبارہ اُوپر جا کر ایگری کولا کو قتل کر دیا۔"

"ہاں۔ یہ اپنی سگریٹ بھول آیا تھا۔" ڈیوڈ نے بتایا۔

"یقیناً..." میں نے کہا۔ "وہ اس بہانے سے اُوپر گئے اور چاقو سے ایگری کولا کو قتل کر دیا۔ مجھے علم نہیں ہے کہ چاقو ان کے پاس کہاں سے آیا تھا۔"

"وہ اسی کمرے میں تھا۔" جون نے کہا۔ "وہ خط کھولنے کا چاقو تھا لیکن اب بھی میں یہی کہوں گا کہ وہ چاقو تم نے استعمال کیا تھا۔"

"کیا تمھیں پتہ ہے کہ البرٹ اُوپر آئے تھے؟" میں نے اس سے سوال کیا۔

"نہیں..." جون بولا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے سے نکل رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنی کوتاہی تسلیم نہیں کر سکتا تھا۔

"وہ دوبارہ اُوپر گیا تھا۔" ڈیوڈ نے میری تائید کی۔ "میں نے خود اسے اُوپر جاتے دیکھا تھا۔"

"لیکن اس نے ایگری کولا کو قتل کیوں کیا؟" انسپکٹر بولا۔ "اسے کیا فائدہ پہنچ سکتا تھا؟"

"یہ بات چچا البرٹ خود بتائیں گے۔" میں نے کہا۔

"سُنو..." ڈیوڈ بولا۔ "تم نے ابھی ایک نام لیا تھا کسی پولیس مین کا..."

"میں نے؟"

"ہاں۔ کسی ٹونی کا... اس نے گفتگو کے دوران یہی نام ایگری کولا کے سامنے لیا تھا پھر اچانک ہی چُپ ہو گیا تھا۔"

میں نے مسٹر گروس کی طرف دیکھا۔ "کیا چچا البرٹ کو معلوم تھا جناب کہ لیفٹیننٹ ٹونی سنڈیکیٹ کے لیے کام کر رہا ہے؟"

"نہیں... ممکن ہے ولیم نے اسے بتایا ہو۔" مسٹر گروس بولے۔

"میں نے؟ ہرگز نہیں۔" ولیم چمک کر بولا۔ "میں اسے زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔"

"تو بات صاف ہو گئی جناب۔" میں نے کہا۔ "چچا البرٹ سے بھول میں ٹونی کا نام نکل گیا پھر اُنھیں فوراً ہی احساس ہو گیا کہ غلطی ہو گئی... ایگری کولا جلد یا بدیر یہ بات معلوم کر سکتا تھا کہ ٹونی اور چچا البرٹ میں کیا تعلق ہے۔ یہ خوف زدہ ہو گئے اور سگریٹ بھول آنے کا بہانہ کر کے اُوپر آئے اور ایگری کولا کو قتل کر دیا۔"

سب لوگ چچا البرٹ کی صُورت دیکھ رہے تھے۔ "البرٹ کی صُورت سے نظر آتا ہے کہ چارلی سچ کہہ رہا ہے۔" انسپکٹر نے کہا۔ "سوائے ایک بات کے۔"

"کیا بات؟"

"آج شام لیفٹیننٹ ٹونی نے تمھیں میرے دفتر میں دیکھتے ہی شناخت کر لیا تھا۔ کیوں؟"

"اس کی صرف ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "کہ وہ تمھیں مشتبہ سمجھتا ہے اور تمھاری تاک میں ہے۔"

"یہ بالکل سچ کہہ رہا ہے۔" دروازے میں سے کسی نے میری تائید کی۔ سب آدمیوں کی گردنیں اس طرف گھوم گئیں۔ وہاں لیفٹیننٹ ٹونی کھڑا ہُوا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں ریوالور دبے ہُوئے تھے۔ پھر کمرے میں پولیس والوں کا سیلاب آ گیا۔

"کھڑے ہو کر ہاتھ اُوپر کر لو... سب لوگ..." وہ گرجا۔ "کھیل ختم

ہو چکا ہے۔"

◆

واپسی میں ٹونی نے مجھے اپنی کار میں بٹھا لیا اور باقی داستان سنائی۔ "ہم کئی ماہ سے تمہارے بار کی نگرانی کر رہے تھے۔ پیٹرول مین زکوٹا گشتی پولیس مین نہیں بلکہ ہمارے محکمے کا سُراغ رساں ہے۔ اس کی ڈیوٹی تھی کہ تمہارے بار اور اس میں آنے جانے والوں پر نظر رکھے۔ اس نے ٹراسک اور ڈیوڈ کو تمہارے پاس دیکھ کر یہی سمجھا تھا کہ وہ پھر کوئی پیکٹ دینے یا لینے آئے ہیں۔ وہ مجھے اطلاع دینے باہر آ گیا لیکن ذرا دیر بعد وہ واپس آیا تو تمہارے بار کا عقبی دروازہ ٹوٹا ہوا تھا اور تم غائب تھے، اس سے ہمیں حالات کی سنگینی کا احساس ہو گیا۔

دوبارہ کینارٹی میں جب تم زکوٹا سے ملے اور ولیم فریزر کے بارے میں پوچھا تو اس نے تمہیں ہیڈ کوارٹر آنے کے لیے کہا اور خود پیدل آنے کا بہانہ بنا دیا۔ اس نے مجھے اطلاع کر دی تھی۔ زکوٹا نے جب مجھے تمہارا نام اور تفصیلات بتائیں تو مجھے یاد آیا کہ انسپکٹر نے مخبری کے سلسلے میں تمہارا ہی نام لیا تھا۔ میں اس وقت چونک اُٹھا تھا۔ پھر میرے ذہن میں واقعات کی کڑیاں ملنے لگیں۔ میں فوراً ہی ہیڈ کوارٹر پہنچ گیا اور اپنے ساتھیوں کو خبردار کر دیا۔ تم نے واقعی جرأت کا مظاہرہ کیا تھا جو سیدھے شیر کی کچھار میں چلے آئے تھے۔ انسپکٹر نے مجھے بُلایا تو میں سمجھ گیا کہ وہ مجھ سے تمہاری شناخت کرانا چاہتا ہے۔ میرا شک یقین میں بدلتا جا رہا تھا۔ میں نے اندر آ کر انسپکٹر کو دھوکا دینے کے لیے فوراً ہی تمہیں شناخت کر لیا حالانکہ وہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔ پھر میں باہر آ گیا اور تمہارے تعاقب کی تیاریاں کرنے لگا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ تمہیں کہاں لے جانا چاہتے ہیں۔"

"تو تم اس وقت قریب قریب ہی تھے جب ٹراسک اور ڈیوڈ مجھے گولی مارنے والے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں... ہم تمہاری کار کا تعاقب نہیں کر سکے تھے۔"

"پھر تم مسٹر گروس کے گھر تک کیسے پہنچے؟"

"انسپکٹر ولیم کا پیچھا کر کے...!"

"اوہ...!" میں نے کہا اور خاموش ہو گیا۔

شہر آ کر اس نے مجھے آرٹی کے فلیٹ کے سامنے اُتار دیا... پیگی... مجھے پیگی یاد آ رہی تھی۔ شاید وہ آرٹی کے فلیٹ میں میرا انتظار کر رہی ہو اور آرٹی بھی... میں نے سوچا اور عمارت میں گھس گیا۔ میں جلد از جلد پیگی کو یہ ساری باتیں بتانا چاہتا تھا پھر... میرا خیال تھا کہ میں اسے ڈنر کی دعوت دوں گا۔

آرٹی کے فلیٹ میں روشنی تھی۔ میری دستک کے جواب میں پیگی نے دروازہ کھولا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بولی: "کیا پھر یہاں چھپنے آئے ہو چارلی؟"

"نہیں جان... ہم جیت گئے۔" میں نے کہا اور اندر آ کر دروازہ بند کر دیا۔

"کیا... کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ...!" میں نے اسے ساری داستان سنا دی۔ "آرٹی کہاں ہے؟" آخر میں نے پوچھا۔

"خدا جانے... وہ اب تک نہیں آیا اور نہ ہی اس کی کوئی خبر آئی ہے۔"

"کیا تم اس کے لیے پریشان ہو؟"

"نہیں۔ وہ بہت ہوشیار آدمی ہے۔ اپنا دھیان خود رکھ سکتا ہے۔ میں تو... تمہاری طرف سے پریشان تھی۔"

"اوہ... جان...!" میں نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔

"اب تم کیا کرو گے؟" اس نے آہستگی سے دُور ہٹتے ہوئے پوچھا۔

"فی الحال ہم ڈنر لینے چلیں گے پھر جب آرٹی آ جائے گا تو میں اس سے تمہارے بارے میں بات کروں گا۔"

"میں اُس کی پابند نہیں ہوں۔"

"ٹھیک ہے جان... مگر وہ میرا دوست ہے۔ اس کے بعد میں کوئی اچھی سی نوکری تلاش کروں گا اور کہیں گھر بنا کر تمہارے ساتھ...!"

... اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ "شاید آرٹی آ گیا۔" میں نے کہا اور بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

وہ پوسٹ مین تھا۔ اُس نے ایک ٹیلی گرام میرے ہاتھ میں دیا اور واپس چلا گیا۔ میں نے دوبارہ دروازہ بند کیا اور لفافہ چاک کر دیا۔ ٹیلی گرام آرٹی کی طرف سے تھا اور ایلاما سے آیا تھا۔ اس میں لکھا تھا: "میں نے اور الیتھی نے آج شام شادی کر لی ہے۔ کل صبح ہم سوئٹزرلینڈ جا رہے ہیں۔ تم دونوں بھی شادی کیوں نہیں کر لیتے؟"

"ہُرّا...!" میں نے خوشی سے نعرہ لگایا اور تار پھینک کر پیگی کی طرف بڑھا۔ پیگی کے چہرے پر بہاریں اُتر آئیں۔ اس نے ستاروں کی سی چمک دار آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ پھر مسکرا کر خواب گاہ کی طرف بھاگ اُٹھی۔ میں اس کا تعاقب کرنے کے سوا اور کیا کر سکتا تھا۔

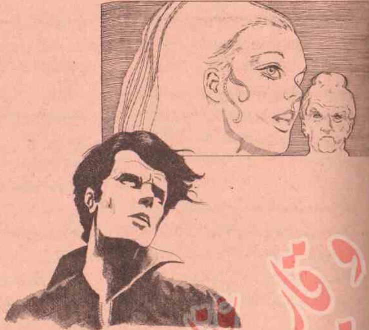

عزم کامل

طاہر قریشی

ان لوگوں کے لیے بطورِ خاص جو آسانی سے شکست تسلیم نہیں کرتے۔ وہ لڑکی اپنی حیثیت سے کہیں زیادہ اونچے خواب دیکھنے لگی تھی

اُس روز نہ جانے کس طرح یہ تمام واقعات یکے بعد دیگرے رونما ہوتے چلے گئے ایسے ہی جیسے کسی ڈرامے میں ایک کے بعد دوسرا منظر بڑی خوبی اور مہارت کے ساتھ تماشائیوں کے روبرو پیش کیا جاتا ہے... شفاف پانیوں والے سمندر کے ساحلوں سے گھرا ہوا یہ ایک دل کش جزیرہ ہے جس میں ریستوران اور ہوٹلوں کی قطاریں محل نما لگتی ہیں۔ زیادہ تر تفریح گاہیں اور ریستوران دو افراد کی ملکیت میں شمار کیے جاتے ہیں... ایک فرد میں ہوں اور دوسرا میلکم ہے۔ ہمارے درمیان خوش نصیبی سے نہ تو کوئی پیشہ ورانہ رقابت ہے اور نہ ہی کوئی خاص دوستانہ تعلق قائم ہے۔ شاید ہمیں اس قسم کی فرصت ہی میسر نہیں آتی۔

وہ ایک عام ساون تھا شام ہونے کو تھی اور یہی وہ وقت ہوتا ہے، جب ہوٹل یا ریستوران کا کاروبار شروع ہوتا ہے میں بار کاؤنٹر کی چوبی سطح پہ کہنیاں ٹکائے، کانچ کے دروازے سے باہر سڑک پہ گزرنے والے افراد کو دیکھ رہا تھا کہ فرینک روجر، مقامی پولیس کے شعبۂ سُراغ رسانی کا سُراغ رساں اندر آ گیا... میزوں پہ بیٹھے ہوئے دیگر افراد کے چہرے اُسے دیکھ کر قدرے ناگواری کے تاثر کا اظہار کرنے لگے تھے لیکن میرے نزدیک وہ

ایک اچھا اور خوش خوراک گاہک تھا اس لیے میں نے کاؤنٹر کی چوبی سطح چھوڑ دی اور کھڑا ہو گیا۔

"ہیلو فرینک!" اُس نے میرے سامنے آ کر ایک سیٹ سنبھال لی۔

"شہر کا کیا حال ہے؟" میں نے بھی جواباً خوش دلی سے دریافت کیا۔

"معمول کے مطابق..." اُس نے مختصر سا جواب دے کر قریب سے گزرنے والے ویٹر کو اشارے سے بُلایا اور اپنی پسندیدہ اشیا کا آرڈر کرنے لگا۔

"انسپکٹر...!" میں نے اُسے متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ "تمھارے بارے میں آج کل کچھ زیادہ ہی سُننے میں آ رہا ہے۔"

"مثال کے طور پر کیا؟" وہ بے نیازی سے ٹانگیں پھیلا کر بولا۔

"یہی کہ تم اکثر بے گناہ آدمیوں کو اپنے پھیلائے ہوئے جال میں، اس خوبصورتی اور ترتیب سے پھانستے ہو کہ وہ اُس میں سے نکل ہی نہیں پاتے۔ یہ تمام باتیں کس تک درست ہیں، یہ تو تم ہی جان سکتے ہو۔"

میری گفتگو کے دوران، ایک پل کے لیے اُس کے چہرے نے رنگ سا بدلا اور پھر وہ قہقہہ لگا کر بولا "لڑکے...!" اُس نے میرے شانے پر تھپکی دی۔ "میں تو اس وقت بس اتنا ہی سوچ سکتا ہوں کہ آج کل تمھاری قسمت عروج پر ہے۔ اتنے بہت سے ریستوران... اور پھر سُنا ہے کہ تم نے انناس کا فارم بھی خرید لیا ہے۔"

میں نے اُسے بھرپور نگاہوں سے دیکھا اور یقیناً خوشی کا تاثر میرے چہرے پر چھا گیا ہوگا۔

وہ اطمینان سے کھانے میں مصروف ہو گیا اور ہمارے درمیان گفتگو ادھوری ہی رہ گئی۔

"اچھا روفی...!" وہ اُٹھ کھڑا ہُوا۔ "پھر ملاقات ہوگی۔"

وہ چلا گیا تو میں اپنے نجی دفتر کی جانب بڑھ گیا۔ دبیز پردوں کے باعث دفتر کی فضا میں اندھیرا سا چھانے لگا تھا اور دُور کونے میں، میری مخصوص نشست پر براجمان وہ پستہ قد شخص مجھے فوراً ہی دکھائی نہ دے سکا۔ شاید اس شخص کو باہر کوئی میز نہیں مل سکی۔ میں نے اپنے دل میں سوچا اور پھر تصدیق طلب انداز میں پُوچھا۔ "باہر کوئی نشست خالی نہیں ہے کیا؟" میں نے کمرے میں روشنی کر دی۔

"مسٹر روفی!" وہ شخص اُٹھ کھڑا ہُوا اور میرے نزدیک پہنچ کر کہنے لگا۔ "میں آپ کے دفتر میں اس لیے آیا ہُوں کہ تنہائی میں ہم بہتر طور سے گفتگو کر سکیں گے۔"

"کیسی گفتگو...؟" میں نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا اور میز کے عقب میں رکھی، اپنی نشست پر جا بیٹھا۔

"میرا نام سام ہے اور میں مائیک کی طرف سے دوستی کی پیش کش کرنے آیا ہوں۔"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "تو پھر پیش کش کرنے میں تامّل... کیوں ہے؟"

"دراصل مائیک چاہتا ہے کہ آپ کے تمام ریستورانوں میں اپنے لیے چھوٹی سی جگہ کرائے پر حاصل کرے۔" اُس نے یہ جملہ بڑے اعتماد سے ادا کیا تھا۔ "ایسے ماحول میں، اُس پر کوئی شک بھی نہیں کرے گا کیوں کہ لوگ یہاں ہر وقت آتے جاتے رہتے ہیں اس کا خیال ہے کہ ایسی جگہوں پر خوب رقم بنائی جا سکتی ہے۔"

"اچھا۔" میں نے دلچسپی لیتے ہوئے، قہقہہ لگا کر اس کی طرف دیکھا۔ "میری عمارات میں ہر جگہ ایک دُکان! واہ بڑا شاندار پروگرام ہے، یہاں بیٹھ کر وہ چوری کی اشیا خریدے گا یا پھر نشہ آور ادویہ بھی فروخت کر سکتا ہے اور بقول تمھارے کسی کو شک نہیں ہوگا..."

"مائیک گرینجر ایک بڑا نام ہے۔" سام میرے تبصرے پر بُرا سا منہ بنا کر بولا۔

"ہوگا...!" میں نے رُکھائی سے جواب دیا۔ "جاؤ اور جا کر اپنے باس سے کہہ دو کہ میرا جواب نفی میں ہے۔"

"میں نے تمھیں ایک کاروبار کی پیش کش کی ہے روفی اور تم نے نوعیت جانے بغیر ہی انکار کر دیا۔ اُس کے مدقوق چہرے کا زاویہ نیچ اور طیش سے بگڑ گیا پھر وہ آہستہ آہستہ چلتا ہُوا میرے قریب آیا... اور جب وہ اپنی جیبوں میں ڈالے ہوئے ہاتھوں کو جنبش دینے کی حالت میں پہنچ گیا تو میں نے اُسی لمحے جست لگائی اور اُس کی دائیں جیب سے ریوالور نکال لیا۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے اُس کا کھلا ہُوا منہ دبا کر بے ساختہ آواز بھی روک دی... پھر سر پر لگنے والی ضرب کا ایک زوردار جھٹکا کھا کر وہ دیوار سے جا لگا میں نے اُس کے ریوالور سے تمام گولیاں نکال کر خالی ریوالور دونوں ہاتھوں سے بصد احترام اُسے واپس کر دیا۔ "دوسری بار آؤ تو دو ریوالور لے کر آنا... ایسی صورتِ حال میں ایک اکثر ناکافی ثابت ہوتا ہے۔"

وہ کچھ کہے بغیر دیوار سے ٹک کر مجھے دیکھتا رہا۔ اُس کی آنکھوں میں انتقام اور کمینگی کی برہنہ چمک دُور ہی سے نظر آ رہی تھی اس نے ریوالور جیب میں ڈال لیا اور دروازے کی جانب قدم بڑھانے لگا۔

"اپنے باس سے ملو تو میرا جواب اچھی طرح سے بتا دینا میری جانب سے صاف انکار ہے۔" میں نے مزید سختی سے کہا۔

"میں بتا دوں گا۔" وہ جاتے جاتے رُک گیا۔ "اور تم بھی کان کھول کر سن لو۔ میں یہاں اپنے باس کا پیغام لے کر آیا تھا۔ لیکن میں جا رہا ہوں تو اب یہ میرا ذاتی معاملہ بن گیا ہے..."

میں زیرِ لب تبسم کے ساتھ اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا اور اُس وقت میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ وہ دن ختم ہوئے جب کوئی مجھے یعنی روفی کو زچ کر یا اُس کے کاروبار کو ذرہ برابر بھی نقصان پہنچا سکتا ہو۔

خلافِ توقع اگلا روز کمال اطمینان سے بیت گیا وہ ہفتے کا آخری دن تھا اور اگلی صبح سے ہفت روزہ تعطیلات شروع ہونے والی تھیں۔ میں ضروری اُمور سرانجام دے کر ذرا جلدی اپنے گھر پہنچ گیا ابتدائی معمولی سی ناگواری مجھے اُس وقت محسوس ہوئی جب گھریلو خادمہ نے چھٹی مانگی وہ اپنی بیمار بہن کی تیمارداری کے لیے جانا چاہتی تھی اور میں اُسے روکنے کا مجاز نہیں تھا لیکن اُس کی اس بے وقت رخصت نے مجھے اچانک دُشواری میں مبتلا کر دیا۔ اب پیر کی صبح تک دفترِ روزگار بند تھا اور مجھے کسی دوسری ملازمہ کے لیے گویا دو روز تک انتظار کرنا پڑے گا لیکن حُسنِ اتفاق کہ محض نصف گھنٹے کے بعد ہی اطلاعی گھنٹی کی آواز سُنائی دی اور جب میں نے دروازہ کھولا تو ایک حسین لڑکی کھڑی دکھائی دی۔

"میرا نام روزی ہے۔" وہ مسکرائی۔ "کیا آپ مجھے اندر آنے کے لیے نہیں کہیں گے؟"

"کیوں نہیں!" میں نے نرمی سے کہا اور ایک جانب ہٹ گیا۔ "اندر تشریف لے آئیں۔" لباس کی تراش سے لے کر سر کے بالوں کی سجاوٹ تک وہ لڑکی نہایت دیدہ زیب اور متوازن شخصیت کی مالک تھی اس لیے فطری طور پر میرا دھیان اس جانب نہ جا سکا کہ اس کی آمد کا مقصد میرے ہاں حصولِ ملازمت بھی ہو سکتا ہے۔

"مجھے مسز فرگوسن کی زبانی علم ہُوا تھا کہ وہ آپ کی ملازمت ترک کر کے اپنی بہن کے پاس جا رہی ہے اس لیے میں نے سوچا کہ آپ سے مل لُوں دراصل مجھے ملازمت کی ضرورت ہے..." وہ دھیمی آواز میں بات کر رہی تھی لیکن اُس کی اس خواہش پر مجھے بے حد تعجب ہُوا۔ وہ اچھی خاصی شخصیت کی مالک تھی اور کسی بھی اچھی جگہ باآسانی ملازم ہو کر من مانی تنخواہ حاصل کر سکتی تھی۔

"مِس روزی!" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اُسے دیکھا۔ "آپ گھریلو ملازمت کی کیوں خواہاں ہیں جب کہ آپ کو تو کہیں بھی کوئی جگہ مل سکتی ہے۔"

"ہاں... دراصل میں نے سُنا ہے کہ آپ بہت اچھا معاوضہ ادا کرتے ہیں ایسے میں مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں ہوٹلوں میں بھٹکتی پھروں۔"

میں خاموش ہو گیا لیکن دل میں بے چین سا کر دینے والا خیال بدستور موجود تھا... پھر اس خیال کو بھی روزی کی مہارت، سلیقے اور چابک دستی نے وقتی طور پر ختم کر دیا۔

اُس شام میں نہا کر نکلا تو سارا اپارٹمنٹ چند ہی منٹوں میں یکسر بدلا بدلا سا دکھائی دے رہا تھا ہر چیز صاف اور موزوں جگہ پر آراستہ تھی میرا ڈنر سوٹ استری ہو کر ہینگر پر جھول رہا تھا اور کھانے کے کمرے سے کافی کی دلفریب مہک مجھے گیلری میں بھی محسوس ہو رہی تھی۔

"مِس روزی! آپ کو کیسے معلوم ہُوا کہ آج شب مجھے رات کا کھانا کہیں باہر کھانا ہوگا؟" میں نے کافی کی چسکی لیتے ہوئے پُوچھا۔

"آپ کی ٹیبل ڈائری سے۔" وہ ہنس کر کہنے لگی۔ "ہر اچھی ہاؤس کیپر کو کسی سیکرٹری کی طرح اپنے باس کی مصروفیات کا دھیان رکھنا چاہیے..."

واقعی وہ لڑکی بڑی مستعد، ہوشیار اور سلیقہ شعار تھی۔ میں باہر جانے تک ہر ہر قدم پر اُس کے حُسنِ انتظام کو سراہتا رہا۔

اپنی گرل فرینڈ لولین سے میرا شادی کرنے کا پروگرام پختہ اور مکمل تھا۔ وہ لڑکی اپنے بے مثال حُسن کے باعث کچھ ایسی ہی بے نظیر تھی کہ مجھ جیسے مالی لحاظ سے مستحکم شخص کو یقیناً اسی قسم کی... شریکِ حیات کا انتخاب کرنا یوں زیب دیتا تھا، جیسے کوئی شاندار ہیرا، تاجِ شاہی کی زینت کے لیے منتخب کیا جاتا ہے۔ لولین گزشتہ کچھ عرصے سے میری زندگی کی رعنائی اور دل فریبی بڑھانے کے لیے منتخب ہو چکی تھی لیکن اُس شب مجھے احساس ہُوا کہ وہ قدرے اُکھڑی اُکھڑی سی ہے یا پھر شاید مجھے بھی اُس میں حُسن کے سوا دیگر تمام صفات عنقا محسوس ہوئی تھیں سلیقہ یا ہوشیاری نہ تو اُس میں تھی اور شاید نہ ہی اُسے ان اوصاف کی ضرورت تھی۔ اس قدر حسین خواتین ایسی صفات کی قائل بھی نہیں ہوتیں اور پھر وہی ہُوا جس کا مجھے خدشہ تھا جیب میں رکھی ہوئی وہ ننھی سی ڈبیہ میں نے نکالی اور میز کی چمک دار سطح پر رکھ دی۔ ہم لوگ ڈنر کھا

چکے تھے اور اب میلکم کے ایک ساحلی ریستوران میں بیٹھے کافی پی رہے تھے۔

"یہ کیا ہے؟" لولین نے اپنے طلائی تاروں جیسے ریشمی بالوں کو ایک ادائے ناز سے جھٹک کر پوچھا۔

"عرفِ عام میں یہ انگوٹھی کہلاتی ہے اور عشّاق کی زبان میں ہمارے مقدّس بندھن کی علامت یا پھر اُلفت کی یادگار وغیرہ۔" میں نے ڈبیہ کھول کر اُس کی طرف بڑھا دی۔

نیلگوں بیضوی پتّھر اپنی چکاچوند سے آنکھوں کو خیرہ کرنے لگا۔ لولین کے ریشمی بالوں جیسی کرنیں اطراف میں پھیل گئیں لیکن اُس کے دل کش چہرے پر کسی نئے جذبے کا حسین رنگ پیدا نہ ہوا۔ وہ غیر دلچسپ انداز میں چند ثانیے کے لیے متوجہ ہوئی پھر اُس نے اپنا رُخ پھیر لیا۔ "مجھے افسوس ہے رونی!" مجھ سے آنکھ ملائے بغیر اُس نے کہا۔ "ابھی میں حتمی طور پر اپنے آپ کو شادی کے لیے آمادہ نہیں کر سکی ہوں۔"

میں جواب میں اُسے کچھ بھی نہ کہہ سکا اور کہتا بھی تو کیسے جب کہ ہم دونوں یا کم از کم میں شادی کے فیصلے کو قطعی سمجھ بیٹھا تھا، محض زبانی یا پھر کاغذی کارروائی باقی تھی۔ مجھے اس بات سے اس قدر صدمہ ہوا کہ میں ساکت بیٹھا رہ گیا جب وہ اپنا پرس اُٹھا کر چلنے لگی تو مجھے جیسے جھٹکا سا لگا۔

"لولین...!" میں نے گھُٹی گھُٹی سی آواز میں اُسے پکارا۔ "خدارا میری بات سنو...!"

"پلیز رونی!" وہ بدستور مُنہ پھیرے، ذرا دیر کو رُک کر بولی۔ "ہم یہ بات پھر کسی وقت کریں گے۔ تم مجھے فون کر لینا۔"

... اور پھر وہ مجھ سے دُور ہوتی چلی گئی۔

ویٹر میرے لیے مزید کافی لے آیا تھا۔ میں وہاں تنہا بیٹھا رہا۔ زندگی اچانک ہی بوجھل محسوس ہونے لگی تھی۔

دُور دوسرے کونے میں ریستوران کا موٹا مالک میلکم ایک طرف جاتا دکھائی دیا۔ وہ بے حد پریشان اور متفکر تھا۔ یقیناً اُس کا کاروبار خسارے کی جانب مائل ہوگا۔ بہت سی میزیں بھی خالی دکھائی دے رہی تھیں حالاں کہ یہ کاروبار کے عروج کا وقت تھا۔ نہ جانے کیوں اندرونی طور پر مجھے اُس کے اس خسارے سے طمانیت کا احساس ہوا۔

یکایک میری نگاہ اُس پر جا پڑی۔ وہ یقیناً روزی ہی تھی۔ میری نو متعارف گھریلو ملازمہ لیکن اُس وقت وہ بالکل مختلف حُلیے میں تھی۔ بالوں کے انداز اور بہترین لباس نے اُسے کسی متمول گھرانے کی لڑکی کا رُوپ دے دیا تھا۔ آراستہ ریستوران کے دبیز پھول دار قالین پر میں آہستگی سے چلتا ہوا اُس حصّے کی طرف بڑھنے لگا جہاں وہ لڑکی، روزی ایک میز پر بیٹھی تھی اور کافی ہاؤس کا مالک، میلکم اُس کے قریب جھُکا کھڑا تھا۔ میلکم کے چہرے پر وہ مخصوص اور گہری مُسکراہٹ دُور ہی سے دکھائی دے رہی تھی جو اُس نے حسین عورتوں کے لیے مخصوص کر رکھی تھی۔ ابھی میں چند قدم دُور ہی تھا کہ میلکم کورنش کے انداز سے سیدھا ہوا اور دوسری طرف چل دیا۔

"مس روزی!" اُس کے نزدیک پہنچ کر میں نے قدرے بے تکلفی سے پکارا۔ "آپ نے گھر پر تو شام باہر گزارنے کے متعلق کوئی بات نہیں کی تھی؟"

اُس نے رُخ موڑ کر مجھے دیکھا لیکن اُس کی آنکھوں میں شناسائی کی کوئی لہر نہیں تھی۔ وہ خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ "میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔" یہ الفاظ اُس کے ہونٹوں سے بڑی بیزاری کے ساتھ ادا ہوئے اور مجھے تھوڑی سی دیر میں ایک ہی جگہ، دوسری بار حیرت کا جھٹکا برداشت کرنا پڑا۔ پہلے لولین اور اب روزی کا رویّہ ناقابلِ فہم تھا۔

میں خاموشی سے سر جھکائے واپس اپنی میز پر آ گیا۔ روزی سے ملتی جلتی وہ خاتون بھی اُٹھی اور خواتین کے ملبوسات والے کمرے میں چلی گئی۔ میں تھوڑی دیر اور بیٹھا رہا لیکن ناخوشگوار تاثرات میرے ذہن پر بُری طرح چھا گئے تھے۔ لہٰذا وہاں سے اُٹھ جانا ہی بہتر تھا۔

واپسی پر گاڑی چلاتے ہوئے خُنک ہوا میری برہم مزاجی کو معمول پر لانے میں کافی مددگار ثابت ہوئی۔ میں لولین سے شادی کے معاملے میں بے حد پُر اُمید تھا۔ مجھے توقع تھی کہ اُسے جلد ہی صحیح راستے پر لے آؤں گا البتہ یہ نئی ملازمہ روزی والا قصہ میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ یقیناً ان تمام واقعات میں کوئی ایسا راز پنہاں تھا جو فی الحال میری سُوجھ بُوجھ سے بہت دُور تھا۔

میرے مکان کا زیادہ تر حصّہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا شاید روزی ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔ میں نے گاڑی گیراج میں کھڑی کر دی اور روشنی کیے بغیر ہی زینے سے ہوتا ہوا، اُوپر خواب گاہ میں آ گیا۔ راہ داری اور کمرۂ طعام میں روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے اپنے لیے تازہ مشروب کا ایک گلاس تیار کیا اور غیر اخلاقی حرکت سمجھنے کے باوجود، قلبی پریشانی اور تجسّس کے باعث روزی کے کمرے کی جانب چل دیا۔ دروازے کے چابی والے سوراخ سے

جھانک کر اندر دیکھا تو ٹھٹک کر رہ گیا۔

وہ اپنے بستر پر بے سُدھ پڑی سو رہی تھی۔ اُس کی ہموار سانسوں کی آمد و رفت سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بہت دیر سے محوِ خواب ہے۔ میں چند ثانیے کھویا کھویا سا وہاں کھڑا رہا اور آج کی شب پیش آنے والے ناقابلِ یقین واقعات پر غور کرتا رہا۔ یہ سب کچھ ایک سربستہ راز کی سی حیثیت رکھتا تھا۔ گلاس تھام کر میں اسی پریشان کیفیت میں مطالعے کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ آج شب... اتنی آسانی سے نیند نہیں آ سکتی تھی۔ لہٰذا بہتر تھا کہ کسی اچھی سی کتاب کی رفاقت حاصل کر لی جائے۔

تاریک کمرے کا دروازہ کھول کر میں اندازے سے سوئچ کی طرف بڑھنے لگا مگر دو ہی قدم بعد میں نے کسی چیز سے ٹھوکر کھائی اور گرتے گرتے بچا۔ ہاتھ میں تھاما ہوا مشروب بھی چھلک گیا۔ قدرے ہٹ کر گزرتے ہوئے، میں نے کمرہ روشن کر دیا۔

وہ ایک لاش تھی۔

روشنی ہوتے ہی سب سے پہلے میری آنکھوں نے اُسے دیکھا۔ تعجب، حیرت اور خوف کی زیادتی نے جیسے میرے اعصاب شل کر دیے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ بے ساختہ نکلنے والی چیخ بھی میرے ہونٹوں تک آنے سے پہلے ہی دم توڑ گئی۔

میں ساکت کھڑا تھا اور نہ جانے کتنے لمحے بیت چکے تھے کہ اپنی خواب گاہ سے ٹیلی فون کا ڈائل گھمانے کی آواز سنائی دی اور اس آواز سے جیسے مجھے ہوش آ گیا۔ میں نے جھُک کر پہلو کے بل پڑی ہوئی لاش کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی تو مجھے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا۔

یہ لاش میرے کاروباری حریف میلکم کی تھی۔

اسی اثنا میں، خواب گاہ کے فون پر گفتگو سُنائی دینے لگی میں فوراً ہی اُٹھا اور دروازے سے نکل کر اُدھر لپکا۔

اندر میری نئی ملازمہ روزی غالباً پولیس اسٹیشن پر کسی سے بات کر رہی تھی۔ "ہاں جناب! میں مسٹر رونی روجر کے گھر سے بات کر رہی ہوں۔ ابھی ابھی اُنھوں نے مسٹر میلکم کو قتل کر دیا ہے۔" وہ شاید کچھ اور بھی کہہ رہی تھی مگر میں تو ابتدائی الفاظ کے ساتھ ہی چکرا کر رہ گیا تھا اور اس نئے صدمے سے نمٹنے کے لیے میں نے سر کو زور سے جھٹکا دیا۔

"جی ہاں! میں نے کچھ دیر پہلے دونوں کے جھگڑنے کی آوازیں اپنی خواب گاہ میں سنی تھیں۔ ان آوازوں کی وجہ سے میری نیند اُچاٹ ہو گئی اور میں اپنے کمرے سے نکل آئی۔"

اس غلط بیانی پر میرا دماغ جھنجھنا اُٹھا اور میں نے ریسیور اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔

"ہیلو... میں رونی ہوں۔ کون بات کر رہا ہے؟" میں نے پُوچھا۔

"انسپکٹر فرینک!" اس کی کھُردری آواز سُنائی دی۔

"سنو انسپکٹر!" میں تیزی سے بولنے لگا۔ "میں نے اُسے قتل نہیں کیا بلکہ میں نے تو خود ابھی گھر آ کر اُس کی لاش دیکھی ہے۔"

"گویا لاش موجود ہے۔" وہ الفاظ پر زور دے کر کہنے لگا۔

"ہاں..." میں نے مُردہ سی آواز میں جواب دیا۔ "مسٹر میلکم کو کسی نے مار ڈالا ہے۔"

"ہُوں... مسٹر رونی تمھاری اُس سے ایسی کیا چپقلش تھی کہ انجام اس موڑ پر آ کر ہوا؟"

"کیا مطلب...؟" میں نے متعجّب انداز میں کہا۔

"کچھ نہیں... ہم آ رہے ہیں۔" اُس نے مختصر سا جواب دے کر فون بند کر دیا۔

میں تذبذب کے عالم میں وہیں کھڑا خالی خالی نظروں سے اُس لڑکی کو دیکھ رہا تھا جس کا نام روزی تھا اور ابھی شام ہی کو میں جس کے سلیقے، ہنرمندی اور مستعدی کا زبردست مدّاح بن چکا تھا۔ "روزی تم نے فون پر ایسا کیوں کہا؟" بے چارگی اور تعجّب کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ یہ الفاظ میری زبان پر آ گئے۔

"وہ تم ہی تھے مسٹر رونی یا کم از کم مجھے تو ایسا ہی لگا تھا..." اُس نے خفگی اور بے نیازی سے جواب دیا۔

"لیکن تم جانتی ہو کہ میں شام کو ڈنر کے لیے باہر گیا ہوا تھا اور پھر میلکم کے کافی ہاؤس میں تم نے خود مجھے دیکھا تھا تم بھی تو وہیں تھیں نا؟" میں اُمید بھری نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔

"نہیں..." وہ رُکھائی سے کہنے لگی۔ "تمھیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں تو باہر گئی ہی نہیں..."

"اچھا...!" میں نا اُمید سا ہو گیا۔ "لیکن ایک بات تو بتاؤ اگر تم نے مجھے کسی کو قتل کرتے ہوئے دیکھا ہے تو پھر تم کیسے ایک قاتل کے ساتھ تنہا ایک ہی چھت کے نیچے اب تک موجود ہو۔ کیا تمھیں مجھ سے خوف نہیں آتا؟" میں نے اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو اچانک اُن آنکھوں میں دہشت کی پرچھائیاں سی لرزتی دکھائی دینے لگیں لیکن وہ اُس وقت مجھ سے خوف زدہ نہیں تھی کیوں کہ وہ میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ میں نے اُس کی نگاہوں کا تعاقب کرتے ہوئے رُخ پھیرا تو دروازے میں وہی پستہ قد اور مدقوق چہرے والا شخص

سام کھڑا نظر آیا۔ "اب بتاؤ۔۔۔" وہ خباثت سے مسکرایا۔ "مجھ سے سودا کرلیتے تو اچھے رہتے نا!" یہ کہتے ہوئے اچانک ہی اس کے ریوالور نے سرخ شعلہ اگل دیا۔

میں ابھی صورتِ حال سمجھ بھی نہیں پایا تھا کہ روزی اپنا ایک ہاتھ سینے تک لے گئی پھر وہ لڑکھڑائی، گھومی اور فرش پر آہستہ آہستہ پھسلتی چلی گئی۔ اس کا سفید بلاؤز اس کے اپنے ہی خون کی سرخی سے رنگ گیا تھا۔ میں ساکت کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ میرے اعصاب تن گئے تھے اور میں سام کے اگلے فائر کا منتظر تھا جو مجھے بھی اسی حالت سے دوچار کرسکتا تھا۔۔۔ لیکن اس منحنی سے شخص نے جیب سے رومال نکال کر ریوالور صاف کیا اور اسے قالین پر پھینک دیا۔ تب فوراً ہی میں نے اپنے اور ریوالور کے درمیانی فاصلے کا جائزہ لیا اور جست لگا کر اسے پکڑ لینے کے بارے میں سوچنے لگا لیکن اسی وقت سام نے دوسرا ریوالور نکال لیا اور اس کا رخ میری جانب کرتے ہوئے کہنے لگا۔ "اسے وہیں رہنے دو۔" اس کے لہجے میں ذرا سی بھی تشویش نہیں تھی۔

"تمہارا خیال ہے کہ پولیس والے اس ڈرامے پر یقین کرلیں گے؟" میں نے کہا۔

"یقین تو وہ کر بھی چکے ہیں۔" وہ خوش دلی سے بولا۔ "صرف میں یہاں موجود نہیں ہوں گا باقی سب کچھ حسبِ توقع ہے۔"

"لیکن تمہیں شاید معلوم نہیں کہ میں ابھی ابھی فون پر اس کہانی کی تردید کرچکا ہوں۔" میں نے اسے باتوں میں لگانے کی کوشش کی تاکہ کسی طرح وہ پولیس کی آمد سے قبل بھاگ نکلنے میں کامیاب نہ ہوسکے۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ لڑکی نے تمہیں قتل کرتے دیکھا تھا اس لیے تم نے اس عینی گواہ کو بھی ٹھکانے لگا دیا۔" وہ قہقہہ لگا کر بولا۔

"لیکن میلکم کو قتل کرنے کا میرے پاس کیا جواز ہے؟" میں نے گفتگو بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"کاروباری دشمنی۔۔۔" وہ دل لگی کرتے ہوئے کہنے لگا۔ "تمہارے اسی قسم کے خطوط بھی میلکم کی جیب میں رکھے ہوئے ہیں۔۔۔ اور یہ لڑکی؟" اس نے روزی کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ ایک لالچی لڑکی تھی جو اپنی حیثیت سے کہیں زیادہ اونچے خواب دیکھنے لگی تھی۔" وہ بولتے بولتے رکا اور غور سے کچھ سننے لگا۔

دور سے پولیس کار کے سائرن کی گونج دار آواز سنائی دینے لگی تھی۔ سام نے فوراً ہی دروازہ چھوڑ دیا اور الٹے قدموں دوڑتا ہوا راہداری کی تاریکی میں گم ہوگیا۔ میں ابھی تک وہیں کھڑا تھا اور سائرن کی آواز لمحہ بہ لمحہ قریب آتی جارہی تھی۔ اگر میں اپنے گھر میں تنہا ان دو لاشوں کے ساتھ گرفتار ہوگیا تو قانونی موشگافیاں پھر کبھی مجھے آہنی سلاخوں سے باہر نہیں آنے دیں گی۔ مجھے جو کچھ بھی کرنا ہے، ان چند ہی لمحوں میں کرلینا چاہیے۔ سام نے آخری وقت تک یہاں رک کر گویا مجھے پولیس کے ہاتھوں میں سونپ دیا تھا۔ یہی کھیل میں اس کے ساتھ کھیلنا چاہتا تھا لیکن مجھے موقع نہ مل سکا اور اب نیچے جانے اور داخلی دروازہ استعمال کرنے کا وقت بھی نہیں رہا تھا۔۔۔ پولیس کار کی لہراتی ہوئی روشنی بیرونی احاطے کو منور کرنے لگی تھی۔ میں نے کھڑکی سے نیچے جھانکا۔ "رونی!" داخلی دروازے سے فرینک کی آواز سنائی دی۔ "کوئی غلط حرکت نہ کرنا ورنہ نیچے گر کر اپنی ہڈیاں تڑوا بیٹھو گے۔"

۔۔۔ اور فوراً ہی میری سمجھ میں آگیا کہ مجھے اس وقت کیا کرنا ہے۔

۔۔۔ دس بارہ فٹ نیچے لان کے گرد حاشیہ بناتی ہوئی باڑ کا واضح سایہ نظر آرہا تھا۔ میں نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر اپنا نصف جسم کھڑکی سے لٹکایا اور دوسری طرف کود گیا۔ فوراً ہی روشنیاں میرے تعاقب میں لپکیں۔ ایک آدھ آواز بھی ان کے ساتھ ہی للکارتی سنائی دی لیکن اب میں وہ سب کچھ کہاں دیکھ رہا تھا۔ انسپکٹر فرینک کے پھیلائے جانے والے جال کے تذکرے مجھے جان توڑ کر بھاگ نکلنے پر مجبور کررہے تھے۔

نہ جانے کتنا وقت گزر گیا۔ میں بھاگتا ہی رہا اور پھر ایک جگہ تھک کر گر گیا۔ رات نے گہری تاریک چادر اوڑھ رکھی تھی۔ میں اس تاریکی کی پناہ میں کسی سہمے ہوئے خرگوش کی مانند دبکا ہوا تھا لیکن آخر کب تک؟ بالآخر صبح ہوگی اور پھر ہر سو روشنی پھیل جائے گی۔ اجالا ہوجائے گا جو گناہ، جرائم اور اندھیرے کافور کردیتا ہے۔ پھر میں ایک تنہا، خوف زدہ اور تھکا ہوا شخص کہاں پناہ حاصل کروں گا۔ اس قسم کے مایوس کن خیالات ہر طرف سے مجھ پر یلغار کررہے تھے۔ میرے سامنے سب سے پہلی کھلنے والی دکان ایک باربر کی تھی میں نے اس میں جاکر اپنے بال سنوارے اور تازہ اخبار دیکھا۔ اب میرے اندر خاصی تقویت پیدا ہوگئی تھی، اور میں دن کی روشنی کو کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے حقیقت کا مقابلہ کرنے کے متعلق سوچ رہا تھا۔ ۔۔۔ پھر کافی سوچ و بچار کے بعد میں نے ایک فون بوتھ سے انسپکٹر فرینک سے رابطہ قائم کیا۔

"میں رونی بول رہا ہوں۔"

میری آواز سن کر وہ یقیناً اپنی نشست سے اچھل پڑا ہوگا کیوں کہ مجھے کچھ ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔ "کہاں سے بول رہے ہو؟"

اس نے فوراً ہی پوچھا۔

"اسی شہر سے۔۔۔" میں نے مختصراً کہا۔

"رونی دیکھو! یہ روپوشی خود تمہارے خلاف جارہی ہے۔ جس قدر بھی جلد ممکن ہو پولیس اسٹیشن پہنچ جاؤ۔" وہ روایتی زبان میں مجھے سمجھانے بلکہ الجھانے لگا۔

"میں سب سمجھتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا البتہ کسی کو میرے تعاقب میں بھیجنے کی کوشش نہ کرنا۔ اس وقت سے بہت پہلے میں، یہاں سے دور جاچکا ہوں گا۔ میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ میلکم کو میں نے قتل نہیں کیا۔"

"اور لڑکی کو؟" اس نے تیزی سے پوچھا۔

"اسے میرے سامنے ہلاک کیا گیا ہے لیکن فی الحال میں یہ بات ثابت نہیں کرسکوں گا۔"

"ہمیں تمہارے چند خطوط بھی ملے ہیں۔"

"کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ جعلی نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"معلوم نہیں ابھی ان کا معائنہ ہورہا ہے لیکن رونی تم میرے پاس آکر بھی تو بات کرسکتے ہو۔"

اس کے لہجے میں بے تابی محسوس کرکے مجھے خیال آیا کہ شاید اسے میرے فون بوتھ کا نمبر معلوم ہوگیا ہے اس لیے وہ مجھے یہاں [illegible] اور روکے رکھنا چاہتا ہے۔ میں نے فوراً ہی کسی خوف زدہ ہرن کی مانند ریسیور لٹکایا اور بھاگ نکلا۔ اب میرا ذہن قدرے صاف ہوگیا تھا اور انسپکٹر فرینک سے ہونے والی اس گفتگو نے گویا مجھے بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔ قبل اس کے کہ اس جال کی ڈور میرے گرد کسی دی جائے اور میں اپنا دفاع کرنے کے قابل نہ رہ سکوں، مجھے مائیک سے مل لینا چاہیے جو اس منحنی سے شخص، سام کا باس تھا اور اس سارے ڈرامے میں یقیناً کلیدی حیثیت رکھتا تھا۔ کسی ایسے شخص کو ڈھونڈ نکالنا یقیناً کوئی آسان کام نہیں تھا لیکن اسی جیسے چند افراد سے پوچھنے کے بعد آخر کار ایک پرانی خستہ حال عمارت کے دروازے سے برآمد ہونے والے ایک بے حد فربہ مرد نے پہلے تو میرے اس سوال پر سر سے پاؤں تک مجھے غور سے دیکھا پھر بولا۔ "میں سمجھ گیا کہ تم مائیک کو ڈھونڈ رہے ہو۔۔۔" پھر اس نے اپنے عقب میں دو قدم پر واقع ایک دروازے کو دھکا دیتے ہوئے دوبارہ کہا۔ "۔۔۔جاؤ اندر چلے جاؤ۔" یہ کہہ کر وہ دوسری طرف مڑ گیا۔

یہ غالباً کسی ریستوران کا عقبی حصہ تھا۔ میں راہ داری میں سیدھا چلتا گیا۔ آخری حصے کے ایک مختصر سے کمرے میں لگے کاؤنٹر کے پیچھے گڑیا جیسی نازک سی لڑکی بیٹھی تھی۔ میرے استفسار پر اس نے بھی مجھے اسی جسیم شخص کی سی نگاہوں سے جانچا اور قلم منہ میں دبا کر فون پر کسی سے بات کرنے لگی پھر چند لمحے بعد مجھے زینے سے اوپر جانے کا اشارہ کردیا۔

اندر وہ ساگوان کے ایک بھاری دیوان پر نیم دراز تھا۔ ہلکی روشنی کا ایک لیمپ، سرہانے رکھی میز پر روشن تھا۔ کمرے میں بوجھل سی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ میں دبیز قالین پر کھڑا چند لمحے اس غیر مانوس ماحول کو غائر نظروں سے دیکھتا رہا۔ گوشت بھرے بدن اور بھدے نقوش والے مائیک نے مجھے سر کے اشارے سے قریبی کرسی پر بیٹھ جانے کے لیے کہا تو کونے کی میز کے عقب میں کھڑے منحنی سے سام نے بھی کھنکار کر اپنی موجودگی سے آگاہ کرنا ضروری سمجھا تاہم میں نے پلٹ کر اسے دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی اور اطمینان سے بیٹھ گیا۔

"معلوم ہوا تھا کہ تم مجھے تلاش کررہے ہو۔" مائیک کہنے لگا۔

"اور ایسے غیر معمولی انسان سے ملاقات کرنا خود مجھے بھی پسند ہے اب تم اپنی آمد کا مقصد بیان کرسکتے ہو۔"

"اگر تم ایسے شخص کو رابطے کا ذریعہ نہ بناتے تو شاید میں بہت پہلے تم سے ملنے چلا آتا۔۔۔" میں نے سام کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ غراتا ہوا لپکا مگر مائیک نے ہاتھ اٹھا کر اسے وہیں روک دیا۔ "ہاں البتہ اس کاروبار کے سلسلے میں میرا جواب اب تک نفی میں ہے میں یہاں اپنے ایک اور کام سے آیا ہوں۔"

"دیکھو لڑکے!" وہ اٹھ بیٹھا۔ "میں نے تمہیں ایک پیش کش کی تھی جسے تم نے ٹھکرا دیا اور بس۔ ہماری بات وہیں ختم ہوگئی۔"

"میں اپنے ہاں کسی بھی بدنام اور رسوا کاروبار کی اجازت نہیں دے سکتا۔" میں نے ناگواری سے کہا۔

"تم نہیں دو گے تو وہ شخص دے گا جو اب اس علاقے کا مالک ہوگا، جہاں جہاں بھی تمہارے ریستوران موجود ہیں۔" مائیک نے بھدے پن سے ہنستے ہوئے انکشاف کیا۔

نفرت کی ایک شدید لہر میرے جسم میں دوڑ گئی جس نے مجھے سراپا تلخ بنا دیا۔ "وہ شخص کون ہوگا۔۔۔؟" میں نے غصہ دباتے ہوئے دریافت کیا۔

"کوئی بھی ہو، یہ تمہارا معاملہ نہیں ہے۔"

"سنو مسٹر! ہوسکتا ہے، اب تک تم جن افراد کو ناپسندیدہ قرار دیتے رہے ہو وہ صفحۂ ہستی سے نابود کردیے جاتے ہوں لیکن یقین رکھو کہ میرا شمار ان میں نہیں ہوسکتا۔" میرے جملے کے اختتام پر سام غرا کر ایک بار پھر لپکا لیکن میں نے کڑی نگاہوں سے دیکھا تو وہ رک گیا۔

"تمھاری یہ اطلاع بے حد دلچسپ ہے۔" مائیک اس طرح سے مسکرایا جیسے کسی بچّے کی زبان درازی سے محظوظ ہو رہا ہو۔

"کیا ہم کھل کر بات کر سکتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔ "یہ تو تم بھی جانتے ہو کہ مجھے ایک جال میں پھنسایا جا رہا ہے۔"

"اگر تم اس میں خوشی محسوس کر سکتے ہو تو کچھ دیر کے لیے یہی فرض کر لو۔" مائیک سابقہ لہجے کو برقرار رکھتے ہُوئے بولا۔ "تو پھر ہم اس جال کو ذرا ڈھیلا کر کے کسی اور کو بھی پھنس جانے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ میرے پاس ایک اور آدمی بھی موجود ہے جو روزی کے ساتھ ملوث تھا اور اس نے مقتول میلکم کی رقابت کے باعث دونوں کو ٹھکانے لگا دینے کا یہ منصوبہ تیار کر لیا۔"

اب تک کی سوچ نے مجھے کچھ ایسی ہی راہ دکھائی تھی جسے میں نے اندھیرے کے ایک تیر کے مطابق یہاں استعمال کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مائیک کی آنکھیں سکڑ گئیں اور وہ مجھے غور سے دیکھنے لگا۔

"لیکن اُس لڑکی کو تو..." وہ کہنے لگا کہ سام نے گولی مار دی ہے لیکن وہ بولتے بولتے رُک گیا اور جملہ ادھورا ہی چھوڑ دیا۔ میری نظروں کے سامنے روزی کی وہ تصویر آ گئی جب وہ چکرا کر آہستہ آہستہ نیچے گر رہی تھی، اُس کا خون، سفید بلاؤز کو سُرخ کر گیا تھا اور حیرت اُس کی نگاہوں میں منجمد ہو کر رہ گئی تھی وہ یقیناً ایک اچھی لڑکی تھی گھریلو اور سلیقہ مند بیوی بننا چاہتی تھی شاید ایسے ہی خواب دِکھا کر اُسے اس ڈرامے کے لیے تیار کیا گیا ہو گا جس کے انجام سے وہ یقیناً باخبر نہیں تھی ورنہ اس حد تک کبھی ملوث نہ ہوتی۔

"میں اُس شخص کو آج شب کسی بہانے سے ایک جگہ مدعو کر لوں گا اور وہیں ہم تینوں کی موجودگی میں مزید بات ہو گی..." یہ پروگرام میں نے اُس کے سامنے پیش تو کر دیا لیکن خود مجھے اُس کی کامیابی کی قطعی توقع نہیں تھی۔

"کتنے بجے..." مائیک نے بے یقینی سے میری طرف دیکھتے ہُوئے کہا۔ "اور کہاں...؟"

"آج شب دس بجے..." بلا سوچے سمجھے میں نے کہہ دیا۔ "اُس شخص کا اپارٹمنٹ ساتویں فلور پر ہے۔ ویسٹ اسٹریٹ پر دائیں طرف تیسری عمارت۔" یہ سب کہہ دینے کے بعد میرے لیے جیسے ایک واضح راستہ تیار ہو گیا۔ چنانچہ میں بغیر کسی جھجک اور خوف کے اُٹھ کھڑا ہُوا۔ "ٹھیک دس بجے پہنچ جانا..." میں نے اُنھیں دوبارہ تاکید کی اور دروازے کی جانب چل دیا۔

"رخصت ہونے سے قبل ایک بار پھر سُن لو کہ آج تک کسی نے مائیک کو ہوشیاری دکھانے کی جرأت نہیں کی۔ تم بھی ذرا دیکھ بھال کر ہی چلنا۔" وہ دیوان سے نیچے آ گیا تو اُس کے تن و توش کا مجھے صحیح اندازہ ہُوا۔ بلاشبہ وہ ایک غیر معمولی جسامت کا مالک تھا لیکن میں نے اندرونی اضطراب اور خوف کو بڑی خوب صورتی کے ساتھ ایک مسکراہٹ میں چھپا لیا اور محض سر کی اثباتی جنبش سے جواب دے کر ایک طائرانہ نظر سام پر ڈالی۔

"تم نے شاید کوئی اور غلط راستہ منتخب کر لیا ہے۔" سام غصیلی آواز میں بولا۔ "بہرحال، اس مرتبہ بھی تمھیں ندامت اور شکست کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو گا۔"

اُسے نظر انداز کرتا ہُوا، میں مائیک کو خدا حافظ کہہ کر دروازے سے نکل آیا۔

نیچے وہی کانچ کی گڑیا کاؤنٹر پر موجود تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر دوستانہ انداز میں مسکرائے اور میں طویل راہ داری میں تیز تیز قدم اُٹھاتا، باہر آ گیا اب مجھے اُس چوتھے شخص کو فون کرنا تھا تاکہ ڈرامے کا آخری منظر بھی مکمل ہو سکے۔

"ہیلو..." میں نے قریبی ریستوران کے بُوتھ سے، رابطہ قائم کرتے ہُوئے کہا۔

"انسپکٹر فرینک!" دوسری جانب سے مانوس کھُردری آواز سُنائی دی۔

"رونی روجر..." میں نے آہستہ سے اپنا نام بتایا۔ "فرینک میں آج شب تم سے ملنا چاہتا ہُوں۔"

"کیا...؟" وہ شاید حیران رہ گیا تھا۔ "تم جتنی جلدی آؤ گے، تمھارے حق میں بہتر ہو گا۔"

"یہ ملاقات پولیس اسٹیشن میں نہیں بلکہ تمھارے گھر پر ہو گی۔" میں نے اُس کی حیرت میں اضافہ کرتے ہُوئے کہا۔ "اور میرے ساتھ دو اور آدمی بھی ہوں گے لیکن تم اپنے اپارٹمنٹ سے ہر وہ چیز ہٹا دینا جس سے تمھاری پولیس کی مخصوص حیثیت واضح ہوتی ہو۔"

"تم کیا کرنا چاہتے ہو؟" وہ تعجب سے بولا لیکن اس وقت میں اُسے کچھ نہیں سمجھا سکتا تھا۔ میں نے فون بُوتھ کی کانچ کی دیوار سے سام کو اسی طرف آتے دیکھ لیا تھا۔ "دس بجے شب تمھارے اپارٹمنٹ میں..." میں نے فرینک کو یاد دہانی کرائی جس لمحے سام دروازہ کھولنے ہی والا تھا، میں نے اسی وقت رلیسیور رکھ دیا۔

"کس سے بات کر رہے تھے؟" وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

"اپنی منگیتر سے پُوچھ رہا تھا کہ وہ اب بھی مجھ سے محبت کرتی ہے یا نہیں۔ کیوں کہ چند کتّے میرے پیچھے لگے ہُوئے ہیں۔" میں نے اُسے کینہ توز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔

"اچھا...!" اُس نے بھنّا کر سختی سے میرا بازو تھاما اور جیب میں رکھے ریوالور کی نال کا دباؤ میری پسلی پر بڑھا دیا۔ "خاموشی سے باہر چلو۔"

"دیکھو سام یہاں گلیوں اور سڑکوں پر دنگا فساد مجھے بالکل پسند نہیں۔ کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ ہم دس بجے تک کسی جگہ ٹک کر بیٹھ جائیں۔ اس طرح تم بھی میرا تعاقب کرنے کی مصیبت سے بچ جاؤ گے۔ مجھے بھوک لگی ہے اس لیے میں کچھ کھانا بھی چاہتا ہُوں۔"

وہ مجھے ایک نفیس آرائش والے اپارٹمنٹ میں لے گیا اور پھر باقی دوپہر میں نے ہر قسم کے خوف سے بے نیاز ہو کر گزار دی۔ اصل مصیبت کے آنے میں ابھی کئی گھنٹے باقی تھے۔ سام نے جو کھانا پیش کیا وہ بھی اپارٹمنٹ ہی کی مانند نفیس تھا لہٰذا میں نے ڈٹ کر کھایا۔

دس بجنے میں پندرہ منٹ رہ گئے تو ایک باوردی شوفر نے اندر آ کر اطلاع دی۔ "مسٹر مائیک گاڑی میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

"چلو بھئی!" میں نے خود ہی آگے بڑھ کر سام کا بازو تھام لیا۔ وہ مسلسل برہمی کا شکار نظر آ رہا تھا۔ میری اس پیش کش کے جواب میں بھی نہایت خفگی اور طیش کے عالم میں اُس نے بازو چھڑایا اور مجھے ٹھوکر مار کر اپنے آگے کر لیا۔

گاڑی میں بیٹھتے وقت مجھے مائیک کے مزاج کا اندازہ نہ ہو سکا۔ وہ بڑی بے پروائی سے پائپ پینے میں مشغول تھا۔ ہمارے بیٹھتے ہی گاڑی روانہ ہو گئی۔

انسپکٹر فرینک میری تاکید کے مطابق سادہ لباس میں تھا اور اپنے اپارٹمنٹ سے بھی اس نے وہ تمام اشیا ہٹا دی تھیں جن سے اس کی حیثیت کا اندازہ ہو سکتا تھا۔ جب ہم اپارٹمنٹ میں داخل ہو گئے تو اُس نے بیرونی دروازہ بند کیا اور واپس آ کر ایک کُرسی پر بیٹھ گیا۔

"میں نے آج بے حد مصروف دن گزارا ہے۔" انسپکٹر فرینک نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ وہ شاید اس بوجھل ماحول کو کچھ کہہ کر خوشگوار بنانا چاہتا تھا۔ جواب میں کسی نے کچھ نہ کہا البتہ سام نے نگاہیں پھرا لی تھیں جب کہ مائیک کا انداز ایسا تھا جیسے فرینک اس کے لیے ناقابلِ فہم رہا ہو۔ وہ شُبہے کی نظروں سے اُسے ٹٹول رہا تھا۔ ادھر میری حیثیت بھی مشکوک سی ہونے لگی تھی مجھے فرینک کو اسی وقت کچھ نہ کچھ اشارہ دے دینا چاہیے تھا جب میں نے یہ پروگرام بنایا تھا لیکن سام نے بروقت وہاں آ کر میری یہ کوشش ناکام بنا دی تھی۔

"تم لوگ کیا کھیل کھیلنے جا رہے ہو؟" کوئی جواب نہ پا کر فرینک نے دوبارہ کہا۔

"تم بھی کھیلو گے؟" مائیک نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "سب سے پہلے تو تمھیں اس سوال کا جواب دینا ہو گا کہ تم نے کل کی رات کہاں بسر کی تھی؟"

"کل رات؟" فرینک کچھ سوچنے لگا۔ "یہیں... اسی جگہ..." بالآخر اس نے جواب دیا۔

"تنہا تھے یا کوئی اور بھی اس امر کا گواہ ہے؟" مائیک نے اگلا سوال کیا۔

"بالکل تنہا... ہمیشہ کی طرح..." انسپکٹر فرینک کے لہجے میں گھُلی ہُوئی کڑواہٹ صرف میں ہی محسوس کر سکا۔ مائیک نے بے تابی سے سر گھُمایا اور میری طرف دیکھنے لگا سام بھی بے چین سا ہو گیا اور مجھے یُوں محسوس ہونے لگا جیسے بازی شاید اُلٹ جائے گی اور میں اس صورتِ حال پر قابو نہیں پا سکوں گا۔

"فی الحال زیادہ جلد بازی دکھانے کی ضرورت نہیں۔" مائیک نے گہری خاموشی کو توڑتے ہُوئے کہا۔ "ذرا اِسے اور بول لینے دو کہ یہ کیا کہتا ہے۔" اُس کا اشارہ میری جانب تھا اور وہ سام سے مخاطب تھا۔

اب مجھے کچھ نہ کچھ کہنا تھا ورنہ شاید پھر حشر کے روز ہی بولنے کی نوبت آتی۔ سام کے ہولسٹر سے جھانکتا ہُوا ریوالور بھی میں نے دیکھ لیا تھا۔ "میں ایک مختصر سی کہانی سناتا ہُوں۔" میں نے تیزی سے کہا۔ "تمھاری ایک لڑکی سے کہیں ملاقات ہُوئی تھی۔" یہ کہتے ہُوئے میں نے رُخ فرینک کی طرف کر لیا۔ "وہ لڑکی بہت اچھی تھی... گھریلو اور سگھڑ قسم کی... لیکن ایسی لڑکیوں کی وجہ سے عموماً یہ پریشانی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ فوراً ہی گلے کا ہار بن جاتی ہیں اور شادی پر اصرار کرنے لگتی ہیں۔ جب کہ تم اُس شریف لڑکی کے ساتھ محض خوش گوار وقت گزار رہے تھے۔ شاید تم سے بددِل ہو کر یا پھر تمھیں جلانے کے لیے اُس نے میلکم سے بھی ملنا جُلنا شروع کر دیا۔ میلکم اس لڑکی کے سلسلے میں سنجیدہ ہوتا چلا گیا اور پھر تمھارے دل میں بھی لڑکی کے لیے محبت جاگ اُٹھی لیکن اب وہ لڑکی، دوبارہ تمھارے دامِ فریب میں آنے پر آمادہ نہیں تھی۔ میلکم نے اُسے چند روز بعد اپنانے کا وعدہ کر رکھا تھا لہٰذا وہ تمھاری باتوں میں نہیں آئی البتہ تمھاری جانب سے خوف زدہ رہنے لگی تھی۔ پھر میلکم کے مشورے پر وہ ایک شخص کے ہاں چند روزہ گھریلو ملازم بن کر رہنے کے لیے آمادہ ہو گئی۔ اِس اثنا میں ایک شب میلکم اُسے اپنے کانی کلب سے واپس چھوڑنے آیا تو تمھارے ساتھ ایک اور شخص بھی، اپنے مفاد کی خاطر اُسے ٹھکانے

لگانے پر تُلا بیٹھا تھا چنانچہ گھر کے مالک کو پھنسانے کا ڈرامہ رچا کر بعض جعلی خطوط میلکم کی جیب میں رکھ دیے اور تنہا گھر میں اُسے قتل کر ڈالا۔ لڑکی جو پہلے ہی خوف زدہ تھی، منحنی سے سام کی دھمکی میں آ گئی اور اُس نے یہی سمجھا کہ میلکم کا قاتل اُس گھر کا مالک ہے اور اُسی کے کہنے میں آ کر سام نے اُسے مار ڈالا ہے لیکن ڈرامہ ابھی تک ادھورا ہی تھا۔ تمھاری کہانی تو یہیں تک تھی مگر لڑکی کو قتل کر کے مالک یعنی مجھے پھنسانے کا چکر تو خود سام ہی کو چلانا تھا چنانچہ اُس نے لڑکی کو بھی مار ڈالا تاکہ پھانسی کا پھندہ بہر حال میرے ہی گلے میں ڈالا جا سکے۔“

ابھی میں یہیں تک پہنچا تھا کہ سام کا جھانکتا ہُوا ریوالور میری توقع کے عین مطابق کوٹ سے نکل کر اُس کے ہاتھ میں پہنچ گیا لیکن دُوسری حرکت میرے لیے بے حد خلافِ توقع تھی۔ انسپکٹر فرینک جس نشست پر بیٹھا تھا، اُس نے برق کی سی سرعت کے ساتھ کُرسی کے کُشن کے نیچے سے اپنا سروس ریوالور نکالا اور فوراً ہی فائر کر دیا۔ لڑکھڑاتے ہُوئے سام نے، پہلے تو ریوالور والے ہاتھ سے دیوار کا سہارا لینا چاہا لیکن پھر وہ ریوالور سمیت اوندھے مُنہ قالین پر آ رہا۔ اُس کے دونوں بازو اُس کے آگے سیدھے پھیل گئے اور سینے سے خُون رِستا ہُوا باہر چرمی جیکٹ تک آ گیا وہ شاید گولی لگتے ہی مر گیا تھا۔ مائیک بے پروائی سے یہ ساری کارروائی دیکھتا رہا... وہ غالباً سام کی بے جگری اور موقع شناسی کو بھی آزمانا چاہتا ہو گا لیکن جب اُسے یُوں کسی چوہے کی مانند مَسل کر پھینک دیا گیا تو اُس نے مزید توجہ سے اس کی طرف دیکھا اور پھر ہنسنے لگا۔ اُس کی ہنسی بڑی ہی بھیانک تھی... پھر وہ جھومتے ہُوئے اُٹھا اور قریب پہنچ کر بایاں ہاتھ گھُما کر میرے جبڑے پر رسید کر دیا۔ مجھے واقعی دن میں تارے دکھائی دے گئے تھے۔ میں اُلٹ کر صوفے سے جا ٹکرایا تھا مجھے گلابی گلابی سی دُھند ہر طرف پھیلتی محسوس ہونے لگی تھی اور شاید چند ثانیے کے لیے میرے حواس ہی جواب دے گئے تھے

کچھ دیر بعد تھوڑی سی دُھند چھٹی تو مجھے مائیک کا سُرخ چہرہ دُھندلا دُھندلا سا دکھائی دیا۔ طیش اور انتقام کی آگ نے اُس کے نقوش تک بگاڑ دیے تھے۔ اُسے دوبارہ ہاتھ اُٹھائے اپنی جانب بڑھتے دیکھ کر میں اپنا سر بچانے کے لیے بے اختیار ایک طرف ہٹ گیا اس کے باوجود میرے ایک رخسار کی شاید جلد پھٹ گئی ہو گی۔ ضرب اپنے ہدف تک نہ پہنچنے کے باوجود بھی شدید تھی۔ میں جھومتا ہُوا مختلف اشیا کا سہارا لے کر اُٹھا اور بالآخر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ کمرہ اور اس کی ساری چیزیں ابھی تک متواتر گردش میں محسوس ہو رہی تھیں حتیٰ کہ مائیک بھی کمرے میں منڈلاتا نظر آ رہا تھا۔

”مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ تم کیا کرنا چاہتے ہو۔“ انسپکٹر فرینک نے مجھ سے کہا۔ ”جب تم ان دونوں کو ساتھ لے کر آئے تو میں فوراً سمجھ گیا کہ تمھیں ڈرامے کے تمام کرداروں کا علم ہے لیکن سام اُس لڑکی روزی کا قاتل ہو گا، یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں تھا البتہ وہ میلکم والا ڈرامہ...“ انسپکٹر فرینک خاموش ہو کر مجھے گھُورنے لگا اور میں نے جلدی سے دونوں ہاتھ اپنے چہرے کے سامنے بطور ڈھال رکھ لیے۔ مائیک نے اِدھر اُدھر چکراتے ہوئے، اب میز پر رکھا شیشے کا وزنی راکھ دان اُٹھا لیا میرے سر کا نشانہ لینے کے لیے اپنا بازو جھُلانے لگا۔ دفعتاً انسپکٹر فرینک کے ریوالور نے دوسرا شعلہ اُگل دیا۔ مائیک کا پیچھے کی جانب گیا ہُوا ہاتھ، وہیں ساکت ہو گیا۔ راکھ دان اُس کی انگلیوں سے چھُوٹ کر گھِستا ہُوا دیوار سے جا ٹکرایا اور خود کسی ہاتھی کی مانند دھڑام سے قالین پر آ رہا۔

”شکریہ فرینک!“ میں نے انسپکٹر کی طرف دیکھے بغیر کہا اور دو عدد لاشوں کے ساتھ خود بھی فرش پر لمبا لیٹ گیا۔ مائیک کے ڈیڑھ گھونسے نے صحیح معنوں میں میرا ابجر کس نکال دیا تھا۔

”روفی...!“ چند لمحے بعد میرے چکراتے ہوئے دماغ میں انسپکٹر کی آواز گونجی۔ ”کیا تم فون پر اپنی منگیتر ارلین کو اطلاع نہیں دو گے کہ تم نہ صرف بقیدِ حیات ہو بلکہ ہر قسم کی قید و بند سے آزاد بھی ہو چکے ہو؟“

”کیوں نہیں...“ میں خود کو سنبھال کر اُٹھ بیٹھا پھر جھُومتا ہُوا کھڑا ہو گیا۔ کونے میں موجود فون کی طرف بڑھتے ہُوئے ایک لمحے کے لیے یہ افسردہ سا احساس بھی اچانک میرے اندر جاگ گیا کہ مقتول لڑکی، روزی ایک اچھی بیوی بننے کے قابل تھی۔ اگر حالات مختلف نہ ہوتے تو آج انسپکٹر فرینک کی تنہا زندگی میں اُس نے اپنے حُسن اور سلیقے کی وجہ سے اَن گنت خوبصورت رنگ بکھیر دیے ہوتے۔

ساکا

صابر حسین

وہ سمجھتا تھا کہ انسانوں کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہوتا اور دولت دو محبت کرنے والوں کے درمیان دیوار نہیں بن سکتی

میرا نام جیمس تھامس مارٹن ہے۔ عمر تیس سال ہے اور ہارورڈ یونیورسٹی کا تعلیم یافتہ ہُوں۔ آج سے پانچ سال پہلے مشہور کروڑپتی ڈگلس لی نے مجھے اپنا پرائیویٹ سیکرٹری رکھ لیا۔ اس کے تقریباً دو سال بعد میری ملاقات ڈگلس کی حسین و جمیل بیٹی ڈیانا سے ہوئی اور پہلی ملاقات میں ہی اس سے محبت ہو گئی۔ ڈیانا کی ممی بٹریس کی بڑی خوش خلق اور بامروت خاتون تھیں اور میرے

وقار اعظم

ساتھ اُن کا برتاؤ نہایت مشفقانہ اور ہمدردانہ ہوتا۔ ڈیانا کی محبت نے میرے وجود میں ایک تلاطم سا بپا کر دیا تھا اور کائنات ایک نئے حسن و رعنائی کے ساتھ میری آنکھوں کے سامنے جلوہ نما ہو گئی تھی۔ زندگی ایک نئے سانچے میں ڈھل گئی تھی اور اس میں ایک اضطراب آگیں تغیر آ گیا تھا۔ لگتا تھا ڈیانا کی محبت اور رفاقت میری زندگی سے مشروط ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کی دید و شنید کے بغیر ایک جمود سا طاری ہو جاتا تھا اور اُس پر نظر پڑتے ہی زندگی تیزی سے اپنے محور پر گھومنے لگتی تھی۔

آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ میں نے ڈیانا سے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے یقین تھا کہ اُس کا باپ بہ خوشی رضامند ہو جائے گا لیکن جب میں نے اُس سے ذکر کیا کہ میں ڈیانا سے شادی کرنا چاہتا ہوں تو وہ اُچھل پڑا جیسے اُس کے پیروں سے سانپ چھو گیا ہو۔

"تمھیں یہ جرأت کیسے ہوئی کہ میری بیٹی سے شادی کی سوچو۔۔" ڈگلس نے غضب ناک لہجے میں کہا تھا۔ "جانتے ہو اُس کے اور تمھارے درمیان کتنا بُعد ہے؟"

"میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ انسانوں کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہوتا۔" میں نے نرمی سے جواب دیا تھا۔ "اگر آپ کی مراد دولت ہے تو اُس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"بہت فرق پڑتا ہے مسٹر۔" اُنھوں نے حقارت سے کہا تھا۔ "میں اپنی بیٹی کی شادی اپنے ملازم سے نہیں کر سکتا۔ عافیت اسی میں ہے کہ اُس کا پیچھا چھوڑ دو۔"

اُسی روز میں ڈیانا سے ملا تھا اور اُسے، اُس کے ڈیڈی کے فیصلے سے آگاہ کیا۔ "اب کیا ہو گا ڈیانا؟" میں نے یاس انگیز لہجے میں پوچھا۔

"جو تم چاہو گے وہی ہو گا۔" ڈیانا نے جواب دیا۔

اس پر ہم دونوں نے فرار کا منصوبہ بنایا اور ایک روز موقع پا کر گھر سے نکل گئے لیکن بدقسمتی سے جب ہم اسٹیشن پر پہنچے تو ڈیانا کے ڈیڈی نے ہمیں دیکھ لیا۔ وہ اُس وقت اسٹیشن پر موجود تھے۔ اس کوشش ناتمام کے نتیجے میں مجھے ملازمت سے الگ کر دیا گیا اور ڈیانا کو اُس کی ممی کے ساتھ کسی دوسرے مقام پر بھیج دیا گیا۔

یہ آج سے چار ماہ پہلے کی بات ہے۔

مسٹر ڈگلس نے محض اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ متعدد سُراغ رسانوں کو میرے تعاقب میں لگا دیا۔ وہ بہر طور اپنی بیٹی کو مجھ سے دُور رکھنا چاہتا تھا۔ کچھ عرصہ اس طرح گزر گیا اور مجھے ڈیانا کے متعلق کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ فروری کے ابتدائی ایام تھے کہ مجھے پتہ چلا کہ ڈیانا اپنی ممی کے ہمراہ جزیرۂ گیلین روانہ ہونے والی ہے جہاں وہ ایک شکار پارٹی کے ساتھ مچھلی کے شکار میں حصّہ لے گی۔ میں نے اپنا مختصر سا سامان باندھا اور گیلین روانہ ہو گیا اگرچہ مجھے یہ معلوم تھا کہ ڈگلس بھی وہاں موجود ہو گا۔ لیکن اس کے باوجود میں قسمت آزمائی کی مہم سے دست بردار نہیں ہُوا۔

میں جزیرۂ گیلین سے بہ خوبی واقف تھا۔ اپنی ملازمت کے دوران میں تین بار وہاں جا چکا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے جو فلوریڈا کے جنوب میں دو تین میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ عرصہ ہُوا مسٹر ڈگلس ہی نے یہ جزیرہ خرید لیا تھا۔ جزیرے میں ان دنوں تین آدمی اپنی اپنی کشتیوں کے ساتھ مستقل طور پر گھومتے رہتے تھے۔ ان میں سے ایک کا نام جوزف تھا جو فلوریڈا ہی کا رہنے والا تھا۔ دوسرے کا نام ابرٹ اور تیسرے کا نام گراہم تھا۔ یہ دونوں کسی دوسری ریاست سے آئے تھے۔ میں اگرچہ ان تینوں سے اچھی طرح واقف تھا، مگر پھر بھی گراہم سے میرے تعلقات کچھ زیادہ ہی اچھے تھے۔ میں نے گراہم کو تار دیا کہ وہ مجھے ریلوے اسٹیشن پر ملے۔

گراہم بڑی خندہ پیشانی سے ملا اور میں نے اُسے سب کچھ بتا دیا۔

"اگر میں تمھیں اپنے جہاز پر ملازم رکھ لوں، مسٹر ڈگلس کو تو کوئی اعتراض نہ ہو گا؟" گراہم نے میری رام کہانی سننے کے بعد پوچھا۔

"اُسے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟" میں نے ارادتاً جھوٹ بولا اور گراہم نے مجھے اپنے چھوٹے سے جہاز پر ملازم رکھ لیا۔

◆

تقریباً ایک ہفتے کے بعد ڈیانا بھی وہاں آ پہنچی۔ میری مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ ایک طویل اور صبر آزما جدائی کے بعد ڈیانا سے ملاقات کی صورت پیدا ہوئی تھی۔ میں نے گراہم سے کہا کہ وہ مسٹر ڈگلس کو میری موجودگی کے متعلق کچھ نہ بتائے کیوں کہ میں اس سے خود بات کرنا چاہتا تھا۔ گراہم نے تو میری بات مان لی لیکن اس کے دوسرے ساتھی جوزف نے جلد بازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ڈگلس کو بتا دیا۔

"تمھیں یہاں آنے کی جرأت کیسے ہوئی؟" ڈگلس نے سیخ پا ہوتے ہوئے پوچھا۔ "کیا میں نے تمھیں خبردار نہیں کیا تھا کہ میرے قریب آنے کی کوشش مت کرنا۔ تم ڈیانا سے نہیں مل سکتے۔"

"مجھے ڈیانا سے محبت ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"میں اسے برداشت نہیں کر سکتا۔" ڈگلس نے چیخ کر کہا۔ "تم اُس سے محبت نہیں کر سکتے۔"

"آپ کی بیٹی سے محبت کرنا کوئی جرم تو نہیں؟"

"محبت کرنا کوئی جرم نہیں لیکن میری بیٹی سے... اور خصوصاً تمھارا اُس سے محبت کرنا بہت بڑا جرم ہے۔" ڈگلس نے قہر آلود لہجے میں کہا۔ "میں تمھیں صرف آدھ گھنٹے کی مہلت دیتا ہوں۔ آدھ گھنٹے کے اندر اندر یہاں سے نکل جاؤ ورنہ میں تمھیں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ یہ میری آخری وارننگ ہے۔"

"یہ ناممکن ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "اس وقت رات ہے اور رات کو یہاں سے کوئی ٹرین شہر نہیں جاتی۔ ٹرین کے علاوہ کسی اور سواری کا حصول ناممکن ہے۔"

"تو پیدل چلے جاؤ۔" وہ گرج دار آواز میں بولا۔

"میں نے کہہ دیا ہے نا کہ میں اس وقت کہیں نہیں جاؤں گا۔ میں گراہم کا ملازم ہوں اور اُس کی اجازت کے بغیر میں کہیں نہیں جا سکتا۔ آپ مجھے اپنے کمرے سے نکلوا سکتے ہیں، جزیرے سے نہیں۔" میں نے قدرے درشت لہجے میں کہا۔

"یہ جزیرہ میری ملکیت ہے۔ میری مرضی کے بغیر تم یہاں نہیں رہ سکتے۔"

"مجھے اس سے کب انکار ہے۔" میں نے دھیرے سے کہا۔

اتنی دیر میں گراہم بھی آ گیا۔ ڈگلس نے اُس سے کہا کہ اس آدمی کو جلد از جلد یہاں سے چلتا کرے۔ گراہم نے اُس کی بات مان لی اور باہمی سمجھوتے سے یہ طے پایا کہ میں اگلی صبح یہاں سے چلا جاؤں گا اور گراہم مجھے اسٹیشن تک خود چھوڑنے جائے گا۔

صبح چھ بجے کے قریب گراہم نے مجھے اٹھا دیا۔ "جلدی کرو جم، ممیاں شکار کے لیے روانہ ہونے والی ہیں۔"

"شکریہ۔" میں نے بستر چھوڑتے ہوئے کہا۔ "میں تمھارا بے حد ممنون ہوں کہ...۔"

"چھوڑو یار ان باتوں کو۔ جلدی سے تیار ہو جاؤ، میرا خیال ہے تمھاری مراد پوری ہو جائے گی۔"

"تو کیا ڈیانا اسی کشتی میں ہے؟" میں نے فرطِ مسرت سے کہا۔

"ہاں۔" گراہم نے مسکرا کر جواب دیا۔

"کیا میں اس سے ملاقات کر سکتا ہوں؟ تمھیں کوئی اعتراض تو نہیں ہو گا؟"

"مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔" گراہم بولا۔ "بہرحال احتیاط کی ضرورت ہے۔ ڈگلس کو پتہ چل گیا تو غضب ہو جائے گا۔"

"اور کون کون ہے ہماری کشتی میں؟" میں نے کپڑے بدلتے ہوئے کہا۔ ڈیانا سے ملاقات کے تصور نے مجھ پر ایک ہیجانی کیفیت طاری کر دی تھی۔

"ہماری کشتی موریلی نام کے ایک شخص نے ہائر کی ہے۔" گراہم نے جواب دیا۔ "وہ نیویارک میں وکالت کرتا ہے۔ سُنا ہے بڑا مشہور وکیل ہے۔ اُس کے ساتھ مسٹر ڈگلس کا ایک دوست میلویل اور اُس کی لڑکی بھی ہے۔"

"میلویل؟" میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"کیا تم میلویل سے واقف ہو...؟" گراہم نے استفسار کیا۔

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "وہ ڈگلس کے دیرینہ رفیق ہیں بلکہ یہ سمجھو کہ لنگوٹیے ہیں۔ ایک زمانے میں دونوں ہی بیٹرائس سے محبت کرتے تھے لیکن بیٹرائس کی شادی ڈگلس سے ہو گئی اور تمھیں یہ جان کر حیرت ہو گی کہ میلویل اور ڈگلس کی دوستی میں کوئی فرق نہ آیا۔"

"اچھا تو میں اب اوپر جا رہا ہوں۔" گراہم بولا۔ "تم میرے پیچھے پیچھے چلے آنا لیکن محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔"

"تم کوئی فکر نہ کرو۔ میں جلد بازی کا قائل نہیں ہُوں۔"

●

چھت پر پہنچتے ہی میری نظر ڈیانا پر پڑی۔ وہ میری طرف پیٹھ کیے بیٹھی تھی۔ اُس کے سنہرے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ میں نے گراہم کی طرف دیکھا تو اُس نے مجھے اشارتاً سمجھایا کہ آگے بڑھو، سنہرا موقع ہے۔

میں ابھی آگے بڑھا ہی تھا کہ ڈیانا نے پلٹ کر دیکھا اور مجھ پر نظر پڑتے ہی تحیر زدہ رہ گئی۔ "جم، تم؟" اور اس سے پہلے کہ میں قدم اُٹھاتا، وہ تیزی سے میری طرف لپکی اور گرد و پیش کی پروا کیے بغیر میرے بازوؤں

بسم اللہ الرحمن الرحیم
ھو الشافی
یونانی طریقہ علاج
بیرونی حضرات کیلئے خط و کتابت کے ذریعہ مشاورہ کی سہولت

طباآئل	بالوں کی نشو و نما اور افزائش کا قدرتی علاج
وجینا	خواتین کی عام جسمانی کمزوری اور لیکوریا جیسے موذی مرض کی کامیاب دوا
مینینا	خواتین کے ایام حیض کا مکمل علاج
ہائیٹینا	قد اور جسمانی نشو و نما کیلئے، بچوں، بڑوں کیلئے یکساں مفید
ڈائبٹکس	ذیابیطس کا مکمل تدارک
لیٹکس	مردوں کی دماغی جسمانی اور اعصابی تقویت اور توانائی کیلئے بہترین ٹانک
یمانی	احتلام و جریان کی کامیاب دوا
وامینا	نزلہ زکام کھانسی کو جڑ سے ختم کر دیتا ہے۔
شنائل	عرق النساء پٹھوں اور جوڑوں کے درد کیلئے

نوٹ: مندرجہ بالا ادویات قدرتی جڑی بوٹیوں سے تیار شدہ ہیں، جو کہ آپ کے مزاج کے عین مطابق ہیں ہر کورس ۲۱ یوم کا ہے۔ قیمت ۲/۰ روپے فی کورس ہے، علاوہ محصول ڈاک و پیکنگ ۵/۰ روپے۔ مزید معلومات اور مشورے کیلئے جوابی لفافہ بھیجیں۔

شمع لیبارٹریز (یونانی)
پوسٹ بکس نمبر ۱۱۴۹۷
کراچی نمبر ۵

ہیں سمائی چلی گئی۔

"تم کب پہنچے، کیا ڈیڈی نے تمھیں نہیں دیکھا؟" وہ تجسّس بھری آواز میں بولی۔

"کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم نیچے ہی چلیں؟"

"ٹھیک ہے۔ جلدی کرو۔" وہ مجھے گھسیٹتے ہوئے بولی۔

نیچے پہنچ کر ہم گرد و پیش سے بے خبر ہو گئے۔ ہماری محویت کا یہ عالم تھا کہ ہمیں وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہوا اور ہماری یہ محویت اُس وقت ٹوٹی جب گراہم کی تشویش بھری آواز سنائی دی۔

"جلدی کرو جم! فوراً اوپر پہنچو۔" اُس نے چیخ چیخ کے کہا تھا۔

ہم بھاگتے ہوئے چھت پر پہنچے تو سبھی کو حیران حیران سا پایا۔ "کیا بات ہے گراہم؟" میں نے اُس کے قریب پہنچتے ہوئے کہا۔

"ادھر دیکھو۔" گراہم نے زرد رنگ کے لائف بوائے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں کشتی کو اس کے قریب لے جاتا ہوں اور تم اسے پکڑنے کی کوشش کرنا۔" گراہم بولا اور کشتی تیزی سے لائف بوائے کی طرف بڑھنے لگی۔ قریب پہنچتے ہی میں نے پانی میں چھلانگ لگا دی اور رسّے کی مدد سے اُسے کشتی کے ساتھ لگا دیا۔ لائف بوائے کے ساتھ رسّے میں لپٹا ہوا ایک چھوٹا سا نیزہ بھی تھا۔ اسے مچھروں کا نیزہ بھی کہتے ہیں۔ میلویل اور میں نے لاش کو اُٹھا کے ڈیک پر رکھا اور جب ہم نے اسے سیدھا کیا تو فرطِ غم سے ڈیانا کی چیخ نکل گئی۔

"ڈیڈی۔۔" وہ لاش کے اوپر جا گری تھی۔

۔۔۔ یہ لاش اُس کے باپ ڈگلس بی کی تھی۔

ہم سب تحیّر زدہ سے کھڑے تھے۔

"میرا خیال ہے مسٹر ڈگلس کو شب کے پچھلے پہر قتل کیا گیا ہے۔" میں نے گراہم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہم تمھارا مطلب نہیں سمجھے۔۔۔؟" میلویل نے حیرت سے کہا۔

"میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ رات بارہ بجے تک تو میں اُن کے پاس تھا۔" میں نے جواب دیا۔ "لہٰذا اس میں کسی شبہے کی گنجائش نہیں کہ انھیں بارہ بجے کے بعد ہی کسی وقت قتل کیا گیا ہے۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ڈگلس کو تمھی نے قتل کیا ہے۔" میلویل نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے معلوم ہے اُس نے تمھیں ملازمت سے کیوں علیحدہ کر دیا تھا؟ تم ایک عرصے سے انتقام کی فکر میں تھے۔"

"تمھارے پاس کیا ثبوت ہے مسٹر میلویل؟" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"تمھارے اپنے بیان سے ظاہر ہے۔"

"تمھیں غلط فہمی ہوئی ہے مسٹر میلویل۔" میں نے قدرے تلخی سے کہا۔ "مسٹر ڈگلس کو میں نے قتل نہیں کیا۔"

"ہمیں ایسی باتوں سے گریز کرنا چاہیے۔" گراہم نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "قتل کی تفتیش پولیس کی ذمہ داری ہے نہ کہ ہماری۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے ڈگلس کے سینے سے نیزہ نکالا۔

"میرا خیال ہے ہمیں جلد از جلد واپس پہنچنا چاہیے۔" گراہم بولا۔ "مسٹر ڈگلس کو مطلع کرنا ضروری ہے۔"

"کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں۔۔۔؟" موریلی مجھ سے مخاطب ہوا۔

"جیمس مارٹن۔۔۔" میں نے اختصار سے کام لیتے ہوئے جواب دیا۔

"مجھے موریلی کہتے ہیں۔۔" اُس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ "میں نیویارک میں وکالت کرتا ہوں۔ مجھے صرف فوجداری مقدمات سے دلچسپی ہے۔"

"تو ایسی صورت میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟" میں نے اُس کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا۔

"میں آپ سے چند ایک سوالات پوچھنا چاہتا ہوں۔" موریلی بولا۔ "آپ مجھے اجازت دیں گے؟"

"میں مجرم تو نہیں ہوں کہ آپ مجھ پر جرح کرتے پھریں۔"

"میں آپ کو مجرم تو نہیں سمجھتا، پھر بھی چند ایک باتوں کی وضاحت ضروری ہے۔" موریلی بولا۔

"اگر تم نے میرے ڈیڈی کو قتل نہیں کیا تو تمھیں خوف زدہ نہیں ہونا چاہیے۔ میں تمھارے ساتھ ہوں۔" ڈیانا نے آب دیدہ ہو کر کہا۔

"کیا یہ درست ہے کہ مسٹر ڈگلس نے آپ کو ملازمت سے الگ کر دیا تھا؟" موریلی نے پوچھا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے دھیرے سے کہا۔

"اور گزشتہ شب آپ کی اُن سے تلخ کلامی بھی ہوئی تھی؟"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔"

"کس وقت؟"

"مجھے ٹھیک سے نہیں معلوم۔"

"آپ کو مسٹر ڈگلس سے شدید نفرت تھی؟"

"یہ غلط ہے۔" میں نے غصے سے کہا۔

"آپ مسٹر ڈگلس سے کس بات پر جھگڑے تھے؟"

"آپ تجاہلِ عارفانہ سے کام لے رہے ہیں مسٹر موریلی۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ مسٹر میلویل آپ کو سب کچھ بتا چکے ہیں۔"

"مسٹر ڈگلس سے تکرار کے بعد آپ کہاں چلے گئے تھے؟" موریلی نے پوچھا۔

"میں اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"کیا آپ اپنی بے گناہی کا ثبوت پیش کر سکتے ہیں؟"

"افسوس کہ میں آپ کو اب کچھ نہیں بتا سکتا۔" میں نے فیصلہ کُن لہجے میں جواب دیا۔ "مجھے جو کچھ کہنا ہوگا، پولیس سے کہہ دوں گا۔"

"مسٹر موریلی۔" اچانک گراہم کی آواز ابھری۔ "آپ پہلے میری بات کا جواب دیجیے۔"

"تم کیا پوچھنا چاہتے ہو؟" موریلی نے حیرت سے کہا۔

"کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ لاش اس جگہ کیوں کر پہنچی ہے؟" گراہم نے پوچھا۔

"ظاہر ہے تیرتی ہوئی۔۔۔" موریلی نے جواب دیا۔

"یعنی پانی کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ۔" گراہم نے کہا۔ "اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسٹر ڈگلس کو اوپر لے جا کر قتل کیا گیا ہے کیوں کہ لاش کو اتنی دور تک لے جانا ناممکن ہے۔ ہمارے پاس صرف تین بڑی موٹر بوٹس ہیں۔ ایک میری، ایک البرٹ کی اور ایک جوزف کی۔"

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں مسٹر گراہم؟" میلویل نے استفسار کیا۔

"میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مسٹر ڈگلس کو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت قتل کیا گیا ہے۔" گراہم بولا۔

"اور تم کسے قاتل سمجھتے ہو؟" موریلی نے پوچھا۔ "جیمس کو؟ البرٹ کو؟ جوزف کو یا ہم میں سے کسی کو؟"

"مجھے کسی پر شک نہیں ہے۔" گراہم بولا۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "جم، کشتی کو اور تیز چلاؤ، ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔"

اور جب ہم گودی پر پہنچے تو میلویل نے ڈیانا کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ "میں مس ڈیانا کے ساتھ جا رہا ہوں کیونکہ مسز ڈگلس کو مطلع کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔"

"لاش کو کوئی شخص ہاتھ نہیں لگائے گا۔" موریلی نے گراہم سے کہا۔ "اب ہمیں دوسری دونوں کشتیوں کا انتظار کرنا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے۔" گراہم نے گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

اس کے بعد میں اور گراہم نے مل کر لاش کو اسٹریچر پر ڈالا لیکن اس طرح کہ ہمارے ہاتھ اُس سے چھونے نہ پائیں۔

"یہ تو بہت بُرا ہوا جم۔" گراہم دھیرے سے بولا۔

"کیا تم بھی مجھے ہی قاتل سمجھتے ہو؟" میں نے گراہم سے پوچھا۔

"نہیں جم۔۔۔ مجھے یقین ہے تم ایسا کبھی نہیں کر سکتے۔۔۔ میرا خیال ہے تمھیں ڈیانا کی ڈھارس بندھانی چاہیے، تمھاری خاموشی اُسے شک میں مبتلا کر سکتی ہے۔"

"شکریہ گراہم۔۔۔" میں نے آہستہ سے کہا اور ڈیانا کی طرف چل دیا۔ وہ سامنے کھڑی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی دھیرے دھیرے میری طرف چل پڑی۔

"کیا تم نے اپنی ممی کو بتا دیا ہے؟" میں نے اُس کے قریب پہنچتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔۔۔" وہ غم زدہ لہجے میں بولی۔ "ممی اپنے کمرے میں نہیں ہیں۔"

"کیا۔۔۔؟ یہ کیا کہہ رہی ہو؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"خدا جانے وہ کہاں چلی گئی ہیں؟"

"ممکن ہے وہ دوسری کشتیوں پر ہوں؟" میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ وہ کسی کشتی پر نہیں ہیں۔ ہم نے معلوم کر لیا ہے۔ مسٹر بلانس کا کہنا ہے کہ ہماری غیر موجودگی میں وہ اپنے کمرے میں سو رہی تھیں۔"

بلانس کیمپ منیجر تھا۔ ہم ابھی وہیں کھڑے تھے کہ وہ اپنے آفس سے نمودار ہوا۔ "مس بی، چابیاں مل گئی ہیں۔ آئیے اندر چل کے دیکھتے ہیں۔" وہ ڈیانا سے مخاطب ہوا اور ہم دونوں اُس کے پیچھے پیچھے چل دیے۔ وہ جگہ تھوڑے ہی فاصلے پر تھی۔ کیمپ منیجر کا خیال تھا کہ ممکن ہے وہ وہاں ہوں کیوں کہ وہاں بھی اُن کی ایک خوابگاہ تھی۔

ڈیانا نے خواب گاہ کے دروازے پر زور زور سے دستک دیتے ہوئے کہا۔ "ممی! دروازہ کھولیے۔ دروازہ کھولیے ممی۔" لیکن اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔

"مجھے یقین ہے ممی اندر نہیں ہیں۔" ڈیانا آب دیدہ ہو کر بولی۔ اُس کی رنگت زرد پڑ چکی تھی۔ "وہ اندر ہوتیں تو دروازہ کب کا کھل چکا ہوتا۔"

کیمپ منیجر نے قفل کی بیرونی درز میں چابی گھمائی تو دروازہ کھٹ سے کھل گیا اور ہم تینوں کمرے میں داخل ہو گئے۔

اندر کوئی بھی نہیں تھا۔ مسز ڈگلس کی مسہری صاف ستھری اور غیر مستعمل حالت میں تھی۔ ایک سوٹ کیس کھلا پڑا تھا اور مختلف اشیا اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں۔ تمام کمروں کی کھڑکیاں، دروازے فرنچ طرز کے تھے۔ ہر کمرے کا ایک ایک دروازہ عمارت کے عقبی حصے میں کھلتا تھا۔ مسز ڈگلس کی خواب گاہ کا عقبی دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔

"مجھے یقین ہے کہ۔۔۔" ڈیانا نے کچھ کہنا چاہا لیکن الفاظ ہچکیوں میں دب کر رہ گئے۔

“حوصلہ رکھو ڈیانا۔” میں نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

اتنی دیر میں موریلی اور دیگر افراد بھی کمرے میں در آئے۔ “تمہاری ممی عموماً کب سویا کرتی تھیں؟” موریلی نے ڈیانا کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

“نکل جاؤ یہاں سے۔” میں نے مجنونانہ انداز میں کہا لیکن موریلی پر کچھ اثر نہ ہوا وہ بڑی ڈھٹائی سے اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔

“تم سمجھتے کیوں نہیں۔” میں نے غصے سے کہا۔ “یہ لڑکی فرطِ غم سے نڈھال ہوئی جاتی ہے اور تم ہو کہ مسلسل بک بک کیے جاتے ہو۔ تم اپنا منہ بند نہیں رکھ سکتے؟”

“میں فوجداری وکیل ہوں۔” موریلی نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔ “میں اس حادثے سے لاتعلق نہیں رہ سکتا۔”

“تو تم یوں نہیں مانو گے۔” میں نے موریلی کو متوجہ کرتے ہوئے کہا اور اس سے پہلے کہ وہ اپنے دفاع میں کچھ کرتا، میں نے اُسے کمرے سے باہر دھکیل دیا اور اس کے ساتھ ساتھ دوسرے لوگوں کو بھی کمرے سے نکال کر دروازہ اندر سے بند کر دیا۔

“یہ تم نے کیا کیا؟” ڈیانا نے لرزیدہ آواز میں پوچھا۔

“میرے اعصاب قابو میں نہیں ہیں۔” میں نے دھیرے سے کہا۔ “تمہارے ڈیڈی کی موت اور تمہاری ممی کی گمشدگی نے مجھے پاگل سا کر دیا ہے، یوں بھی مجھے اس وکیل کے بچے سے سخت چڑ ہے۔”

“اب کیا ہوگا جمی؟” وہ آب دیدہ ہو کر بولی۔

“کچھ نہیں ہوگا۔” میں نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ “آؤ باہر چلتے ہیں۔” میں نے اُس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا اور پھر ہم دونوں عقبی دروازے سے باہر آ گئے۔

* * *

عمارت سے نکلتے ہی پام کے اُونچے اُونچے پیڑ ہیں اور چھوٹی چھوٹی گھاس بھری روشیں ہیں۔ میں اور ڈیانا انھی روشوں پر چلے جا رہے تھے کہ روش کے عین وسط میں کپڑے کی کوئی شے پڑی تھی۔ ڈیانا نے اُسے اُچک لیا۔ یہ کسی عورت کا سینہ بند تھا۔

“یہ تو میری ممی کا سینہ بند ہے۔” ڈیانا نے اُسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ “اور یہ دیکھو، اس پر خون کے دھبے بھی ہیں۔”

میں نے دیکھا تو واقعی اس پر خون کے بھورے بھورے دھبے خاصے نمایاں تھے۔ خون کی رنگت ظاہر کرتی تھی کہ وہ کسی سن رسیدہ انسان کا خون ہے۔

“اس کا مطلب یہ ہوا کہ ممی رات کو یہیں تھیں۔” ڈیانا بولی۔ “خون کے دھبوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کسی حادثے کا شکار ہوئی ہیں۔ ممکن ہے اُنھیں بھی قتل کر دیا گیا ہو...؟”

“فی الوقت کچھ نہیں جا سکتا۔” میں نے بے یقینی کے سے عالم میں کہا۔ “میرا خیال ہے ہمیں یہ سینہ بند کہیں چھپا دینا چاہیے اور ہاں، کسی سے بھی اس کا ذکر نہیں کیا جائے گا۔”

اچانک میری نظر گودی کی طرف اُٹھ گئی۔ گراہم اپنی موٹر بوٹ کو تیزی سے کہیں لے جا رہا تھا۔

“یہ گراہم کہاں جا رہا ہے اس وقت؟” میں نے ڈیانا سے پوچھا۔

“تم اسے نہیں جانتے، بڑا ہی خبیث آدمی ہے یہ۔” ڈیانا حقارت سے بولی۔ “مجھے یقین ہے کہ ڈیڈی کو اِسی شیطان نے قتل کیا ہے۔ اسے ڈیڈی سے پرانی عداوت تھی۔”

“کیسی عداوت! میں کچھ سمجھا نہیں۔”

“ڈیڈی نے اس کی تمام جائداد خرید کر اسے بالکل کنگال کر دیا تھا۔” ڈیانا بولی۔ “بعد ازاں ڈیڈی نے اسے موٹر بوٹ دے دی تاکہ وہ ہمارے جزیرے میں مچھلیاں پکڑتا رہے اسے مچھلی کے شکار کا ایک جنون سا ہے۔ میرا خیال ہے کہ گراہم نے ڈیڈی سے انتقام لیا ہے۔”

“ممکن ہے تمہارا اندازہ درست ہو... لیکن نہ جانے میرا دل کیوں نہیں مانتا۔”

“تو پھر تم کسے قاتل سمجھتے ہو؟”

“میں اس وقت بہت پریشان ہوں ڈیانا۔” میں نے گودی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ “کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔”

“بہرحال یہ تو یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ قاتل اسی جزیرے میں ہے۔”

“ہاں۔ یہ بات تو میں بھی یقین سے کہہ سکتا ہوں۔” میں نے جواب دیا۔ “آؤ گودی پر چلیں، دوسری کشتیاں بھی واپس آنے والی ہیں۔” میں نے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

ہم ابھی گودی پر پہنچے ہی تھے کہ جوزف بھی اپنی موٹر بوٹ لیے آ پہنچا۔ اُس میں سوار لوگ ایک ایک کر کے باہر آنے لگے۔ مسز ڈگلس ان میں بھی نہ تھیں۔

جوزف چھوٹے سے قد اور گندمی رنگت کا مالک تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اُس کے آباؤ اجداد بحری قزاق تھے اور بعد ازاں وہ فلوریڈا کے ساحل کے ساتھ آباد ہو گئے تھے۔

“مسٹر ڈگلس قتل کر دیے گئے ہیں، جوزف۔” میں نے رنجیدہ آواز میں کہا۔

“یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟” وہ چونک کر بولا۔ اُس کے چہرے کا رنگ متغیر ہونے لگا تھا۔ “گزشتہ شب تو وہ ٹھیک ٹھاک تھے، یقین نہیں آتا۔”

“اُن کی لاش سمندر میں تیرتی ہوئی ملی ہے۔” میں نے غم زدہ لہجے میں کہا۔ “اُنھیں مچھیروں والے نیزے سے ہلاک کیا گیا ہے۔ لاش کو لائف بوائے میں ڈال کر پانی میں چھوڑ دیا گیا تھا۔”

“گراہم کہاں ہے؟” جوزف نے میری بات کو ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

“وہ تو جا چکا ہے۔” میں نے جواب دیا۔

“کہاں؟ یہ موقع کہیں جانے کا ہے بھلا؟” جوزف نے حیرت سے کہا۔

“ممکن ہے، وہ پولیس کو اطلاع دینے گیا ہو۔” میں نے اُس کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔

“یہ بھی خوب رہی!” وہ طنزیہ انداز سے بولا۔ “خود ہی قتل کیا اور دہی تھانے چلا گیا۔”

“تو مسٹر ڈگلس کو گراہم نے قتل کیا ہے؟” میں نے حیرانی سے پوچھا۔

“میرا دل تو یہی کہتا ہے۔” جوزف بولا۔ “مسٹر ڈگلس کو گراہم کے سوا کسی نے قتل نہیں کیا۔”

“اس کا کوئی محرک بھی تو ہونا چاہیے۔ کوئی وجہ؟ کوئی سبب؟”

“سبھی جانتے ہیں۔” جوزف بولا۔ “گراہم سمجھتا ہے کہ مسٹر ڈگلس نے اُسے تباہ و برباد کر دیا تھا۔ وہ ایک عرصے سے انتقام کی تاک میں تھا۔”

میں نے پلٹ کر ڈیانا کی طرف دیکھا مگر وہ وہاں سے جا چکی تھی۔ “تمہارے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ قتل گراہم ہی نے کیا ہے؟” میں نے جوزف سے پوچھا۔ مگر وہ جواب دیے بغیر آگے بڑھ گیا۔

جوزف کے جانے کے بعد میں اُس کی موٹر بوٹ پر پہنچا... تو وہاں سوائے ٹام نامی ملازم کے اور کوئی نہیں تھا۔ وہ اپنے کام میں مگن تھا اور مسٹر ڈگلس کے قتل کے متعلق قطعی بے خبر تھا۔ میں نے موقع غنیمت جانتے ہوئے اُس سے پوچھا۔

“جوزف کو مسٹر ڈگلس سے کیا شکایت ہے؟”

“ایسی تو کوئی بات نہیں۔” ٹام نے بے نیازی سے جواب دیا۔

“تم چھپا رہے ہو۔” میں نے اُسے کریدتے ہوئے کہا۔ “مجھے سب کچھ معلوم ہے۔”

“کیا معلوم ہے آپ کو؟” وہ چونک کر بولا۔

“مجھے معلوم ہے کہ جنوبی ریاستوں کے لوگ جوزف کے پاس آتے رہتے ہیں۔” میں نے کہا۔ “حالاں کہ اس جزیرے میں ان کا داخلہ ممنوع ہے۔ وہ تم لوگوں کے معاملات میں مداخلت کرتے رہتے ہیں۔”

“یہ تو آپ نے ٹھیک کہا ہے۔” ٹام نے زبان کھولی۔ “وہ لوگ جوزف کی دعوت پر یہاں آتے ہیں۔”

“اور مسٹر ڈگلس اس بات کو پسند نہیں کرتے؟ ہے نا؟” میں نے پوچھا۔

“مجھے معلوم ہے۔” ٹام بولا۔

“یہ مسٹر ڈگلس بھی خوب آدمی ہیں، ہر کسی سے اُلجھتے رہتے ہیں۔” میں نے اُس سے سچ اگلوانے کی کوشش کی۔ “ابھی گزشتہ شب تو اُن کا مجھ سے جھگڑا ہو چکا ہے۔”

“اور جوزف سے بھی وہ تین بار اُلجھ چکے ہیں۔” ٹام بولا۔ اور میں یہی معلوم کرنا چاہتا تھا۔

“کس بات پر؟”

“مسٹر جوزف دوسرے لوگوں کو یہاں لاتے رہتے ہیں۔” ٹام بولا۔ “دیکھیے، میرا نام نہ لیجیے گا، نہیں تو میری خیریت نہیں۔”

“تم مطمئن رہو۔ میں اُس سے ذکر تک نہیں کروں گا۔” اور میں دوبارہ گودی پر لوٹ آیا۔ میرا اندازہ تھا کہ مسٹر ڈگلس کو اسی جگہ قتل کیا گیا ہے۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا، ہر شے اپنی جگہ جوں کی توں موجود تھی۔ ایک جگہ کچھ شکاری نیزے بھی رکھے ہوئے تھے۔

اسی دم تیسری موٹر بوٹ بھی کنارے سے آلگی۔ اس کا کپتان البرٹ تھا۔ افسوس کہ مسز ڈگلس اس کشتی میں بھی نہ تھیں۔ البرٹ کی عمر ساٹھ برس کے لگ بھگ تھی اور قد خاصا اُونچا تھا۔ وہ کم گو اور بڑا ہی نفیس شخص تھا۔ جزیرے میں ہر شخص اُس کا مداح تھا۔

مسٹر ڈگلس لِی کے قتل کا سُن کر وہ چپ سا ہو گیا۔ لگتا تھا اُسے اس خبر سے بہت صدمہ پہنچا ہو۔

“تمہیں کس پر شبہ ہے مسٹر البرٹ؟” میں نے دھیرے سے پوچھا۔

“شبہ تو ہر کسی پر کیا جا سکتا ہے۔” وہ سنجیدگی سے بولا۔ “لیکن شبہے سے کیا ہوتا ہے؟”

“اس قتل کے محرکات کیا کیا ہو سکتے ہیں؟” میں نے البرٹ سے پوچھا۔

“ہر قتل کا محرک ہمیشہ ایک ہی ہوتا ہے۔” البرٹ بولا۔ “اور وہ ہے عداوت، اب رہی بات عداوت کی، سو ہر عداوت کی نوعیت ایک سی نہیں ہوتی۔ یہ عداوت کاروباری نوعیت کی بھی ہو سکتی ہے۔ اور سیاسی بھی اور علیٰ ہٰذالقیاس۔ جہاں تک مسٹر ڈگلس کے دشمنوں کا سوال ہے تو میرے نزدیک اس فہرست میں آپ کا نام بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔” اُس نے ہلکی سی مسکراہٹ سے کہا۔ “آپ ان کی صاحبزادی کے عاشقِ زار ہیں، اس عشق میں آپ کی ملازمت بھی جاتی رہی ہے۔ بادی النظر میں آپ کو بھی قاتل ٹھہرایا جا سکتا ہے اس طرح جوزف پر

بھی شبہہ کیا جا سکتا ہے گراہم کو بھی بری الذمہ نہیں کہا جا سکتا۔ میلویل بھی اس واردات کا مرتکب ہو سکتا ہے کیوں کہ عالمِ شباب میں اُسے بھی مسز ڈگلس بی سے والہانہ عشق تھا اور مسٹر ڈگلس نے اُس کی محبوبہ سے شادی کر لی تھی۔ ہم جو مرد لوگ ہیں نا، بڑے ہی کینہ پرور ہوتے ہیں۔ بغض و عناد برسوں تک ہمارے دلوں میں پکتا رہتا ہے اور پھر وقت آنے پر آتش فشاں لاوے کی طرح بہہ نکلتا ہے۔“

”تمھاری بات سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ہم سب کو قتل کے شبہے میں گرفتار کیا جا سکتا ہے۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”لیکن مجھے چھوڑ کے۔“ وہ دھیرے سے مسکرایا۔ ”اب کہاں جا رہے ہو؟“

”ڈیانا بالکل تنہا ہے۔“ میں نے مڑتے ہوئے کہا۔

”اور مسز ڈگلس…؟“

”وہ بھی غائب ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ممکن ہے انھیں بھی قتل کر دیا گیا ہو۔“

”یہ تو بہت بُرا ہُوا۔“ البرٹ افسردگی سے بولا۔ ”اب ہمیں ڈیانا کی حفاظت سے غافل نہیں رہنا چاہیے۔ معلوم ہوتا ہے قاتل سارے خاندان کو ختم کرنے کے درپے ہے۔“

* *

مسز بیٹرائس ڈگلس کی گم شدگی کا معمہ حل کرنے کے لیے اُن کی تلاش شروع کر دی گئی تھی لیکن جوں ہی ہم نے اپنی مہم کا آغاز کیا، ہلکی ہلکی بوندا باندی ہونے لگی جو دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دار بارش میں تبدیل ہو گئی۔ بارش کے ساتھ ساتھ تیز رفتار آندھی بھی سدِ راہ بن گئی تھی۔ آندھی اور بارش کے طوفان میں تلاش کی مہم جاری رکھنا بہت مشکل تھا لیکن اس کے باوجود ہم نے ہمت نہیں ہاری۔ ابھی ہم پام کے درختوں کے قریب ہی پہنچے تھے کہ ایک زوردار کڑاکا ہُوا اور دیکھتے ہی دیکھتے پام کا ایک پیڑ زمین پر آ رہا۔ ہم سب چونک کر رک گئے۔ گرے ہوئے درخت کی شاخوں کے درمیان کوئی سفید سی چیز پڑی تھی۔ سب سے پہلے موریلی وہاں پہنچا اور زور سے بولا۔ ”مسز بیٹرائس کی لاش مل گئی ہے۔“

ہم بھاگتے ہوئے موریلی کے قریب پہنچے۔ پام کی لمبی لمبی شاخوں کے درمیان ڈیانا کی ممی کی لاش پڑی تھی۔ قاتل نے ان کے سر پر ضرب لگائی تھی جس کے نتیجے میں اُن کے سر کا پچھلا حصہ پاش پاش ہو کر رہ گیا تھا۔ لاش کو رسّے کے ذریعے درخت کے بالائی حصّے تک پہنچا کر وہیں باندھ دیا تھا تاکہ وہ پتّوں اور شاخوں کی اوٹ میں چھپی رہے۔

مسز ڈگلس کی لاش کی بازیابی کے بعد ڈیانا کی حالت اور بھی بگڑ گئی تھی۔ وہ بولنے کی کوشش کرتی تو الفاظ اُس کے حلق میں گھٹ کے رہ جاتے۔ ہم سب اُسے دلاسا دیتے تو وہ ہماری طرف یوں دیکھتی جیسے قوتِ گویائی سے محروم ہو گئی ہو۔

مسز ڈگلس کی لاش کی تلاش کے بعد ہم سب لوگ ایک جگہ جمع ہوئے تاکہ قتل کی ان بہیمانہ وارداتوں کا ارتکاب کرنے والے شخص کا سُراغ لگا سکیں۔ ہم سب بیالیس آدمی تھے جن میں جوزف، البرٹ، گراہم اور ڈیانا بھی شامل تھے۔ سب سے پہلے موریلی نے بحث کا آغاز کیا اور قتل کے مختلف محرّکات کا ذکر کرنے کے بعد اُس نے میری طرف گھور کے دیکھا۔

”جانتے ہو قاتل کون ہے، مسٹر جیمس؟“ اُس نے سوالیہ انداز میں کہا۔

”مجھے کیا پتہ؟ تم خود ہی بتا دو۔“ میں نے سپاٹ لہجے میں کہا

”قاتل تم ہو مسٹر جیمس۔“ موریلی نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہ محض بکواس ہے، میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔“ میں نے احتجاج آمیز لہجے میں کہا۔ ”تم جان بوجھ کر مجھے الزام دے رہے ہو۔“

”اس کا فیصلہ تو اب کورٹ ہی میں ہو گا مسٹر جیمس۔“ موریلی نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”فی الحال تم ہماری حراست میں ہو۔“ یہ کہتے ہوئے وہ دوسرے لوگوں سے مخاطب ہُوا۔ ”اسے پکڑ لو، پولیس کی آمد تک اسے کسی کمرے میں بند کر دو۔“

اور اس سے پہلے کہ میں فرار کی کوشش کرتا، بہت سے لوگوں نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا اور پھر ہاتھ پاؤں باندھ کے ایک کوٹھری میں ڈال دیا۔ ڈیانا نے مجھے بے گناہ ثابت کرنے کی بہت کوشش کی لیکن اس کی بات پر کسی نے کان نہ دھرا۔

کوٹھری میں پڑے پڑے مجھے تقریباً دو گھنٹے گزر چکے تھے اور اس عرصہ میں میں نے اپنے ہاتھ پاؤں آزاد کرا لیے تھے اب مسئلہ یہ درپیش تھا کہ کوٹھری سے نجات کیوں کر حاصل کی جائے کیوں کہ… دروازے پر ایک شخص پہرہ دے رہا تھا۔ آخر کچھ دیر کے بعد مجھے ایک تدبیر سُوجھی اور میں نے زور زور سے کراہنا شروع کر دیا۔

”کیا بات ہے مسٹر؟“ پہرے دار نے میری کراہیں سنتے ہوئے پوچھا

”میرے پیٹ میں شدید درد ہے۔ خدا کے لیے میری کچھ مدد کرو۔“ میں نے جواب دیا۔

اس کے ساتھ ہی دروازہ کھُلا، پہرے دار اندر آگیا اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا، میں اُسے فرش پر گرا چکا تھا۔ میں نے جلدی جلدی اُس کے ہاتھ پاؤں باندھے، مُنہ میں کپڑا ٹھونسا اور دبے قدموں باہر آگیا۔ ارد گرد کوئی بھی نہ تھا۔ میں بچتا بچاتا اُس کمرے کی طرف بڑھنے لگا جہاں وہ لوگ اب تک بیٹھے باتوں میں مصروف تھے۔ میں دروازے کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا، موریلی کہہ رہا تھا۔

”یہ ثابت ہو چکا ہے کہ دونوں قتل جیمس ہی نے کیے ہیں۔ یہ گل دستہ جو آپ لوگ دیکھ رہے ہیں نا اس پر مسز ڈگلس کے خون کے دھبے موجود ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ جیمس کی اُنگلیوں کے نشانات بھی اس پر ثبت ہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ قاتل کی اُنگلیوں کے یہ نشانات کیسے ثبت ہوئے لیکن اس سے انکار نہیں کہ یہ نشانات جیمس ہی کی اُنگلیوں کے ہیں۔ یہ گل دستہ یہیں رہے گا، اسی میز پر اور کوئی شخص اسے ہاتھ نہیں لگائے گا۔ ابھی ہم پولیس کو مطلع کر دیں گے اور یہ گل دستہ بطور ثبوت عدالت میں پیش کیا جائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ اُنگلیوں کے نشانات کی شناخت کے بعد مسٹر جیمس پر قتل کا الزام ثابت ہو جائے گا۔“

میرے لیے اب وہاں ٹھہرنا بے سود تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور دبے قدموں گودی کی طرف بھاگ نکلا۔ میں جلد از جلد یہاں سے فرار ہو جانا چاہتا تھا۔ بہ صورتِ دیگر میری گرفتاری یقینی امر تھا۔ گودی پر اس وقت کوئی بھی نہ تھا۔ میں بھاگم بھاگ ایک موٹر بوٹ کے قریب پہنچا اور تیزی سے رسّے کھولنے لگا۔ اُسی دم میری نظر ڈیانا پر پڑی جو گراہم کی موٹر بوٹ اسٹارٹ کر چکی تھی۔ میں نے اُسے زور سے پکارا۔ ”ڈیانا۔ میں آ رہا ہوں۔“ اور میں نے کپڑوں سمیت پانی میں چھلانگ لگا دی اور ہاتھ پاؤں چلاتا ہُوا موٹر بوٹ کی طرف بڑھنے لگا۔ ڈیانا نے میری آواز سُن لی تھی اور اُس کی کشتی میری سمت بڑھنے لگی۔ میں کشتی کے قریب پہنچا ہی تھا کہ ڈیانا نے چیخ کر کہا۔ ”جلدی کرو۔ وقت بہت کم ہے۔“

اور کچھ ہی دیر بعد ہماری موٹر بوٹ پانی کا سینہ چیرتے ہوئے بہت دور نکل گئی تھی۔

”تم کہاں جا رہی تھیں؟“ میں نے ڈیانا کی طرف مڑتے ہوئے پوچھا۔

”میں جلد از جلد شہر پہنچنا چاہتی تھی تاکہ تمھارے لیے کسی قابل ترین وکیل کا بندوبست کر سکوں۔“ اُس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”میں تمھیں قاتل نہیں سمجھتی، جمی۔“

▼▼

سب سے پہلے ہم میامی پہنچے اور وہاں سے سیدھے نیویارک۔ وہاں ہم نے ایک ہوٹل میں کمرہ لے لیا اور آنے والے واقعات کا انتظار کرنے لگے۔ مجھے یقین تھا کہ موریلی میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا چناں چہ یہی وجہ تھی کہ میں قانون کی نظروں سے چھپتا پھر رہا تھا۔

”میرا خیال ہے کہ میں اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دوں؟“ میں نے ڈیانا سے پوچھا جو میرے لیے کافی کا کپ تیار کر رہی تھی۔

”مگر تم مجرم تو نہیں ہو۔“ وہ میری طرف دیکھے بغیر بولی۔

”دوسرے لوگ تو مجھے ہی قاتل سمجھتے ہیں نا؟“

”میں تمھیں عدالت میں پیش نہیں ہونے دوں گی۔“ وہ ایک عزم کے ساتھ بولی۔ ”میں تمھیں…“ اور اُسی وقت وہ فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔

”دیکھو تو کس کا فون ہے؟“ میں نے ڈیانا سے کہا۔

”تمھارا فون ہے۔“ ڈیانا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا اور میں نے آگے بڑھ کر ریسیور لے لیا۔

”کون صاحب ہیں؟“ میں نے دھیرے سے پوچھا۔

”میں موریلی بول رہا ہوں، جیمس۔“ اور اس کے ساتھ ہی مجھ پر ایک لرزہ سا طاری ہو گیا۔ ”تمھیں کس نے بتایا کہ میں اس ہوٹل میں مقیم ہوں؟“

”یہ کوئی مشکل امر نہیں مسٹر جیمس۔“ موریلی نے جواب دیا… ”بہرحال اچھا ہُوا تم مل گئے۔“

”کیا پولیس میرے تعاقب میں ہے؟“ میں نے کپکپاتی آواز میں پوچھا۔

”نہیں، جیمس۔“ وہ قدرے مسرور لہجے میں بولا۔ ”اصل قاتل کا پتہ چل گیا ہے۔“

”کیا…؟ اصل قاتل… کون ہے؟“ میں نے بے ربط الفاظ میں پوچھا۔ ”کہیں مذاق تو نہیں کر رہے ہو؟“

”یہ مذاق نہیں ہے۔ میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔“ موریلی نے جواب دیا۔ ”مجھے پہلے ہی تھا کہ قتل تم نے نہیں کیا لیکن میں نے جان بوجھ کر تم پر الزام لگایا تھا۔ اس طرح میں اصل قاتل کو غفلت کی موت مارنا چاہتا تھا۔ میں اُسے اس طرح گرفتار کرنے کی فکر میں تھا کہ وہ قانون کی زد سے نہ بچ سکے یعنی عدم ثبوت کی بنا پر عدالت اُسے بے گناہ تصور کرتے ہوئے بری نہ کر سکے۔ اسی لیے میں نے تمھیں سب کے سامنے قاتل ٹھہرایا اور کوٹھری میں بند کر دیا۔ گل دستے پر مسز ڈگلس کے خون کے دھبے ضرور تھے لیکن قاتل کی اُنگلیوں کے نشانات نہ تھے۔ وہ نشانات میری اپنی انگلیوں کے تھے جو میں نے ارادتاً ثبت کیے تھے۔ یہ طریقِ کار خطرناک ضرور تھا لیکن اس کے سوا میرے پاس کوئی چارہ کار نہ تھا۔ تمھیں کوٹھری

میں بند کرنے کے بعد میں نے سب لوگوں کو ایک بار پھر بڑے کمرے میں جمع کیا اور انھیں بتایا کہ گل دستے پر جسیں کی انگلیوں کے نشانات موجود ہیں۔ جن کی تصدیق کورٹ میں ہوجائے گی اس کے بعد میں نے سب کو خبردار کیا کہ گل دستے کو کوئی نہ چھوئے، اسے پولیس کی آمد تک اسی میز پر رہنے دیا جائے۔ مجھے یقین تھا کہ قاتل اس گل دستے کو لازمی طور پر غائب کرنے کی کوشش کرے گا۔ وہ اس لیے کہ انگلیوں کے نشانات کی شناخت کے بعد اسے اپنی گرفتاری کا اندیشہ ہوگا۔"

" تو اصل قاتل کون ہے؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

" ابھی بتاتا ہوں،" موریلی نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا "چناں چہ سب لوگ ایک ایک کر کے کمرے سے چلے گئے تو میں ایک جگہ چھپ گیا۔ ابھی آدھ گھنٹہ بھی نہیں گزرا تھا کہ ایک شخص چھپتا چھپاتا کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ دروازے پر پہنچ کر اس نے احتیاطاً اِدھر اُدھر دیکھا اور کمرے میں گھس گیا، واپسی پر گل دستہ اس کے ہاتھ میں تھا۔ پھر وہ تیزی سے درختوں کی اوٹ میں جا پہنچا۔ میں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر واپس آیا اور دوسرے لوگوں کو مطلع کر دیا۔ اس انکشاف پر سبھی تحیر زدہ رہ گئے۔ ہمیں... یقین تھا کہ قاتل اب جزیرے سے فرار کی کوشش کرے گا۔ اس لیے ہم اس کے تعاقب میں دوڑ پڑے لیکن اتنی دیر میں وہ اپنی موٹر بوٹ اسٹارٹ کر چکا تھا اور جب تک ہم اپنی موٹر بوٹ اسٹارٹ کرتے وہ بہت دور جا چکا تھا۔ بہر حال ہم نے اس کا تعاقب نہیں چھوڑا۔ اب اسے ہماری خوش نصیبی سمجھو یا قاتل کی بدنصیبی کہ گھبراہٹ اور خوف کے باعث وہ اپنے راستے سے بھٹک گیا اور اس کی موٹر بوٹ ایک کھاڑی میں پھنس کر الٹ گئی۔ جب ہم وہاں پہنچے تو اس کی موٹر بوٹ خالی پڑی تھی اور قریب ہی اس کی لاش پانی میں تیر رہی تھی۔"

"کس کی لاش؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"قاتل کی لاش،" موریلی نے جواب دیا "یعنی جوزف کی لاش۔"

"جوزف...؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"تمھاری طرح مجھے بھی حیرت ہوئی تھی لیکن حقیقت کو کون جھٹلا سکتا ہے،" موریلی بولا "جوزف چوں کہ جزیرے میں غیر ملکی باشندوں کو اسمگل کیا کرتا تھا، اس لیے مسٹر ڈگلس اس سے سخت ناراض تھے اور کئی بار اسے وارننگ دے چکے تھے یہ بات مجھے اس کے ملازم ٹام نے بتائی تھی۔ جوزف سمجھتا تھا کہ مسٹر ڈگلس اس کے کاروبار میں رکاوٹ ڈالنا چاہتے ہیں، لہٰذا اس نے مسٹر ڈگلس کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا اور جس رات سبھی کشتیاں شکار پر روانہ ہونے والی تھیں، جوزف مسٹر ڈگلس کی تاک میں تھا، جوں ہی وہ گودی پر تنہا رہ گئے، اس نے شکاری نیزہ ان کے دل میں اتار دیا۔ پھر اس نے ان کی لاش کو اٹھایا اور بہت اوپر لے جا کر اسے لائف بوائے میں رکھا پھر پانی میں پھینک دیا۔ وہاں سے وہ تیزی سے پلٹا تو دیکھا کہ مسز ڈگلس اپنے شوہر کی تلاش میں گودی کی طرف جا رہی ہیں، وہ چپکے سے ان کے ساتھ ہو لیا اور موقع پا کر انھیں بھی ہلاک کر دیا۔ پھر بڑی پھرتی سے اس نے لاش کو رسّے سے باندھا اور پیڑ کے اوپر لٹکا دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ چپکے سے اپنی موٹر بوٹ میں لوٹ آیا اور جب دوسرے لوگ اس کی کشتی میں پہنچے تو وہ ان سے پہلے وہاں موجود تھا۔"

"یہ گل دستے والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی؟" میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"مسز ڈگلس کو پھولوں سے بہت لگاؤ تھا اور وہ اکثر اوقات پھول چنتی رہتی تھیں۔ اس رات بھی جب وہ کمرے سے نکلیں تو روشوں میں رنگ برنگے پھول مہک رہے تھے۔ انھوں نے چلتے چلتے کچھ پھول توڑ لیے اور چھوٹا سا گل دستہ بنا لیا۔ آخر یہی گل دستہ قاتل کی شناخت کا سبب بن گیا اور ہاں، کیا تم نے ڈیانا سے شادی کر لی...؟"

"ابھی نہیں..."

"ابھی کرنا بھی نہیں۔ اس پُرمسرت تقریب میں مجھے بھی شامل ہونا ہے،" موریلی نے شرارت آمیز لہجے میں کہا۔

"شکریہ، ہم آپ کا انتظار کریں گے۔"

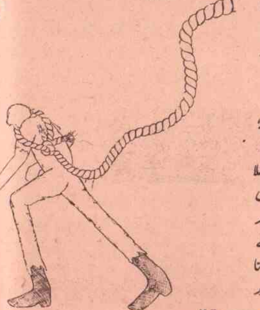

وقار عظیم
پاکستان ڈائجسٹ ڈاٹ کام

ہمالے

سنگلاخ چٹانوں کے دیس سے، خون اور آہوں میں ڈوبی ہوئی سرگزشت۔ نئے اُفق کے لیے ایم اے راحت کی دلچسپ ترین سلسلے وار کہانی

ایم اے راحت

مجذوب سلال خان نے خوف ناک طوفان کی پیش گوئی کر دی تھی۔ ی کے لوگ اپنے اپنے گھروں میں سکون سے دبکے بیٹھے تھے۔ اگر بے چین تھا تو صرف مرحوم فیروز خان کا خاندان کیوں کہ چچا بادشاہ خان، جس کا ار پورے یورپ میں پھیلا ہوا تھا، ایک طوفان لیے آ رہا تھا۔ بالآخر وہ آ گیا اور نوجوان بھتیجوں کو فیروز خان کے قتل کی روداد سنا کر انتقام کے لیے آمادہ کر لیا... پھر بوڑھی خانم کی فریاد اور جوان بہنوں کی سسکیاں بھی نو بھائیوں کو نہ روک سکیں۔ وہ باپ کا انتقام لینے کے لیے بہزاد سلامن کے بیٹے، شیراں کو قتل کرنے نکل کھڑے ہوئے جو اکیسویں سال میں قدم

دیکھنے کی خوشی میں اپنی ماں کے ساتھ پیر بابا کے مزار پر آدھی رات کو دیا جلانے آنے والا تھا۔ اندھیری رات میں فائرنگ ہوئی تو گولیاں نہتے شیران کے بجائے بوڑھی ماں کو لگیں۔ شیران نے ماں کا انتقام فیروز خان کی بیٹیوں کو اغوا کر کے لیا۔ جب بڑی لڑکی تینوں بہنوں کی شرمناک لاشیں لے کر حویلی پہنچی تو بھائیوں کے سر جھک گئے اور بادشاہ خان کی آنکھوں میں اُتر آیا۔ اب شیران کے ایک طرف تو بادشاہ خان تھا اور دوسری طرف تمام قبیلوں کے مسلح افراد جو اُس کی تلاش میں تھے اور وہ خود نہر وادی میں شہابہ کی رفاقت میں دنیا و مافیہا سے بے خبر تھا۔ دوسری طرف بادشاہ خان کو چند اجنبیوں کے آنے کی اطلاع ملی تو وہ فوراً حویلی پہنچ گیا اور آنے والوں کو دیکھ کر ٹھٹھک کر رہ گیا۔

اب آپ اس ہولناک کہانی کے باقی واقعات ملاحظہ کیجیے!

اس کی آنکھوں میں خوف کا شائبہ تک نہ تھا جب کہ شہابہ کا بدن تھرتھر کانپ رہا تھا اور اُسے لرزتا دیکھ کر وہ ہنس پڑا۔ "خوف کے عالم میں بھی تُو رقص کر رہی ہے شہابہ! اپنے بدن کی یہ تھرتھراہٹ روک اور کوئی کام کی بات کر۔۔۔" اس نے بے خوفی سے کہا۔

"تم نے موت کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا شیران! بپھرے ہوئے لوگ ایک معمولی سے شبے پر کسی کو بھی ہلاک کرنے سے گریز نہیں کریں گے۔ اُن کے وحشت ناک چہروں پر نگاہ ڈالو تو موت کی تصویر نظر آتی ہے۔" شہابہ نے گلوگیر آواز میں کہا۔

"تیرا یہ خوف ضرور میری نشان دہی کر دے گا۔ تُو تو میری محبت کے بڑے بڑے دعوے کرتی تھی۔ موت کے تصور نے تیرا عشق کافور کر دیا ہے۔"

"موت سے کون خوف زدہ نہیں ہوتا شیران لیکن تیرے لیے موت کو گلے لگانے سے کیا فائدہ ۔۔۔ تُو کسی کا نہیں بن سکتا۔ میں تیری فطرت سے اچھی طرح واقف ہوں۔"

"کیا یہ وقت ان باتوں کا ہے شہابہ؟" شیران نے تیوریاں چڑھا کر پوچھا۔

"ہر انسان خود غرض ہوتا ہے شیران! اگر میں خود غرضی کی کوئی بات کروں تو غلط نہ ہوگی۔ میں تجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔"

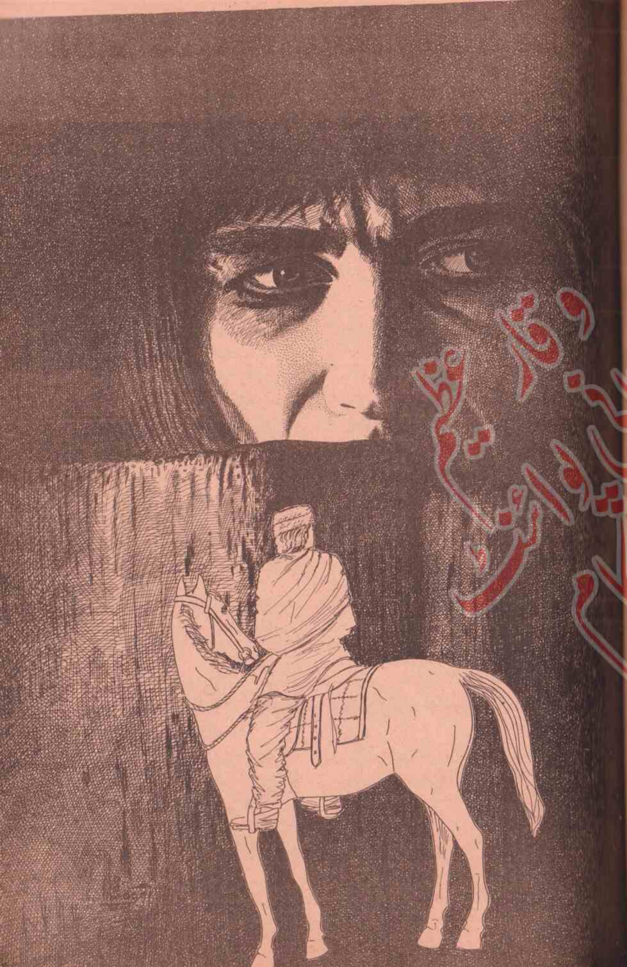

شیران سوالیہ نگاہوں سے اُسے دیکھتا رہا۔

"وعدہ کر شیران، اگر مَیں تیرے لیے جان کی بازی لگا دوں اور تجھے بچانے میں کامیاب ہو جاؤں تو... تو تُو مجھ سے شادی کرلے گا۔ ساری زندگی کے لیے میرا ہو جائے گا۔ اگر تُو یہ وعدہ کرلے تو میں موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تیرے لیے جان پر کھیل جاؤں گی۔"

شیران کے چہرے کے تاثرات ایک دم بدل گئے۔ نہر وادی کی قحباؤں کا شمار عورتوں میں نہیں ہوتا تھا اور اگر ہوتا تھا تو صرف اس حد تک کہ وہ عورتوں کی ہمشکل ہیں اور انھی جیسی لطافتیں رکھتی ہیں لیکن ان کا حصول سکّوں کے عوض ممکن ہے اور ان سے شادی کا تصوّر، کسی بھی خاندان کے لیے گالی کی سی حیثیت رکھتا تھا۔ قبیلوں کی عورتوں کو ان عورتوں سے پردہ کرنے کا حکم تھا اور ان عورتوں کو کسی شریف گھرانے میں داخلے کی اجازت نہیں تھی۔ اَب ایسی ہی عورت نے شیران کو اس کی نسل آگے بڑھانے کی پیش کش کی تھی۔ ان حالات میں جب شیران کی زندگی خطرے میں تھی۔ یہ بات شیران کے لیے گالی سے کم نہ تھی لیکن وہ مسکرا دیا اور اس کی مسکراہٹ دیکھ کر شہابہ کا حوصلہ بڑھ گیا۔

"مَیں جانتی ہوں شیران کہ مَیں اس قابل نہیں ہوں۔ قبیلوں کے قوانین ہم قحباؤں کو یہ مقام نہیں دیتے لیکن مَیں تجھے چاہتی ہوں۔ تیرے بغیر زندہ رہنے کا تصور نہیں کرسکتی۔ ہم یہاں سے نکل چلیں گے شیران! کابل چلیں گے پھر وہاں سے ایران نکل جائیں گے اور پھر وہاں سے بھی آگے... ہم ان قبیلوں سے دُور جا کر اپنی دُنیا آباد کریں گے تاکہ قبیلوں کے فرسودہ قوانین ہماری راہ میں مزاحم نہ ہوں۔"

"شہابہ... اگر میں اس سے انکار کردوں تو...؟" شیران نے کہا۔

"تو مَیں خود غرض بن کر سوچوں گی۔ ممکن ہے مَیں خود ہی تیری گرفتاری کا سبب بن جاؤں۔"

"کیا میری گرفتاری سے تجھے دُکھ نہ ہوگا؟"

"ہوگا لیکن یہ سوچ کر مطمئن ہو جاؤں گی کہ تُو اگر میرا نہیں بن سکا تو کسی اور کا بھی نہیں بن سکے گا۔" شہابہ نے جواب دیا۔

"بڑی صاف گو ہے تُو... جس طرح تیرا چہرہ شفاف اور بے داغ ہے، اسی طرح تیرا دِل بھی شفاف ہے۔ سُن شہابہ! میری زندگی بچانے کے بعد اگر تُو زندہ بچ گئی تو مَیں... تجھ سے شادی کرلوں گا۔"

شہابہ کا چہرہ مسرت سے گلنار ہوگیا۔ وہ جذبات سے مغلوب ہو کر شیران سے لپٹ گئی۔ "شیران! تُو نے مجھے ہمالیہ سے زیادہ بلند کردیا ہے۔ تُو نے مجھے کائنات کی سب سے بڑی مُسرت دی ہے۔"

"جذباتی باتیں چھوڑ اور باہر کی خبر لا... نہ جانے میرے دوستوں پر کیا گزری۔ کوئی حادثہ تو نہیں پیش آگیا اُنھیں۔ ورنہ وہ مجھے قبیلوں کے بے وقوفوں کے اس طرف آنے کی اطلاع ضرور دیتے۔"

"مَیں جاتی ہوں۔" شہابہ نے کہا اور مسرت سے ناچتی ہوئی باہر نکل گئی۔

شیران کے ہونٹوں پر ایک سفاک مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

چند لمحوں بعد شہابہ واپس آگئی۔ اُس کے چہرے پر خوف اور پریشانی کے آثار تھے۔

"ہاں، کیا خبر لائی ہے؟"

"انھوں نے نہر وادی کے تمام مَردوں کو ایک جگہ اکٹھا ہو جانے کا حکم دیا ہے اور کہا گیا ہے کہ اگر کسی غار میں کوئی مَرد پایا گیا تو اُسے بے دریغ گولی ماردی جائے گی۔ اس کے بعد وہ غاروں کی تلاشی لیں گے۔" شہابہ نے کہا۔

"ہُوں..." شیران پُرخیال انداز میں چاروں طرف دیکھنے لگا، اور پھر اس کی نِگاہ ایک سمت جا ٹکی۔ یہ غسل گاہ تھی۔ چند ثانیے تک وہ غسل گاہ کو دیکھتا رہا اور پھر اُس کی طرف بڑھ گیا۔ شہابہ تعجب سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ شیران نے غسل گاہ میں لگے ہوئے بڑے آئینے کو اُتار لیا اور اُسے ہاتھ میں لیے باہر آگیا۔ آئینہ ایک طرف رکھ کر وہ شہابہ کی طرف دیکھ کر مُسکرانے لگا۔

"تُو غسل نہیں کرے گی شہابہ؟"

"مَیں سمجھی نہیں شیران۔" شہابہ نے تعجب سے کہا۔

"جب وہ لوگ اس غار کی تلاشی لینے داخل ہوں گے تو غسل گاہ میں تم ہوگی اور مَیں دیوار کی آڑ میں... یہ آئینہ اس رُخ سے لگا ہُوا تھا کہ باہر سے دیکھنے والے کو اس میں میرا عکس بھی نظر آسکتا تھا اس لیے مَیں نے اسے اس دیوار سے جُدا کردیا۔" شیران نے پیٹی سے اڑسا ہُوا پستول نکالا اور اس کا چیمبر کھول کر دیکھنے لگا۔

شہابہ کے حلق سے ایک آواز سی نِکل گئی تھی۔ "گویا مَیں جب غسل کروں گی تو تُو میرے نزدیک پوشیدہ ہوگا؟" اُس نے شرمگیں آواز میں کہا۔

"ہاں... اور تلاشی لینے والوں کو اس کی اجازت تو نہ ہوگی کہ وہ ایسے وقت غسل گاہ میں داخل ہو جائیں جب کوئی حسینہ غسل کر رہی ہو۔"

"مگر... مگر شیران!"

"اوہ... دیکھ... دہانے کے باہر قدموں کی آوازیں اُبھر رہی ہیں، شاید اس غار کا نمبر بھی آگیا ہے۔ بس اَب دیر نہ کر۔ جلدی آجا..."

شیران پستول ہاتھ میں لے کر خود غسل گاہ میں داخل ہوگیا۔

شہابہ نے بس ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر وہ بادلِ نخواستہ غسل گاہ میں داخل ہوگئی..... اُس کی آنکھیں شرم سے جھکی ہُوئی تھیں اور چہرہ حجاب سے سُرخ ہو رہا تھا۔

اُسی لمحے ایک آواز اُبھری "کوئی اس غار میں موجود ہے۔ اگر کوئی ہے تو آواز دے۔"

شہابہ نے جلدی جلدی بدن بھگو لیا اور اس کے بالوں سے پانی کے قطرے ٹپکنے لگے۔ اس نے لرزتی آواز میں کہا۔

"کون ہے۔ کیا بات ہے۔ اس طرف آؤ۔" اس نے غسل گاہ کے دروازے کو اس قدر کھول دیا کہ باہر دیکھ سکے... اور جو کوئی بھی اندر آیا تھا، وہ تیزی سے غسل گاہ کے پاس پہنچ گیا۔

"اندر کون ہے۔ اس دروازے کو کھولو۔" اس نے بے اختیار دروازے کو دھکیل دیا اور شہابہ اس کے سامنے آگئی۔ دیکھنے والا ایک بدصورت انسان تھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ مبہوت ہوگیا لیکن دوسرے لمحے شہابہ نے دروازہ بند کردیا۔

"کیا بدتمیزی ہے۔ کیا تم غسل گاہوں میں اس طرح دَرانہ چلے آنے کی اجازت لے کر آئے ہو؟" وہ بولی۔

"مجھے معاف کرنا، صحیح اندازہ نہیں ہوسکا تھا۔" آنے والے کی آواز کی لرزش نمایاں تھی۔ "یہاں کوئی مَرد تو نہیں ہے؟"

"تمھارے سوا کوئی نہیں۔" شہابہ نے اپنا خوف دُور کرلیا تھا۔ وہ شخص غالباً اپنے ساتھ آنے والوں کو غار کے دوسرے حصّوں کی تلاشی لینے کی ہدایت کرنے لگا۔

... اور تھوڑی دیر بعد غار اُن کے وجود سے خالی ہوگیا۔

شیران شرارت بھری نگاہوں سے شہابہ کو دیکھ رہا تھا اور شہابہ شرم سے زمین میں گڑی جا رہی تھی۔

"غسل مکمل کرلو شہابہ۔"

"مَیں کہتی ہوں رُخ بدلو ورنہ مَیں... مَیں..." شہابہ نے لباس بدن کے گرد لپیٹا اور باہر نکل گئی۔ شیران نے اندازہ لگایا کہ اس نے لباس پہن لیا ہوگا تو وہ خود بھی باہر آگیا۔

"یہ کیسے معلوم ہو کہ اس کے بعد کوئی اور اس غار میں داخل نہ ہوگا۔" اس نے کہا۔

"مَیں باہر جا کر صورتِ حال کا جائزہ لیتی ہوں۔" شہابہ نے کہا اور باہر نکل گئی۔ اس کے چہرے پر اَب بھی شرم کے آثار تھے پھر وہ کسی قدر مطمئن انداز میں واپس آئی اور کہنے لگی "سب ٹھیک ہے، وہ جس غار کی تلاشی لے لیتے ہیں، اس کے دروازے پر ایک نشان لگا دیتے ہیں۔"

"گویا ہماری ترکیب کارگر رہی اور اَب یہاں کوئی نہیں آئے گا۔" شیران پُرخیال انداز میں بولا اور اس نے پستول دوبارہ پیٹی میں اُڑس لیا تھا۔

"اور میں تمھارا قول جیت گئی۔" شہابہ پُرمسرت آواز میں بولی۔

اسی وقت غار کے دروازے پر کسی کا سایہ نظر آیا اور شیران چیتے کی طرح جست لگا کر دیوار سے چپک گیا۔

شہابہ ہکا بکا رہ گئی... آنے والا وہی شخص تھا جو پہلے اپنے ساتھیوں کے ساتھ تلاشی لینے آیا تھا اور اَب وہ تنہا تھا۔ اس کے خبیث چہرے پر ایک مکروہ مسکراہٹ پھیلی ہُوئی تھی۔

"مجھے معاف کرنا لڑکی۔ اس بار مَیں اپنے ساتھیوں سے چھُپ کر آیا ہوں۔ کیا نام ہے تمھارا؟" اُس نے کہا۔

لیکن شہابہ کے مُنہ سے کوئی آواز نہ نِکل سکی۔ شیران اس کی آنکھوں کے سامنے تھا اور آنے والے کی پُشت اس کی جانب تھی۔

"کیا نام ہے تمھارا؟" اُس نے پھر پُوچھا اور شہابہ کے حلق سے بمشکل آواز نکلی۔

"شہابہ..."

"غلط نام ہے۔ تمھیں "شبابہ" کہا جائے تو بہتر ہے۔ نہر وادی میں ایسے ایسے گُلِ نایاب کھِلے ہیں، مجھے تو معلوم ہی نہ تھا اور اَب افسوس ہے کہ اس سے قبل کبھی اِدھر کا رُخ کیوں نہ کیا۔ مجھے تورشاہ کہتے ہیں... تو اے گُلِ نایاب اس وقت تو میں مصروف ہوں لیکن رات کو میرا انتظار کرنا۔ تمھارا مُنہ موتیوں سے بھر دوں گا۔"

"یہ تمھاری خام خیالی ہے دوست! ہر خوب صورت پھُول میں کانٹے بھی ہوتے ہیں۔" دفعتاً شیران کی آواز اُبھری اور وہ شخص گھبرا کر پلٹا... وہ طاقت اور... چُستی میں شیران کا ہم پلّہ نہیں تھا۔ بہزاد سلامن کا قاتل بیٹا وحشت و قوت میں بے مثال تھا۔ اس نے چیتے کی طرح جست لگائی اور اُس شخص کی گردن دبوچ لی۔

شہابہ نے موت کی شکل اس سے قبل اتنی قریب سے نہیں دیکھی تھی۔ موت اس مکروہ شکل کے چہرے پر مجسّم ہوگئی تھی۔ زبان دہانے سے کئی اِنچ باہر نکل آئی تھی اور آنکھیں کرب سے پھیل گئی تھیں پھر اُسی وقت وہ شیران کی گرفت سے نکلا جب اس کے بدن میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہ رہی۔ شیران نے اُسے کسی چوہے کی مانند ہی ہلاک کردیا تھا۔

شہابہ بیدِ لرزاں بنی ہُوئی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے یہ پہلا قتل تھا۔ شیران نے اس کے لباس سے وہ نشان نوچ لیا جو اس کی شناخت تھا۔ ایسے نشان غالباً غاروں کی تلاشی لینے والوں کو ہی دیے

گئے تھے۔

"اور اب یہ نشان مجھے ان لوگوں کے درمیان سے اس طرح نکال لے جائے گا جیسے صابن میں سے تار۔۔۔" شیراں نے اس نشان کو اپنے سینے پر آویزاں کرتے ہوئے کہا۔

"اس لاش کا کیا کرو گے شیراں؟" شہابہ نے کہا اور شیراں اس طرح چونک کر اُسے دیکھنے لگا جیسے اس کی موجودگی کو ہی بھول گیا ہو پھر اس نے عجیب نگاہوں سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہروادی افراتفری کا شکار ہے۔ کون آئے گا یہاں۔ ٹھکانے لگا دیں گے۔ جلدی کیا ہے۔ کیا نام ہے اس کا، تور شاہ۔"

"شیراں اَب تم کیا کرو گے۔ میں بہت خوف زدہ ہوں۔ بہت ڈر لگ رہا ہے مجھے۔"

"بس یہاں سے نکل جاؤں گا۔"

"اور مجھے نہیں لے جاؤ گے؟"

"تجھے۔۔۔" شیراں ہنس پڑا۔ "تجھے ساتھ لے جا کر گرفتار ہونا ہے کیا مجھے۔ تمھارے لیے بھی میرے دماغ میں ایک ترکیب ہے۔"

"کیا شیراں۔ کیسے لے جاؤ گے مجھے؟"

"قبل از وقت کوئی بات کہنا درست نہیں ہوتا، کون جانے آنے والا وقت کس کے لیے سازگار ہو۔"

"آہ شیراں۔۔۔ میں بہت بزدل ہوں۔ خوف کے یہ لمحات میرے دل کی حرکت بھی بند کر سکتے ہیں لیکن ایک احساس اس وقت تمام احساسات پر بھاری ہے۔ مستقبل میں، میں تیری شریکِ زندگی ہوں گی۔ ایک شریف عورت کہلاؤں گی۔ تجھے صرف میرا ماضی یاد ہوگا اور میری محبت تیرے دل سے میرا ماضی صاف کر دے گی۔ وہ وقت آنے دے۔"

"ہاں۔۔۔ وقت آنے دے شہابہ! میرے دل میں بھی بہت کچھ ہے۔" شیراں نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر غار کے دہانے کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔ "ذرا دیکھوں تو سہی، پہاڑوں کے غیرت مند لوگ کیا کر رہے ہیں۔"

رات کا دوسرا پہر تھا۔ شیراں، شہابہ کی آغوش میں سر رکھے لیٹا تھا۔ دونوں جاگ رہے تھے۔ شہابہ اس کے بالوں میں اُنگلیاں پھیر رہی تھی۔ تب شیراں نے چونک کر کہا۔

"چاند نکل آیا ہے شہابہ؟"

"ہاں پہاڑوں میں چاندنی پھیلی ہوئی ہے۔"

"لوگ گہری نیند میں ڈوبے ہوں گے۔"

"یقیناً۔" شہابہ نے جواب دیا۔

"ایک بات کا جواب دے شہابہ! میرے علاوہ کوئی ایسا جوان تیری زندگی میں آیا جس کے ساتھ رہنے کی خواہش تیرے دل میں بیدار ہوئی ہو؟"

"کوئی نہیں۔"

"کسی نے خود تجھے اس کی پیش کش کی؟"

"ایسی باتیں کیوں کر رہے ہو شیراں؟" شہابہ نے افسردگی سے کہا۔

"ان کی تعداد جاننا چاہتا ہوں۔ تجھے بتانا چاہتا ہوں کہ تُو نے جو گالی مجھے دی ہے اس کا جواب کیا ہو سکتا ہے۔"

"گالی۔۔۔" شہابہ چونک پڑی۔

"ہاں شہابہ۔۔۔ کسی غیرت مند نے تجھے اپنی زندگی میں شامل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ کیا میں تجھے اتنا بے غیرت محسوس ہوا تھا جو تو نے مجھے گرفتار کرانے کی دھمکی دے کر میری بیوی، میری آئندہ آنے والی نسل کی ماں بننے کی بات کی؟"

"شیراں۔۔۔" شہابہ خوف زدہ آواز میں بولی۔۔۔ اور شیراں ہنسنے لگا۔

"بزدل بے وقوف۔ ڈر گئی میری باتوں سے۔۔۔ دراصل میں یہ سب کچھ اس لیے کہہ رہا تھا شہابہ! کہ اگر آئندہ میں نے تجھ سے کبھی یہ باتیں کیں تو تیری کیفیت کیا ہو گی۔" شیراں نے اس کی گردن میں ہاتھ ڈال دیے۔

"شیراں۔۔۔ میرا ماضی بھلا دو۔ میں تمھاری لونڈی بن کر بھی زندگی گزار دوں گی۔" شہابہ شیراں پر جھک آئی تھی لیکن ایک بار پھر اس کے چہرے پر خوف اور بے چینی کے آثار نمودار ہو گئے کیوں کہ شیراں کے ہاتھ اس کی گردن سے پھسل کر نرخرے پر آ جمے تھے اور اُنگلیوں کی گرفت غیر معمولی تھی۔

"شیراں۔۔۔ تمھیں کیا ہو گیا ہے؟" شہابہ نے گھٹی گھٹی سی آواز میں کہا۔

"تیرے اعضا سکوں کی جھنکار پر تھرکتے ہیں۔ تیرے احمریں ہونٹ چاندی کی چمک پر مُسکراتے ہیں اور اس کے باوجود تُو شیراں سلامن کے بچّوں کی ماں بننے کی خواہش مند ہے۔ بے وقوف عورت، اس سے بڑی گالی سلامن خاندان کے لیے اور کون سی ہو سکتی ہے۔ تجھے یہ گالی دینے کی جرأت کیسے ہوئی۔ تُو نے شیراں کو دھمکی دینے کی جرأت کیسے کی؟"

شیراں کی گرفت دفعتاً شدید ہو گئی۔ اس کی آہنی اُنگلیوں کے خول میں شہابہ جیسی نازک اندام حسینہ کی گردن موم کی طرح پگھل گئی۔

وہ تو اپنے بدن کو جنبش بھی نہ دے سکی تھی۔ کوئی آواز نہیں نکلی تھی اس کے حلق سے۔۔۔ بس وہ بے جان ہو گئی تھی۔

شیراں نے حقارت سے اُسے ایک طرف دھکیل دیا اور غار کی تلاشی لینے لگا۔ سونے کے سکّے اور نوٹ اس نے برآمد کیے اور انھیں اپنے لباس میں ڈال کر غار کے دہانے کے پاس پہنچا اور چند لمحات کے بعد چاند کی ٹھنڈی روشنی میں کسی رُوح کی مانند چٹانوں میں بھٹکنے لگا۔

●

بادشاہ خان چند لمحات تحیّر کا شکار رہا اور پھر اس کے ے کے نقوش میں کھُردرا پن پیدا ہو گیا۔ "بہت غلط وقت پر آئے آپ لوگ۔ اس وقت میں پہاڑوں کے قدیم کھیل میں مصروف ہوں۔"

"دروازے بند کر دو، بادشاہ خان! ہمیں کچھ ضروری گفتگو کرنی ہے۔" ایک غیر ملکی نے کہا۔

"میں زیادہ وقت نہ دے سکوں گا۔" بادشاہ خان نے کہا۔

"تم شاید ہوش کھو بیٹھے ہو، بادشاہ خان! کس سے مخاطب ہو؟" خص نے کہا جس کا چہرہ کافی سخت تھا۔

"میں معذرت کر لوں گا جناب! اس وقت میں واقعی حواس یں نہیں ہوں۔" بادشاہ خان نے کہا۔

"لیکن بادشاہ خان! تمھارا حواس میں رہنا ضروری ہے۔ تنظیم تعلق رکھنے والے کسی بھی شخص کی بدحواسی تنظیم کے لیے نقصان اعث ہو سکتی ہے۔"

بادشاہ خان کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں خون اُتر ھر اس نے غراتی ہوئی آواز میں کہا۔ "یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔۔۔ یں کسی قسم کی مداخلت مجھے پسند نہیں۔"

"شق نمبر بارہ کے تحت تنظیم کا کوئی فرد تنظیم سے منسلک ے کے بعد صرف اُسی کی ملکیت ہوتا ہے اس کی ذاتی حیثیت ختم جاتی ہے۔ تم ہمارے نئے ساتھی نہیں ہو بادشاہ خان!" غیر ملکی کہا۔

"مگر اس وقت مجھے کوئی تنظیم یاد نہیں ہے، میں اپنی زندگی ب سے مشکل وقت سے گزر رہا ہوں۔ میں سب کچھ بھول گیا ں اور اس وقت تک بھولا رہوں گا جب تک میرے سینے میں ام کا جہنم روشن ہے۔"

"نہیں بادشاہ خان! تم کچھ نہیں بھول سکتے، تنظیم کا کوئی بھی ظیم کے علاوہ کسی بھی ذاتی مفاد کو یاد رکھنے پر قادر نہیں ہے اور جو ول جاتے ہیں، ان کی حیثیت ہمارے نزدیک لنگڑے گھوڑے کی مانند ہوتی ہے، تم جانتے ہو، ریس کے میدان میں لنگڑے ہو جانے والے گھوڑے سے کیا سلوک کیا جاتا ہے؟"

"کیا مطلب ہے تمھاری اس بات کا؟" بادشاہ خان نے غرّا کر پوچھا۔

"لنگڑے گھوڑے کو گولی مار دی جاتی ہے اور اُس کی جگہ نیا گھوڑا میدان میں لے آیا جاتا ہے۔"

"گویا مجھے دھمکی دی جا رہی ہے۔" بادشاہ خان بولا۔

"نہیں تنظیم کے اصول تمھیں یاد دِلائے جا رہے ہیں اور یہ الفاظ ہمارے نہیں ہیں بلکہ تنظیم کے سربراہ کے ہیں اور سربراہ ہمیشہ وہی دیکھنا چاہتا ہے جو ہوتا رہا ہے، کیوں کہ تبدیلی موت کا دوسرا نام ہے اور ہم تنظیم کو بے موت نہیں مار سکتے۔"

بادشاہ خان کئی منٹ تک ساکت و جامد کھڑا رہا، یہ الفاظ اس کی فطرت کے خلاف تھے لیکن بہرصورت وہ تنظیم کا ایک رُکن تھا اور یہ تنظیم جو کچھ تھی، بادشاہ خان کے علاوہ اسے اور کوئی نہیں جان سکتا تھا۔

وہ خود کو پُرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اُسے احساس ہو گیا کہ جوشِ غضب میں وہ اُن لوگوں کے ساتھ بھی سخت زبان استعمال کر بیٹھا ہے جو قطعاً اُس کے مفاد میں نہیں تھی، چنانچہ اس کا ذہن آہستہ آہستہ اعتدال پر آنے لگا پھر اُس نے نرم لہجے میں کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں نے ذہنی ہیجان کے عالم میں غلط الفاظ استعمال کیے ہیں لیکن آپ تھوڑی سی صورتِ حال سُن لیں۔ ہُوا یوں ہے کہ میرے ایک دُشمن نے میرے بھائی کو قتل کر دیا تھا، پہاڑوں کا قانون انتقام کا سبق دیتا ہے، وہ شخص اگر زندہ ہوتا تو اس سے میں اپنے بھائی کی موت کا انتقام لیتا لیکن وہ درندوں کا شکار ہو کر مر گیا اور ہم اس کے بیٹے کے جوان ہونے کا انتظار کرنے لگے، سو یوں ہُوا کہ ہم نے اس کے قتل کا فیصلہ کیا لیکن وہ بدبخت بچ گیا اور بچنے کے بعد اُس نے میرے بھائی کی چار بیٹیوں کے ساتھ وحشیانہ سلوک کر کے اُنھیں موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ دوستو! تنظیم کے ایک رُکن ہونے کی حیثیت سے بھی اور ان پہاڑوں کا انتظام سنبھالنے والے کی حیثیت سے بھی میرا ایک مقام ہے۔ کوئی دُشمن اگر اس شرمناک طریقے سے میرے چہرے پر سیاہی مَل جائے تو میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ تنظیم براہِ راست اس معاملے میں ملوث ہو گئی اور یہ اس کا بھی فرض بن گیا کہ وہ میرے چہرے کی سیاہی دھونے کی کوشش کرے، میں نے تنظیم کو اس معاملے میں ملوث نہیں کیا بلکہ پہاڑوں میں اپنا وقار قائم رکھنے کے لیے فیصلہ کیا ہے کہ اُس شخص کے قبیلے کو نیست و نابود کر دیا جائے، یہ سب کچھ

کرنے کے بعد میں اپنی خدمات تنظیم کو پیش کر دوں گا۔"

تینوں افراد کے چہروں پر مسکراہٹ پھیل گئی پھر ان میں سے اُسی شخص نے کہا جو اب تک بادشاہ خان سے سخت لہجے میں گفتگو کرتا رہا تھا۔

"بادشاہ خان! کیا تم نے تنظیم سے اس سلسلے میں کوئی امداد طلب کی ہے؟"

"نہیں۔۔۔ اس لیے کہ مجھے یہ گمان نہیں تھا کہ تنظیم میرے راستے میں مزاحم ہو گی۔ میں خود ہی اپنا فیصلہ کرنے کے بعد اپنے کاموں میں مصروف ہو جانا چاہتا ہوں۔"

"تب پھر تنظیم سے شکایت بے کار ہے۔ اگر یہ سارے معاملات تم ہمارے سپرد کرتے اور ہم تم سے تعاون نہ کرتے تو تمھاری شکایت حق بجانب تھی۔ رہی بات اس قبیلے کو نیست و نابود کرنے کی، تو بادشاہ خان! تم نے اس معاملے کی نزاکت پر غور نہیں کیا۔ ہم تمھارے جذبۂ انتقام کے خلاف نہیں ہیں۔ بے شک پہاڑوں میں یہی سب کچھ ہوتا ہے لیکن جو تبدیلیاں ہم یہاں لا رہے ہیں یا لانا چاہتے ہیں، اُن کے تحت یہ خون ریزی ابھی ہمارے لیے سخت نقصان دہ ہو سکتی ہے۔"

"بھلا وہ کس طرح؟" بادشاہ خان نے پوچھا۔

"اس طرح کہ کسی ایک پورے قبیلے کی تباہی تمھارے ملک اور عوام کی نگاہوں سے پوشیدہ تو نہیں رہ سکے گی۔ یہاں تحقیقاتی کمیٹیاں آئیں گی، باہر کی دُنیا سے براہِ راست مداخلت ہو گی، ممکن ہے فوجی حکام بھی یہاں آئیں اور تم سمجھتے ہو، ابھی ہم اس علاقے کو دوسروں کی نگاہوں سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ علاقے میں امن رہے اور یہاں کوئی ایسا بڑا واقعہ پیش نہ آئے جس کی وجہ سے لوگوں کی نگاہیں اس سمت مرکوز ہو جائیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ یہاں کا ماحول پُرسکون ہو اور بادشاہ خان! تم اس پُرسکون ماحول میں ایک ہلچل پیدا کرنا چاہتے ہو۔ گویا تنظیم کا یہ پلان فیل کرنے میں تنظیم کے ہی ایک خاص رُکن کا ہاتھ ہو گا۔"

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ میری ایسی کوئی خواہش نہیں ہے اور نہ ہی میں یہ پسند کروں گا۔" بادشاہ خان نے کہا۔

"تب یہ احمقانہ خیال ترک کرو اور ہمیں ان واقعات سے تفصیلی طور پر آگاہ کرو، ممکن ہے، ہم تمھاری مدد کر سکیں۔"

بادشاہ خان پُرخیال انداز میں گردن ہلانے لگا پھر بولا۔ "بڑی سُبکی ہو گی میری، لوگ میرے بارے میں طرح طرح کے افسانے گھڑیں گے، حقیقت یہ ہے کہ اس وقت میرے دُشمن کو مجھ پر برتری حاصل ہے، جب کے وہ یکہ و تنہا ہے، اس کا قبیلہ بھی اس کا مددگار نہیں ہے پہاڑوں میں رہنے والے تمام قبائل دن رات اس کی تلاش میں سرگر ہیں تاکہ اُسے تلاش کر کے میرے حضور پیش کر سکیں لیکن وہ بدبخت ابھی تک بادشاہ خان کے شکنجے سے بچا ہوا ہے، تم نہیں سمجھ سکتے کہ یہ بات میرے لیے کس قدر اذیت ناک ہے۔"

"میں تم سے پھر کہہ رہا ہوں بادشاہ خان! اس کی نشان دہی کرو، تنظیم اسے کسی چوہے کی طرح گردن سے پکڑ کر تمھارے سامنے لا ڈالے گی اور پھر تم اس کے جسم میں گولیوں سے اتنے سوراخ کرنا کہ ہوا اس کے جسم سے پار ہونے میں ذرا بھی دقت نہ ہو لیکن تنظیم کے مفاد کے خلاف کوئی کام نہ کرو۔"

بادشاہ خان اب بالکل نارمل ہو گیا تھا، اس نے کرسی کی سے گردن ٹکاتے ہوئے کہا۔ "ہر چند کے پہاڑوں میں ہلچل مچ جائے گی، لوگ بادشاہ خان کے بارے میں طرح طرح کے افسانے تراشیں گے گے کہ بادشاہ خان وہ نہیں ہے، جو نظر آتا ہے بلکہ اس نے صرف دھمکیاں دے کر اس علاقے کو اپنے قابو میں رکھا ہے لیکن تنظیم مفاد کے لیے میں یہ سب کچھ بھی برداشت کر لوں گا۔ صورتِ حال جس حد تک میں آپ لوگوں کو بتا چکا ہوں اس سے زیادہ نہیں اس قبیلے کا نام تراب زان ہے اور وہ مشرقی پہاڑیوں کے اُس آباد ہے، جو کچھ ہوا ہے، اس کی تفصیل بتانا میرے لیے ممکن نہیں ہاں جو ہونے والا تھا وہ یہ تھا کہ میرے قبیلے کے لوگ پوری طرح تیار کہ راتوں رات تراب زان پر جا پڑیں اور تراب زان کے کسی شخص کو زندہ نہ چھوڑیں، یہ میرا انتقام ہو گا جو پہاڑوں کی روایت ہے اور سمجھ لیں گے کہ بادشاہ خان کے مقابل آنا بچوں کا کھیل نہیں

"اس سلسلے میں دوسرے قبائل سے مشورہ کیا تم نے؟ اُن کی کیا رائے ہے؟"

"وہ سب میرے احکامات پر عمل کرنے کے لیے تیار ہیں کر رہے ہیں۔"

"تب تو بادشاہ خان! تمھیں جو مشورہ دیا جائے اس پر عمل کرو اس سے سرِمو انحراف نہ کرو۔" غیر ملکی نے نرم لہجے میں کہا اور بادشاہ خان سوالیہ نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگا۔

"یوں کرو بادشاہ خان! کہ اس بات کی پبلسٹی کرا دو کہ تم قبیلہ تراب زان کو فنا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو، ممکن ہے کچھ قبائل کے تمھارے پاس کوئی تجویز لے کر آئیں، ان میں سے کسی ایک کو فوقیت دے دو اور اس بات کا اظہار کرو کہ تم نے امن کی جانب ایک قدم ہے، تم ان سے کہو کہ تمھاری دُشمنی صرف ایک شخص سے ہے اور تم

نوجوان کو زندہ یا مُردہ حالت میں چاہتے ہو، تم پہاڑوں کے قانون میں اس بات کا اضافہ کر دو کہ اُس شخص کی تلاش ان پہاڑوں میں رہنے والے ہر فرد کا فریضہ ہے اور اس کے بعد تم تراب زان کو امن کا پیغام دو اور یہ بات تمھاری فراخدلی پر محمول کی جائے گی اس طرح تمھارا وقار بڑھ جائے گا۔"

"نہیں۔۔۔ افسوس کہ تم یہ بات نہیں سمجھتے، یہ بات میری موت کے مترادف ہو گی۔" بادشاہ خان نے کرب ناک لہجے میں کہا۔

"بادشاہ خان! جو بات تم سے کہی جا رہی ہے۔ وہ تنظیم کے مفاد میں ہے، اگر تمھاری یہ احمقانہ حرکت تنظیم کے لیے کسی رُکاوٹ کا باعث بن گئی تو یقین کرو کہ تراب زان نہیں بلکہ تہمانہ تباہ ہو گا اور تم سب کو موت کی نیند سلانے کے بعد یہاں نئے لوگ لائے جائیں گے جو ہمارے مفاد کے لیے کام کریں گے۔"

"یہ دھمکی میرے لیے بڑی اذیت ناک ہے لیکن افسوس کہ یورپ کی زہر آلود فضاؤں میں رہ کر میرے خون میں بھی زہر شامل ہو گیا ہے۔ میں ان مکاروں کے درمیان زندگی بسر کرتے کرتے خود بھی مکار ہو گیا ہوں، اور میرے اندر وہ صفات ختم ہو گئی ہیں جو اُن پہاڑوں کی رُوح تھی، ٹھیک ہے میں وہی کروں گا جو تم نے کہا ہے کیوں کہ میں تنظیم سے غداری کا مرتکب نہیں ہو سکتا، میں جانتا ہوں کہ تنظیم سے غداری ساری دُنیا میں میرے مفاد کو نقصان پہنچائے گی اور میں کسی طور اپنے مفاد کو غداری کی بھینٹ نہیں چڑھا سکتا۔"

"یورپ کی جن زہر آلود فضاؤں میں رہ کر تم اپنے خون کو مسموم قرار دیتے ہو، دراصل وہ ذہانت کی فضائیں ہیں جہاں عقل جنم لیتی ہے اور کائنات کی تاریخ ہے کہ عقل نے ہمیشہ حکمرانی کی ہے۔"

بادشاہ خان نے ایک گہری سانس لے کر گردن جھکا لی تھی۔ "ٹھیک ہے، وہی ہو گا جو تمھارا مشورہ ہے۔" اس نے مُردہ لہجے میں جواب دیا۔

* * *

پہاڑوں کی فضائیں زہر آلود ہو گئی تھیں، گلہ بان مویشیوں کو لے کر چراگاہوں کا رُخ کرتے ہوئے کترانے لگے تھے کہ خدا جانے کب اور کہاں خون ریزی شروع ہو جائے، ہر قبیلے میں ہیجان کی فضا طاری تھی۔ بات صرف کسی ایک قبیلے کی نہیں رہی تھی بلکہ پہاڑوں کی پُرسکون دُنیا میں شدید ہلچل پیدا ہو گئی تھی۔ کچھ قبائل کو بادشاہ خان کی برتری کا مکمل احساس تھا اور انھوں نے بادشاہ خان کی طرفداری کا اعلان کھلے بندوں کر دیا تھا۔ ہر چند کہ اس میں یہ بات ان کے ذہنوں میں موجود تھی کہ وہ حق و انصاف سے کام نہیں لے رہے۔ اگر قبیلہ تراب زان کے سلامن خاندان کے بیٹے نے بادشاہ خان کے بھائی کی بیٹیوں کے ساتھ درندگی کا سلوک کر کے انھیں موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا تو اس میں قبیلہ تراب زان کا کوئی قصور نہیں تھا۔ تقریباً سب ہی کو معلوم تھا کہ بادشاہ خان کے بھائی فیروز خان کا قتل مشکوک تھا اور یہ بات حتمی طور پر نہیں کہی جا سکتی تھی کہ بہزاد سلامن ہی اس قتل میں ملوث تھا۔ شروع ہی میں یہ بات طے پا چکی تھی بہزاد سلامن کو مجرم نہیں قرار دیا جا سکتا اور پہاڑوں میں یہ ہوتا بھی نہیں تھا۔

اگر کوئی کسی کو قتل کر دیتا تو بہت کم ایسا ہوتا کہ وہ اس قتل سے انحراف کرتا، قتل کی بُنیاد تو کچھ نہ کچھ ضرور ہوتی تھی اور اگر یہ بُنیاد کسی آن سے تعلق رکھتی تو پھر قاتل فخریہ کہتا کہ اس نے فلاں شخص کو موت کے گھاٹ اُتار دیا ہے۔

دوسرے نمبر پر وہ جرائم پیشہ افراد آتے ہیں جو مجرمانہ سرگرمیوں کے سلسلے میں قتل کرتے ہیں لیکن بہزاد سلامن ایسے لوگوں میں سے نہیں تھا۔ اس کی گواہی نہ صرف تراب زان قبیلے کے لوگ بلکہ دوسرے لوگ بھی دے سکتے تھے۔

۔۔۔۔ اگرچہ چند قبائل جو بادشاہ خان سے مرعوب تھے اس سلسلے میں بادشاہ خان کی پُرجوش امداد کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ وہ اس حادثے پر سخت برہم تھے، ورنہ یہی کہا جاتا کہ قبیلوں کے سرداروں نے بادشاہ خان سے خوف زدہ ہو کر اس کی امداد کا اعلان کیا ہے۔۔۔ بہرصورت یوں یہ بات نبھ گئی تھی۔

سردار داؤد خان جانتا تھا کہ شیران جیسا نوجوان جو ایک شریف باپ کا بگڑا ہوا بیٹا ہے، انتقام کی ایسی ہی انوکھی راہ اختیار کر سکتا ہے، سردار داؤد کا بس چلتا تو وہ خود ہی شیران کو گولی مار دیتا اور اسے شرمناک جُرم کا مرتکب نہ ہونے دیتا لیکن وہ بے قصور اور سیدھا سادہ انسان بلاوجہ مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ البتہ چند قبائل ایسے بھی تھے جنھوں نے حق و انصاف کا ساتھ دیتے ہوئے تراب زان کے سردار داؤد کو اطلاع بھیج دی تھی کہ وہ کیل کانٹے سے لیس رہے۔۔۔ انھوں نے اعلان کیا کہ وہ اس ناانصافی پر مظلوم کا ساتھ دیں گے۔

چنانچہ قبیلوں میں جنگ کی فضا قائم ہو گئی تھی۔ جاسوس خبریں لا رہے تھے اور یہ خبر بھی اب عام ہو گئی تھی کہ تہمانہ کا بچہ بچہ جنگی ہتھیاروں سے مسلح ہو کر بس بادشاہ خان کے آخری حکم کا انتظار کر رہا ہے۔

دوسری جانب تراب زان کے سردار داؤد نے بدرجہ مجبوری

اپنے قبیلے کو بھی جنگ کے لیے تیار کرلیا تھا، البتہ وہ اپنی جانب سے پہل نہیں کرنا چاہتا تھا کیوں کہ یہ کسی طور مناسب نہ تھا۔ وہ صرف اصولوں کی جنگ لڑنے کے لیے تیار تھا اور اس نے اپنے مخصوص لوگوں کو پہاڑوں میں پھیلا رکھا تھا تاکہ اگر بادشاہ خان اور اس کے حلیف قبائل دن اور رات کے کسی بھی حصّے میں تراب زان کی طرف آتے دیکھے جائیں تو پھر انھیں تراب زان سے دور ہی روکنے کی کوشش کی جائے۔

◆

فضل خان ترازو میں کچھ تول رہا تھا کہ اُسے کچھ فاصلے پر سلال خان جاتا ہُوا نظر آیا اور فضل خان نے جلدی سے ترازو رکھ دی پھر زور زور سے سلال خان کو آوازیں دینے لگا... سلال خان نے اس کی جانب دیکھا، سوچا اور ٹھٹکتا ہُوا فضل خان کے پاس آگیا۔

"کیا بات ہے سلال خان! کہاں رہتے ہو آج کل۔ کبھی نظر ہی نہیں آتے؟"

"ہم بلاوجہ کسی کو نظر نہیں آتے۔ گڑ لیتے ہیں تو گڑ کی سی بات کہتے ہیں، آج کل کوئی بات ہی نہیں ہے ہمارے پاس جو ہم کسی سے کہیں۔"

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے سلال خان، تمھیں گڑ کی ضرورت ہے تو لے لو۔"

"لو... جس چیز کی ہمیں ضرورت ہی نہ ہو، اسے لے کر کیا کریں گے، نہیں بھائی! ہمیں گڑ نہیں چاہیے۔ خدا حافظ..." سلال خان نے واپسی کے لیے قدم بڑھائے تو فضل خان نے جلدی سے اُسے روکا اور اس سے کہا۔

"سُنو تو سہی سلال خان! ایسی بھی کیا جلدی ہے؟"

"کیا سُنیں اور کیا سُنائیں۔ نہ سُننے کی خواہش ہے اور نہ سُنانے کی۔ بادل صاف ہیں، آسمان پُرسکون ہے۔ کیا رکھا ہے، فضول باتوں میں..." سلال خان نے بدستور اپنے مخصوص مجذوبانہ انداز میں کہا۔

"یوں لگتا ہے، سلال خان! تم آج کل کے حالات کی طرف سے آنکھیں بند کیے ہُوئے ہو۔" فضل خان نے کہا۔

"آنکھیں کھلیں گی تو جو ہوگا نظر آجائے گا جب دیکھنے کو کچھ نہیں ہے تو پھر آنکھیں کیوں کھولی جائیں۔ ایں... بولو... سوتے رہیں اچھا ہے، سوتے رہنا اچھا ہے، کم از کم غلط باتوں سے نجات ملتی ہے۔"

"پہاڑوں میں تو بڑی سرگرمیاں جاری ہیں، سلال خان!"

"تو پھر ہم کیا کریں، لوگوں کی مرضی، جو ہونا تھا، وہ ہُوا اور ہوگیا اَب کیا ہونا ہے۔ کچھ نہیں، قطعی نہیں۔ خدا حافظ..."

"مگر سلال خان! جنگ تو تیار کھڑی ہے۔"

"کھڑی کہاں ہے، بیٹھی ہے، لیٹ جائے گی، سو جائے گی۔ خدا حافظ..." سلال خان کا موڈ کچھ اچھا نہیں تھا۔ فضل خان کے اصرار کے باوجود اس نے گڑ نہیں لیا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہُوا وہ آگے بڑھ گیا۔

فضل خان اس وقت تک اُسے دیکھتا رہا جب تک کہ اس کا ہیولہ نگاہوں سے معدوم نہیں ہوگیا۔ اُسے سلال خان سے بڑی عقیدت تھی اور سلال خان کی کہی ہُوئی باتوں کو وہ پتھر کی لکیر سمجھتا تھا، جب بھی سلال خان اس کے پاس آتا، گڑ مانگتا اور جو بھی پیش گوئی کرتا... فضل خان بڑے اعتماد کے ساتھ اُسے دوسروں تک پہنچا دیتا لیکن اُس کی آج کی بات فضل خان کے لیے تعجب خیز تھی۔

پہاڑوں میں جو کچھ ہو رہا تھا اس سے تو یہی اندازہ ہوتا تھا کہ کسی بھی وقت چٹانیں خون میں نہا جائیں گی۔ چاروں طرف گولیاں برسیں گی، گھر نذرِ آتش کیے جائیں گے اور بے شمار المیے جنم لیں گے، نہ جانے کس قبیلے کا کیا حال ہو؟ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا لیکن سلال خان کی پیش گوئی غلط بھی تو نہیں ہوتی تھی، اس نے جب اور جو کچھ کہا تھا وہ صحیح نکلا تھا تو پھر اَب اس کی باتوں کو جھوٹا کیسے مان لیا جائے اور اس کے بعد جو پہلا گاہک فضل خان کی دُکان پر آیا، فضل خان نے اُس پر اپنی جانکاری کا راز کھول دیا۔

"ارے بھائی کیوں چہرہ لٹکا ہُوا ہے تمھارا، پریشانی کی کوئی وجہ تو ہو۔" فضل خان بڑے اعتماد سے بولا۔

اس کا گاہک چونک کر اس کی صورت دیکھنے لگا۔

"فضل خان! تم آج کل کے حالات سے آنکھیں بند کیے بیٹھے ہو۔ دیکھ نہیں رہے، پہاڑوں کی کیا کیفیت ہے؟"

فضل خان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"بھیا! یہ بادلوں کی گڑگڑاہٹ ہے۔ یہ بادل برسیں گے نہیں، یہ میری پیش گوئی ہے۔" فضل خان نے کہا۔

"لو تم تو ولی بنتے جارہے ہو فضل خان! چاروں طرف جنگ کے بادل منڈلا رہے ہیں اور تم اسے صرف گڑگڑاہٹ قرار دے رہے ہو۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے جاؤ... مگر فضل خان کی بات یاد رکھنا کچھ نہیں ہوگا۔ مطلع صاف ہو جائے گا۔"

گاہک گردن ہلاتا ہُوا چلا گیا۔

فیروز خان کی حویلی میں موت کا سناٹا طاری تھا، ان سناٹوں میں اگر کبھی کوئی آواز گونج جاتی تو وہ خانم کی آواز ہوتی تھی... جو وحشت زدہ انداز میں چیخ پڑتی تھی۔ اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا تھا اور نقاہت سے زرد ہوگئی تھی۔ وہ بیٹوں کی شکل تک دیکھنے کی روادار نہیں تھی۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ کہتی رہتی تھی۔

اس وقت بھی نعمان خان اپنے بقیہ بھائیوں کے ساتھ اس کمرے میں موجود تھا جس کے ملحقہ کمرے میں خانم ایک مسہری پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔ نعمان خان کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ ماں کو یورپ لے جائے اور وہاں اس کے ذہن کا علاج کرائے، وہ جانتا تھا کہ بیٹیوں کے صدمے نے ماں کو اس حد تک ذہنی طور پر مفلوج کر دیا ہے کہ اَب مشکل ہی سے اس کے ہوش میں آنے کی توقع کی جاسکتی ہے لیکن اَب وہ اپنی کوششوں میں کوئی کسر نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

ان سب کو پہاڑوں کے حالات معلوم تھے، بادشاہ خان جو کچھ کر رہا تھا۔ اب اس سے انھیں کوئی سروکار نہیں تھا۔ اُن کی دُنیا تو برباد ہوچکی تھی، ان کے ذہنوں میں تو تاریکیاں پھیلی ہُوئی تھیں اور ان تاریکیوں میں روشنی کی کوئی کرن نہیں تھی۔

شیران اگر ہاتھ بھی آجاتا تو بہنوں کی زندگی واپس نہیں لائی جاسکتی تھی، ماں کا دماغ تو ٹھیک نہیں ہوسکتا تھا۔ اگر وہ ماں کو شیران کے خون سے غسل بھی دے دیتے، تب بھی خانم کی ذہنی حالت دُرست نہیں ہوسکتی تھی اور پھر خانم تو شروع ہی سے اس انتقام کے خلاف تھی غلطی ہوگئی تھی اُسے بادشاہ خان پر اس قدر اعتماد نہیں کرنا چاہیے تھا۔ بالآخر وہ بھی انسان تھا اور دُشمن کبھی کمزور نہیں ہوتا لیکن انھوں نے بادشاہ خان ہی کی عنایتوں کے سائے میں پرورش پائی تھی اور اس پر مکمل اعتماد کرتے تھے، ماں کا احترام بے شک اپنی جگہ... لیکن بادشاہ خان کی حیثیت بھی ایک باپ کی سی تھی، ان کی نگاہوں میں۔ انھوں نے ہمیشہ اُسی سے امداد چاہی تھی اور اسی کو اپنا بڑا سمجھا تھا، اسی لیے وہ اس کے احکامات سے انحراف نہیں کرسکتے تھے۔

لیکن اس کا نتیجہ کچھ بہتر نہیں نکلا، نعمان خان نے دروازے سے کان لگا کر خانم کی آواز سُنی اور پھر دروازے پر آہستہ سے دستک دی، اسے اُمید نہیں تھی کہ خانم دروازہ کھول دے گی لیکن چند لمحوں بعد دروازہ کھلنے کی آواز سُنائی دی، خانم پُرسکون چہرہ لیے اُن کے سامنے موجود تھی۔

"ماں ہمیں اپنے سامنے حاضر ہونے کی اجازت دے۔" نعمان خان نے کہا اور خانم ایک گہری سانس لے کر اندر مُڑ گئی۔

"آؤ... اندر آجاؤ..." اس کا لہجہ پُرسکون اور جذبات سے عاری تھا۔

نعمان خان کے چہرے پر کسی قدر مسرت کے آثار نظر آئے،

گھر بیٹھے اپنا علاج کرائیں....

آپ پاکستان میں ہوں یا پاکستان سے باہر ہم آپ کی صحت کی حفاظت کرسکتے ہیں۔ کراچی سے دور شہروں اور بیرون ملک سعودی عرب، دوبئی کویت، انگلینڈ، امریکہ، کینیڈا میں مقیم پاکستانیوں کی سہولت و آسانی کے پیش نظر ادارہ فکرِ صحت قائم ہوا ہے۔

اس معتبر ادارہ کا بڑا مقصد عوام کی بے لوث خدمت سستے، آسان و موثر علاج سے کرنا ہے

یہ ادارہ خط و کتابت سے ان دکھی دل بیمار مریضوں کو جو اپنا حال کسی کے سامنے بیان کرنے سے شرماتے ہیں ہمدردانہ غور و فکر کے بعد آسان علاج اور ساتھ ساتھ صحت مند اور کامیاب زندگی گزارنے کے اصولوں اور طریقوں سے آگاہ کرتا ہے۔ آپ اپنی صحت سے متعلق شکایتوں بیماریوں کے تفصیلی کوائف کیساتھ اس شعبے سے استفادہ کرنے کیلئے بذریعہ خط رابطہ قائم کریں

ادارۂ فکرِ صحت

معرفت پوسٹ بکس 483 کراچی ۱

کافی دِنوں بعد اس نے ماں کا یہ لہجہ سُنا تھا۔ تمام بھائی اندر داخل ہو گئے۔ خانم کمرے کے بیچوں بیچ پہنچ کر پلٹی اور عجیب سی نگاہوں سے انھیں دیکھنے لگی پھر اس کی آواز اُبھری۔

"تمھیں دیکھ کر دل بہت بڑا ہو جاتا ہے، یوں لگتا ہے جیسے سینے پر بے شمار ہاتھ رکھے ہوں اور اُسے تسلیاں دے رہے ہوں لیکن جگر کے ٹکڑے یکساں ہوتے ہیں۔ تمھاری حماقت نے مجھ سے میری بیٹیاں چھین لیں۔ مجھے اُن سے بھی اتنا ہی پیار تھا جتنا تم سے... تندرست و توانا تھیں، کسی بیماری کا شکار بھی نہ تھیں لیکن اُنھیں تمھاری بیماری چاٹ گئی۔ تمھارے ذہن بیمار ہو گئے تھے، جن کا اثر ان کی زندگی پر پڑا۔ مجھے بتاؤ نعمان خان! کیا مَیں اپنی کسی ایک بیٹی کو بھی آواز دے سکتی ہوں، کیا میری آواز کی بازگشت صرف فضاؤں میں گونج کر نہ رہ جائے گی۔ کیا مجھے ان میں سے کسی ایک بھی آواز کا جواب ملے گا؟ بولو... کس کا نام لے کر پکاروں، کون آئے گا میرے پاس... بولو۔ جواب دو... جواب دو نا...؟" خانم کی آواز میں دُنیا جہان کا درد تھا اور نعمان خان کا سَر جُھک گیا۔

"ماں..." نعمان کی کرب ناک آواز اُبھری۔ "جو کچھ ہُوا ماں! ہمارے لیے بھی اتنا ہی کرب ناک ہے جتنا تیرے لیے... ماں! ہم انھیں واپس نہیں لا سکتے لیکن اس آڑے وقت میں ہمیں تیری رہنمائی کی ضرورت ہے، ہمیں اس طرح تنہا نہ چھوڑ...؟"

"مَیں... مَیں ایک بے بس عورت ہوں، جب فیروز خان زندہ تھا تو مَیں بھی زندہ تھی، لوگ میری سُنتے تھے، میری مانتے تھے اور ہر عورت کو یہ خیال رکھنا چاہیے کہ اولاد بہت کچھ ہوتی ہے لیکن شوہر اس بہت کچھ سے بھی زیادہ ہوتا ہے، شوہر ہی تو عورت کا مان ہے، دوسرا کون سُنتا ہے اُس کی؟"

"نہیں ماں... ہم تیرے تابعدار ہیں۔ ساری زندگی میں ہم سے صرف یہی ایک غلطی ہُوئی ہے۔ ہمیں اس کی اتنی بڑی سزا نہ دے، چلو ماں! ہم یہاں سے چلتے ہیں۔ ہم یورپ میں رہیں گے۔ ہم صرف وہ کریں گے جو تُو چاہے گی۔"

"وعدہ کرتے ہو؟" خانم نے مُسکرا کر پوچھا اور نعمان خان تعجب سے اُسے دیکھنے لگا۔

"ہاں ماں! وعدہ..."

"تو پھر یوں کرو، ہم تنہا نہیں جائیں گے، میری چاروں بیٹیوں کو لے آؤ، خاموشی سے ہم یہاں سے نکل چلیں گے۔"

"ماں! اَب وہ واپس نہیں آ سکتیں۔"

"تو پھر مَیں یہاں سے کہیں نہیں جا سکتی، مَیں دِل میں سوچتی ہوں تو یہی فیصلہ کرتی ہوں کہ مجھے اپنی بیٹیوں کے پاس پہنچ جانا چاہیے۔"

"نہیں ماں! نہیں... ایسا کبھی نہ کرنا، ورنہ ہم اس دُنیا میں تنہا رہ جائیں گے۔"

"تنہا... نہیں، بادشاہ خان تمھارا سرپرست ہے۔ تم اس کے پاس چلے جانا اور پھر یوں کرنا کہ شیران کو تلاش کرنا۔ ٹکڑے ٹکڑے کروا لنا اُس کے... اور ان ٹکڑوں کو اپنی چاروں بہنوں کی قبروں پر سجا دینا۔ یہی دلیر کی آن ہوتی ہے اور یہی تو دلیر کی شان ہوتی ہے۔"

"ماں! ہم پر طنز نہ کر۔"

"اچھا اچھا، اَب تم جاؤ، مَیں اس وقت زمین اور آسمان کے درمیان معلّق ہونا چاہتی ہوں۔ مَیں دیکھنا چاہتی ہوں کہ میری بیٹیاں کیا کر رہی ہیں۔" پھر وہ بیٹیوں کو آوازیں دینے لگی۔ اُس پر پھر جنونی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

نعمان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، وہ سب کے سب سر جُھکائے باہر آ گئے اور خانم نے دروازہ بند کر دیا۔ اندر سے اُس کی عجیب و غریب آوازیں سُنائی دے رہی تھیں۔ کافی دیر تک وہ دروازے کے باہر کھڑے رہے اور پھر مُنہ لٹکائے اپنے اپنے کمروں کی جانب واپس چل پڑے... نعمان خان نے غرّاتی ہوئی آواز میں کہا۔

"شیران! انتقام کا یہ طریقہ کسی طور بہتر نہیں تھا۔ ایک بار ہمارے سامنے آ جاؤ تو ہم تجھ سے سوال کریں گے کہ کیا کبھی ایسے بھی انتقام لیا گیا ہے۔ کیا کبھی یُوں بھی ہُوا ہے، کسی بھی دلیر نے ایسا تو نہیں کیا؟"

"یہ بات تو نہ کہو نعمان خان! اس کی ماں بھی ہماری ہی گولیوں کا شکار ہُوئی تھی۔ کیا کسی دلیر نے اس سے قبل ایسا کیا تھا کہ کسی بوڑھی عورت کو اپنی گولیوں کا نشانہ بنایا ہو۔ نعمان خان! اگر سوچو تو شیران بھی اپنی جگہ غلط نہیں تھا، یہ صرف اپنے اپنے دِل کی بات ہے کہ ہم صرف اپنا غم محسوس کرتے ہیں، دوسرے کا نہیں۔" نعمان خان کے چھوٹے بھائی نے کہا۔

"تو پھر اس کا انتقام بادشاہ خان سے لینا چاہیے۔" نعمان کے چہرے پر درندگی کے تاثرات پھیل گئے۔

"نہیں نعمان خان! یہ بھی حماقت ہو گی۔ بادشاہ خان کے سینے کی آگ اُسے یہاں تک لے آئی تھی، ورنہ شاید وہ بھی ایسا نہ کرتا۔"

"تو پھر ہم سب کو خودکشی کر لینی چاہیے۔" نعمان خان بولا۔

"ہاں... یہ بات قابلِ غور ہے اور اس پر توجہ دی جا سکتی ہے۔" نعمان خان کے چھوٹے بھائی نے جواب دیا اور اسی وقت ایک ملازم دوڑتا ہُوا اُن کے نزدیک آ گیا، اُس کے چہرے پر بدحواسی کے تاثرات تھے۔

"کیا ہُوا...؟" نعمان خان نے اُسے دیکھتے ہی پوچھا۔

"آگ... آگ... خانم کے کمرے میں آگ...؟"

"کیا...؟"

وہ سب بدحواسی کے عالم میں خانم کے کمرے کی جانب دوڑے... کھڑکیوں اور دروازوں سے دُھواں نکل رہا تھا اور اندر خانم کے قہقہے سُنائی دے رہے تھے۔ وہ قہقہے جو آہستہ آہستہ دم توڑتے جا رہے تھے۔

نعمان نے وحشیانہ انداز میں دروازے پر ٹکریں مارنا شروع کر دیں اور دروازہ چند ٹکروں میں ٹوٹ گیا۔ اندر چاروں طرف آگ بکھری ہوئی تھی۔ چاروں بھائی آگ میں کُود پڑے اور خانم کو باہر گھسیٹ لائے لیکن عجیب و غریب شکل میں... خانم کے سر پر اَب ایک بال بھی نہ تھا۔ اس کا لباس جل چُکا تھا۔ پُورے بدن سے چراند اُٹھ رہی تھی اور وہ اپنی زندگی کا آخری قہقہہ لگا رہی تھی پھر قہقہے کی یہ آواز جان کنی کی ہچکیوں میں تبدیل ہو گئی اور پھر آخری ہچکی کے ساتھ اُس نے اپنے بیٹوں کی آغوش میں دَم توڑ دیا۔

خانم مر گئی... بادشاہ خان کو اس سلسلے میں کوئی اطلاع نہیں دی گئی تھی۔ فرانہ کے قبرستان میں اس کی تدفین ہو گئی اور نعمان خان اپنے بھائیوں کے ساتھ واپس اپنی حویلی میں آ گیا۔

"جو کچھ ہو چکا ہے اس کے لیے ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ ہم معذور ہیں لیکن ہمارا ایک عہد ہے کہ اگر شیران ہمیں مل گیا اور اس نے کہیں اپنا خاندان آباد کر لیا تو اس خاندان کے ایک فرد کو بھی نہیں چھوڑیں گے۔ تنہا شیران کو نہیں مارا جائے گا بلکہ انتظار کیا جائے گا، اس بات کا شیران اپنا ایک گھر آباد کرے پھر جب اس آبادی میں خاطر خواہ اضافہ ہو جائے تو ہم اس آبادی کو تہ تیغ کر دیں گے۔ زندہ رہے تو یہ کام ہمیں ضرور کرنا ہے۔ تیاریاں کرو۔ بادشاہ خان سے اَب ہمارا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ہم یورپ چلیں گے۔ اس علاقے میں اب ہمارے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ میرے بھائیو! تم سے کسی کو میری رائے سے کوئی اختلاف ہے؟"

"نہیں نعمان خان! تم دُرست کہتے ہو، تم ہمارے سرپرست ہو۔ اَب جیسا تم کہو گے، ویسا ہی ہم کریں گے۔"

"تو پھر مَیں یہاں نہیں رہنا چاہتا۔ ہمیں فوراً یہ علاقہ چھوڑنا ہے۔ جاؤ، اپنے اپنے سامان باندھو۔ ہم کسی سے اپنے یہاں سے جانے کا تذکرہ نہیں کریں گے کیوں کہ چہرے پر سیاہی لے کر جا رہے ہیں اور سیاہ رو کبھی دِن کی روشنی میں اپنا مقام نہیں چھوڑتے، تیاریاں کرو میرے بھائیو! جاؤ تیاریاں کرو۔"

... پھر تمام بھائی منتشر ہو گئے۔

نعمان اپنے کمرے میں آ گیا... ماں کی تصویر سامنے ہی رکھی ہُوئی تھی۔ اس کے سامنے کھڑے ہو کر وہ پھُوٹ پھُوٹ کر رو پڑا۔

* *

بادشاہ خان کا دیا ہُوا وقت ختم ہو چکا تھا بلکہ کئی دن اوپر ہو چکے تھے لیکن پہاڑوں میں بدستور سنسنی پھیلی ہُوئی تھی۔ مخبر، جو خبریں لا رہے تھے، ان سے پتہ چل رہا تھا کہ قبائل اَب تہمانہ میں جمع ہو رہے ہیں۔ تہمانہ کی فضا جنگی نعروں سے گونج رہی تھی۔ شاید بادشاہ خان اپنی ساری قوت مجتمع کر کے چند گھنٹوں میں فیصلے کا خواہاں ہے وہ بڑے حملے کی تیاریاں کر رہا ہے۔

تراب زان کا سردار داؤد بھی ایک دَم تبدیل ہو گیا تھا اور قبیلے کے نوجوان اس پر نثار ہو رہے تھے۔ سردار داؤد کسی خونخوار چیتے کی طرح دُشمنوں کی گھات لگائے بیٹھا تھا۔ اس کی امن پسندی قبر کی گہرائیوں میں جا سوئی تھی۔ اس کی تقریروں سے نوجوانوں کا خون کھول اُٹھتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ تہمانہ اور اس کے حلیف قبائل کو ایسی بدترین سزا دے کہ اس کے بعد کوئی شہ زور ناانصافی کی جُرأت نہ کر سکے۔ وہ کہتا تھا کہ امن دُنیا کی سب سے خوب صورت چیز ہے۔ انسانی زندگی کے لیے امن و سکون بے حد ضروری ہے لیکن کوئی رخنہ انداز اگر پیدا ہو جائے تو پھر اس وقت تک سکون سے رہنا حرام ہے جب تک اس دُشمنِ امن کا نام زمین سے نہ مٹا دیا جائے۔ وہ کہتا تھا کہ اگر پہاڑوں کا قانون مانع نہ ہوتا تو وہ سیدھا تہمانہ کی طرف چل پڑتا اور تہمانہ میں گھُس کر اس بات کا فیصلہ کر لیتا کہ زندگی کس کے لیے ہے اور موت کس کے لیے... اس کے حامی قبائل اسے دِن رات پیغامات بھیجتے رہتے تھے اور تسلّیاں دے رہے تھے کہ جُونہی تہمانہ کے لوگ تراب زان کی طرف رُخ کریں گے، وہ اپنی جگہ چھوڑ دیں گے اور آنے والوں کو چاروں طرف سے پہاڑوں میں گھیر لیں گے۔ ایک قابلِ عمل جنگی نقشہ تیار ہو گیا تھا اور اس جنگی پلان کی تمام حلیف سرداروں نے منظوری دے دی تھی۔

... پھر یُوں ہُوا کہ چند قبیلوں کے سردار تہمانہ پہنچ گئے... بادشاہ خان کی خدمت میں حاضر ہُوئے اور اُنھوں نے اُسے پہلے سے مختلف پایا۔ اس کے چہرے سے بے بسی کے اثرات نمایاں تھے۔ تب سردار ہارون نے اس سے پوچھا۔

"کیا بات ہے، بادشاہ خان! حملے میں تاخیر کیوں کی جا رہی ہے؟"

بادشاہ خان نے نگاہیں اُٹھا کر سردار کو دیکھا اور پھر بھاری لہجے میں بولا۔ "صرف اس لیے سردار کہ پہاڑوں کی تاریخ مستقبل میں بادشاہ خان کو درندہ نہ کہہ سکے، مَیں ان لوگوں کو زیادہ سے زیادہ موقع

دینا چاہتا ہوں، جو شیران کو پہاڑوں میں تلاش کر رہے ہیں۔ میری دلی خواہش ہے سردار! کہ شیران جو ہمارا اصل مجرم ہے۔ میرے ہاتھ آجائے اور اس کی وجہ سے پہاڑی نشیب خون کے تالاب نہ بننے پائیں، مَیں صرف یہ انتظار کر رہا ہوں سردار! اور جس دن مجھے یقین ہو جائے گا کہ شیران اب میری دسترس سے باہر ہے تو وہ دن قیامت کا دِن ہو گا۔"

بادشاہ خان کی آواز میں کھوکھلا پن تھا جسے شاید دوسرے محسوس نہ کر سکے لیکن خود بادشاہ خان کو احساس تھا کہ اس کی آواز میں اَب وہ گرج نہیں ہے جو کچھ عرصہ پہلے تھی اور اس کی وجہ وہ بیڑیاں تھیں، جو تنظیم سے منسلک ہونے کے بعد بادشاہ خان کے ہاتھوں میں پڑ چکی تھیں۔ . .

بادشاہ خان تہمانہ قبیلے کا سردار ہونے کے باوجود ایک دُنیا ساز آدمی تھا۔ اس کے بازوؤں میں اَب بھی پہاڑوں جیسی سختی تھی اور اس کے سینے میں اَب بھی دِل کی جگہ چٹان کا ٹکڑا رکھا ہُوا تھا۔ خون ریزی سے اُسے کوئی خوف محسوس نہیں ہوتا تھا اور گولیوں کی آوازیں اس کے کانوں میں اَب بھی آبشاروں کے مدھر نغموں کی مانند تھیں کہ کبھی ان میں موسیقیت ہوتی ہے اور کبھی کرب زدہ انسانی چیخیں۔ . .

لیکن یہ تنظیم۔ . . اس تنظیم نے اسے بُری طرح اپنے جال میں جکڑ رکھا تھا اور یہ ایک طویل کہانی تھی۔ بادشاہ خان کا کاروبار دُنیا کے مختلف ممالک میں پھیلا ہُوا تھا۔ دولت اس کی نگاہوں میں بہت بڑی وقعت رکھتی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ آنے والا وقت اسے صرف ایک دلیر خان ہی نہ کہے بلکہ وہ پہاڑوں کے سیاہ و سفید کا مالک ہو۔ ہر چند کہ اَب مستقبل کا اُسے یقین نہیں تھا کیوں کہ وہ عُمر کی اس منزل میں تھا، جہاں موت کسی بھی وقت مزاج پُرسی کر سکتی تھی لیکن قابلِ رشک صحت ہونے کی بِنا پر وہ جوانوں کی سی اُمنگیں رکھتا تھا لیکن تنظیم کے اغراض و مقاصد پر اس نے ہوش و حواس کے عالم میں ہی دستخط کیے تھے۔ اس نے سوچا تھا کہ یہ تنظیم اس کے لیے ایک مضبوط سہارا ثابت ہو گی اور کسی بھی بُرے وقت میں وہ اس کی پناہ لے سکتا ہے، لیکن تنظیم کے اغراض و مقاصد اس کی راہ میں رُکاوٹ بن گئے تھے۔

یہ بات تو اُسے بہت بعد میں معلوم ہوئی تھی کہ تنظیم نے اس کا انتخاب کسی خاص مقصد کے تحت کیا ہے۔ وہ ان پہاڑوں میں کوئی ایسا کام کرنا چاہتی تھی جو بقول اس کے پہاڑوں کی بقا کے لیے بہت ضروری تھا لیکن اس شکل میں کہ ان پہاڑوں پر قبائل کا کنٹرول ہونے کی بجائے صرف بادشاہ خان کا کنٹرول ہو اور بادشاہ خان دُور دراز کے علاقوں کا حُکمران کہلائے۔

تنظیم کا واحد مقصد یہ تھا کہ جس مُلک کے مفاد میں یہ تنظیم کام کر رہی تھی اس کی حمایت میں بڑے سرداروں کو منظم کر کے ایک باطنی حکومت قائم کی جائے اور بادشاہ خان کچھ اس طرح اُن کے جال میں جکڑا گیا کہ وہ اپنے تمام وسائل اُن کے حوالے کرنے کا پابند تھا۔ چنانچہ اس بڑے مقصد کی آڑ لے کر انھوں نے بادشاہ خان کو بے دست و پا کر دیا تھا اور اَب وہ . . . وہ نہ رہا تھا۔ جو تھا، اَب اُسے صرف انھی اغراض و مقاصد کا پابند رہنا تھا جو تنظیم کے یا اس بڑے مُلک کے تھے۔ چنانچہ اسے اپنی آواز کے اس کھوکھلے پن پر رونا آ رہا تھا لیکن وہ رو بھی نہیں سکتا تھا۔ سردار حیرت سے اس کی صُورت دیکھ رہے تھے تب اس نے اپنے حواس مجتمع کر کے کہا۔

"اور یہی میرا فیصلہ ہے کہ جنگ سے جس قدر بچا جائے، اچھا ہے۔ مَیں نے بہت غور و خوض کیا ہے اور عقل نے مجھے یہی مشورہ دیا کہ شیران کی پُشت پر کوئی نہیں ہے۔ تراب زان کا صرف اتنا قصور ہے کہ اس نے سلامن قبیلے کو اپنے اندر ایک مقام دیا اور شیران اس کی فضاؤں میں پل کر جوان ہُوا لیکن اس قصور کی بِنا پر مَیں لاتعداد بچوں کو یتیم نہیں دیکھنا چاہتا۔ ان سینکڑوں عورتوں کو بیوہ نہیں دیکھنا چاہتا، جن کا کوئی قصور نہیں ہے۔ مَیں نہیں چاہتا کہ بے گناہ عورتیں شیران کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے مہرداد کی پناہ لیں اور بالآخر بُرائیوں کو جنم دیں۔"

سرداروں نے بادشاہ خان کی اِس تبدیلی کو تحسین کے انداز میں محسوس کیا اور ان کی آنکھوں میں مسرت کی پرچھائیاں رقص کرنے لگیں۔ جتنے بھی قبیلے یہاں جنگ کرنے آئے تھے۔ کوئی بھی دِل و جان سے اس جنگ پر آمادہ نہیں تھا کیوں کہ سب جانتے تھے کہ دشمن بھی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھا ہے۔ اگر یہ لوگ چار افراد کے سینوں میں سوراخ کریں گے تو کم از کم دو افراد ان کے بھی مارے جائیں گے کیوں کہ قبیلوں میں سچے نشانے بہادری کی علامت سمجھے جاتے۔ اپنے نوجوانوں کو کھونے کا احساس کچھ خوشگوار نہ تھا۔ چنانچہ سرداروں نے مناسب سمجھا کہ اس موقعے سے فائدہ اُٹھائیں۔ اُنھوں نے آپس میں ایک دوسرے کو اشارے کیے اور پھر ان میں سے ایک کو منتخب کر لیا گیا کہ وہ بادشاہ خان سے بات کرے۔ یہ سردار طغرل تھا۔ سردار طغرل نے نرم اور شیریں آواز میں بادشاہ خان سے مخاطب ہُوا۔

"عظیم خان کا یہ عظیم فیصلہ پہاڑوں کی عظمت کی دلیل ہے۔ یہ فیصلہ ہمالیہ کی مانند بلند اور اس سے بہنے والے جھرنوں کی طرح نرم و نازک ہے، بے شک ایک اہلِ دِل ہی انسانوں کا درد اپنے اندر محسوس کر سکتا ہے اور بُرا ہُوا اس بدبخت کا جس نے خان کے غصّے کو آواز دی لیکن یہ فیصلہ بہت ہی مُناسب اور انتہائی خوشگوار ہے، بادشاہ خان . . . اور اَب ہم سب پر بھی یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ ہم سب شیران کی تلاش میں اپنا کچھ وقت صرف کریں، اور پہاڑوں میں بسنے والے تمام قبائل کو مشترکہ یہ اعلان کرنا چاہیے کہ شیران قابلِ گردن زنی ہے اور اس کی تلاش بھی ایک اتنا ہی اہم فریضہ ہے جتنا کہ عبادت . . . تو سردار بادشاہ خان! اگر ہم اپنا یہ پیغام تراب زان اور دیگر قبائل کو پہنچا دیں تو وہ سب بادشاہ خان کی عظمت کا اعتراف کیے بغیر نہ رہیں گے اور ان میں سے ہر شخص کم از کم ایک گھنٹہ شیران کی تلاش میں ضرور صرف کرے اور اسے پہاڑوں کے غاروں میں سے ڈھونڈ نکالے، سرحدیں بند کر دیں اور جہاں بھی شیران کو پائیں، اُسے زندہ یا مُردہ بادشاہ خان کی خدمت میں پیش کر دیں لیکن اگر یہ اعلان ہو جائے بادشاہ خان! تو قبائل ان نقصانات سے دوچار نہ ہوں گے، جو جنگ کی صُورت میں پیش آنے والا ہے۔"

بادشاہ خان کو انھی الفاظ کا انتظار تھا، اپنی انا اور اپنے وقار کے آخری ستون کو گرنے سے بچانے کے لیے یہ الفاظ اس کے لیے ضروری تھے۔ چنانچہ اس نے سردار طغرل کی جانب نرمی اور محبت سے دیکھا اور کہا۔ "سردار طغرل! میرا کوئی بیٹا نہیں ہے، میری کوئی بیٹی نہیں ہے۔ مَیں بے اولاد ہوں لیکن میرا دِل انسانی دَرد سے خالی نہیں ہے، مَیں نہیں چاہتا کہ ہم میں سے کچھ کم ہو جائیں۔ مَیں نہیں چاہتا کہ جنھیں میں دُشمن سمجھتا ہوں، اُن کی عورتیں بے بسی سے آنسو بہائیں اور روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کی محتاج ہو جائیں۔ . . مَیں خود بھی انسان ہوں سردار طغرل! اور انسانوں کے ساتھ انسانی سلوک کرنا چاہتا ہوں، ہر چند کہ مَیں جانتا ہوں کہ تہمانہ کی طاقت کا کوئی بھی مقابلہ نہیں کر سکتا لیکن میں اُن قوتوں کو ان دُشمنوں کے لیے محفوظ رکھنا چاہتا ہوں جو پہاڑوں کے باہر سے ہم پر حملہ آور ہونے کی کوشش کریں، چنانچہ اس سلسلے میں اگر کوئی بہتر لائحہ عمل بنانا چاہتے ہو تو میں تمھیں اس کی اجازت دیتا ہوں۔"

"یہ کام ہمارا ہے بادشاہ خان! اور ہم اس کے لیے آپ سے صرف آٹھ گھنٹے کی مہلت چاہتے ہیں۔"

"مَیں تمھیں یہ مہلت دیتا ہوں۔ جاؤ اور جس طرح مُناسب سمجھو، کرو۔" بادشاہ خان نے کہا۔ اپنی بے بسی پر اس کی آنکھوں سے آنسو اُمڈ رہے تھے لیکن کسی بھی آنسو کے باہر گرنے سے قبل وہ اپنی آنکھوں کی بینائی ختم کر سکتا تھا اس لیے اس نے یہ آنسو روک لیے۔ . . سردار خوش خوش واپس چلے گئے تھے اور پھر منادی کرنے والوں نے پہاڑوں میں نئی زندگی کی لہر دوڑا دی۔

تراب زان کے سردار داؤد کا سر سجدے میں جُھک گیا۔ اس کے بعد۔ . . اُس نے باہر آ کر اعلان کیا۔ "تراب زان کے لوگو . . . مَیں بادشاہ کی خدمت میں جاؤں گا اور اُس سے کہوں گا کہ شیران کا جُرم ہم میں سے کسی کو بھی پسند نہیں۔ ہم ایک ایک لمحہ اس کی تلاش میں صرف کریں گے اور جب بھی وہ مِل گیا اُسے بادشاہ خان کے حضور پیش کر دیا جائے گا۔"

سردار داؤد خان کی یہ سعی ناکام نہ رہی۔ . . بادشاہ خان نے اُسے تہمانہ میں خوش آمدید کہا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ بادشاہ خان کے اندر یہ تبدیلی کیوں کر رُونما ہُوئی ہے لیکن وہ اس تبدیلی کو پسندیدہ نِگاہوں سے دیکھ رہے تھے اور جب سردار داؤد نے اپنی خدمات بادشاہ خان کو پیش کیں تو بادشاہ خان نے سنجیدگی سے گردن ہلاتے ہُوئے کہا۔

"جو کچھ ہُوا ہے، سردار داؤد! وہ انتہائی نامُناسب تھا۔ مَیں نے اپنے غضب کو خود ہی ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دیے ہیں اور وہ بھی صرف اس لیے کہ میں بھی پہاڑوں کے قانون کو بُرا نہیں سمجھتا، میرے سینے میں جو آگ روشن تھی، اُس نے مجھے روک دیا تھا کہ مَیں اس قانون کی پُشت پناہی نہ کروں لیکن بالآخر انسانوں کی محبت میرے احساسات پر غالب آئی اور مَیں نے سوچا کہ میری انا ہزاروں انسانوں کا خون بہانے کے لیے مُناسب نہیں ہے لیکن سردار داؤد! مَیں شیران کو کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا اور اگر تم دوستی کا پیغام لے کر میرے پاس آئے ہو تو اپنے قبیلے میں جا کر اعلان کر دو کہ ہر شخص شیران سے اپنی دُشمنی کا اعلان کرے اور اُسے تلاش کرے۔"

"ایسا ہی ہو گا بادشاہ خان! ایسا ہی ہو گا۔" سردار داؤد نے خوشی کے عالم میں کہا اور پھر وہ وہاں سے چلا آیا۔

لیکن تنہائیاں بادشاہ خان کے لیے بڑی جاں گُسل تھیں۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا لباس مجمعِ عام میں اُتر گیا ہو اور اَب وہ ایک بے بس بوڑھے کے علاوہ کچھ نہ ہو، پھر یہ بے بس بوڑھا گھوڑے کی پُشت پر بیٹھ کر فرانہ کی طرف چل پڑا۔ وہ اُن بے بسوں کو تسلّی دینا چاہتا تھا جو اس کی اَنا پر قربان ہو گئے تھے اور جن کی ناموس خاک میں مِل گئی تھی اور یہ فیروز خان کے بیٹے تھے۔

. . . جب اس کا گھوڑا فرانہ میں داخل ہُوا اور اُس نے حویلی میں قدم رکھا تو سوگوار ملازموں کے علاوہ اُسے کوئی نہ مِلا۔ حویلی خالی پڑی ہُوئی تھی۔ ملازموں نے اُسے خانم کی موت کی اطلاع دی اور بتایا کہ فیروز خان کے تمام بیٹے فرانہ چھوڑ کر کسی نامعلوم سمت کو چل پڑے ہیں۔ . . اور اس وقت بادشاہ خان کی آنکھوں سے دو آنسو نِکلے اور خاموشی سے زمین پر جذب ہو گئے کہ بادشاہ خان، فیروز خان کے بیٹوں کو اپنے بیٹے سمجھتا تھا اور اُسے احساس تھا کہ ان کی تباہی کا باعث

وہ خود ہے لیکن قصور اس کا بھی نہیں تھا۔ قبیلوں کی یہی رسمیں ہوتی ہیں اور وہ اپنے بھائی کی موت کو فراموش نہیں کر سکتا تھا۔

سوگوار ملازم گردن جھکائے کھڑے تھے۔ بادشاہ خان کافی دیر تک خاموش کھڑا رہا پھر ملازموں سے مخاطب ہو کر بولا۔ "خانم کی موت کی اطلاع مجھے کیوں نہ دی گئی۔"

"نعمان خان کی اجازت نہ تھی، خان۔" ایک ملازم نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

"اُس نے تمھیں منع کیا تھا؟"

"ہاں مالک... سختی سے منع کیا تھا کہ کوئی نوکر تہمانہ کا رُخ نہ کرے ورنہ اُسے سزا دی جائے گی۔"

"آہ... فیروز خان کے بیٹے مجھے قصوروار سمجھتے ہیں جب کہ مَیں نے اُن کی موجودگی میں خود کو کبھی بے اولاد نہیں سمجھا۔ مَیں نے ہمیشہ اُنھیں اپنی اولاد سمجھا لیکن... لیکن بادشاہ خان ان دِنوں تقدیر کے عتاب کا شکار ہے۔ اسے ہر طرف سے مایوسی کا مُنہ دیکھنا پڑ رہا ہے۔"

سب ملازم خاموشی سے سر جھکائے کھڑے تھے۔

چند لمحوں بعد بادشاہ خان نے پوچھا۔ "تمھیں معلوم ہے کہ وہ کہاں گئے ہیں؟"

"نہیں آقا! ہمیں کچھ معلوم نہیں۔"

"ہوں... اچھا ٹھیک ہے۔ تم آرام کرو۔"

"ہمارے لیے کیا حکم ہے مالک؟" ایک پُرانے خادم نے پوچھا اور بادشاہ خان رُک کر اُسے دیکھنے لگا۔

"کیا مطلب ہے تمھارا؟"

"ہمیں اَب کیا کرنا چاہیے؟"

"جو کرتے تھے، کرتے رہو۔ یہ حویلی غیر آباد نہیں رہنی چاہیے۔ ہر صبح دروازے کھولو اور آنے والوں کا انتظار کرو۔ مَیں حالات کا شکار ہُوا ہوں لیکن مستقبل سے مایوس نہیں ہُوں۔ ایک نہ ایک دن یہ حویلی ضرور آباد ہوگی۔ مَیں ایک نہ ایک دِن اپنے بچّوں کے دِل سے غلط فہمیاں دُور کر دوں گا اور اپنے گھر کی رونقوں کو واپس لے آؤں گا۔ یہ دولت یہ جائدادیں یہ کاروبار اور کس کے لیے ہیں؟ مَیں نے جو کچھ کیا ہے۔ اُنھی کے لیے تو کیا ہے۔ حویلی اسی طرح آباد رکھو۔"

بادشاہ خان دروازے کی طرف بڑھ گیا اور اس کا گھوڑا تہمانہ کی جانب روانہ ہوگیا۔

●

"آؤ سلال خان! گزر جا ہیے؟" فضل خان نے پوچھا۔

"نہیں... آج کوئی پیش گوئی نہیں کروں گا۔ دیکھو۔ کُہر کی دُھند میں دیکھو۔ وہ مایوس واپس جا رہا ہے۔"

"کون...؟"

"زلزلہ... جس کی آمد کے احساس سے پہاڑ دھمک رہے تھے۔ مَیں نے کہا تھا نا کہ یہ بس تیز ہَواؤں کا شور ہے، زلزلہ نہیں ہے۔ ہَوائیں چلتی ہیں اور بند ہو جاتی ہیں۔ سو یہ کھیل ختم ہُوا۔ اچھا اَب مَیں چلتا ہُوں تمھیں اَب میری ضرورت نہیں ہے۔" سلال خان نے کہا اور تیزی سے ایک طرف چل پڑا۔

✵

شیران پہاڑوں میں بھٹک رہا تھا۔ دو دِن ہو گئے تھے، اُس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ ایک دو جگہ پہاڑی چشمے ملے تھے، جن کا شیریں پانی بس اس کی پیاس بُجھانے میں معاون ہُوا تھا۔ بھوک اُسے بے چین کر رہی تھی لیکن بدبختی تھی یا قدرت کا انتقام کہ ان دو دِنوں میں اُسے کوئی شکار بھی نہیں نظر آیا تھا اور نہ ہی کوئی ایسا پھل دار درخت جس سے وہ اپنے پیٹ کی آگ بُجھاتا۔

حتی الامکان وہ انسانوں سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ فطرتاً وحشی تھا لیکن چالاک بھی تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس وقت ان پہاڑوں میں کوئی اس کا دوست نہیں ہے۔ اس کا حُلیہ ہر شخص کو ذہن نشین کرا دیا گیا ہوگا اور تلاشی لینے والوں کا وہ نشان بھی اس کی مدد نہیں کر سکے گا جو اس نے تور خان کو قتل کر کے حاصل کیا تھا۔

تاحدِ نگاہ چٹیل پہاڑ بکھرے ہُوئے تھے۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ کس سمت نکل آیا ہے۔ وہ افغانستان میں داخل ہونا چاہتا تھا اور اس کا خیال تھا کہ افغانستان کے راستوں کی جو تفصیلات اس نے دوسروں سے سُنی ہیں، انھیں مدِنظر رکھتے ہُوئے وہ بہ آسانی افغانستان میں داخل ہو جائے گا لیکن پہاڑوں کی بھُول بھُلّیوں نے اُسے اُلجھا لیا تھا اور اَب اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ راستہ بھٹک گیا ہے۔

اُسے اس بات کی پروا نہیں تھی۔ آدھی عُمر بھی اگر راستوں کی تلاش میں صرف ہو جائے تو کیا فکر ہے۔ اَب کون تھا جو اس کا انتظار کرے گا۔ ماں کی ڈانٹ ڈپٹ سے تو وہ ہمیشہ کے لیے آزاد ہو گیا تھا لیکن ماں اُسے یاد بہت آتی تھی۔ بہت اچھی تھی وہ... اُس کے ہاتھ کے پکے ہُوئے کھانے... بھوک کی شدّت تھی، اس لیے اُسے کھانا ہی یاد آیا اور وہ ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔

رات جھُکتی چلی آ رہی تھی۔ قُرب و جوار میں دُور دُور تک کوئی درخت یا جھاڑی نہیں تھی۔ جدھر نگاہ اُٹھتی ننگی چٹانیں ہی چٹانیں بکھری نظر آتیں۔ یہ چٹانیں تاریکی میں ڈوبتی جا رہی تھیں۔ اس نے رات بسر کرنے کے لیے ایک جگہ کا انتخاب کر لیا۔ دو چھوٹے چھوٹے پتھر اُٹھا کر سرہانے رکھے اور تکیہ بنا کر لیٹ گیا۔

ہَوائیں سرد تھیں لیکن ناقابلِ برداشت نہ تھیں اس لیے بھوک کے علاوہ اسے اور کوئی تکلیف نہ محسوس ہُوئی۔ اس تکلیف سے نجات حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ اس کے ذہن میں نہیں آ رہا تھا... نہ جانے کتنا وقت گزر گیا۔ اس پر غنودگی طاری ہو گئی۔ یہ غنودگی تھی یا نقاہت، اس کا اُسے اندازہ نہیں ہو سکا تھا۔

بہر حال رات گزرتی رہی... اُس نے کروٹ تک نہیں بدلی۔ دو دِن کی بھوک نے اُسے نڈھال کر دیا تھا۔ وہ رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا کہ اچانک اس کے پیر میں انگارے بھر گئے۔ دَرد کی شدّت سے اس کے حلق سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ دفعتاً اُسے کسی جانور کے غرّانے کی آواز سُنائی دی۔ اس کی نگاہ سامنے اُٹھ گئی... چاند کی زرد زرد روشنی میں اُس نے دیکھا کہ اُس سے کچھ ہی فاصلے پر انگاروں جیسی چمکتی ہُوئی دو آنکھیں اُسے گھُور رہی تھیں۔ وہ لکڑ بگڑ تھا جو اس پر دوسرا حملہ کرنے کے لیے تیار تھا۔

شدید تکلیف کے باوجود اس کے حلق سے غرّاہٹ نکلی اور اس نے جلدی سے پیٹی میں اڑسا ہُوا پستول نکال لیا لیکن اس کے جنبش کرتے ہی وحشی جانور نے چٹانوں کے پیچھے چھلانگ لگا دی اور نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اب فائر کرنا بے کار تھا۔

اس نے گہری گہری سانسیں لیتے ہُوئے پستول قریب ہی رکھ لیا۔ خون کا رسیا جانور اسے غافل پا کر دوبارہ اس کے نزدیک آنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے اپنے زخمی پیر کو قریب کر کے دیکھا۔ لکڑ بگڑ نے اس کا پنجہ چبا ڈالا تھا اور اس کے نوکیلے خونخوار دانت ہڈیوں تک اُتر گئے تھے۔ زخمی پنجے سے خون بہہ رہا تھا۔ درد کی ناقابلِ برداشت لہریں اس کے پُورے بدن میں دوڑ رہی تھیں۔ تکلیف کی شدّت سے اس پر غشی طاری ہونے لگی اور تھوڑی دیر کے لیے اس کا ذہن تاریکی میں گُم ہو گیا لیکن درندوں کے خوف نے اُسے زیادہ دیر بے ہوش نہ رہنے دیا۔ آنکھیں پھر کھُل گئیں۔ آسمان پر ستارے ٹمٹما رہے تھے اور چاندنی بدستور ماحول کو روشن کر رہی تھی۔ اِرد گِرد کا ماحول بھیانک اُداسی میں ڈُوبا ہُوا تھا۔ ہر طرف وحشت کی حُکمرانی تھی۔ اس نے ایک کراہ کے ساتھ دونوں ہاتھ زمین پر ٹِکا کر اُٹھنے کی کوشش کی لیکن سر چکرا گیا۔ ساری کائنات گھُومتی ہُوئی محسوس ہُوئی اور وہ مُنہ کے بل نیچے آ رہا... بھوک کی نقاہت تو تھی ہی، زخم سے بہنے والے خون نے بدن کی قوتیں نچوڑ لی تھیں۔

وہ چند ثانیے اسی طرح پڑا رہا۔ اُسے اپنی کمزوری پر خود جھنجلاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ جھلّائے ہُوئے ذہن کے ساتھ وہ پھر اُٹھا اور اس بار اُسے کامیابی نصیب ہو گئی۔ تب اس نے دوسری طرف سے ایک لمبا شکاری چاقو نکالا اور اُسے کھول کر اپنی قمیص کے دامن سے لمبی لمبی پٹّیاں کاٹنے لگا پھر ان پٹّیوں کو بمشکل تمام اس نے اپنے زخم پر کَسا۔ خون تو بند ہو گیا لیکن کان اَب بھی سائیں سائیں کر رہے تھے... بار بار چکّر آ جاتا اور وہ آنکھیں بند کر لیتا۔ اگر دو دِن کا بھوکا نہ ہوتا تو شاید حالت اتنی زیادہ خراب نہ ہوتی لیکن اس وقت وہ اپنی زندگی کی سب سے بڑی کشمکش کا شکار تھا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت تھی اور بار بار وہ گردن جھٹک جھٹک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا تھا۔

پٹّی بہت زیادہ کَس کر باندھنے سے ٹانگ بے حس ہوتی جا رہی تھی۔ یہ اس کے حق میں بہتر تھا کیوں کہ اس طرح زخم کی تکلیف سے کسی قدر نجات ملتی جا رہی تھی لیکن بعد کے معاملات کٹھن تھے۔ دوست تو درکنار، یہاں دُور دُور تک دُشمنوں کا بھی پتہ نہیں تھا۔ اور لمحہ بہ لمحہ حالت خراب ہی ہوتی جا رہی تھی۔

وہ اسی عالم میں بیٹھا رہا... پستول پاس ہی رکھا تھا اور اس کے کان ہر آہٹ پر لگے ہُوئے تھے لیکن درندہ واپس نہیں آیا۔ نہ جانے کیوں اُس نے دوبارہ اس طرف آنے کی جُرأت نہیں کی۔

ستارے مدّھم پڑنے لگے۔ شاید صبح کی آمد تھی اور اس وقت روشنی اور دُھند لکے آپس میں مدغم ہو رہے تھے... اچانک اُسے ایک عجیب سی آواز اپنے عقب میں سُنائی دی۔ اُس نے گردن جھٹک کر گھُوم کر دیکھا اور اس کی سانس ایک دم حلق میں رُک گئی۔

تھوڑے ہی فاصلے پر سیاہ رنگ کا ایک سانپ رینگ رہا تھا جس کی لمبائی پانچ فٹ سے کم نہیں تھی۔ اس سے قبل شاید وہ کسی زندہ وجود سے باخبر نہ تھا لیکن جُونہی شیران پلٹا، سانپ کو کسی جاندار شے کا احساس ہو گیا۔ وہ بھی اپنی بستی کا شیران ہی معلوم ہوتا تھا کیوں کہ وہاں سے بھاگ جانے کے بجائے اُس نے جلدی سے اپنے بدن کو سمیٹا اور اس کا چوڑا پھن کھُل گیا۔ وہ پھن کاڑھ کر کھڑا ہو گیا اور اَب وہ دُشمن سے مقابلے کے لیے پُوری طرح تیار تھا۔ اس کی ننھی ننھی سُلگتی ہُوئی آنکھیں شیران پر جمی ہُوئی تھیں۔

شیران ساکت تھا... دونوں دُشمن ایک دوسرے کو خونی نگاہوں سے گھُور رہے تھے۔ شیران کے ہاتھ غیر محسوس انداز میں پیچھے کھسک رہے تھے۔ اُسے پستول کی تلاش تھی جو اُس نے نزدیک ہی رکھا تھا لیکن پستول اُس کے ہاتھ کی پہنچ سے دُور تھا اور اُسے حاصل کرنے کے لیے پلٹنا ضروری تھا۔

شیران جانتا تھا کہ جونہی اُس کی نگاہ ہٹی، سانپ فوراً حملہ کر دے گا اور کامیابی چوکنّے دُشمن کو ہی نصیب ہوتی ہے۔ دفعتاً اس کے ہاتھ چاقو کے دستے سے ٹکرائے اور شیران نے اُسے گرفت میں لے لیا۔ اگر ہوشیاری سے کام لیا جائے تو یہ چاقو بھی کارآمد ہو سکتا ہے۔

چاقو کو اُس نے پھل کی طرف سے پکڑ لیا۔ ہرچند کہ یہ چاقو پھینک کر مارے جانے کے قابل نہیں تھا لیکن اگر مہارت سے کام لیا جائے اور پھینکنے کی قوت بحال رکھی جائے تو کام بن سکتا تھا... حالانکہ حواس دُرست نہ تھے، اس کے باوجود شیران کے ذہن میں نئے خیال نے پرورش پائی تھی اُس نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ زندگی بچانے کے لیے سانپ کا شکار بہت ضروری ہے اور پھر ناقابلِ یقین پھرتی سے چاقو شیران کے ہاتھ سے نکلا... سانپ نے پھن ہلانا چاہا لیکن شیران نے چاقو اتنی مہارت اور چابک دستی سے پھینکا کہ اُسے ہلنے تک کی مہلت نہ مل سکی۔ چاقو اُس کے پھن کے درمیان اُتر گیا... چند لمحوں تک تو سانپ اپنا سَر زمین پر مارتا رہا پھر اُس کی کنڈلی کے بَل کُھلتے گئے اور وہ بے سُدھ ہو کر بے حس و بے حرکت ہو گیا۔

شیران کے حلق سے ہذیانی قہقہے نکل رہے تھے۔ اس دلچسپ تماشے میں ایک لمحے کے لیے وہ اپنی تکلیف بُھول گیا تھا لیکن جونہی وہ ہلا، دَرد کی ایک لہر نے اُسے پھر تکلیف کا احساس دِلا دیا۔

شیران زمین پر لیٹ گیا۔ اس کے لمبے بازو پھیل گئے اور پھر وہ آہستہ آہستہ سانپ کی طرف کِھسکنے لگا۔ پاؤں کی تکلیف کے احساس کے باوجود وہ سانپ تک پہنچ گیا۔ اس نے سانپ کے پھن سے چاقو کھینچ لیا اور اسے اپنے لباس سے رگڑ کر اس نے سانپ کے پھن کو گردن سے کافی نیچے سے کاٹ کر پھینک دیا پھر سانپ کے بقیہ بدن کو گھسیٹ کر قریب کر لیا۔ اندر کی کیفیت پر قابو پانے میں اُسے صرف چند لمحات صَرف ہُوئے پھر سانپ کا بدن اس کے دانتوں تلے آ گیا۔ تیز دانتوں نے اُسے کاٹ لیا اور وہ اس کا گوشت چبانے لگا۔

پھیکا اور بے مزا گوشت اس کے معدے میں اُترنے لگا اور شیران کی شکم پُری ہونے لگی۔ آخر میں سانپ کی دُم رہ گئی جسے اُس نے ایک طرف پھینک دیا۔

پیٹ کی آگ بُجھ گئی... لیکن اس سے شیران کی وحشی فطرت کا اظہار ہوتا تھا۔ سانپ کو اس طرح کھا لینا معمولی بات نہیں تھی۔ پیٹ بھر جانے کے بعد وہ خود کو چاق و چوبند محسوس کر رہا تھا لیکن پیر کی تکلیف اُسے اَب بھی بے کل کیے دے رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اَب پیدل چلنا اس کے لیے ممکن نہ ہو گا اور نہ جانے کتنا سفر کرنا ہے۔ اس نے یہ بھی سوچا تھا کہ اس وقت اس کے پاس پستول اور چاقو دُنیا کی سب سے قیمتی شے ہے۔ پستول کی ایک ایک گولی اہمیت رکھتی ہے اور چاقو اس کا مونس ہے۔ اس نے بڑے پیار سے چاقو اپنے لباس میں رکھ لیا۔

پہاڑوں کے دامن میں آہستہ آہستہ صبح کا لالہ زار کِھلتا جا رہا تھا... آسمان پر ہلکی ہلکی روشنی نمودار ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے بدن کی توانائی سانپ کے گوشت سے بحال ہو گئی تھی حالانکہ یہ زندگی کا پہلا تجربہ تھا لیکن بُرا نہیں تھا پھر جب روشنی پُوری طرح پھیل گئی تو اس نے زمین پر گِھسٹنا شروع کر دیا۔ خون جم کر مرہم بن گیا تھا لیکن تکلیف اَب بھی تھی۔ وہ حواس مجتمع کیے گھسٹتا رہا اور اپنی جگہ سے کافی دُور نکل آیا...

سورج بلند ہو گیا تھا اور چونکہ یہ علاقہ زیادہ سرد نہیں تھا اس لیے اچھی خاصی گرمی ہو گئی تھی۔ وہ اسی طرح گرتا پڑتا کافی دُور نکل آیا۔

دوپہر ڈھلے وہ ایک ایسے علاقے میں پہنچا جہاں درخت نظر آ رہے تھے۔ ان درختوں کو دیکھ کر اُسے بیساکھی کا خیال آیا اور اس نے تیزی سے درختوں کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ کافی دیر کے بعد وہ درختوں کے پاس پہنچا۔ چاقو جیب سے نکالا اور حواس مجتمع کر کے ایک ایسے دوشاخے کا انتخاب کیا جسے بیساکھی بنایا جا سکتا تھا۔ شدید جدوجُہد کے بعد اس نے ایک بیساکھی تیار کی، دوسرے ہاتھ کے سہارے کے لیے اس نے ایک چھڑی بنا لی تھی۔ اس کے بعد وہ لنگڑاتا ہُوا چل پڑا۔ ایک نامعلوم منزل کی جانب اور اس وقت تک چلتا رہا جب تک رات نہ ہو گئی۔

◆

شاہ امان اللہ کی ملکہ نے چادر اُتاری تو شاہ کو سلطنت سے ہاتھ دھونے پڑے مگر وہ پُرانے وقتوں کی بات ہے۔ جدید افغانستان منی اسکرٹ اور اُونچی ایڑی کے جُوتوں والی خواتین کا افغانستان ہے جو جدید اور نوجوان ہوں تو چادر کا ایک کونہ سَر پر رکھے نظر آتی ہیں... جسے "اسکارف" کہا جا سکتا ہے اور اگر ذرا قدیم ہوں تو اسکرٹ کو سفید بُرقعے سے چُھپا لیا جاتا ہے لیکن اس طرح کہ چلتے وقت عُریاں ٹخنوں کا حسین نظارا نگاہوں سے محو نہ ہونے پائے۔ بھُوری پہاڑیوں سے پرے کا کابل البتہ جوں کا توں تھا اور شہرِ نو کی رونقوں کا وہاں گزر نہ تھا۔ وہاں اَب بھی روایتی لباس پہنے جاتے ہیں اور باحیا عورتیں بدن کی نمائش سے گریز کرتی ہیں۔

شیران نے سیاہ چُغے میں لپٹی ہُوئی اس سُرخ و سفید حسینہ کو دیکھا جس کے اخروٹی رنگت کے بال مخصوص طرز کی باریک باریک چوٹیوں میں لپٹے اس کے سینے پر جھُول رہے تھے۔ وہ پتھر کی ایک سِل پر کچھ پیس رہی تھی اور ڈھیلے ڈھالے چوغے سے بھی اس کے بدن کی رعنائیاں آواز دے رہی تھیں اور اس کی نوعمری کی کہانیاں سُنا رہی تھیں۔ شیران کو وہ سلاخیں بہت بدنُما لگیں جو اس کے اور لڑکی کے درمیان حائل تھیں اور لڑکی مکمل طور پر اس کے سامنے نہیں تھی۔ یہ سلاخیں اس کھڑکی میں لگی ہُوئی تھیں جو اس کمرے کی دیوار میں تھی۔

اس نے اپنی جگہ سے کھسک کر کوئی ایسی جگہ تلاش کرنے کی کوشش کی جہاں یہ سلاخیں اس کے اور لڑکی کے درمیان حائل نہ ہوں اور دفعتاً دَرد کی ایک لہر اس کے پیر میں اُٹھی اور وہ چونک کر ساکت ہو گیا۔ یہ دِل کش نظارا اُسے ایک خواب کی مانند محسوس ہُوا اور چٹیل میدانوں کی وہ حقیقتیں عُریاں ہو گئیں جو ان دِل کش نظاروں سے مختلف تھیں۔ پاؤں کی تکلیف نے اُسے سب کچھ یاد دِلا دیا، گزرا ہُوا وقت مکمل طور پر اس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا اور اس نے کئی بار آنکھیں بھینچ کر کھولیں اور اپنے اِرد گرد کے ماحول کو دیکھا لیکن اس وقت جو کچھ اس کے سامنے تھا۔ وہ کوئی خواب نہ تھا۔ پتھریلی دیواریں، بائیں سمت ایک دروازہ اور اس جگہ جہاں وہ ایک مخصوص قسم کی مسہری پر لیٹا ہُوا تھا دیوار میں یہ کھڑکی جس میں موٹی موٹی لوہے کی سلاخیں لگی ہُوئی تھیں اور ان سلاخوں کے دوسری جانب سِل پر کچھ پیستی ہُوئی حسین لڑکی، یہ سب کچھ بھی خواب نہ تھا۔ اس نے گھبرا کر اپنا بدن ٹٹولا، وہ لباس بھی اس کے جسم پر موجود نہیں تھا جسے پہن کر وہ جنگلوں میں سفر کر رہا تھا۔ پاؤں کے زخم پر وہ پٹی بھی نہیں تھی جو اس نے اپنی قمیص پھاڑ کر پیر پر کَسی تھی، بلکہ اس کی جگہ اب ایک سفید پٹی کَسی ہُوئی تھی۔ سب کچھ بدل گیا تھا۔ سارا ماحول ہی بدل گیا تھا۔ وہ وقتی خواب نہ تھا اور اس وقت بھی وہ خواب نہیں دیکھ رہا تھا لیکن نیند کے عالم میں یا بے ہوشی کے عالم میں یہ فاصلے کس طرح طے ہُوئے اور یہ کون سی جگہ ہے؟ اس نے سوچا اور خود کو پُرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ یوں لگا جیسے ماحول بدل گیا ہے۔ کوئی مجھے یہاں لے آیا۔ مگر کون...؟

اس کا جواب شیران کے پاس نہیں تھا اور یہ سوال اس کے ذہن میں شدید اُلجھن پیدا کر رہا تھا۔ پاؤں کچھ اس طرح ہلا تھا کہ دَرد ہونے لگا تھا لیکن شیران محسوس کر رہا تھا کہ دَرد میں اَب وہ شدت نہیں ہے جو کچھ دیر قبل تھی۔ اس کی نگاہیں کھڑکی کے پار اس حسینہ کی جانب اُٹھ گئیں جو اَب اپنا کام ختم کر چکی تھی پھر وہ ایک برتن ہاتھ میں لیے ہُوئے اُٹھی اور مست چال چلتی ہُوئی شیران کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

شیران نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ اس لڑکی کی مست چال بھی اس کی آنکھوں میں کُھب گئی تھی لیکن اپنی موجودہ حالت کا احساس کر کے اس نے گردن جھٹک دی۔ سب سے پہلے تو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ وہ یہاں کیسے اور کس حال میں پہنچا۔

یقیناً وہ نیند، جسے اُس نے نیند تصور کیا تھا، خون بہہ جانے کی وجہ سے بے ہوشی تھی یا پھر سانپ کے گوشت کا اثر تھا جس میں ممکن ہے زہر کی کچھ آمیزش باقی رہ گئی ہو اور اس آمیزش نے شیران کو گہری نیند سُلا دیا ہو۔

یہ سارے خیالات اس کے ذہن میں آ رہے تھے لیکن ابھی اس کے سوالات کا جواب دینے والا کوئی نہیں تھا۔ اس نے کُہنیوں کے بَل مسہری پر اُٹھ کر اپنے پاؤں کو دیکھا۔ اسے آہستہ آہستہ اِدھر اُدھر جنبش دی۔ بے شک تکلیف تھی لیکن اس قدر نہیں کہ اس کے حلق سے کراہیں نکل جاتیں۔ وہ بیساکھی جو اس نے خود بنائی تھی، اَب موجود نہ تھی، ایک گہری سانس لے کر وہ آنے والے وقت کا انتظار کرنے لگا۔

کافی دیر تک وہ اسی طرح لیٹا رہا پھر اگر دروازے پر آہٹ نہ ہوتی تو وہ خود ہی کسی کو چیخ کر آواز دینے والا تھا۔ آہٹ ہُوئی اور دروازہ کُھلا اور کسی نے گردن اندر کر کے اس کی طرف دیکھا لیکن اُسے بستر پر بیٹھا دیکھ کر وہ چونک پڑی، وہی اخروٹ کے رنگ کے بالوں والی حسینہ تھی۔ اُس کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے شرم کے آثار نمودار ہُوئے اور پھر وہ خود کو سنبھال کر پُورا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ شیران اُسے دیکھنے لگا۔

"بابا نے کہا تھا، تھوڑی دیر کے بعد تمھیں دیکھتی رہوں اور جب تم ہوش میں آ جاؤ تو اُسے اطلاع دوں۔ کیا تم ہوش میں آ گئے ہو؟" اس نے معصومیت سے پوچھا اور شیران کو ہنسی آ گئی۔

"ابھی نہیں۔" اس نے ہنستے ہُوئے کہا اور لڑکی کے چہرے پر مایوسی کے آثار پھیل گئے۔

"ٹھیک ہے۔" اُس نے مُردہ سی آواز میں کہا اور واپسی کے لیے مُڑ گئی۔ گویا اُس نے شیران کی بات مان لی تھی۔

"ارے ارے سُنو تو... کہاں جا رہی ہو؟"

"باورچی خانے میں۔ کھانا پکا رہی ہوں۔"

"بات سُنو۔ اِدھر آؤ۔ کیا کہو گی بابا سے؟"

"پُوچھے گا تو کہوں گی، ابھی ہوش میں نہیں آئے۔" وہ معصومیت سے بولی اور شیران کو اس کا یہ بھولپن بہت بھلا لگا۔ وہ ہنستا رہا۔

"کہہ دینا... تھوڑی دیر تو رُکو۔"

"نہیں، ہانڈی جل جائے گی۔" لڑکی نے کہا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔ شیران ہنستا رہا تھا۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک قوی ہیکل شخص، لمبا سا چُغہ لیے اندر داخل ہُوا۔ اس کی بھری ہُوئی داڑھی

مہندی کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ بوڑھا ہونے کے باوجود وہ نہایت چاق و چوبند نظر آ رہا تھا۔ شیران کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے اسے سلام کیا۔ اس کے چہرے پر نرم تاثرات تھے۔

"زخم کی تکلیف اب کیسی ہے؟"

"ٹھیک ہوں۔" شیران آہستہ سے بولا۔ وہ گہری نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"کسی جنگلی جانور کے شکار ہوئے تھے۔ زخم میں زہر پھیل رہا تھا۔ اگر فوری دیکھ بھال نہ ہوتی تو پورا پاؤں خراب ہو جاتا لیکن اب فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔"

"میری تیمارداری تم نے کی ہے؟"

"ہاں... خدا کا شکر ہے یہ فرض میں نے پورا کیا ہے اور اس کے لیے میں اپنے دوست گل چراغ کا شکر گزار ہوں۔"

اسی وقت دروازہ کھلا اور وہی لڑکی ہاتھوں میں ایک بڑا پیالہ لیے اندر داخل ہوئی۔ اسے دیکھ کر شیران کے ذہن پر پھر ایک خوشگوار سی کیفیت طاری ہو گئی۔

"لاؤ..." بوڑھے نے پیالہ لڑکی کے ہاتھ سے لیا اور پھر شیران کی طرف دیکھ کر بولا۔ "لو اسے پی لو۔ کیا میں تمھیں سہارا دوں؟"

"نہیں... میں ٹھیک ہوں۔" شیران اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے پیالہ ہاتھوں میں لے لیا... دودھ تھا لیکن اس کا رنگ سبز تھا اور اس کی بھاپ میں ہلکی سی بو شامل تھی۔

"اس کا رنگ کیسا ہے؟" اس نے سوال کیا۔

"دوا ملی ہوئی ہے اس میں۔ یہ تمھارے جسم کی توانائیوں کو بحال کر دے گی۔ پی لو اسے۔" بوڑھے نے کہا اور شیران دودھ کے گھونٹ لینے لگا۔

"یہ لڑکی تمھاری بیٹی ہے؟"

"ہاں... بے وقوف زرمانہ۔ میں نے اسے ذمے داری سونپی تھی کہ جب تم ہوش میں آ جاؤ تو مجھے اطلاع دے۔ ابھی تھوڑی دیر قبل اس نے اطلاع دی تھی کہ وہ کہتا ہے کہ ابھی ہوش میں نہیں آیا۔ میں نے تفتیش کی تو اس نے انکشاف کیا کہ یہ الفاظ تم نے کہے ہیں۔"

شیران مسکراتے ہوئے دودھ پیتا رہا۔

"بابا پیالہ تم رکھ دینا، میں جا رہی ہوں۔" لڑکی بولی اور باہر چلی گئی۔

"تمھارا شکریہ خان! میں تمھارا نام جان سکتا ہوں؟"

"اوغلول..." بوڑھے نے جواب دیا اور دودھ کا پیالہ شیران کے ہاتھوں میں ہل گیا۔ بوڑھے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"تمھیں یہ نام سن کر حیرت ہوئی ہے، نا؟"

"ہاں... کیا میں افغانستان میں ہوں؟"

"یہ کابل ہے۔" بوڑھے نے جواب دیا۔

"میں یہاں کیسے پہنچا؟"

"تم یہیں آنا چاہتے تھے، نا۔ میرے پاس... سو دیکھ لو تقدیر نے کس طرح تمھاری رہنمائی کی اور میری عزت بچ گئی۔" بوڑھے اوغلول نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں تفصیل جاننا چاہتا ہوں۔" شیران نے دودھ پی کر پیالہ ایک جانب رکھ دیا۔

"کوچی قبائل موسم بہار میں سفر کرتے ہیں۔ گل چراغ ایک کوچی سردار ہے اور میرا گہرا دوست ہے۔ کچھ عرصہ قبل وہ مجھ سے ملنے آیا تھا۔ اس کے پاس بھیڑیوں کی چالیس کھالیں تھیں، وہ فروخت کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اس کی مدد کی۔ تم کوہ ہندوکش کے دامن میں اسے بے ہوش پڑے ملے، تمھارے نزدیک تمھاری بیساکھی تھی۔ اس نے ازراہِ ہمدردی تمھیں اٹھا لیا اور تمھارے بارے میں چھان بین کرتے ہوئے اسے تمھاری جیب سے میرے دوست سردار داؤد کا خط ملا۔"

"سردار داؤد کا خط؟" شیران بری طرح چونک پڑا۔

"ہاں، تمھارا نام شیران ہی ہے نا؟" بوڑھے اوغلول نے پوچھا اور شیران کی گردن بے اختیار اثبات میں ہل گئی۔ "میرے دوست سردار داؤد نے تمھارے بارے میں لکھا تھا کہ میں تمھیں پناہ دوں اور تمھارے ساتھ دوستوں جیسا سلوک کروں، اس کے بعد اگر ممکن ہو سکے تو تمھیں کابل میں کوئی ایسا کام دلوا دوں جس سے تم بہتر زندگی گزارنے کے قابل ہو جاؤ، اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ تم سرکش فطرت کے مالک ہو، چنانچہ تمھاری فطرت کا خیال رکھا جائے اور تمھیں تمھاری پسند کی کوئی ایسی جگہ دلائی جائے جہاں تم خوش رہ سکو، سو میرے عزیز تمھاری بے ہوشی کے دوران ایسی جگہ کے بارے میں سوچتا رہا ہوں اور میں نے ایک مناسب فیصلہ کیا ہے جو یقیناً تمھیں بھی پسند آئے گا لیکن یہ سب کچھ اس وقت ہو گا جب تم مکمل طور پر صحت مند ہو جاؤ گے۔"

شیران عجیب سے انداز میں بوڑھے اوغلول کو دیکھ رہا تھا، نجانے سردار داؤد کا خط اس کے لباس کے کون سے حصے میں چھپا رہ گیا تھا، یہ اتفاق نہایت دلچسپ تھا کہ کوچی سردار کے ہاتھ وہ خط لگ گیا اور وہ اوغلول کا شناسا تھا، ورنہ شاید شیران کو یہ آسانیاں فراہم نہ ہوتیں لیکن یوں لگتا تھا جیسے اوغلول اپنے دوست سردار داؤد کے حالات سے قطعی ناواقف رہتا ہے، ورنہ شاید اسے شیران کے بارے میں اور بھی بہت کچھ معلوم ہو چکا ہوتا۔ بہرصورت شیران نے اس اتفاق سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ پاؤں زخمی نہ ہوتا تو وہ کسی کے رحم و کرم پر پڑے رہنے کا عادی نہ تھا، تقدیر نے اسے کابل پہنچا دیا تھا اور یہ اچھا ہی ہوا تھا کیونکہ خود اس کی یہی خواہش تھی کہ وہ ان پہاڑوں کے درمیان سے نکل آئے جس کی ایک ایک چٹان اس کے خون کی پیاسی ہے چنانچہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"یہ دلچسپ اتفاق ہے سردار اوغلول کہ مجھے جس جگہ پہنچنا تھا وہیں پہنچ گیا۔"

"بلاشبہ یہ تقدیر کا کرشمہ ہے، ورنہ میں اپنے دوست سردار داؤد کو کیا جواب دیتا لیکن تمھاری معلومات کے لیے میں تمھیں بتا دوں کہ میں صرف اوغلول ہوں، کھالوں کا بیوپاری، سرداری سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔" اوغلول نے مسکراتے ہوئے کہا۔

شیران بھی مسکرانے لگا۔

"میں اس دلچسپ اتفاق پر بڑا حیران ہوں اور تمھارا شکرگزار بھی کہ تم نے میری مدد کی لیکن اتنی طویل بے ہوشی میری سمجھ میں نہیں آئی، میں اتنے عرصے بے ہوش کیوں رہا؟"

"زخم میں زہر پھیل جانے کی وجہ سے، میں حکیم بھی ہوں بڑے بڑے زخموں کا علاج کر لیتا ہوں، اگر میں تمھارے پاؤں پر ایک مخصوص بوٹی نہ لگاتا تو شاید آنے والے وقت میں تمھیں ایک پاؤں سے محروم ہونا پڑتا۔"

"شکریہ خان اوغلول۔ میں اب خود کو بہت بہتر محسوس کر رہا ہوں۔"

"آرام کرو، تمھاری ضرورت کی ہر چیز تمھیں مہیا کر دی جائے گی کسی قسم کا تکلف نہ کرنا ورنہ مجھے افسوس ہو گا۔"

"بیٹھو خان اوغلول۔ میں تم سے مزید باتیں کرنا چاہتا ہوں۔" شیران نے کہا۔

"ہاں ہاں۔ میں صرف اس لیے جا رہا تھا کہ ممکن ہے تم آرام کرنے کے خواہش مند ہو۔" اوغلول بیٹھ گیا۔

"تم میرے سپرد کیا کام کرو گے؟"

"یہ بعد کی بات ہے۔ اوغلول کے مہمان کو تردد کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں تمھیں کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ ویسے تمھیں بھیڑیوں کے شکار سے کوئی دلچسپی ہے؟" اوغلول نے پوچھا۔

"ہاں مجھے بھیڑیوں کا شکار بہت پسند ہے۔" شیران کی آنکھوں میں بادشاہ خان کا چہرہ گھوم گیا۔

"تمھارا نشانہ کیسا ہے؟"

"ایک کارتوس۔ ایک شکار۔ یہ حساب کبھی غلط نہیں ہوا۔"

"خوب۔ سردار داؤد نے ٹھیک ہی کہا تھا۔"

"ایک اور سوال خان۔ میرے لباس سے کچھ اور بھی برآمد ہوا ہے؟"

"تمھاری مراد اگر کسی رقم سے ہے تو نہیں اور اسے ملنا بھی نہیں چاہیے کیونکہ تمھیں چراغ گل کے ساتھیوں نے تلاش کیا تھا۔ انھوں نے اپنی محنت کا صلہ پہلے ہی وصول کر لیا ہو گا۔ کچھ زیادہ رقم تھی؟"

"نہیں ٹھیک ہے۔" شیران نے آہستہ سے کہا۔

"تم اس کی فکر مت کرو تمھیں جس قدر رقم کی ضرورت ہو گی مل جائے گی تم کسی فقیر کے مہمان نہیں ہو۔ اب میں چلتا ہوں تم آرام کرو۔" اوغلول اس کے شانے پر تھپکی دے کر باہر نکل گیا۔

شیران کے چہرے پر تشویش کے آثار تھے۔ اوغلول کے جانے کے بعد وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ دیر تک وہ نہ جانے کیا کیا سوچتا رہا پھر اس نے تشویش کی نگاہ سے اپنے زخمی پاؤں کو دیکھا اور بے بسی سے ہونٹ کاٹ کر رہ گیا۔ صرف یہ ایک مجبوری اس کی راہ میں حائل تھی۔

◆

اوغلول بے حد مہربان انسان تھا۔ قدیم روایتوں کا پابند مہمان کو عظیم درجہ دینے والا۔ اس نے شیران کے لیے تمام آسانیاں مہیا کر دی تھیں۔ شیران کو یہاں آئے ہوئے آٹھواں دن تھا۔ ان دنوں میں اس کا زخم تقریباً بھر چکا تھا۔ پٹی اتر گئی تھی اور اب صرف مرہم لگایا جاتا تھا۔ زرمانہ ہنوز روزِ اول کی مانند تھی۔ اس قدر معصوم، اس قدر بے وقوف کہ شیران اس کی باتوں پر ہنستا رہتا تھا۔ وہ جوانی کی لطافتوں سے ناآشنا تھی۔ اس بے وقوف کو علم ہی نہیں تھا کہ دیکھنے والوں کی نگاہوں میں وہ کیا ہے۔ ماں مر چکی تھی۔ گھر میں اس کی دیکھ بھال کرنے والی اس کی بوڑھی پھوپھی کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا اور زرمانہ کو اپنی پھوپھی بالکل پسند نہیں تھی۔

شیران اب چہل قدمی کرنے لگا تھا۔ اوغلول نے اس کے لیے چند لباس بھی مہیا کر دیے تھے۔ شیران سوچ رہا تھا

کہ اب اسے زیادہ عرصہ یہاں نہیں رہنا چاہیے لیکن اس کے لیے اسے چند چیزوں کی ضرورت تھی۔

ایک دن اُس وقت جب اوغلول گھر پر موجود نہ تھا اُس نے زرمانہ سے کہا۔

"یُوں لگتا ہے زرمانہ، اوغلول بہت بزدل انسان ہے۔"

"کیوں...؟" اُس نے پوچھا۔

"بہادر لوگوں کے پاس پستول ہوتا ہے۔ ہتھیار تو بہادروں کی شان ہوتے ہیں۔"

"پستول...؟ میرے بابا کے پاس کئی پستول ہیں۔ بندوق ہے اور کارتوسوں کی پیٹیاں ہیں۔" زرمانہ نے کہا۔

"کیا واقعی؟"

"تمھیں یقین نہیں؟"

"ممکن ہے تم مذاق کر رہی ہو۔ ذرا ایک پستول اور کارتوس لا کر تو دکھاؤ؟" شیران نے کہا۔

زرمانہ خاموشی سے اندر چلی گئی۔ اُسے شیران کی یہ بات پسند نہیں آئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک پستول لے کر آ گئی۔ کارتوسوں کی پیٹی بھی ساتھ تھی۔ پستول اور کارتوس دیکھ کر شیران کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔

"واہ کتنا خوبصورت پستول ہے۔ بے شک تم سچی ہو۔ زرمانہ تمھیں اچھے اچھے کھانے پکانے آتے ہیں؟"

"بابا کو میرے پکائے ہوئے کھانے بہت پسند ہیں اور تم نے اچھا یاد دلایا۔ مجھے تمھارے لیے تیتر ذبح کرنے ہیں کھانے میں دیر ہو جائے گی۔"

"افوہ۔ مجھے بھوک بھی بہت لگ رہی ہے۔ جلدی جاؤ۔ جلدی۔" شیران نے کہا اور زرمانہ بدحواس سی باہر نکل گئی۔ شیران کو یہ پستول ہتھیانے میں کوئی دقت نہیں ہوئی تھی۔ اُس نے احتیاط سے پستول چھپا لیا اور زرمانہ کی معصومیت پر مسکرانے لگا۔ زرمانہ کو یہ خیال بھی نہ آیا کہ وہ اُس سے پستول واپس لے اور شیران نے اوغلول کو اس کی ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی۔ اب پستول اُس کے لباس میں چھپا رہتا تھا۔

چند روز اور گزر گئے۔ یہ ایک دوپہر کا واقعہ تھا۔ صبح کو شیران نے کافی چہل قدمی کی تھی۔ جوتا پہن کر دیکھا تھا اور اُسے کوئی تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ اب خاموشی سے کسی وقت یہاں سے نکل جائے گا۔ اوغلول کے ساتھ زیادہ وقت گزارنا خطرناک تھا۔ کسی بھی وقت اُسے صورتِ حال معلوم ہو سکتی تھی۔

ہر چند کہ شیران کے سامنے کوئی راہِ عمل نہیں تھی سارا زندگی عیش سے گزاری تھی۔ سیر و شکار کے علاوہ کوئی کام نہیں کیا تھا۔ اُس کی فطرت کسی سنجیدگی کی متحمل نہیں تھی۔ وہ تو آزاد فضاؤں کا پنچھی تھا لیکن اُس نے زندگی کو ان پہاڑوں میں دیکھا تھا۔ اس سے آگے وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔

کابل کی یہ پرانی بستی بھی اُس کی نگاہوں سے اوجھل تھی اور ابھی وہ اوغلول کے مکان تک ہی محدود تھا لیکن اس ہمت تھی۔ باہر کی دُنیا جیسی بھی ہو بہر حال اب وہ ان پہاڑوں کو تو خیرباد کہہ چکا تھا۔ چنانچہ وہ یہاں سے جانے کے لیے تیار تھا

دوپہر ڈھل رہی تھی لیکن ابھی تک اُس کے لیے کھانا آیا تھا۔ سلاخوں والی کھڑکی سے دوسری طرف زرمانہ بھی نہیں نظر آئی تھی۔ یُوں لگتا تھا جیسے گھر کے افراد کہیں چلے

صورتِ حال معلوم کرنے کے لیے وہ جوتے پہن کر کی طرف بڑھا اور دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن اب تک قیام میں پہلی بار دروازہ باہر سے بند تھا۔ شیران ایک لمحے کے لیے ساکت رہ گیا۔ یہ کیا ہُوا... یہ کیوں ہُوا...؟

ابھی وہ دروازے کے قریب ہی کھڑا تھا کہ اُسے قدموں کی آہٹ سُنائی دی۔ شیران جلدی سے اپنے بستر پر آ گیا۔ اُس کی چھٹی حِس اُسے تنبیہہ کر رہی تھی اور وہ چوکنا ہو گیا تھا۔

بستر کی پُشت سے ٹیک لگا کر اُس نے کمبل پیروں کھینچ لیا۔ اُس نے جوتے بھی نہیں اُتارے تھے۔ پستول کا چیمبر کر اُس نے اُسے بھی کمبل میں چھپا لیا اور دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ دروازہ باہر سے کھولا جا رہا تھا۔

پھر دروازہ کھلا۔ سب سے آگے اوغلول تھا۔ اُس چار آدمی تھے جن کا تعلق تراب زان سے ہی تھا اور شیران پہچانتا تھا۔ اوغلول کے چہرے پر گہری سنجیدگی کے آثار تھے۔ عجیب سی نگاہوں سے شیران کو دیکھ رہا تھا۔

"یہی قاتل شیران ہے۔" تراب زان کے ایک شخص اوغلول چند قدم آگے بڑھ آیا اور بولا۔ "کیا یہ حقیقت شیران کہ تم نے فرانہ کے ایک مکان سے چار لڑکیوں کو اغوا کیا اُن کے ناموس سے کھیل کر انھیں گولی مار دی اور یہ لڑکیاں تمھا کے ایک معزز سردار کی بھتیجیاں تھیں؟" اوغلول نے پُوچھا۔

"تراب زان کے یہ جوان کیا کہتے ہیں؟"

"انھیں میرے دوست سردار داؤد نے میرے پاس ہے۔ جو خط تمھارے لباس سے نکلا تھا اُس نے اُسے منسوخ کرتے ہوئے مجھے دوسرا خط بھیجا ہے جس میں مجھ سے کہا گیا ہے کہ تراب زان کی بقا کے لیے میں اس کی مدد کروں اور اگر کسی طور خونی شیران کابل پہنچ جائے تو اس کی گرفتاری میں مدد دُوں۔ اُس نے اپنے خط میں مجھے تمھارے گھناؤنے جرم کی تفصیل بھی لکھی ہے۔ کیا یہ سب کچھ سچ ہے شیران؟"

"تمھارے دوست نے تم سے جھوٹ نہ بولا ہوگا اوغلول۔" شیران نے سکون سے کہا۔

"گویا تم اعتراف کر رہے ہو؟"

"ہاں جو کچھ میں نے کیا ہے اس سے انحراف میرے لیے گالی ہے۔ بادشاہ خان نے میری ماں کو قتل کیا تھا۔ میں نے اس کے جواب میں اُسے سرِ عام ذلیل کر دیا۔ یہ میرا فرض تھا۔"

"ہر چند کہ تم میرے مہمان ہو شیران اور مہمان ہماری آن ہوتا ہے لیکن ایسے بدترین جرم کے مرتکب شخص کو میں پناہ نہیں دے سکتا۔ میں نے ہی یہ دروازہ بند کیا تھا اور اب کافی غور و خوض کے بعد میں تمھارے پاس آیا ہوں۔ ان لوگوں نے مجھے جو واقعات بتائے ہیں ان سے مجھے یہ بھی احساس ہوا ہے کہ میرے دوست کا قبیلہ خطرے میں ہے۔ اس کی بقا اسی میں ہے کہ تمھیں بادشاہ خان کے حوالے کر دیا جائے۔ اس لیے شیران میں تمھیں اُن لوگوں کے حوالے کرنے پر مجبور ہوں۔"

"تمھیں کچھ اور لوگ بھی ہماری مدد کے لیے ساتھ کرنا ہوں گے خان۔ اس شیطان سے آپ واقف نہیں ہیں۔" تراب زان سے آئے ہوئے ایک شخص نے کہا اور شیران ہنس پڑا پھر اُس نے کہا۔

"تراب زان ابھی محفوظ ہے زردار خان۔"

"ہاں۔ تمھاری وجہ سے پہاڑوں میں جو خونریزی ہونے والی تھی وہ عارضی طور پر رک گئی ہے۔ بستی کے بزرگ ہمیشہ یہی کہتے تھے کہ تم ایک نہ ایک دن تراب زان کے لیے بہت بڑا خطرہ بن جاؤ گے۔"

"بے وقوف ہیں تراب زان کے بزرگ۔ شیران کے لیے اتنی چھوٹی سی بات کہتے تھے۔ انھیں کہنا چاہیے تھا کہ ایک نہ ایک دن میں اس دُنیا کے لیے خطرہ بن جاؤں گا اور بزرگ اوغلول یہ ایک حقیقت ہے۔" شیران نے حقارت سے کہا۔

"کاش تمھاری دلیری تعمیری کاموں میں کام آتی۔"

"بزرگ اوغلول تم نے مجھ پر احسانات کیے ہیں۔ میں چاہتا ہوں تم غیر جانب دار رہو۔ ان لوگوں کو یہاں سے لے جاؤ اور کسی مناسب جگہ بند کر دو۔ تاکہ میں خاموشی سے یہاں سے نکل جاؤں اس کے بعد میرا اور اُن کا براہِ راست معاملہ رہ جائے گا۔"

"یہ ناممکن ہے۔ میں اپنے دوست سے غداری نہیں کر سکتا۔"

"میری بات مان لو اوغلول۔ یہی مناسب ہوگا۔"

"ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔"

"گویا ہمارے درمیان دوستی اور مروّت کے رشتے ختم۔" شیران ذرا بھی ہراساں نہیں تھا اور یہ بات اُن سب کے لیے باعثِ حیرت اور پریشانی کا سبب تھی۔

"میں تمھیں ایک مجرم سمجھتا ہوں اور ایسے بدترین جُرم کے مرتکب شخص کو میں دوست کہنے کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا۔"

"تب مجبوری ہے اوغلول۔ افغانستان میں تم میرے بدترین دُشمن ثابت ہو سکتے ہو۔ ان لوگوں کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں ہے میری نگاہوں میں۔ اچھا اوغلول جو کچھ ہو رہا ہے بحالتِ مجبوری ہو رہا ہے۔"

کمبل کے سوراخ سے ایک گولی نکلی اور اوغلول کی پیشانی میں پیوست ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی شیران اُچھل کر نیچے آ گیا تھا۔ ایک اور گولی اُسے اس شخص پر چلانی پڑی تھی جس نے رائفل سیدھی کرنے کی کوشش کی تھی۔ اُس کی پیشانی میں بھی اُسی جگہ گولی لگی تھی جس جگہ اوغلول کے۔ باقی تینوں دم بخود رہ گئے تھے...

"اور تم لوگ شیران سے اچھی طرح واقف ہو۔ اس لیے اِدھر ہٹ کر دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو جاؤ۔" شیران کی غُراہٹ اُبھری اور ان تینوں نے بادلِ ناخواستہ اُس کے حکم کی تعمیل کی۔ شیران کے اس قول سے وہ سب واقف تھے کہ ایک گولی ایک شکار اور اگر کارتوس ضائع کرنا پڑے تو پھر دوسرا کارتوس خود پر ضائع کر لینا چاہیے۔

شیران دروازے سے باہر نکل گیا اور دروازہ باہر سے بند ہو گیا۔ اس عمارت کے کسی اور مکین سے اُسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اوغلول نے چالاکی سے کام لیا تھا۔ زرمانہ اور اپنی بُوڑھی بہن کو یہاں سے ہٹا دیا تھا۔ چنانچہ شیران کے راستے میں اور کوئی مزاحمت نہ ہوئی اور وہ نہایت اطمینان سے عمارت سے باہر نکل آیا۔

پستول اُس نے اپنے لباس میں چھپا لیا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ پستول انسان کا سب سے بڑا ساتھی ہے بلکہ ہتھیار کے بغیر انسان نامکمل رہتا ہے۔ چنانچہ بدن پر لباس ہو یا نہ ہو،

ہتھیار ضرور ساتھ رکھو۔

اور اب ایک نئی دُنیا اُس کے سامنے تھی۔ پُرانے کابل سے نکل کر وہ نئے کابل میں آ گیا۔ شہر کے درمیان بہنے والے دریائے کابل نے اُسے شدید حیران کر دیا تھا۔ باہر کی زندگی پہاڑوں کی زندگی سے کافی مختلف تھی۔ ایسی ایسی اجنبی اور انوکھی چیزیں اُس کی نگاہوں کے سامنے تھیں جن کا اُس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

مغرب کی طرف کوہ بابا کی برف پوش چوٹیاں چمک رہی تھیں، وہ اتنی نزدیک لگتی تھیں کہ بس ہاتھ بڑھاؤ اور چھو لو لیکن اُن کی بلندیاں ناقابلِ عبور سمجھی جاتی تھیں۔ وہ پہاڑیاں جن کی بلندیاں عقاب کی پرواز سے بھی اُونچی تھیں اُن پر جمی ہُوئی لاکھوں سال پُرانی برف میں تاریخ کے کئی باب دفن تھے۔

کابل کے گلی کوچوں، بازاروں میں وہ ستاروں سے آگے کے جہاں دیکھ رہا تھا اور اُس کی آنکھیں تعجب سے پھٹی ہُوئی تھیں۔ وہ پریشانی کے عالم میں سوچ رہا تھا کہ اِس انسانی طُوفان میں اپنے لیے کوئی... جگہ تلاش کر لے۔ کوئی نہ کوئی جگہ بنانی ہو گی ورنہ اس کی ناواقفیت اُسے عام نگاہوں میں لے آئے گی اور یہ بہتر نہ ہو گا۔

تب اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ کوئی سنسان راستہ تلاش کرے۔ کوئی ایسی جگہ بھی ضرور ہو گی جہاں اتنے سارے انسان نہ ہوں۔ وہ چلتا رہا اور کافی دیر بعد ایک ایسی سڑک پر نکل آیا جو ویرانوں کی طرف جاتی تھی۔ اوغلول کی مہربانیوں سے اُس کے پاؤں کا زخم بالکل ٹھیک ہو گیا تھا اور اب اس میں کوئی تکلیف نہیں تھی۔ اُسے اوغلول کی موت کا خیال آیا اور اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

’ایک مہربانی میں نے بھی تم پر کی ہے اوغلول کہ تمھاری اس حسین لڑکی کو چھوڑ دیا۔‘ اور زرمانہ کے بارے میں سوچتا ہُوا وہ آگے بڑھتا رہا۔

نہ جانے کتنی دُور نکل آیا تھا لیکن یہ علاقہ اطمینان بخش تھا۔ یہاں دُور دُور تک کسی انسان کا پتہ نہیں تھا۔ شام جھکتی آ رہی تھی اور لمبی سڑک تاحدِ نگاہ پھیلی ہُوئی تھی۔

دفعتہً اُسے اپنے عقب میں کسی گاڑی کے انجن کی گڑگڑاہٹ سُنائی دی۔ ایک دیو ہیکل ٹینکر سڑک کے بیچ چلا آ رہا تھا۔ وہ کنارے ہو کر چلنے لگا لیکن ٹینکر اُس کے پاس آ کر رُک گیا۔

"اوئے کتھاں چلے باشاہ، غزنی جانا اے؟" ڈرائیونگ سیٹ سے گردن نکال کر ڈرائیور نے پُوچھا۔ یہ لہجہ اور الفاظ کسی قدر اجنبی تھے لیکن سمجھ میں آ گئے اور شیران نے گردن ہلا دی۔

"تے آجاؤ فر۔ اتھے کھڑے گردن کیوں ہلا رہے ہو۔ آؤ جی دیری نہ کرو۔" چمکتی ہُوئی پگڑی والے ٹرک ڈرائیور نے کہا اور دوسری طرف کا دروازہ کھول دیا۔

شیران جھجکتا ہُوا اندر بیٹھ گیا اور ڈرائیور نے ٹینکر آگے بڑھا دیا۔ سکھ ڈرائیور کافی خوش مزاج معلوم ہوتا تھا۔ تھوڑی دُور چل کر اس نے پُوچھا۔ "پنجابی سمجھتے ہو؟"

"نہیں۔" شیران نے گردن ہلا دی۔

"او جی تو کیا فرق پڑتا ہے۔ ہم تمھاری زبان سمجھتے ہیں۔"

"ہماری زبان؟"

"اوئے افغانی یار۔ جو تم بول رہے ہو۔"

"تم افغانی نہیں ہو؟"

"پکے افغانی ہیں جی۔ یہیں پیدا ہوئے ہیں، یہیں پلے بڑھے ہیں۔ ہمارے اُوپر والے پنجاب سے آئے تھے۔"

"او ہو۔ اچھا کیا نام ہے تمھارا؟" شیران تمام تر ذہنی قوتوں سے کام لے رہا تھا اور اُسے یہ احساس نہ ہونے دے رہا تھا کہ وہ اِس ماحول میں اجنبی ہے۔

"سردار گرنتھ سنگھ۔" سردار جی نے اکڑ کر کہا۔

"سردار... کون سے قبیلے کے سردار ہو؟" شیران نے پُوچھا اور گرنتھ سنگھ ہنسنے لگا۔

"او کسی قبیلے کا سمجھ لے یار۔ واہگورو کی مہربانی ہے۔ چھوٹا سا قبیلہ ہے اپنا۔ رتن کور ہے، چار بچے ہیں۔ ماں پیو ہیں۔ یہی اپنا قبیلہ ہے۔" اُس نے کہا اور شیران حیران رہ گیا لیکن اُس نے کسی حیرت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ "تیرا کیا ناں ہے؟" اُس نے پُوچھا۔

"شیران۔"

"ایں۔ تو تُو سردار نہیں ہے۔ شکل صُورت سے تو تو بھی سردار ہی نظر آ رہا تھا۔ داڑھی بھی سرداروں جیسی ہے۔ چل کوئی بات نہیں ہے۔ غزنی میں کہاں جانا ہے؟"

"کہیں نہیں۔ غزنی میرے لیے نئی جگہ ہے۔" شیران نے جواب دیا...

"یارا، مجھے تو تُو افغانستان میں بھی اجنبی لگ رہا ہے۔ کہیں اُس پار کے پہاڑوں سے تو نہیں بھاگ کر آیا ہے کسی کو قتل وتل کر کے۔ اگر ایسی بات ہے تو گرنتھ سنگھ سے سچ بول دے، گرنتھ سنگھ کا دل بہت بڑا ہے۔ وہ تیری دل کھول کر مدد کرے

گا۔ اوئے تُو غازی خان کو تو نہیں جانتا۔"

"نہیں۔" شیران نے کہا۔

"وہ بھی اُس پار کے پہاڑوں سے بھاگ کر آیا تھا۔ چار آدمیوں کو قتل کر کے خاندانی دشمنی چل رہی تھی اُس کی۔ گرنتھ سنگھ کا دوست بن گیا اور اب تو آسمان پر اُڑ رہا ہے۔"

"آسمان پر اُڑ رہا ہے؟" شیران نے تعجب سے پُوچھا۔

"بڑا دھندا کر رہا ہے۔ کبھی کبھی ہمیں بھی کام دے دیتا ہے ہاتھ کا کھرا ہے۔ جو کام لیتا ہے اُس کی رقم پُوری دیتا ہے۔ بس واہگورو کی مہربانی سے اسی طرح کام چل رہا ہے۔" گرنتھ سنگھ ہنسنے لگا پھر بولا۔ "بتائے گا نہیں یارا۔ کیا تو بھی اُدھر سے ہی آیا ہے؟"

"ہاں سردار۔ تمھارا خیال ٹھیک ہے۔" شیران نے جواب دیا۔

"آنکھ بھی ٹھیک ہے۔ اُڑتی چڑیا کو پہچان لیتی ہے..." گرنتھ سنگھ ہنسنے لگا پھر بولا۔ "ادھر تو کوئی خطرہ نہیں ہے؟"

"ہے..." شیران نے گہری سانس لے کر کہا۔

"اوئے اتھکے۔ ادھر کون آ گیا؟"

"میرے دُشمن میری تلاش میں یہاں پہنچ گئے ہیں۔ اُن سے بھی دو مارے گئے۔"

"او جیو یار۔ شکل سے ہی مرد لگتے ہو۔ پرواہ مت کرو، گرنتھ سنگھ کی دوستی مل گئی ہے تمھیں۔ پر یہ اچھی بات نہیں ہے کہ تمھارے دُشمن یہاں تک پہنچ گئے ہیں، اس کے لیے کچھ کرنا ہو گا۔"

"کیا کرو گے؟"

"کچھ نہ کچھ تو کر ہی لیں گے۔ سُنو۔ ایمانداری سے بتانا، بڑا کرو گے؟ او یار کوئی مشکل کام نہیں ہے مردوں کا کھیل ہے۔ پر ہاتھ سچا ہونا چاہیے سارے کھیل آسان ہوتے ہیں۔ غازی خان سے ملا دُوں گا۔ خود بھی جی دار ہے اور جی داروں کو پسند بھی کرتا ہے۔ تھوڑے دن پہلے بول بھی رہا تھا کہ گرنتھ سنگھ کوئی کام کا آدمی دے۔"

شیران نے اس بڑے دھندے کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا لیکن اتنا وہ ضرور سمجھ گیا کہ بڑا دھندا کوئی ایسا کام ہے جس کے لیے بندوق بھی استعمال کی جاتی ہے اور ایسے کسی کام میں اُسے کوئی عار نہ تھی۔ چنانچہ اُس نے گرنتھ سنگھ سے کوئی اختلاف نہیں کیا۔

*

بادشاہ خان اپنے تینوں غیر مُلکی دوستوں کے ساتھ اس چھوٹے سے ہیلی پیڈ کے پاس پہنچ گیا جو سرسبز درختوں کے درمیان ایک مسطح جگہ پر بنایا گیا تھا۔ ہیلی پیڈ پر ایک ہیلی کاپٹر کھڑا ہُوا تھا جس کے نزدیک اُس کا پائلٹ کھڑا سگریٹ کے گہرے کش لے رہا تھا۔

اُس نے اُن لوگوں کو دُور ہی سے دیکھ کر جلدی سے سگریٹ زمین پر پھینک کر جُوتے سے مسل دیا اور مستعد ہو گیا۔ ایک غیر مُلکی نے آگے بڑھ کر ہیلی کاپٹر کا دروازہ کھولا... اور بادشاہ خان کو اُوپر جانے کا راستہ دیا۔ بادشاہ خان کے بیٹھنے کے بعد وہ تینوں بھی بیٹھ گئے۔ سب سے آخر میں پائلٹ نے اپنی سیٹ سنبھالی اور چند ساعت کے بعد ہیلی کاپٹر فضا میں بلند ہو کر ایک سمت چل پڑا۔

تقریباً بیس منٹ کا سفر تھا جو مکمل خاموشی کے دوران ختم ہُوا اور پھر کسی شہر کی عمارتیں نظر آنے لگیں۔ درمیانے قسم کی عمارتیں تھیں۔ ان میں کچھ بہت عمدہ تھیں اور کچھ معمولی۔ ہیلی کاپٹر شہر سے بچتا ہُوا کنارے کنارے چلا جا رہا تھا اور پھر وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں کسی کارخانے کی چمنیاں نظر آ رہی تھیں۔

ہیلی کاپٹر کارخانے کے احاطے میں اُتر گیا جہاں اُن لوگوں کے استقبال کے لیے چند افراد موجود تھے۔ مشین بند ہونے کے بعد یہ لوگ نیچے اُتر گئے اور استقبال کرنے والے جو سب کے سب غیر مُلکی اور مخصوص خدوخال کے مالک تھے مُسکراتے ہُوئے اُس طرف بڑھے۔

"ہیلو باشا کان۔ کیسے مزاج ہیں؟"

"ٹھیک ہُوں۔" بادشاہ خان آہستہ سے بولا۔ سب نے اُس سے ہاتھ ملائے اور پھر وہ اُسے لیے ہُوئے کارخانے کی عمارت کے ایک مخصوص حصّے میں پہنچ گئے جو رہائشی تھا۔

نہایت خوبصورت عمارت تھی۔ اندر سے بے حد شاندار۔ عمارت کے ایک بڑے ہال میں ایک دراز قامت غیر مُلکی نے جو بیش قیمت لباس پہنے ہُوئے تھا بادشاہ خان کا استقبال کیا۔ دوسرے لوگ اُس کے سامنے مؤدّب ہو گئے۔ خود بادشاہ خان بھی محتاط نظر آ رہا تھا۔

"آؤ بادشاہ خان۔ کیا ہنگامے کر رہے ہو آج کل، کیسے مزاج ہیں...؟"

"ٹھیک ہُوں جنرل۔ بس کچھ حالات بگڑ گئے تھے۔"

"بیٹھو۔" طویل قامت شخص نے ایک کُرسی کی طرف اشارہ کیا اور بادشاہ خان بیٹھ گیا۔ "تم جیسے سمجھ دار آدمی سے ایسی حماقت

کی توقع نہیں تھی یہ تم کیسے فضول ہنگاموں میں اُلجھ گئے؟"

" بات اس قدر آگے بڑھ جانے کی اُمید نہیں تھی جنرل کیونکہ معاملہ خاندانی تھا اس لیے جذباتی ہو گیا تھا۔ ایک خاندان سے دُشمنی تھی لیکن..."

" مَیں تفصیل سُن چکا ہُوں۔ مجھے بس ایک بات پر حیرت ہے۔ تم اس قدر جذباتی ہو گئے کہ تنظیم سے وابستگی بھی بُھلا بیٹھے ہم اس بات کے لیے کوشاں ہیں کہ یہ پہاڑ سوتے رہیں اور ان میں کوئی ایسی تحریک نہ ہو کہ یہ کسی کی توجّہ کا مرکز بنیں اور تم یہاں خونریزی کرنے پر تُل گئے تھے۔ اس طرح تو تم نے ہمارے پلان کو کئی سال پیچھے دھکیل دیا تھا۔"

" مجھے افسوس ہے جنرل" بادشاہ خان نے کہا۔

" دیکھو بادشاہ خان۔ عظیم تر مفاد کے لیے ذاتی مفادات قربان کرتے پڑتے ہیں۔ تنظیم کے اہم افراد کو قطعی غیر جذباتی ہونا چاہیے۔ تم اپنی طاقت کے مظاہرے ضرور کرتے رہو تاکہ پہاڑوں میں تمھاری انفرادیت برقرار رہے اور اس وقت جب ہمارا آپریشن شروع ہو تم اپنے اختیارات سے کام لے کر اُن پہاڑی قبائل کو ہمارے راستے میں آنے سے روکو لیکن طاقت کا کوئی مظاہرہ اگر سارا کھیل بگاڑ دے تو..."

" مجھے احساس ہے جنرل کہ مجھ سے غلطی ہُوئی ہے۔"

" بہرحال یہ غلطی پُوری طرح سرزد نہ ہو سکی، اس لیے قابلِ معافی ہے لیکن بادشاہ خان آیندہ اس قسم کی کوئی غلطی نہ دُہرائی جائے۔"

" میرے ذہن میں ایک پھانس ہمیشہ چُبھتی رہے گی جنرل۔"

" کیسی پھانس؟"

" وہ میرا خاندانی معاملہ تھا۔ اس کی وجہ سے مَیں اپنا وقار کھو بیٹھا ہُوں۔ خود اپنی نگاہوں میں ذلیل ہو گیا ہُوں۔ اگر وہ مجھے نہ ملا تو... تو مَیں سکون سے نہ رہ سکوں گا۔"

" شیران؟" جنرل نے مُسکرا کر پُوچھا۔ اُس کی معلومات شاندار معلوم ہوتی تھیں۔

" ہاں شیران" بادشاہ خان کی آواز میں غرّاہٹ تھی، جنرل بدستور مُسکرا رہا تھا پھر اُس نے اسی طرح مُسکراتے ہُوئے کہا۔

" لیکن بادشاہ خان، اگر شیران پہاڑوں سے کہیں نکل گیا ہے تو یہ اتنی اہم بات تو نہیں ہے، تم ایک ایسی تنظیم کے فرد ہو جو ساری دُنیا کے گوشے گوشے میں پھیلی ہُوئی ہے اور جس کے ہاتھ اتنے لمبے ہیں کہ کوئی شخص اس کی دسترس سے باہر نہیں جا سکتا۔ بہرحال، آؤ پہلے تمھارا مسئلہ حل کریں، اس کے بعد تم واپس چلے جاؤ اور ایسے اقدامات کرو کہ قبائل کا اعتماد تم پر بحال ہو جائے اور تم پُورے سکون سے تنظیم کے مقاصد کو آگے بڑھا

" مَیں نہیں سمجھا جنرل، میرا کام ہو جائے، سے آپ کی کیا مُراد ہے...؟"

"شیران کی شناخت کرو۔ چلو نمبر چار بادشاہ خان سے لے کر شیران کی تصویر تیار کرو۔" جنرل نے ایک شخص کو اشارہ کیا اور وہ ایک کیمرہ نما مشین اُٹھا لایا۔ اس کے تار سرکٹ میں لگائے اور مشین کے ایک حصّے سے ایک سفید سی روشنی پھُوٹنے لگی، دوسری سمت سے ایک سفید سی شعاع سا اسکرین پر پڑ رہی تھی۔

" آیئے بادشاہ خان اس طرف بیٹھ جایئے" وہ شخص جسے چار کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا، بادشاہ خان سے بولا اور بادشاہ خان اُلجھے ہُوئے سے انداز میں اپنی جگہ سے اُٹھ کر اس کرسی پر گیا جس پر اُسے بیٹھنے کا اشارہ کیا گیا تھا لیکن کرسی پر بیٹھنے کے بعد مشین کے بائیں سمت سے نکلنے والی روشنی بادشاہ خان کے چہرے اور سر پر پڑ رہی تھی، اُس نے کسی قدر اُلجھے ہُوئے انداز میں اس روشنی کی جانب دیکھا اور بولا۔

" یہ کیا ہے؟"

" اطمینان سے بیٹھے رہو بادشاہ خان، جو سوال تم سے کیا اُس کا جواب دینے کی کوشش کرو،" جنرل بولا اور بادشاہ خان اپنی جگہ بیٹھ گیا۔

" اس اسکرین کی جانب دیکھیے بادشاہ خان" اسکرین بولا اور بادشاہ خان کی نگاہیں اسکرین کی جانب اُٹھ گئیں مشین آپریٹر کی آواز اُبھری۔

" اُس کا چہرہ..." اور بادشاہ خان کے ذہن میں شیران کا چہرہ گھوم گیا، مشین پر ایک دائرہ بن گیا تھا، بیضوی دائرہ یقیناً شیران کے چہرے کی تراش کے مطابق تھا۔

" آنکھیں..." مشین آپریٹر کی آواز اُبھری اور بادشاہ خان کے ذہن میں شیران کی جاندار آنکھیں گھوم گئیں۔ اُس نے مُنہ سے ایک لفظ بھی نہ کہا تھا کہ سامنے بنے ہُوئے دائرے دو آنکھیں نظر آنے لگیں اور بلاشبہ یہ شیران ہی کی آنکھیں

تب مشین آپریٹر کی آواز پھر اُبھری۔ " پیشانی" بادشاہ نے گھبرا کر مشین آپریٹر کی جانب دیکھنے کی کوشش کی لیکن روشنی سے اُس کی آنکھیں چُندھیا گئیں اور وہ پھر اسکرین کی

جانب دیکھنے لگا۔

"بادشاہ خان، شیران کے چہرے پر غور کرو اور جو سوال تم سے کیا جائے، یا تو اس کا جواب اپنی زبان سے دو، یا اپنے ذہن میں اس چہرے کا صحیح تصور کرو۔" مشین آپریٹر نے کہا اور بادشاہ خان کی نگاہوں میں شیران کی کشادہ پیشانی گھوم گئی۔

"ناک۔" مشین آپریٹر کی آواز اُبھری۔ "ہونٹ، ٹھوڑی، بال، گردن...." آپریٹر.... بولتا رہا اور بادشاہ خان کی آنکھوں میں شیران کا چہرہ گھومتا رہا پھر آپریٹر نے مشین کا ایک بٹن دبایا اور بادشاہ خان کے چہرے سے روشنی ہٹ گئی البتہ مشین پر وہ تصویر بدستور موجود تھی اور دُنیا کا کوئی بھی فرد اُسے شیران کی تصویر کہے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

ایک اور کیمرے سے اسکرین کی تصاویر لی جانے لگیں۔ تین، چار تصاویر لینے کے بعد مشین آپریٹر نے مشین بند کی اور اُسے وہاں سے ہٹا دیا تھا۔

جنرل نے مُسکراتے ہُوئے بادشاہ خان کی طرف دیکھا پھر وہ بولا۔ "بادشاہ خان، یُوں لگتا ہے، جیسے تم نے تنظیم پر اپنے ذاتی معاملات میں مکمل اعتماد نہیں کیا ہے۔ بیٹھو کیا پیو گے؟"

"شکریہ جنرل، ویسے آپ کا یہ خیال غلط ہے، تنظیم پر مجھے مکمل اعتماد ہے، لیکن آپ قبائل کی تاریخ پر ایک نگاہ ڈالیں تو آپ کو احساس ہو جائے گا کہ ہم لوگ صدیوں سے انتقام کے راستوں پر چلتے آئے ہیں اور یہ ہمارے ہاں کی ایک ریت بن گئی ہے۔" بادشاہ خان نے جواب دیا۔

"یہ اچھی بات تو نہیں ہے بادشاہ خان، بہرصُورت چونکہ یہ تمھارا خاندانی معاملہ ہے اس لیے مَیں اس میں مداخلت نہیں کروں گا لیکن ایک بار پھر تم سے یہی کہوں گا کہ اپنے معاملات میں تنظیم کو مت بھولا کرو۔ ہم اپنے کارکنوں کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار رہتے ہیں۔" جنرل نے کہا اور پھر ایک مشروب طلب کر لیا۔ بادشاہ خان خاموشی سے مشروب کے گھونٹ لیتا رہا، تھوڑی دیر کے بعد اُس کے سامنے وہ تصویریں لا کر ڈال دی گئیں جو اُس کے ذہن کا عکس تھیں اور مشینی ذرائع کے ذریعے تیار کی گئی تھیں۔

"کیا اس تصویر میں اور اس شخص کے اصل چہرے میں کوئی فرق ہے؟"

"سرِ مُو نہیں۔" بادشاہ خان نے جواب دیا۔

"شکریہ۔ اب یہ تمام تصویریں ہر جگہ تقسیم ہو جائیں گی۔ میرا مقصد ہے ہر اُس جگہ، جہاں اس شخص کے موجود ہونے کے امکانات ہیں۔ ہمارے عظیم ترین کارکن اُسے تلاش کریں گے اور بالآخر اُسے پکڑ کر تمھارے سامنے پیش کر دیں گے، انڈیا میں مونی ماروین موجود ہے، اپنے پُورے گروہ کے ساتھ، ایران میں ہیلیکا جیسی خطرناک عورت کام کر رہی ہے، فار ایسٹ میں ایڈنا ڈیل اور تمھارے اندرُونی علاقوں میں ہارڈ گریپ موجود ہے، فوری طور پر ان چاروں کو یہ تصاویر فراہم کر دی جائیں گی اور اس کے بعد دُنیا کے چپے چپے میں یہ تصویریں پہنچ جائیں گی۔ شیران اگر امریکا بھی پہنچ گیا ہے تو ہم اسے وہاں سے پکڑ لائیں گے۔ تم اس سلسلے میں بالکل بے فکر رہو اور دل جمعی سے اپنا کام کرو۔ تم اگر چاہو تو ہم پر وقت کی قید لگا سکتے ہو کہ شیران اتنے عرصے میں تمھارے پاس پہنچ جانا چاہیے۔" جنرل نے کہا۔

بادشاہ خان کا چہرہ کسی قدر بحال ہو گیا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں پھر ایک بار زندگی لوٹ آئی تھی۔ اُس نے گردن ہلاتے ہُوئے کہا۔

"شکریہ جنرل۔ واقعی مجھ سے بہت بڑی غلطی ہُوئی تھی، مجھے پہلے ہی تنظیم سے رجوع کرنا چاہیے تھا لیکن مَیں اس لحاظ سے بے قصور ہُوں کہ مجھے حالات کے اس قدر بگڑ جانے کی اُمید نہیں تھی، بس حالات بگڑتے چلے گئے اور مَیں ان حالات میں ایسا اُلجھا کہ کچھ ہوش نہ رہا لیکن مجھے احساس ہے کہ میرا یہ عمل تنظیم کے مفاد کے خلاف تھا، بہرصُورت مَیں کوشش کروں گا کہ آیندہ مجھ سے اس قسم کی کوئی غلطی نہ ہونے پائے۔"

"ہاں بادشاہ خان، یہ کوشش بہت ضروری ہے ورنہ ہمارے لیے بے پناہ مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ اب تم آرام کرو، تمھارا یہ معاملہ ہم نے سنبھال لیا ہے۔"

"بہت بہت شکریہ جنرل۔" بادشاہ خان اپنی جگہ سے اُٹھ گیا اور جنرل نے اپنے ایک آدمی کو اشارہ کیا۔ "بادشاہ خان کو عزت و احترام کے ساتھ اُن کے قبیلے تھانہ میں چھوڑ آؤ۔"

"بہت بہتر جناب۔" اُس نے جواب دیا اور وہ بادشاہ خان کو لے کر ہیلی کاپٹر کی طرف بڑھ گیا۔

□

کابل کی نواحی آبادیاں ختم ہو چکی تھیں، دائیں طرف کوہ بابا کی سر بہ فلک چوٹیاں سینہ تانے کھڑی تھیں، برف چاندی کے تاروں کی مانند چوٹیوں سے نیچے وادی تک لٹکی ہُوئی تھی، خنک ہَوا کے جھونکے سردی میں اضافہ کر رہے تھے۔

ٹینکر سڑک کے دائیں ہاتھ سرو کے درختوں کی جانب مُڑ گیا۔ سامنے غزنی تھا، سر بفلک اور خاموش، سُلطان محمود کا مزار پیچھے رہ گیا تھا لیکن اُس کا غزنی سامنے موجود تھا۔ ٹینکر نے ایک اور موڑ کاٹا اور دُھول سے اَٹے ہُوئے ایک سنسان چوک میں جا کھڑا ہُوا۔ جہاں چند بوسیدہ سے قہوہ خانے موجود تھے۔ ایک قہوہ خانے پر "سُلطان محمود ہوٹل" کا بورڈ آویزاں تھا۔

گرنتھ سنگھ نے مُسکراتے ہُوئے شیران کی جانب دیکھا اور بولا۔

"آ یارا ایتھے بیٹھ کے چائے پی واں گے، ہُن تے تیرا غزنی وچ رُکن دا کوئی ارادہ نئیں اے۔"

گرنتھ سنگھ نے چائے منگوالی، ہَوا کی شدت میں اضافہ ہو چکا تھا، دُور صحرا میں بگولے اُٹھ رہے تھے اور سڑک کے قریب اُگی ہُوئی جھاڑیاں اس شدید ہَوا میں لرز رہی تھیں۔

تھوڑی دیر وہ وہاں رُکے پھر ٹینکر وہاں سے قندھار کی جانب چل پڑا۔

"قندھار سے واپسی پر ہم سیدھے کابل آئیں گے پھر مَیں تمھیں غازی خان سے ملا دُوں گا، ٹھیک ہے؟" گرنتھ سنگھ نے پوچھا۔

"کابل میرے لیے خطرناک ہو گا، گرنتھ سنگھ کہیں میری وجہ سے تمھیں کوئی پریشانی نہ ہو جائے؟"

"اوئے یار جب یار کہہ دیا تو پھر جو ہو گا دیکھا جائے گا.... گرنتھ سنگھ اسی طرح کا آدمی ہے، تیرے لیے اگر کوئی مشکل بھی اُٹھانی پڑے تو اُٹھا لیں گے، کیا فرق پڑتا ہے۔" گرنتھ سنگھ نے کہا اور شیران نے گردن ہلا دی۔

کافی دیر تک ٹینکر وہاں رُکا، اس کے بعد گرنتھ سنگھ سیٹ پر آ بیٹھا، شیران بھی اُس کے نزدیک ہی بیٹھ گیا تھا۔

"میرا ایک کلینر بھی ہے، مگر وہ بیمار ہے۔ اُس کی وجہ سے مَیں کام میں دیری نہیں کر سکتا تھا، قندھار میں ہمیں رات کو رُکنا پڑے گا کیونکہ یہ ٹینکر خالی کرنا ہے، اس کے بعد سیدھے کابل پر جا کر دَم لیں گے۔ آرام بھی ہو جائے گا تھوڑا سا۔" گرنتھ سنگھ بولا اور شیران نے گردن ہلا دی۔

ٹینکر قندھار میں داخل ہو گیا، کچے مکانات، گندی گلیاں اور کہیں کہیں سرو کے درخت، گرنتھ سنگھ ٹینکر کو ایک بہت بڑے پیٹرول پمپ پر لے گیا تھا جہاں کچھ اور سردار بھی موجود تھے۔ بالکل گرنتھ سنگھ کی مانند، پگڑیاں باندھے ہُوئے، چڑھی ہُوئی داڑھیوں والے....

ٹینکر پر پہنچ کر اُنھوں نے گرنتھ سنگھ سے مُلاقات کی اور پھر شیران کی طرف دیکھتے ہُوئے ایک سردار نے کہا۔

"اوئے گرنتھیا، اے توں کہنوں اپنے نال لے آیا اے۔ تیرا او جھورا کِتھے اے؟"

"او نئیں یار اے تے میرا یار اے، کلینر نئیں اے۔" گرنتھ سنگھ نے جواب دیا۔

"ہلا تے فیر تہاڈا یار ساڈا وی یار اے۔ آؤ جی یار بادشاہ کی خاطر کریئے تہاڈی...." ایک سردار نے شیران کی جانب ہاتھ بڑھا کر کہا۔ شیران کچھ خجل سا تھا، اُن لوگوں کی گفتگو پُوری طرح اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ تاہم اُس نے اجنبیت کا مظاہرہ نہیں کیا، ابھی وہ اس دُنیا میں اجنبی تھا، جب تک وہ یہاں کے بارے میں اچھی طرح جان نہ لیتا، کھُل کھیل نہیں سکتا تھا.... بہرصُورت ٹینکر.... کا تیل پیٹرول پمپ کی ٹنکی میں منتقل ہونا شروع ہو گیا تو یہ لوگ ایک چھوٹے سے ہوٹل میں جا بیٹھے تھے، جو مٹی کا بنا ہُوا چوکور سا قلعہ معلوم ہو رہا تھا۔

بکرے کی رانیں الاؤ پر بھُونی جا رہی تھیں اور گوشت سے چربی پگھل کر سُلگتی ہُوئی لکڑیوں پر گر رہی تھی۔ گوشت کی اشتہا انگیز خوشبو سُرمئی دُھوئیں میں مدغم ہو کر پُوری فضا میں رچی ہُوئی تھی۔ گرنتھ سنگھ گوشت سے پرہیز نہیں کرتا تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے بکرے کی رانیں اُدھیڑنے لگے۔ شیران کی خوراک دیکھ کر گرنتھ سنگھ نے مُسکراتے ہُوئے گردن ہلائی تھی۔

"جوان اے یار، جوان اے، کھا یار ڈٹ کے کھا۔" اُس نے شیران کی پُشت پر تھپکی دی اور اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر مُسکرانے لگا جو شیران کو دیکھ کر مُسکرا رہے تھے، لیکن شیران کھاتے وقت عام طور سے دوسروں کی جانب متوجہ نہیں ہوتا تھا، کھانا کھاتے کھاتے ایک لمحے کے لیے اُسے اپنی ماں یاد آئی جس کے ہاتھ کے پکائے ہُوئے کھانے شیران کو بہت پسند تھے اور وہ اس کے لیے نجانے کیا کیا اَلا بَلا پکاتی رہتی تھی۔

ٹینکر کافی دیر تک خالی ہوتا رہا لیکن اب گرنتھ سنگھ کو اس کی پروا نہیں تھی، رات کو وہ اطمینان سے پیٹرول پمپ کے پچھلے حصے میں، بانوں سے بنی ہُوئی چارپائیوں پر سو گئے، شیران بھی اطمینان سے سو گیا تھا، اُس کے پاس اُس کے پستول کے علاوہ ایسی کوئی خاص چیز نہیں تھی جس کی حفاظت کرنا ہوتی،

پستول ابھی تک اُس نے گرنتھ سنگھ کی نگاہوں سے بھی پوشیدہ رکھا تھا...

گرنتھ سنگھ نے اُسے صبح سویرے ہی اُٹھا دیا تھا۔ وہ پُوری طرح تیار ہو چکا تھا، شیران آنکھیں ملتا ہُوا اُٹھ بیٹھا، نیند نے اُسے ماحول سے بیگانہ کر دیا تھا لیکن صبح اُٹھنے کے بعد اُس نے اردگرد کے ماحول کو دیکھا تو اُسے احساس ہُوا کہ گھر کی پُرسکون چہار دیواری اُس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھن چکی ہے اور اب دن اور رات کا کوئی تعین نہیں کیا جا سکتا کہ کہاں بسر ہو۔

گرنتھ سنگھ کے ساتھیوں نے ناشتے کا بندوبست کر لیا تھا چنانچہ ایک میلی سی دری بچھا کر انڈے اور پراٹھے سامنے لا کر رکھ دیے گئے اور گرنتھ سنگھ نے اُس کے ساتھ ناشتہ کیا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر اُس نے واپسی کا فیصلہ کر لیا تاکہ سُورج تیز ہونے سے پہلے سفر کا آغاز کر دیا جائے اور تیز رفتاری سے کافی سفر طے کر لیا جائے۔ چنانچہ اُس نے ٹینکر اسٹارٹ کیا اور اُسے موڑ کر اُسی سڑک پر چل پڑا جو قندھار سے غزنی اور غزنی سے کابل جاتی تھی...

▼ ▼

رتن کور چار بچّوں کی ماں ہونے کے باوجود شوخ و شنگ اور چلبلی عورت تھی، دوشیزگی کی حدود سے نکل چکی تھی اور اب چار بچّوں کی محبت اُس کے چہرے پر جگمگاتی رہتی تھی لیکن سیاہ آنکھوں میں شرارت اب بھی باقی تھی۔ شیران کو دیکھ کر اُس نے آواز لگائی...

"اوئے خالصے، تُو نے تو سردار ہی بنا دیتا میرے پھائی نُوں، سَوں واہگورو دی بالکل سرداراں وانگو لگدا اے، تے تیرا تے جوڑ دا پھائی لگدا اے، بس کنڈے دی کسر اے کلائی وِچ!"

گرنتھ سنگھ جو دوسرے کمرے میں تھا، وہیں سے چیخا۔

"نی نظر نہ لا دئیں پیر ٹھے، ساڈا یار تے ہے ہی خالصہ۔"

"نا گرنتھیا، اے گل نہ کہہ، اودا جو دھرم اے او ہی رہنا چاہیدا اے، مجبوری دی گل دوسری اے۔"

گرنتھ سنگھ کمرے سے نکل کر ان دونوں کے پاس آگیا۔ شیران کے چہرے پر جھجک اور شرم تھی، اُس نے بھی اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا تھا، بڑھی ہُوئی داڑھی جو اب باقاعدہ داڑھی بن چکی تھی، گرنتھ سنگھ نے دو حصّوں میں تقسیم کر کے اُوپر چڑھا دی تھی اور سر پہ چپکی ہُوئی پگڑی باندھنے سے شیران بالکل سکھ معلوم ہو رہا تھا، اُس نے تو زندگی میں پہلی بار سکھوں کو دیکھا تھا، اس لیے اُن کے دین و مذہب، رسم و رواج کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا تھا، سچی بات تو یہ تھی کہ وہ بیرونی دُنیا کے ماحول کے بارے میں... کچھ نہیں جانتا تھا۔

پہاڑوں کا باسی، بہتے ہُوئے جھرنوں، سنگلاخ چٹانوں، سرسبز وادیوں، بندوق کی گولیوں اور تڑپتے ہُوئے شکار کے خُون کے علاوہ اور کچھ نہیں جانتا تھا، یہ سارا ماحول ہی اُس کے لیے اجنبی تھا لیکن وہ خود کو اس اجنبی ماحول میں ڈھالنے کا خواہش مند تھا، اُسے یہ دُنیا بُری نہیں لگی تھی، بچپن سے اب تک جن پہاڑوں میں اُس نے زندگی گزاری تھی اب وہ اُس کے دُشمن تھے، چٹانوں میں چھپے ہُوئے لوگ اپنی رائفلوں کے ٹرائیگر پر اُنگلی رکھے ہُوئے اُس کی آہٹوں کے منتظر تھے، بھلا ایسے لوگوں کے درمیان زندگی بھی کوئی زندگی تھی۔ اب تو اُس کے سامنے یہ وسیع و عریض دُنیا پڑی تھی جس کے متعلق کبھی کسی بھولے بھٹکے شخص سے آتے جاتے دو چار باتیں سُنی تھیں، بس اس سے زیادہ اس دُنیا کے بارے میں نہیں جانتا تھا لیکن اب وہ یہ رنگین کائنات اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ چالاک اور زیرک تو وہ تھا ہی اُس نے اب تک کسی پر یہ اظہار نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ قبائلی باشندہ ہے یا کسی ایسے خطّے سے آیا ہے جہاں تہذیب کی کرنیں دُور دُور تک موجود نہیں ہیں۔

گرنتھ سنگھ کو یہ تو احساس تھا کہ وہ پہاڑی آدمی ہے لیکن اُس نے ابھی تک شیران میں ایسی کوئی بات محسوس نہیں کی تھی جس پر اُسے حیرت ہوتی یا ہنسی آتی۔

کابل پہنچنے کے بعد وہ اپنے گھر آگیا تھا۔ رتن کور سے اُس نے شیران کا تعارف کرا دیا تھا۔ رتن کور فطرتاً شوخ اور چلبلی ضرور تھی لیکن صاحبِ کردار تھی۔ اُس نے شیران کو بھائی کہہ کر پُکارا اور دل سے بھائی ہی سمجھنے لگی تھی۔

گرنتھ سنگھ واقعی مخلص انسان تھا، دو دن تک اُس نے شیران کی خوب خاطر مدارت کی، شیران اس کا ممنونِ احسان تھا۔ تیسرے دن شیران نے اُس سے خود ہی تقاضا کیا۔

"سردار، میں اب زیادہ عرصے تمھارے پاس نہیں رہوں گا۔ میں چاہتا ہُوں کہ میں بھی تمھاری طرح کوئی عملی زندگی اختیار کر لوں۔"

"تو منع کس نے کیا ہے میرے یار، چار چھ دن آرام تو کر لے، میں نے بھی تیری وجہ سے چھٹی کر رکھی ہے، ورنہ مجھے ٹینکر لے کر ایران جانا تھا۔ ایران سے میری کمپنی نے مجھے بُلایا ہے۔ وہاں سے مجھے تیل لانا ہے۔"

"تو پھر گرنتھ سنگھ، مجھے کسی کام سے لگاؤ اور تم اپنے کام سے لگو۔ تم نے میرا حُلیہ تو بدل ہی دیا ہے، مجھے یقین ہے کہ اس حُلیے میں مجھے میرے قریبی لوگ بھی نہیں پہچان سکیں گے۔ اب تم یُوں کرو، مجھے غازی خان سے مِلا دو۔"

"تیری مرضی اے پھائی، میں کب منع کر رہا ہُوں، آج چلیں گے شام کو... لیکن پہلے پتہ کر لوں کہ غازی خان یہاں موجود بھی ہے یا نہیں... کبھی کبھی وہ باہر چلا جاتا ہے کسی کام سے اور پھر ہفتوں نہیں آتا۔ مگر میرے یار تجھے پروا نہیں کرنی چاہیے، تیرا یار اب اتنا بودا بھی نہیں ہے کہ تھوڑے دن تیری خدمت بھی نہ کر سکے۔"

"مجھے یقین ہے گرنتھ سنگھ، اور سچ بات یہ ہے کہ... کابل میں تم نے جس طرح میری مدد کی ہے میں اسے کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا، میں پٹھان ہُوں اور پٹھان جس کے احسان مند ہوتے ہیں اُس کے لیے اپنے خُون کا آخری قطرہ بھی بہا دیتے ہیں، بہر صُورت میں ابھی کوئی دعوٰی نہیں کروں گا لیکن میری دوستی تمھارے لیے بُری ثابت نہ ہو گی۔"

"اوئے یار انسان کو انسان سے اتنی محبت تو ہونی ہی چاہیے اور مجھے بھی تجھ سے بہت پیار ہو گیا ہے۔ میں تیرے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہُوں، بس تو کسی بات کی فکر مت کر۔" گرنتھ سنگھ نے خلوص انداز میں کہا اور پھر وہ شیران سے اجازت لے کر غازی خان کو تلاش کرنے چلا گیا۔ رتن کور مسکراتی ہُوئی شیران کے پاس آ بیٹھی...

"تینوں میری نظر نہ لگے بھرا، میں تے تینوں ویخ ویخ کے واری جاندی آں، میرا کوئی بھرا نہیں اے، پر ہُن مینوں اے حسرت نئیں رہی۔ میں تینوں اپنا بھرا سمجھنی آں، تُو میرے دل نُوں لگ گیا ایں۔"

"میں تمھیں اس محبت کے صلے میں کچھ بھی نہیں دے سکتا رتن کور... لیکن مجھے یقین ہے ایک نہ ایک دن وہ وقت ضرور آئے گا جب میں تمھاری محبت کا جواب دینے کے قابل ہو جاؤں گا۔" شیران نے کہا۔

دوپہر کو گرنتھ سنگھ واپس آگیا اور اُس نے شیران کو یہ خوشخبری سُنائی کہ اُس کی مُلاقات غازی خان سے ہو گئی ہے اور غازی خان نے شام کو سات بجے کا وقت . . . دیا ہے، ٹھیک سات بجے ہم غازی خان کے پاس چلیں گے۔ اس کے بعد اُس نے رتن کور سے کھانا مانگا اور دونوں ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے لگے۔

ساڑھے چھ بجے گرنتھ سنگھ نے شیران کو تیار کیا... نئی پگڑی باندھی، پہننے کے لیے بوشرٹ اور پتلون دی جو شیران کو بہت عجیب لگی تھی لیکن اُس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ گرنتھ سنگھ کے کہنے پر مکمل طور پر عمل کرے گا، اس کا اصُول تھا کہ جب حالات اپنے بس میں نہ ہوں تو پھر ان سہاروں سے پُورا پُورا فائدہ اُٹھایا جائے جو میسّر ہوں، یہ لباس اُس کے بدن پر بے حد خوبصورت لگ رہا تھا، رتن کور اُس کو دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی تھی۔

وہ دونوں غازی خان کے پاس پہنچ گئے۔ شیران نے غازی خان کے بارے میں بھی غلط اندازہ لگایا تھا اُس کا خیال تھا کہ وہ ایک قبائلی پٹھان ہو گا، معمولی سی رہائش گاہ ہو گی... خوش اخلاق اور ملنسار سا انسان ہو گا لیکن غازی خان کو دیکھ کر وہ خود بھی حیران رہ گیا تھا۔

غازی خان کے چہرے پر پہاڑوں کی سی سختی تھی... وہ ایک تندرست و توانا اور خُوبرو نوجوان تھا، انتہائی جدید تراش کا خُوب صُورت سُوٹ پہنے ہُوئے تھا، اُسے دیکھ کر یہ تمیز کرنا مشکل ہو جاتا تھا کہ وہ مقامی باشندہ ہے یا اس کا تعلق یورپ سے ہے۔ گرنتھ سنگھ نے اُسے غازی خان کہہ کر مخاطب کیا تب اُسے پتہ چلا کہ غازی خان اُس کے اپنے علاقے کا کوئی جوان ہے۔

"اوہ کمال ہے سردار، تم نے تو میرے یار کو بالکل ہی سکھ بنا دیا۔ اُتارو یہ پگڑی تم میرے مذہب کو تبدیل نہیں کر سکتے..." غازی خان نے پُرمزاح انداز میں کہا اور بڑی محبت سے شیران سے ہاتھ ملایا۔ کافی دیر تک وہ شیران کے طاقت ور ہاتھ ٹٹولتا رہا تھا۔ گرنتھ سنگھ نے سنجیدگی سے کہا۔

"یار غازی محبت کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، واہگورو کی قسم، میں نے یہ پگڑی اس کے سر پر اس لیے باندھی ہے کہ اس کے دُشمن اسے نہ پہچان سکیں، ورنہ مجھے اس بات کی کوئی خوشی نہیں تھی کہ میں اسے اپنے رُوپ میں دیکھوں۔"

"اوہ یار بُرا مان گیا تُو تو، گرنتھ سنگھ تُو تو چیز ہی ایسی نہیں ہے کہ تیرے اُوپر شک کیا جائے، میں نے تو یہ بات مذاق میں کی تھی۔ آؤ اندر چلتے ہیں۔" غازی خان نے کہا اور وہ تینوں اندر چلے گئے...

شیران اس خوبصورت عمارت کو دیکھ رہا تھا جو آرائش کی ایسی ایسی چیزوں سے آراستہ تھی، جن کا تصوّر اُس نے کبھی نہیں کیا تھا، ایک آرام دِہ صوفے پر ان دونوں کو بٹھانے کے بعد غازی خان بھی اُن کے سامنے بیٹھ گیا۔

"بات یہ ہے شیران کہ کچھ لوگ صرف اسی لیے پیدا ہوتے

ہیں کہ انسانوں کے کام آئیں، آج میں لاکھوں میں کھیل رہا ہوں، میرے پاس بے پناہ دولت ہے اور میں دل سے اب بھی یہ سمجھتا ہوں کہ مجھے سب سے بڑا سہارا دینے والا میرا دوست گرنتھ سنگھ ہے۔ میں اس کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں، مگر یہ شخص بے حد خوددار ہے۔ کبھی کبھی کوئی معمولی سا کام کر ڈالتا ہے، میرا... اور اس کا معاوضہ مجھ سے صرف اتنا ہی لیتا ہے جتنا میں دوسروں کو دیتا ہوں، میں نے جو کچھ کیا ہے شیران، بے شک اس میں میری کاوشیں ضرور ہیں لیکن سہارا مجھے گرنتھ سنگھ ہی نے دیا تھا، میں آج بھی اس بات پر تیار ہوں کہ گرنتھ سنگھ کو اپنے ساتھ شامل کر لوں اور اسے کوئی نوکری نہ کرنے دوں لیکن یہ میری بات نہیں مانتا۔ تمھارے بارے میں اس نے مجھے تھوڑی بہت تفصیل بتائی ہے... باقی باتیں تمھارے اور ہمارے درمیان بعد میں ہو جائیں گی لیکن ایک خواہش ہے میری۔"

"کیا... ؟" شیران نے پوچھا۔

"شیران تم کسی طرح اس گرنتھ سنگھ کو بھی اس بات پر آمادہ کر لو کہ یہ ہمارے ساتھ مل کر کام کرے، سچ مجھے کبھی کبھی... بے حد افسوس ہوتا ہے کہ یہ بالکل عام سی زندگی گزار رہا ہے اور یقین کرو مجھے اس کی یہ زندگی پسند نہیں ہے۔"

"نئیں او یار توں خوش ایں، تے خالصہ دی خوش اے، بس باقی کیا رہ جاتا ہے۔"

"مگر ہم تمھیں بھی خوش دیکھنا چاہتے ہیں گرنتھ سنگھ، تمھارے چار بچے ہیں، ان کے لیے بھی کچھ کر لو، جس طرح تم کام کر رہے ہو اس طرح کوئی بڑی بات کبھی نہیں ہو سکتی، اپنے "حصے" کا مال خود وصول کرو تو مل جاتا ہے، ورنہ کوئی تمھیں دینے نہیں آئے گا۔"

"مجھے تم سے اتفاق ہے غازی خان۔"

"تو پھر گرنتھ سنگھ تم غازی خان کی بات کیوں نہیں مان لیتے... پھر تم اتنے مذہبی بھی نہیں ہو، جب چھوٹے موٹے کام کر لیتے ہو تو پھر ایک بار ہی کوئی بڑا کام کر کے اپنی زندگی بہتر کیوں نہیں بنا لیتے۔" شیران نے کہا اور گرنتھ سنگھ ہنسنے لگا۔

"اوہ یار، سمجھنے کی کوشش کرو، اگر مجھے کوئی بڑا فائدہ حاصل ہو گیا تو پھر ایک بہت بڑا مان مجھ سے چھن جائے گا اور وہ مان یہ ہے کہ میں غازی خان کے کام آیا اور غازی خان جیسا کہ وہ کہتا ہے کہ اسے میرے سہارے آگے بڑھنے کا موقع ملا، اگر میں بھی غازی خان کا سہارا لے کر آگے بڑھ جاؤں تو میرا مان کیا رہے گا۔ یہ تو دوستی نہ ہوئی کاروبار ہو گیا۔" گرنتھ سنگھ نے کہا۔

"واہ گرنتھ سنگھ واہ، خوب سوچا تم نے... اور یہ جو میرے ساتھ بے شمار لوگ کام کرتے ہیں یہ میرے کیا لگتے ہیں۔ ان سے میرا کیا تعلق ہے۔ غیر ہونے کے باوجود وہ میرے ذریعے لاکھوں کما چکے ہیں اور میرا اپنا جو میرا ساتھی ہے مجھ سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتا... نہیں گرنتھ سنگھ نہیں، یہ خیال ذہن سے نکال دو، میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ وہی کام تم سے لوں گا جو دوسروں سے لیتا ہوں اور وہی ادائیگی تمھیں کروں گا جو دوسروں کو کرتا ہوں۔ اس طرح تمھارے اوپر کوئی احسان نہیں ہوگا، کام کے وقت ہم صرف کاروباری ہوں گے اور جب کام ختم ہو جائے گا تو پھر اپنی اپنی دوستیاں نبھائیں گے، اس بات پر تمھیں کیا اعتراض ہے... ؟"

"ہاں اس بات پر تو مجھے کوئی بھی اعتراض نہیں ہے۔" گرنتھ سنگھ نے ہنستے ہوئے کہا اور غازی خان اچھل پڑا۔

"تو... تو تم تیار ہو؟"

"اگر میرا یار شیران بھی تیار ہوتا ہے تو ٹھیک ہے جو کہو کریں گے۔"

"اوہ ونڈر فل، ونڈر فل۔" غازی خان مسرت سے اچھل پڑا۔ "یہ ہوئی نا مسرت کی بات، یار شیران تم نے چند لمحوں میں وہ کچھ کر دکھایا جس کے لیے میں سالوں سے رو رہا ہوں۔ تمھارا یہ کارنامہ میں ہمیشہ یاد رکھوں گا، تو گرنتھ سنگھ جی سب سے پہلا کام تم یہ کرو کہ اپنی اس کمپنی کو "چھٹی" کی درخواست بھیج دو، درخواست منظور کرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بس درخواست بھیج دو، وہ لوگ تمھیں رکھتے ہیں رکھیں، نکالتے ہیں نکال دیں، ہمیں اس کی پروا نہیں ہے۔"

"او بھیج دوں گا بھائی بھیج دوں گا۔ پہلے کوئی پروگرام تو بنا لو..."

"بس پہلا پروگرام یہ ہے کہ تم اپنی "چھٹی" منظور کرا لو، باقی باتیں بعد میں ہوں گی اور ہاں اپنے اس یار کو ہمیں ادھار دے جاؤ۔ آج ہم اسے واپس نہیں جانے دیں گے۔" غازی خان نے کہا اور گرنتھ سنگھ ہنسنے لگا، شیران کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ تھی۔ اس کے حسین چہرے پر یہ مسکراہٹ دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ان خوب صورت خدوخال کے پیچھے ایک درندہ صفت آدمی چھپا بیٹھا ہے۔ درحقیقت ماحول کی اجنبیت نے شیران کی معصومیت کو ابھار دیا تھا۔ اگر یہ ماحول اس کے لیے اجنبی نہ ہوتا تو غازی خان اور گرنتھ سنگھ کو اس کے بارے میں بہت کچھ سوچنا پڑتا لیکن اس ماحول میں وہ ایک معصوم بچے کی مانند نظر آ رہا تھا اور فطری طور پر حقیقت کی تصویر نظر آتا تھا۔

گرنتھ سنگھ تھوڑی دیر بیٹھا پھر ان دونوں سے رخصت ہو گیا... اس نے غازی خان سے کہہ دیا تھا کہ شیران اگر گھر واپس آنا چاہے تو یہ اس کی ذمے داری ہوگی اور غازی خان نے ہنستے ہوئے وعدہ کر لیا تھا، اس نے کہا تھا۔

"تم بے فکر رہو گرنتھ سنگھ مہاراج، تمھارے ممولے کو ہمارے ہاتھوں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔" گرنتھ سنگھ کے جانے کے بعد غازی خان شیران کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"تمھارا یہ حلیہ مجھے ایک آنکھ نہیں بھا رہا ہے شیران، کہاں پہاڑوں کے شیر دل جوان اور کہاں یہ خالصے، حالانکہ تم اس لباس میں بہت جچ رہے ہو، مگر میں جانتا ہوں کہ حقیقت میں تم کیا ہو گے۔ چھوڑو ان باتوں کو، یہ بتاؤ کیا پلواؤں تمھیں... ؟"

"دیکھو غازی خان، گرنتھ سنگھ نے مجھے بتایا تھا کہ تم بھی پہاڑوں کے باشندے ہو، پہاڑوں سے یہاں آئے تھے کسی خاندانی دشمنی کا بدلہ لے کر... اور یہاں آ کر تم یہ سب کچھ بن گئے، بارے میں تم یہ سمجھ لو کہ نیا نیا پہاڑوں سے آیا ہوں... میری رہنمائی کرنا ہوگی، یہ سب کچھ کیا ہے اگر تم پہاڑوں سے نے سے پہلے سے جانتے تھے تو ٹھیک ہے لیکن میرے بارے میں یہ سمجھ لو کہ میں کچھ نہیں جانتا۔ اب تک بس کام چلاتا آیا ہوں... میرے لیے خطرناک جگہ ہے، میں مختصراً تمھیں اپنی کہانی دوں، تاکہ تمھیں میرے بارے میں فیصلہ کرنے میں آسانی شیران نے کہا...

"میرے دوست تم بالکل بے فکر رہو، مجھے آج بھی اپنا وقت یاد ہے جب میں پہلی بار کابل آیا تھا لیکن میں تمھاری کہانی ضرور سنوں گا تاکہ تمھاری شخصیت کو سمجھنے میں مجھے آسانی ہو۔" غازی خان نے کہا۔

"یہ بتاؤ غازی خان، تمھارا تعلق کون سے قبیلے سے ہے؟" شیران نے پوچھا اور غازی خان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی...

"تمھارے اسی سوال سے مجھے تمھاری شخصیت کے بارے میں تھوڑا بہت اندازہ ہوتا ہے شیران، ذہین آدمی اگر دلیر اور طاقت ور بھی ہو تو کامیابی اس سے زیادہ دور نہیں ہوتی۔ بہرصورت میں مغربی پہاڑوں کا رہنے والا ہوں اور میرے قبیلے کا نام خطابیہ ہے..." غازی خان نے کہا۔

"ٹھیک ہے، اس کا مطلب ہے کہ ہمارے اور تمھارے درمیان بہت طویل فاصلہ تھا اور میری کارکردگی کا اثر تم تک نہیں پہنچتا۔" شیران مسکرا کر بولا اور غازی خان ہنس پڑا۔

"میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ تم نے میرے قبیلے کا نام کیوں پوچھا ہے۔"

پھر شیران نے کہا۔ "میں قبیلہ تراب زنان کا ایک فرد ہوں اور میرا خاندان سلامن خاندان کہلاتا ہے۔ بہزاد سلامن میرا باپ تھا۔ میرے باپ کو درندوں نے پھاڑ کھایا تھا۔ اس وقت سے مجھے درندوں سے نفرت ہو گئی، میری زندگی کا بیشتر وقت جنگلوں میں خونخوار جانوروں سے نبرد آزمائی میں گزرا ہے... مقصد یہ کہ شکار کا شوقین ہوں۔ سیدھی سادی زندگی گزار رہا تھا کہ ایک خاندانی دشمنی کا شکار ہو گیا۔" وہ تفصیل سنا کر بولا... "قبیلہ تراب زنان میں اب میرا کوئی نہیں ہے اور مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں رہی ہے۔ ہاں اگر بادشاہ خان یا فیروز خان کے بیٹے کبھی راستے میں آئے تو انھیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"بادشاہ خان۔ میں نے یہ نام کہیں سنا ہے۔ نہ جانے کہاں۔ بس یاد پڑتا ہے کہ یہ نام... ممکن ہے اپنے قبیلے میں کسی کی زبانی سنا ہو۔ بہرحال تمھاری کہانی بہت دلچسپ ہے۔ شکاری ہو، نشانہ بھی ٹھیک ہوگا۔ اب ہماری دوستی "پکی"۔"

"تم میرے لیے اب کون سا راستہ تجویز کرتے ہو؟"

"دیکھو دوست۔ پہاڑوں کے رشتے سے تم میرے بہت کچھ ہو۔ میں ساری زندگی تمھیں اپنے دوست اور بھائی کی حیثیت سے اپنے ساتھ رکھ سکتا ہوں اور تمھیں ہاتھ ہلانے کی ضرورت بھی نہیں ہوگی لیکن نہ تم اسے قبول کرو گے اور نہ میں یہ پسند کروں گا۔ کوئی غیور قبائلی کبھی کسی کے ٹکڑوں پر پرورش نہیں پاتا۔ تم نے اپنی کہانی جس خلوص سے سنا دی ہے اسی خلوص سے میں تمھیں اپنے بارے میں بتا رہا ہوں۔ میں منشیات کی تجارت کرتا ہوں۔ تھائی لینڈ، ملائشیا، انڈونیشیا، بنکاک اور ہانگ کانگ میں بھنگ، چرس، افیون، میتھیڈرین اور ہیروئن فروخت کرتا ہوں اور اسے کابل سے لے کر امریکا تک بھی سپلائی کرتا ہوں۔ میرے آدمی ایک مخصوص حصے سے سفر کرتے ہیں اور میرے لیے کام کرتے ہیں، میں نے یہ کام اپنی حدود میں رکھا ہے اور اتنا کما لیتا ہوں کہ عیش کی زندگی گزار رہا ہوں۔"

"گرنتھ سنگھ اسے بڑا دھندہ کہتا ہے۔" شیران نے کہا۔

"ہاں۔ کام یہ بہت بڑا ہے اور بے حد خطرناک بھی۔"

"خطرناک کیوں؟"

"اس لیے کہ پُوری دُنیا میں ہمارے دشمن ہی دشمن ہیں۔ قدم قدم پر موت اور زندگی کی کش مکش ہوتی ہے۔"

"یہ دشمن کون لوگ ہوتے ہیں؟"

"حکومت... اور بعض اوقات ہمارے حریف۔"

"ہوں۔ تب تو دلچسپ کام ہے۔"

"ہوشیاری، چالاکی اور بہادری۔ تینوں چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے اس میں۔ کسی ایک چیز کی کمی موت کا پیغام بن جاتی ہے۔"

"میرے لیے تم نے کون سا کام منتخب کیا ہے؟"

"کم ازکم ایک ہفتے تک تم میرے ساتھ رہو گے۔ اس کے بعد میں تمہیں پہلا ٹرپ دُوں گا۔"

"کیا دو گے؟" شیران نے تعجب سے پُوچھا۔

"جو کچھ دوں گا بعد میں بتا دُوں گا۔ پہلے تم اپنا حلیہ تبدیل کرلو۔ اس خالصے نے تمہاری شخصیت دبا دی ہے۔" غازی خان نے یہ کہہ کر کال بیل کا بٹن دبا دیا۔ چند لمحات کے بعد ایک خوبصورت لڑکی اندر آ گئی۔ سیاہ گھنگھریالے بالوں والی شوخ و شنگ لڑکی جو جدید تراش کا لباس پہنے ہُوئے تھی۔

"لیلیٰ... یہ شیران خان ہے۔ اسے شیران خان بناؤ۔"

"خان...؟" لڑکی نے تعجب سے کہا۔

"ہاں، خان۔ میرا دوست۔ میرا گہرا دوست۔ اس کے موجودہ حُلیے پر توجّہ نہ دو۔"

"داڑھی...؟" لیلیٰ نے پُوچھا۔

"صاف۔" غازی خان نے ایک آنکھ دبا کر کہا اور لیلیٰ مُسکرا دی پھر اُس نے شیران کا بازُو پکڑ لیا۔

"آؤ جانِ من۔"

شیران نے آہستہ سے بازُو چھڑا لیا اور بھاری لہجے میں بولا۔ "اس کے بعد میرا بازُو پکڑ کر مجھے چلانے کی کوشش مت کرنا۔ نُقصان اُٹھاؤ گی۔" اور پھر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

لیلیٰ اُس کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ شیران کے پاس آ کر اُس نے کہا۔ "میں نے محبت سے تمہارا بازُو پکڑا تھا۔"

"دو قدم پیچھے رہو۔ میں اسی کا عادی ہُوں۔"

"نفرت کرتے ہو عورتوں سے؟"

"ایسی بات نہیں۔ محبت بھی کرتا ہُوں لیکن صُبح شام نہیں، اُس وقت جب اور کوئی کام نہ ہو۔" شیران خان نے کہا۔

"ادھر... اس کمرے میں آ جاؤ۔" لیلیٰ نے ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا اور شیران خان نے پاؤں کی ٹھوکر سے دروازہ کھول دیا۔ ایک خوبصورت کمرہ تھا جو عمارت کے بقیّہ حصّوں کی طرح آراستہ تھا۔ اس میں باتھ رُوم بھی نظر آ رہا تھا۔

لیلیٰ باتھ رُوم کی طرف بڑھ گئی اور اُس نے دروازہ کھول کر شیران کی طرف دیکھا۔ "آؤ۔" شیران اُس کے نزدیک پہنچ گیا لیکن باتھ رُوم میں جھانک کر وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔

"کیوں... وہاں کیوں بلا رہی ہو؟"

"آ جاؤ۔ پتہ چل جائے گا۔"

"لڑکی۔ میں بھی کافی بے تکلّف آدمی ہوں لیکن ابھی میرے اور تمہارے درمیان ملاقات کو زیادہ وقت نہیں ہُوا ہے ورنہ میں بھی بے تکلفی کا مظاہرہ کرتا۔ اس لیے مطلب کی بات کرو۔" شیران نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

"یُوں لگتا ہے جیسے تم عورتوں سے خوف زدہ ہو۔ بہرحال دیکھو سامنے ریزر ہے۔ یہ نہانے کا تیل ہے۔ یہ ٹب ہے۔ تمہارے لیے کوئی لباس موجود نہیں ہے۔ غسل کر لو تو میں تمہیں گاؤن دُوں گی۔ اس کے بعد لباس کے بارے میں دیکھا جائے گا۔ جلدی کرو۔ تم میری مدد نہیں لے رہے تو بہرحال میری ہدایات تو [illegible]"

"بس...؟" شیران نے پُوچھا۔

"ہاں۔ مجھے غازی خان کے احکامات کی تعمیل تو کرنی ہی ہے۔ وہ میرا باس ہے۔" لیلیٰ نے کہا۔

"دروازہ بند کر دو۔" شیران نے کہا اور لیلیٰ کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اُس نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ شیران جلدی سے غسل خانے سے باہر نکل آیا۔

"میں نے وہ دروازہ بند کرنے کے لیے نہیں کہا تھا۔"

"پھر...؟"

"اس دروازے کو باہر سے بند کر دو۔" وہ غسل خانے کے دروازے کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

"یہ ممکن نہیں ہے۔ تم نے سُنا نہیں، غازی خان نے کہا تھا کہ یہ میرا دوست ہے۔ اسے شیران خان بناؤ۔"

"اور تم اُس کی باتوں میں آ گئیں؟" شیران خان نے مُسکراتے ہُوئے کہا۔

"کیا مطلب؟" لیلیٰ حیرت سے بولی

"آؤ میں سمجھاؤں۔" شیران خان نے آگے بڑھ کر اُس کا بازُو پکڑ لیا اور پھر وہ لیلیٰ کو لے کر دروازے تک آیا۔ دروازہ کھولا اور سامنے کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ "ذرا دیکھو اصل معاملہ کیا ہے۔"

لیلیٰ چونک کر سامنے دیکھنے لگی۔

لیکن اُسی وقت ایک لات اُس کی کمر پر پڑی اور اُس کے حلق سے زوردار چیخ نکل گئی۔ اگر سامنے والے ستون سے اُس کے دونوں ہاتھ نہ ٹِک گئے ہوتے تو شاید اُس کے چہرے کا بھُرتہ بن جاتا۔ عقب میں دروازہ اندر سے بند ہو گیا تھا۔

"وحشی۔ کمینہ، ذلیل۔" اُس کے حلق سے آواز نکلی۔ یہ چیخ کی آواز سُن کر غازی خان اس طرف آ نکلا تھا۔ لیلیٰ کو دیکھ کر اُس کے چہرے پر حیرت کے آثار پھیل گئے۔

"ارے لیلیٰ۔ کیا تم چیخی تھیں؟ کیا بات ہے؟" اُس نے [illegible] انداز میں پُوچھا۔

"غازی خان... تمہیں وحشی جانوروں کے پالنے کا اتنا ہی شوق ہے تو کوئی چڑیا گھر کھول لو۔" وہ غصّے سے بولی۔

"ہُوا کیا گلبدن؟" غازی خان ہنس پڑا۔

"اس وحشی نے لات مار کر مجھے باہر پھینک دیا۔ آہ میری [illegible] مجھ سے تو کھڑا بھی نہیں ہُوا جا رہا۔"

"کیوں پھینک دیا۔ اصل بات تو بتا دو۔" غازی خان ہنستا ہُوا بولا۔

"تم ہنس رہے ہو غازی خان۔ یقین کرو مجھے سخت چوٹ آئی ہے۔ میں نے تو اُس سے کچھ کہا بھی نہیں تھا۔"

"اپنی چوٹ کا علاج کر لو لیلیٰ۔ میں بے حد خوش ہُوں، یقین [illegible] ہی خوش ہُوں۔ طویل عرصے کے بعد مجھے اپنی پسند کا [illegible] ملا ہے۔ اب لُطف آئے گا کام کرنے کا۔"

"وہ تمہاری پسند کا آدمی ہے؟"

"پہاڑوں کا وحشی خُون، طاقت ور، خوبصورت، تم دیکھتی جاؤ [illegible] اُسے کیا سے کیا بنا دیتا ہُوں۔"

"اس سے قبل تمام لڑکیوں کو یہاں سے ہٹا دینا۔ ورنہ ان [illegible] ایک بھی زندہ نہ رہ سکے گی۔ اُف۔ وحشی جانور، درندہ۔" [illegible] کمر پر ہاتھ رکھ کر ادھر اُدھر جھکتی ہُوئی بولی۔

"آؤ۔ میں... سہلا دُوں... آؤ۔" غازی خان بولا۔

"آخر یہ ہے کون۔ شکل سے سِکھ نظر آتا ہے اور تم اُسے قبائلی [illegible] کہتے ہو؟" لیلیٰ بولی۔

"اب بھی فیصلہ نہیں کر سکیں؟"

"کیا فیصلہ...؟"

"وہ سِکھ ہے یا قبائلی؟" غازی خان نے کہا اور لیلیٰ آنکھیں [illegible] کے ہنسنے لگی۔ غازی خان نے دوبارہ گھنٹی بجائی اور پھر ایک مُلازم کے آنے پر اُسے کافی لانے کا حکم دیا۔

کافی کے گھونٹ لیتے ہُوئے وہ لیلیٰ سے کہہ رہا تھا۔ "بے حد شاندار جوان ہے لیلیٰ۔ چل گیا تو وارے نیارے ہو جائیں گے اور پھر میں نے اُسے دوست کہا ہے۔ یہ دوستی بھی نبھانی ہے۔ اُسے اپنے کام کا بنانا ہے۔ تم اُس کی فطرت کو پڑھو اور اس کے مطابق چلتے ہُوئے اُسے جدید دُنیا سے رُوشناس کراؤ۔"

"میں...؟" لیلیٰ چیخ کر بولی۔

"ہاں تم۔"

"نہیں غازی خان۔ یہ بہت مشکل کام ہے۔ وہ شاید حُسن سے متاثر نہیں ہوتا۔ دُنیا کا کوئی شخص کسی حسین لڑکی کو اس طرح لات مار کر کمرے سے باہر نہیں پھینک سکتا۔"

"اس کے باوجود تم اُس سے متاثر نہیں ہو؟"

"آہ... میں تو اس سے بہت زیادہ متاثر ہُوں۔" لیلیٰ کمر پر ہاتھ رکھ کر کراہنے لگی اور غازی خان ہنسنے لگا۔

"وہ ابھی ہر چیز سے ناواقف ہے۔ قطعًا ناواقف لیکن تم محسوس بھی نہ کر پائی ہو گی۔ یہ بھی اُس کی خوبی ہے۔" غازی خان نے کہا۔ اُسی وقت دروازہ کھُلا اور کھُلے ہُوئے دروازے سے جو کوئی اندر داخل ہُوا۔ اُسے دیکھ کر دونوں مبہوت ہو گئے تھے ایسا وجیہہ چہرہ بہت کم ہی نگاہوں سے گزرتا ہے۔ ایک انتہائی خوش رُو جوان اُن کے سامنے تھا۔

باقی آئندہ ماہ

جرم کے اثرات فوراً ہی ختم نہیں ہوجاتے
ایک صدی پر محیط مجرم کی داستانِ حیرت
خوف وہراس میں ڈوبی ہوئی تحریر

خواب پریشاں

ش۔م۔جمیل

اُس کے چہرے پر خوش گوار تاثرات پھیلے ہُوئے تھے اور آنکھیں کسی اندرونی جذبے کے تحت بے پناہ روشن لگ رہی تھیں۔ وہ اپنے شوہر پال کے ساتھ ایک ریستوران میں بیٹھی لنچ لے رہی تھی۔ کھانے سے فارغ ہو کر اُس نے پال کی طرف دیکھا اور بے حد مسرور لہجے میں بولی "غالباً دسمبر میں، پال... اور ہم اُسے کرسمس بے بی، کہہ سکیں گے" جملہ ختم ہوتے ہوتے اُس کی مسکراہٹ ہونٹوں سے اُتر کر پورے چہرے پر پھیل گئی۔

"ہُوں..." پال نے کہا "تمہارا لہجہ اب کافی بدل گیا ہے" کافی کی طرف متوجہ ہوگیا جسے ابھی ابھی ویٹرس اُس کے سامنے رکھ گئی تھی۔

جولی مُسکراتی رہی۔

"لیکن تمہارے اُن ارادوں کا کیا ہُوا جو تم نے شادی سے پہلے بڑے چاؤ سے باندھے تھے۔ وہ قالین کیا ہُوئے، جنھیں خریدنے کے خواب دیکھ رہی تھیں؟ اس فرنیچر کی خواہش کیوں دم توڑ گئی جس کے لیے تم نے منصوبہ بنایا تھا کہ شادی کے بعد ابتدائی دو سال ملازمت کرو گی؟ تم کہا کرتی تھیں کہ محض ایک تنخواہ سے یہ سب کچھ نہیں ہو سکتا اس لیے تمھیں ہر حال میں کام کرنا پڑے گا۔"

پال نے ابھی حال ہی میں اپنی تربیت مکمل کی تھی اور وہ مقامی طور پر کام کرنے والے ایک ماہر ڈاکٹر کی شراکت میں کام کر رہا تھا... اس سے پہلے جولی بطور سیکریٹری ملازمت کرتی تھی لیکن پال نے اور اُس نے ازدواجی زندگی کا آغاز کرنے کے لیے اُس نے اپنے آبائی ضلع اور ملازمت، دونوں کو خیرباد کہہ دیا اور وہ برطانیہ کے شمالی حصّے میں آکر آباد ہوگئے تھے۔ جولی نے یہاں آنے کے بعد ملازمت تلاش کرنے کی کوشش تو کی لیکن جلد ہی ایک ایسی خواہش کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے جو اکثر عورتوں کو شادی کے بعد، بالکل بے بس بنا کر رکھ دیتی ہے... اور اُس نے آج اسی خواہش کا اظہار بھی کر دیا تھا گویا یہ ایک طرح سے ملازمت ترک کرنے کی تاویل تھی۔

"یوں لگتا ہے" وہ محتاط لہجے میں بولی "ہمیں ان تمام چیزوں کے لیے ابھی کچھ عرصے تک مزید انتظار کرنا پڑے گا۔ دراصل گزشتہ چند مہینوں سے بچّے کی خواہش نے باقی تمام خواہشات پر بالادستی حاصل کر لی ہے... میں جو علامات محسوس کر رہی ہوں، اگر خدانخواستہ وہ غلط نکلیں تو مجھے بے حد مایوسی ہوگی۔"

پال خاموش رہا۔ اُس کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ رقص کرنے لگی۔

جولی اپنی بات ختم کرکے ریستوران کی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی تھی اس لیے وہ پال کی مُسکراہٹ نہ دیکھ سکی۔ کچھ دیر وہ بڑے فراغت پسندانہ انداز میں باہر دیکھتی رہی... پھر اپنے شوہر کی طرف متوجہ ہو کر بولی "کیا تمھیں میری اس خواہش پر کوئی اعتراض ہے پال؟"

اس بار پال اپنے دِلی تاثرات چھپانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ وہ قدرے کھسیا کر بولا "اگر تم جاننا ہی چاہتی ہو تو سُن لو کہ یہ ایک عالی شان دار خیال ہے۔ بے حد شان دار ڈارلنگ!" یہ کہتے ہُوئے اُس نے ہاتھ بڑھا کر جولی کا ہاتھ تھام لیا اور اُسے دھیرے دھیرے تھپتھپانے لگا... پھر یکایک اس کی نگاہ اپنی گھڑی کی طرف اُٹھ گئی اور وہ چونک پڑا "اوہ! ڈارلنگ! اَب مجھے چل دینا چاہیے۔ اگر دیر ہوگئی تو بلاوجہ جیمز سے تلخ کلامی ہوگی۔ اُسے اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں کہ ہم اپنے ہونے والے بچّے کے بارے میں کوئی منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔ وہ وقت کا پابند ہے اور مجھے بھی ایسا ہی دکھنا چاہیے۔ بہرحال، ہم اس سلسلے میں، شام کو، تفصیل سے بات کریں گے۔"

اُس نے بِل منگوایا اور ادائیگی کرکے اُٹھ کھڑا ہُوا۔

"آج سہ پہر کے لیے تمھارے کیا ارادے ہیں؟" وہ اپنی حسین و جمیل بیوی کی جھیل جیسی گہری آنکھوں میں جھانک کر بولا۔

"میرا خیال ہے، مَیں کسی کاہل سی عورت کی طرح شہر میں گھُوموں پھروں گی" جولی نے ہنس کر کہا "بچّوں کی اَشیا فروخت کرنے والے اسٹوروں کا جائزہ لوں گی اور اگر کچھ سمجھ میں آگیا تو اُسے خرید بھی لُوں گی۔"

پال نے اثبات میں سر ہلا دیا "ٹھیک ہے، پھر ملیں گے... لیکن زیادہ خرچ نہ کر بیٹھنا" اس کے انداز میں شرارت کُوٹ کُوٹ کر بھری ہُوئی تھی۔

وہ رُخصت ہوگیا تو جولی دیر تک کھڑی اُسے دیکھتی رہی۔ جب وہ سڑک کے اُس پار جاکر نظروں سے اوجھل ہوگیا تو وہ بھی شہر کے مرکزی علاقے کی طرف چل دی۔ اس کے چہرے کی بے شکن جلد صحت مندی کے اظہار میں چمک رہی تھی اور اس کے بال دُھوپ میں چمک رہے تھے۔ وہ اپنی ٹوکری جھلاتی ہُوئی مختلف سڑکوں پر چلتی رہی۔

ایک نئے شاپنگ سینٹر کے سامنے خاصا ہجوم تھا۔ وہ اس میں سے بمشکل راستہ بناتی ہُوئی ایک ذیلی سڑک پر نکل آئی جہاں چھوٹے موٹے کئی اسٹال لگے ہُوئے تھے۔ یہ شہر کا قدیم علاقہ تھا۔ اس حصّے کی دُکانیں قدیم اینٹوں کی بنی ہُوئی تھیں۔ وہ اس وقت بے حد مسرُور اور اپنی قسمت پر نازاں ایک ایسی عورت لگ رہی تھی جس کے قدم مارے خوشی کے زمین پر نہ پڑ رہے ہوں۔

اچانک اس کی نگاہ ایک بے بی بوتیک پر پڑی۔

اُس کے قدم تھم گئے۔

شوکیس میں بچّوں کے رنگ برنگ ملبوسات اور کھلونے بہار دِکھا رہے تھے۔ وہ اُن کی رنگینیوں میں کھوگئی۔ بے ساختہ اس کے دِل میں، اندر جانے کی خواہش پیدا ہُوئی اور وہ یوں دُکان میں داخل ہُوئی جیسے مقناطیس کسی حقیر ذرّے کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ اُس پر نگاہ پڑتے ہی سیلز گرل نے وہ رُومانی ناول رکھ دیا، جسے وہ فرصت کے لمحات میں پڑھتی رہتی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر استقبالیہ مُسکراہٹ رینگ گئی۔

"مَیں کچھ چیزیں دیکھنا چاہتی ہُوں" جولی نے کہا۔

"اوہ... کوئی بات نہیں۔ میری مدد کی ضرورت پڑے تو بُلا لیجئے گا" یہ کہہ کر سیلز گرل دوبارہ ناول کی طرف متوجہ ہوگئی۔

جولی بچّوں کے ملبوسات، گاڑیوں، کھلونوں اور کُرسیوں کے درمیان سے گزرتی ہُوئی اُس زیرِ زمین حصّے میں اُتر گئی جہاں نسبتاً

چھوٹی اُشیا' برائے فروخت رکھی ہُوئی تھیں۔ وہ ان اُشیا کا جائزہ لیتی ہُوئی آگے بڑھتی رہی حتیٰ کہ ایک جگہ فَر کے بنے ہُوئے کھلونے کے قریب رُک گئی اور اس کی اُنگلیاں فَر کی نرماہٹ محسوس کرنے لگیں۔ اچانک ہی وہ سَر سے پاؤں تک کانپ گئی۔ اُسے یوں محسوس ہُوا جیسے اس کے پاؤں فرش سے یوں چپک گئے ہوں کہ وہ اُنھیں اپنی مرضی سے حرکت بھی نہیں دے سکتی۔ ایک سَرد سی لہر اُس کی ریڑھ کی ہڈی میں کسی زندہ چھپکلی کی طرح متحرک ہوگئی۔ خوف کی اَن گنت ننھی ننھی سی چھپکلیاں اُس کے جِسم پر رینگنے لگیں۔ تب اُسے پہلی بار احساس ہُوا کہ وہ ایک ایسے حصّے میں کھڑی ہے' جہاں کوئی دوسرا موجود نہیں ہے۔ . . لیکن اُس کے باوجود کوئی موجود تھا۔ کوئی شیطانی سا ماورائی وجود قریب ہی موجود تھا۔ اُسی لمحے اُسے ایک سرگوشی سُنائی دی۔

یہ ایک ایسی آواز تھی جس سے اُس کا رُواں رُواں کانپ گیا۔ سرگوشی کی یہ مدّھم سی آواز اُسے چاروں طرف' دیواروں سے پھُوٹتی محسوس ہو رہی تھی۔ بے اختیار اس کا جی چاہا کہ سیڑھیوں پر جا پہنچے، جہاں سے دُھوپ نیچے آ رہی تھی لیکن اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے اُسے جکڑ رکھا ہو اور وہ ایک قدم بھی نہ اُٹھا سکتی ہو۔

یکایک دو نادیدہ ہاتھ اُسے اپنی گردن پر محسوس ہونے لگے۔

اس کا گلا دبایا جا رہا تھا۔

اُس کی سانس رُکنے لگی۔ اس کا دَم گھٹنے لگا۔ . . اور وہ خود میں اتنی طاقت بھی نہیں پا رہی تھی کہ کم ازکم مدافعت ہی کر سکے۔ بالآخر ڈوبتے ذہن کے ساتھ ہی اُسے خیال آیا کہ کم ازکم چیخنا تو چاہیے . . . لیکن اَب اُسے چیخنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی کیوں کہ سیلز گرل کا تشویش آمیز چہرہ اس کے سامنے آ گیا تھا اور وہ بڑی ہی فکرمندی سے پوچھ رہی تھی: "آپ کی طبعیت تو ٹھیک ہے، میڈم؟"

پہلے تو اس کا خیال تھا کہ وہ قوتِ گویائی بھی کھو چکی ہے کیونکہ اس کے حلق میں کانٹوں کی چُبھن سی ہُوئی تھی اور اس کے خشک حلقوم سے خرخراہٹ سی اُبھرنے لگی تھی لیکن جب اس نے لب کُشائی کی تو عجیب سی آواز اس زیرِ زمین کمرے میں گونج اُٹھی۔ اُسے خود اپنی ہی آواز بے حد اجنبی اجنبی لگی تھی۔

"ہاں . . . میرا خیال . . . ہے . . . مجھے چکر سا آ گیا تھا۔" یہ کہتے ہُوئے اس نے مسکرانے کی بھی کوشش کی لیکن اس کی مسکراہٹ اتنی نقاہت آمیز تھی کہ اس کے لب محض پھڑپھڑا کر ہی رہ گئے۔

اس نے خود کو قدرے سنبھال لیا تو لڑکی کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے بروقت آکر اس کی جو خبرگیری کی تھی، اس کے لیے وہ تہ دِل سے اس کی شکر گزار تھی۔ وہ لڑکھڑاتی ہُوئی، سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

باہر کھلی فضا میں آکر اُس نے اطمینان کی ایک طویل سانس لی۔

وہ اس خوف ناک اور آسیبی جگہ سے ہر ممکن دُور ہو جانا چاہتی تھی۔ اُس نے ایک گزرتی ہُوئی ٹیکسی روکی اور اپنے گھر روانہ ہوگئی۔

اُس شام جب پال گھر واپس آیا تو اس نے اُسے اسٹور کے تہ خانے میں پیش آنے والے واقعے کی تفصیل سُنا دی۔ اُس نے گہری تشویش کا اظہار کیا اور جولی یہ محسوس ہی نہ کر سکی کہ وہ تمام محض اس کا دِل رکھنے کے لیے کر رہا ہے۔ پال نے اُسے ہر طرح اطمینان دِلایا اور بالآخر وہ پُوری طرح پُرسکون ہوگئی۔

"ہاں . . ." اس نے ایک طویل سانس لیتے ہُوئے کہا۔ "جب عورتیں اُمید سے ہوتی ہیں تو اس قسم کے چکر یا بے ہوشی کے دورے پڑ جایا کرتے ہیں۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں لیکن چونکہ میرے ساتھ ایسا پہلی بار ہُوا ہے، اس لیے مَیں نے اُسے کچھ زیادہ ہی محسوس

جولی نے کہنے کو تو یہ سب کچھ کہہ دیا تھا۔ . . لیکن اُس کے دِل میں اَب بھی ایک ہلکی سی پھانس موجود تھی۔ وہ یہ سمجھنے سے رہی کہ آخر اُس کے ساتھ کیا ہُوا تھا کہ وہ یکایک اتنی دہشت زدہ ہوگئی تھی۔

* * *

کئی ہفتے بعد جُولی نے ایک بار پھر خود کو اُسی تہ خانے میں پایا۔ لیکن اس مرتبہ اُس کی ماں اُس کے ساتھ تھی۔ وہ گزشتہ چند دنوں سے اُس کے پاس آئی ہُوئی تھی اور متوقع بچّے کے لیے کچھ خریداری کرنے کے ارادے سے جُولی کو بصدِ اصرار اپنے ساتھ یہاں لائی تھی۔ جیسے ہی وہ چھوٹی اُشیا کے ڈیپارٹمنٹ، یعنی اسٹور کے نچلے حصّے میں پہنچیں، جُولی نے کہا: "یہ وہی تہ خانہ ہے، ممّی! جہاں مجھ پر بے ہوشی کا اچانک حملہ ہُوا تھا۔ مَیں نے آپ سے تذکرہ کیا تھا، نا؟ دیکھیے وہ رہا میوزیکل ٹوائنز!" اُس نے اُنگلی سے ایک طرف اشارہ کر دیا۔

وہ آگے بڑھی اور اُس نے ایک میوزیکل باکس کا ڈھکنا اُٹھایا۔ اس کا خیال تھا کہ اندر سے موسیقی سُنائی دے گی لیکن مارے خوف کے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اُسے بالکل وہی آواز، وہی سرگوشی اور وہی خوف ناک مدّھم آواز سُنائی دی جسے سُن کر وہ پچھلی مرتبہ بے ہوش ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔

خوف کی سَرد سَرد سی اُنگلیاں اُسے اپنے بدن پر سرسراتی محسوس ہونے لگیں۔ اس نے دہشت سے پھٹی پھٹی آنکھوں ساتھ اپنی ماں کی طرف دیکھا لیکن یہ کیا؟ اس کی ماں کے انداز سے پتہ چلتا تھا جیسے اُس نے سرے سے کوئی آواز سُنی ہی نہ ہو۔ خون منجمد کر دینے والا احساس اُس کی ہستی پر چھا گیا اور سرگوشی رفتہ رفتہ اتنی بلند ہوگئی کہ وہ اس کی دھمک اپنی کھوپڑی میں محسوس کرنے لگی۔ اس نے چیخنے کے لیے مُنہ کھولا لیکن اس کے حلق سے کوئی آواز نہ نکل سکی۔

* * *

اس کے نرخرے پر جیسے جیسے دَباؤ بڑھتا جا رہا تھا، وہ ویسے ویسے سانس لینے کی بھرپُور کوشش کر رہی تھی لیکن اُسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اُس کے ہوش و حواس ساتھ چھوڑتے جا رہے ہوں۔

دفعتاً اُس کی ماں نے اُسے پُکارا۔

ماں کی آواز جیسے ہی اس کی سماعت سے ٹکرائی، اس کے اُوپر چھایا ہُوا خوف ناک تاثر رفتہ رفتہ کم ہونے لگا۔ وہ دہشت زدہ خواب کی سی حالت خود بخود ختم ہوتی چلی گئی۔

وہ اس بُری طرح کانپ رہی تھی جیسے اس کی ہستی اُس کے اختیار سے نکل گئی ہو۔ اس نے بہ مشکل ہاتھ بڑھا کر اپنی ماں کا بازو تھام لیا جو اُسے لے کر آہستہ آہستہ سیڑھیوں کی طرف بڑھتی چلی گئی۔

گھر پہنچتے ہی جولی ایک نرم و گداز صوفے کی نرماہٹوں میں ڈوب گئی لیکن یہ نرماہٹیں بھی اس کی حالت پر فوری طور پر کوئی خوش گوار اثر نہ ڈال سکیں۔ اس کی ماں نے پال کو فون کر دیا اور خود اس کے لیے کافی بنانے کچن میں چلی گئی۔ کیتلی سے اُبھرنے والی بھاپ کی سُوں سُوں اُسے بے حد بھلی محسوس ہونے لگی۔

جولی سیاہ شیریں کافی کے گھونٹ بھر رہی تھی کہ اس کا شوہر گھر آ گیا۔ اس کے چہرے پر فکرمندی کی گہری لکیریں تھیں۔ وہ آنکھوں میں آنسو بھرے، بڑی درد بھری آواز میں اُسے اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعے کی تفصیل سُنانے لگی۔ اس دوران میں جیسے ہی اُسے اس خوف ناک سرگوشی کا خیال آیا، وہ سَر سے پاؤں تک کانپ گئی اور اس نے خود کو پُرسکون بنانے کے لیے جلدی سے پال کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"یقیناً اُس دُکان ہی میں کوئی مصیبت ہے۔" وہ بولی۔ "لیکن ممّی میرے بالکل قریب ہی موجود تھیں۔ اُنھوں نے تو کوئی آواز نہیں سُنی اور نہ ہی اُنھیں کوئی غیر معمولی احساس ہُوا تھا۔"

پال اس کا ہاتھ تھپ تھپانے لگا۔

"مجھے کیا ہو گیا ہے، پال؟" وہ سسک کر بولی۔

پال نے اُسے مضبوطی سے تھام لیا۔ وہ اُسے تسلّی دے رہا تھا لیکن جولی یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی کہ اُسے اس کی باتوں پر یقین نہیں آیا اور وہ ان باتوں کو محض اس کا ایک واہمہ ہی سمجھ رہا ہے۔

"کیا تمھیں یاد ہے کہ وہ آواز تم سے کیا کہہ رہی تھی؟" پال نے پُوچھا۔

اُس نے اپنی آنکھوں کے نمناک گوشے پُونچھ ڈالے۔ "یہ بھی عجیب بات ہے، پال!" وہ لرزتی ہُوئی آواز میں بولی۔ "مَیں نہیں جانتی کہ مجھ سے کیا کہا گیا ہے، یقیناً وہ ایک مردانہ آواز ہی تھی لیکن اس کے الفاظ ناقابلِ فہم تھے . . . مَیں تو آواز سُنتے ہی یوں محسوس کرنے لگی جیسے میرا دَم گھٹنے لگا ہو۔ میری گردن کے پٹھے یکایک اکڑ گئے تھے۔ مَیں اَب بھی گردن میں شدید اینٹھن محسوس کر رہی ہوں۔"

پال نے اُس کی گردن کا جائزہ لیا تو چونک پڑا۔ وہ بمشکل چونکنے کی یہ حالت جُولی سے چھپانے میں کامیاب رہا۔ جُولی کی گردن پر نیلی نیلی خراشیں موجود تھیں اور وہ گردن اکڑنے کے بارے میں جو شکایات کر رہی تھی، اس میں جھُوٹ کا شائبہ تک نہیں تھا۔ وہ اُسے مزید دہشت زدہ نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے اُس نے ان خراشوں کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ اُس نے جو کچھ دیکھا تھا، وہ جولی کی کہانی کو سچ ثابت کرنے کے لیے کافی تھا۔ بہرحال، اس نے سوچا، اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ ضرور ہونا چاہیے۔

نئے اُفق
آنچل
نیا رُخ
کے سول ایجنٹ برائے کراچی
مُحمّد حسین برادرس
فون نمبر ——— ۶۱۷۵۰۰
مُحمّدی بلڈنگ بلاک "ا" نارتھ ناظم آباد کراچی

"میرا خیال ہے کہ مجھے اس سلسلے میں جیمز سے بات کرنی چاہیے۔" پال نے کہا اور اپنی ساس کی طرف متوجہ ہوگیا۔ "آپ میرے شریکِ کار جیمز سے مِل چکی ہیں۔ وہ محض ایک ڈاکٹر ہی نہیں ہے۔ اس نے ہومیوپیتھی میں بھی مہارت حاصل کی ہے اس کے علاوہ ہپناٹزم میں بھی اُسے کمال حاصل ہے۔ وہ اس میدان میں کافی کام کر چُکا ہے۔ ممکن ہے، وہ ہماری کوئی مدد کر سکے۔"

جولی مزید دہشت زدہ ہوگئی۔ "اوہ، میرے خدا۔ پال، کہیں تم یہ تو نہیں سمجھ رہے کہ میں پاگل ہوگئی ہوں یا مجھے کوئی شدید نوعیت کا نفسیاتی عارضہ لاحق ہوگیا ہے؟"

پال نے اُسے تسلی دیتے ہُوئے کہا۔ "دیکھو جولی! اگر ایسی کوئی بات ہے بھی تو محض یہ ہوگی کہ کوئی چیز لاشعوری طور پر تمھیں پریشان کر رہی ہے... ممکن ہے، یہ بچّے کی پیدائش کا خوف ہو۔ وہ تمھیں ہپناٹائز کر کے اس چیز کا سُراغ لگالے گا۔ اس کا نظریہ ہے کہ خوف و دہشت کی بیشتر مثالیں، ماضی کے کسی بھولے بسرے حادثے کی مرہونِ منت ہوتی ہیں۔ میں اُس سے بات کرلوں گا۔ آخر اس میں حرج بھی کیا ہے؟"

جولی دِل سے اس خیال کی حمایت نہیں کر رہی تھی لیکن پال کا دِل رکھنے کے لیے اُسے ہامی بھرنی پڑی۔

"یہ سب کچھ مجھے بے حد عجیب اور ناقابلِ فہم لگ رہا ہے۔" وہ بجھے بجھے سے لہجے میں بولی۔ "لیکن میں سمجھتی ہُوں کہ اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ اوہ، ڈارلنگ! میں اس معاملے کی تہ تک پہنچنا چاہتی ہُوں۔ آخر یہ مجھے یکایک کیا ہوگیا ہے؟"

ڈاکٹر جیمز کو اگلے روز ڈنر پر بُلالیا گیا۔

◆

جُولی نے کوشش کی کہ اُسے وہ سب کچھ من و عن سُنا دے جو کچھ اس پُراسرار اسٹور میں اُسے پیش آیا تھا۔ ڈاکٹر جیمز بڑی خاموشی اور تحمل سے اس کی ایک ایک بات سُن رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کر کے کچھ پوچھ بھی لیتا تھا۔ جولی کو یہ محسوس کر کے سکون کا احساس ہُوا کہ جیمز نہ صرف اس کی باتوں پر یقین کر رہا ہے بلکہ وہ اس مسئلے پر بڑی سنجیدگی سے کام بھی کرنا چاہتا ہے۔

"میں اس نتیجے پر پہنچا ہُوں۔" اُس نے بالآخر کہا۔ "تمھارے بچپن میں کوئی ایسا حادثہ پیش آیا ہے، جسے شعوری طور پر تم بالکل ہی بھلا چکی ہو لیکن اس کی جڑیں ابھی تک تمھارے لاشعور سے چپکی ہوئی ہیں... ممکن ہے، تمھاری حالیہ کیفیت..." وہ اس کی طرف دیکھ کر نرمی سے مُسکرانے لگا۔ "ہوسکتا ہے، اس حالت میں، تم جذباتی طور پر منتشر ہوگئی ہو۔"

جولی نے کوئی جواب نہ دیا۔ بھلا وہ کہتی بھی تو کیا؟

"اگر تم مجھے، خود کو ہپناٹائز کرنے کی اجازت دے دو تو ممکن ہے، میں اس خوف کا سبب معلوم کرنے میں کامیاب ہو جاؤں۔ ایک بار وجہ معلوم ہوگئی تو اس کا علاج زیادہ دُشوار نہیں ہوگا۔"

جولی نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا جس نے اثبات میں سر ہلا کر اپنی رضامندی ظاہر کردی۔ جولی ڈاکٹر جیمز کی طرف متوجہ ہو گئی۔ "ٹھیک ہے۔" وہ ایک طویل سانس لے کر بولی۔ "لیکن اس بات کا خیال رکھنا کہ میں اس معاملے میں بے حد خوف زدہ ہُوں۔ ایسی چیزوں سے مجھے یوں بھی بہت خوف آتا ہے۔"

"نہیں... اس میں گھبرانے یا دہشت زدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں کیوں کہ یہ ایک سیدھا سادہ سا معاملہ ہے۔" ڈاکٹر جیمز نے اُسے اطمینان دِلایا۔ "تم آنکھیں بند کر کے سکون سے صوفے پر بیٹھ جاؤ اور آنکھیں بند کرلو۔"

جولی ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔

جیمز آہستہ آہستہ بولنے لگا۔ جولی کو اس کی آواز بے حد سکون بخش محسوس ہونے لگی۔ اس کی آنکھیں اب بھی بند تھیں۔

"تمھاری پلکیں اب بے حد بوجھل ہوگئی ہیں... تم غنودگی محسوس کر رہی ہو۔ یہ غنودگی بڑھتی جا رہی ہے... تمھیں نیند آ رہی ہے... تم سو رہی ہو... تم گہری نیند میں ڈوب رہی ہو۔"

جب اس نے جُولی کا ماضی ٹٹولنا شروع کیا تو جولی کے حلق سے ایک ٹھنڈی سانس نکل گئی۔ جیمز اُسے رفتہ رفتہ ماضی بعید کی طرف لے جا رہا تھا۔ وہ اُس سے ایسے سوالات کر رہا تھا۔ جن کا جواب وہ کسی ہچکچاہٹ کے بغیر دے سکتی تھی۔ کافی دیر بعد، وہ آہستہ آہستہ اُسے خیالوں کی دُنیا سے واپس حقیقت کی دُنیا کی طرف لے آیا۔

"مجھے افسوس ہے۔" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ "ہپناٹزم کے زیرِ اثر تم نے کوئی ایسی بات نہیں بتائی جس سے تمھاری الجھن کا سبب معلوم ہو سکے۔ اب میں صرف ایک ہی تجویز پیش کر سکتا ہُوں کہ ہم تینوں کو اس دُکان پر چلنا چاہیے جہاں تمھیں اس خوفناک تجربے سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ وہاں جا کر ہم دیکھیں گے کہ مزید کیا سامنے آتا ہے۔"

"تمھارا کیا خیال ہے، پال؟" جُولی نے پوچھا۔

"یہ تمھاری مرضی پر منحصر ہے، ڈارلنگ!... لیکن اگر تم واقعی اس معاملے کا سُراغ لگانا چاہتی ہو... اور ان پُراسرار جملوں کی وجہ جاننا چاہتی ہو تو تمھیں جیمز کی بات مان لینی چاہیے۔"

جولی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

●

اگلے روز لنچ کے وقت اُن تینوں کی ملاقات ہُوئی تو وہ اُسی اسٹور کے سامنے کھڑے تھے جس کے تہ خانے میں جُولی کو پُراسرار سرگوشیاں سُنائی دی تھیں۔ وہ اسٹور میں داخل ہُوئے اور سیدھے اس تہ خانے میں اُتر گئے۔ اُنھیں یہ دیکھ کر اطمینان کا احساس ہُوا کہ تہ خانے میں صرف ایک ہی گاہک موجود ہے اور وہ بھی بس واپس ہی جا رہا تھا۔ جب تک وہ آخری گاہک یعنی ایک خاتون، تہ خانے کی سیڑھیاں چڑھتی ہُوئی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوگئی، وہ اِدھر اُدھر پڑی اشیا کا جائزہ لینے میں مصروف رہے... پھر جُولی نے اُن کھلونوں کی طرف رہنمائی کی جن میں سے ایک نے گویا خوف ناک سرگوشیاں کی تھیں۔

"اوہ پال..." وہ کانپ کر بولی۔ "میں بے حد خوف زدہ ہوں۔"

"گھبرانے کی ضرورت نہیں، ڈارلنگ! میں، تمھارے ساتھ ہوں۔" پال نے کہا۔

جُولی کی ہمت فوراً ہی ٹوٹنے لگی کیوں کہ پال کا جُملہ ختم ہوتے ہی، اچانک اُسی خنک سے احساس نے اُس کی ہستی پر چھانا شروع کر دیا تھا۔ ٹھٹھرا دینے والا احساس اس کے قلب و ذہن پر حاوی ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی دہشت زدہ آنکھیں اپنے شوہر کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ اس نے پال کو پکارنا چاہا لیکن اس خوف ناک خواب کی سی حالت میں، اس کے حلق سے کوئی آواز نہ نکل سکی۔

وہی ناقابلِ فہم سرگوشی سُنائی دینے لگی۔ دھمکی آمیز اور کپکپی طاری کر دینے والے الفاظ اُس کے کانوں میں اُترنے لگے اور دل تک پہنچ کر نہ صرف اس کی دھڑکنیں تیز کرنے لگے بلکہ ان کے زیرِ اثر جُولی کا رُواں رُواں کانپنے لگا۔ اچانک وہ اپنے رُخساروں پر گرم گرم سانسیں محسوس کرنے لگی اور اس کے فوراً ہی بعد اس کے گلے پر دو نادیدہ ہاتھ جم گئے۔ ان ہاتھوں کی گرفت، ہر گزرتے ہُوئے لمحے کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی گئی۔ خون اُسے اپنی کنپٹیوں پر ٹھوکریں مارتا محسوس ہونے لگا۔ اس کے ذہن پر تاریکی، سیاہ برف کے گالوں کی طرح گرنے لگی اور دماغ ماؤف ہوتا چلا گیا حتیٰ کہ وہ بے ہوش ہو کر اپنے شوہر کی باہوں میں گر گئی۔

اسٹور کی جواں سال، سیلز گرل تہ خانے میں ہونے والے اس ڈرامے سے بے خبر رہی۔ اس نے جب دو مَردوں کو دیکھا تو بُری طرح چونک پڑی۔ وہ ایک نوجوان عورت کو سہارا دے کر اسٹور سے باہر لے جا رہے تھے۔

جولی بے حد خوف زدہ تھی اور اس کے حلق سے بار بار سسکیاں نکل رہی تھیں۔ مایوسی کی شدید حالت میں، وہ اپنے شوہر سے لپٹی ہُوئی تھی جو گھبرائے ہُوئے انداز میں اُسے تسلی دینے کی کوشش کر رہا تھا حالانکہ صاف نظر آ رہا تھا کہ خود اُسے بھی تسلی کی شدید ضرورت پڑ گئی ہے۔

وہ اُسے لے کر سیدھے گھر پہنچے اور جیمز نے اپنے کلینک فون کر دیا۔ اس نے چند ضروری اقدامات کیے تاکہ پال کے ساتھ جولی کی دیکھ بھال کر سکے۔

●

وہ جیمز کی طرف رحم طلب نِگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اُسے اس ذہین شخص پر بے حد اعتماد تھا۔ "پلیز... جیمز... میری مدد کرو۔ خُدا کے لیے کچھ کرو... میں زیادہ عرصے تک یہ صورتِ حال برداشت نہیں کر سکتی۔"

جُولی جس تجربے سے دوچار ہُوئی تھی، اس کے اثرات دیکھتے ہُوئے ڈاکٹر جیمز نے دوبارہ ہپناٹائز ہونے کی تجویز پیش کر دی... اور اس بار وہ نسبتاً زیادہ گہرائی میں جانے کی کوشش کرنے لگا۔ جُولی مایوسی کی انتہا تک پہنچ چکی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ کچھ بھی کیا جائے لیکن اُسے اس خوف ناک صورتِ حال سے نجات دِلا دی جائے۔

جیمز نے اُسے اطمینان دِلایا کہ جلد ہی سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا... اور پھر اس کی نرم اور ہمدرد آواز کے جادو نے جُولی کے اعصاب پُرسکون کرنے شروع کر دیے۔ وہ اس کے یومِ پیدائش تک جا پہنچا... پھر اُس نے پیدائش سے پچاس سال پہلے کا عرصہ ٹٹولنا شروع کر دیا حتیٰ کہ وہ پُوری ایک صدی پر محیط ہوگیا۔ بالآخر اُس نے بڑی ہی عجیب آواز میں پُوچھا۔ "اب تم کہاں ہو؟ اور تم کیا کر رہی ہو؟"

صوفے پر ہپناٹزم کے زیرِ اثر محوِ خواب جولی بولنے لگی لیکن یہ جولی کی آواز نہیں تھی۔ اس آواز میں انتہائی ناقابلِ فہم سا تاثر گھلا ہُوا تھا۔

"شام ہو چکی ہے... مجھے چھٹی ہوگئی ہے... میں ٹہلنے کے ارادے سے باہر نکل آئی ہوں... لیوک! میں تمھیں پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ تمھارے ساتھ وہاں نہیں جاؤں گی۔ مجھے یہ بھی یقین نہیں کہ تم نے ان پُرانے زینوں کے نیچے میری، سانپ کی چھتریاں ڈھونڈ نکالی ہیں۔ مجھے میری مرضی پر چھوڑ دو... کیوں کہ میں تمھارے بارے میں سب کچھ سُن چکی ہوں لیوک ویلس... میرے خُدا... میں تمھاری طرف دوسری بار نہیں دیکھنا چاہتی۔

تمھارے . . . وہ خوف ناک مُسّے میرے لیے بے حد قابلِ نفرت ہیں۔ ان بڑے بڑے مسّوں کو دیکھ کر میں خود کو بیمار محسوس کرنے لگتی ہُوں . . . اوہ، مجھے جانے دو . . . مجھے چھوڑ دو . . . مَیں کہتی ہُوں مجھے چھوڑ . . .!"

جولی یکایک صوفے پر یُوں لوٹنے لگی جیسے کسی نادیدہ حملہ آور کے خلاف بھرپُور دفاع کر رہی ہو۔ جیسے اس کی گرفت سے نکلنے کے لیے مچل رہی ہو۔

"مجھے تنہا چھوڑ دو . . . تم . . . تم کیا کر رہے ہو . . . مجھے جانے دو . . . ذلیل . . . کمینے . . . خود پر قابو پانے کی کوشش کرو . . . اوہ، میرے خُدا . . . نہیں . . . مدد . . . کوئی میری مدد کرے . . . نہیں . . . نہیں . . . پلیز!"

جُولی کی چیخ و پکار اتنی تیز ہو گئی کہ کمرے میں موجود جیمز اور پال کے کانوں کے پردے پھٹنے لگے۔ وہ بُری طرح تڑپ رہی تھی . . . ہاتھ پاؤں مار رہی تھی . . . خود کو کسی کی گرفت سے نکالنے کی جدوجُہد کر رہی تھی . . . اچانک ہی اس کی چیخیں دَم توڑ گئیں اور کمرہ گہرے سکوت میں ڈوب گیا۔

پال اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اس کا چہرہ راکھ جیسی رنگت اختیار کر چُکا تھا۔ "میرے خُدا!" وہ ہانپ کر بولا۔ "جیمز! تم نے اسے کیا کر دیا ہے؟ کیا یہ ٹھیک ہے؟"

جیمز کے چہرے پر اَب اطمینان جھلک رہا تھا۔ "سب ٹھیک ہے، پال۔ سب کچھ ختم ہو گیا۔" وہ جولی کی طرف متوجہ ہُوا اور بڑی ہی نرمی سے بولا۔ "میں اَب تمھیں جگانے جا رہا ہوں، جولی! بالکل اُسی طرح جیسے پہلے جگایا تھا۔ مَیں دس کی اُلٹی گنتی کروں گا اور گنتی ختم ہوتے ہی تم بیدار ہو جاؤ گی۔ دس . . . نو . . . تمھارے پپوٹوں کا بھاری پن ختم ہو رہا ہے . . . آٹھ . . . سات . . . تمھارے پپوٹے ہلکے ہوتے جا رہے ہیں . . ."

. . . وہ ضبط کی انتہائی حالت کا مظاہرہ کرتے ہُوئے بولتا رہا۔ ٹھہری ہُوئی آواز، پُرسکون لہجہ اور سکون بخش الفاظ رفتہ رفتہ جُولی کو دوبارہ عالمِ حقیقت میں لے آئے۔ وہ ایک طویل سانس لے کر بیدار ہو گئی۔ اس نے ان دونوں کی طرف دیکھا اور مُسکرانے لگی۔ پال اُس کے قریب بیٹھا ہُوا تھا اور اس نے جُولی کے کندھے تھام رکھے تھے۔ چند منٹ قبل جو ڈرامائی صُورتِ حال پیش آئی تھی، اُس کا ہلکا سا تاثر بھی اُس کے چہرے پر موجود نہیں تھا۔ پال نے اُسے بتایا کہ تنویمی نیند کے دوران کیا صورتِ حال پیش آئی تھی۔ وہ بے یقینی سے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کے انداز سے شدید اُلجھن کا اظہار ہو رہا تھا۔ پال نے اس کی گردن کا جائزہ لیا تو وہاں خراشوں کا نام و نشان تک نہیں تھا۔

ڈاکٹر جیمز نے اس صورتِ حال کی وضاحت کرتے ہُوئے بتایا کہ ایسا کیوں کر ہُوا ہے۔ "مجھے اَب تک کی زندگی میں کبھی کسی ایسے کیس سے دوچار نہیں ہونا پڑا۔ بہر حال، گزشتہ چند سالوں میں تجسیمِ نو کے سلسلے میں کافی تحقیقی کام ہُوا ہے۔ اگرچہ دُنیا کے بعض مذاہب اس فلسفے کی سختی سے تردید کرتے ہیں اور بعض اس کی شدید حمایت بھی کرتے ہیں۔ اس سے قطع نظر دُنیا میں ایسے واقعات ہو چُکے ہیں۔ کئی لوگوں نے یہ دعوا کیا کہ وہ اپنی موجودہ زندگی سے پہلے بھی کسی اور حیثیت سے زندگی گزار چکے ہیں۔ مجھے توقع ہے کہ تمھیں ایسے واقعات کا علم ہو گا کہ بعض لوگوں نے بعض ایسے مقامات کے سلسلے میں بھرپور معلومات کا اظہار کیا ہے، جہاں وہ زندگی میں پہلے کبھی نہیں گئے۔"

"لیکن میرے ساتھ کیا معاملہ تھا، جیمز؟" جُولی نے اُلجھن سے کہا۔

"مَیں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک قدیم یادتھی جو ماضی سے حال میں دَر آئی اور اتفاق سے تم ہی سب سے پہلے اس کا شکار ہو گئیں۔ تم اس جگہ جا پہنچیں جہاں ایک صدی پیشتر کوئی خوف ناک حادثہ ہُوا تھا۔"

جُولی اور پال حیرت اور بے یقینی سے سُنتے رہے۔

"تنویمی نیند کے تحت، تمھارے لاشعور نے بالآخر یہ حقیقت مجھ پر ظاہر کر دی اور یُوں اس خوف ناک صُورتِ حال سے تمھارا پیچھا چھُوٹ گیا۔"

جُولی اَب تک اُلجھن میں مبتلا تھی۔ "جو کچھ تم کہہ رہے ہو، اگر یہ دُرست ہے، جیمز! تو مَیں اس تجسیم میں کیا تھی؟ اور تمھارے خیال میں تب، درحقیقت میرے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا تھا؟"

جیمز چند لمحوں تک غور و فکر میں ڈُوبا رہا . . . پھر اُس نے کہا۔ "مَیں بھی یہ جاننے کے لیے بے چین ہُوں جُولی لیکن اس کے لیے تھوڑی سی مہلت دو۔ مَیں اس کا سُراغ لگانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔"

●

ہفتے کی شام ڈنر ٹیبل پر ڈاکٹر جیمز کا چہرہ فاتحانہ تاثرات سے کھلا ہُوا تھا اور اس کے ہونٹوں پر مُسکراہٹیں مچل رہی تھیں۔ جُولی اور پال سمجھ گئے کہ وہ معاملے کی تہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو چُکا ہے۔

"مَیں نے گزشتہ تین روز لوکل لائبریری میں بہت مصروف گزارے ہیں۔ وہاں کرونیکل کے تمام شماروں کی مائکروفلمیں موجود ہیں . . . اور یہ ریکارڈ گزشتہ ایک صدی پر محیط ہے۔ مَیں نے اندازے سے اس تاریخ کی فلم نکلوائی، جب وہ حادثہ پیش آیا ہو گا، تھوڑی سی محنت کے بعد مَیں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا . . .

لیکن دوستو! معاملہ بڑا ہی دہشت ناک اور افسوسناک ہے۔"

جُولی کا کانپتا ہُوا ہاتھ اپنے شوہر کے ہاتھ کا سہارا تلاش کرنے لگا۔

"بولو جیمز . . . خُدا کے لیے اس اسرار سے پردہ ہٹا دو . . ." وہ منمنائی۔

"خیر . . ." جیمز ایک طویل سانس لے کر بولا۔ "آج کل جہاں وہ بے بی شاپ بنی ہُوئی ہے، ایک صدی قبل وہاں ایک مکان ہُوا کرتا تھا جس میں ایک بڑا خاندان رہائش پذیر تھا۔ تم جس تہ خانے میں گئی تھیں، وہ اُس زمانے میں بھی تہ خانہ ہی تھا۔ ایک شب خاندان کا ایک نوجوان اور وہاں کی نوعمر ملازمہ کا وہاں آمنا سامنا ہو گیا . . . لڑکا اوباش تھا اور اس وقت نشے میں دُھت تھا۔ اس سے قبل بھی وہ خواتین کی آبرو ریزی کی کئی وارداتوں میں ملوّث رہ چُکا تھا اس لیے ملازمہ اُس سے ہمیشہ دُور ہی رہتی تھی۔ جب لڑکے نے پیش قدمی کی تو ملازمہ نے اپنے دفاع کے لیے ہر جتن کیا۔ اس پر لڑکا چراغ پا ہو گیا اور شدید غصّے کی حالت میں اس کے دونوں ہاتھ نوعمر ملازمہ کی گردن پر جم گئے۔"

جُولی سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔ "اور اس لڑکے کا نام لیوک ویلس تھا؟" اس نے لرزتی ہُوئی آواز میں پُوچھا۔

جیمز نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "ہاں۔ یہ دُرست ہے۔ وہ اس علاقے میں خوب جانا پہچانا تھا کیوں کہ اس کے دونوں ہاتھوں کی پُشت پر بڑے بڑے اَن گنت، خوف ناک مُسّے تھے۔ ملازمہ ان مسّوں سے کراہیت محسوس کرتی تھی۔ بہرحال، وہ اسی تہ خانے میں ہلاک ہو گئی۔ کئی ہفتے بعد سُراغ لگا تو اُسے مقدمے کے انجام پر پھانسی کی سزا دے دی گئی۔ اس نے بالآخر اقبالِ جُرم کر لیا تھا . . . جب یہ اسکینڈل دم توڑ گیا تو کسی مسخرے نے اس گلی کا نام ویلس اسٹریٹ رکھ دیا۔ آج بھی وہ بازار، ویلس اسٹریٹ ہی کہلاتا ہے۔"

جُولی کو یُوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ حقائق سُن کر اس کا دماغ گھوم گیا ہو۔ وہ تصوّر کی آنکھ سے نوعمر ملازمہ کا حشر دیکھ رہی تھی۔ بالفاظِ دیگر یہ اس کی سابق شخصیت تھی جس کی اس انداز میں دھجیاں بکھر گئی تھیں۔

"جیمز! تم نے جو کچھ بھی کیا، اس کے لیے مَیں تمھاری شُکر گزار ہوں۔" وہ خود پر قابو پاتے ہُوئے بولی۔ "تم شاید اندازہ بھی نہ لگا سکو کہ تمھاری اس وضاحت کے بعد میں خود کو کس قدر پُرسکون محسوس کرنے لگی ہُوں۔"

. . . لیکن اس کے باوجود جُولی کو ابھی ایک اور امتحان سے گزرنا تھا۔ وہ پُوری طرح یقین کر لینا چاہتی تھی کہ اس بھُوت سے اس کا پیچھا ہمیشہ کے لیے چھُوٹ چُکا ہے . . . اور یہ امتحان تھا۔ ایک بار پھر اُسی بے بی شاپ میں جانا۔

وہ اس کے لیے تیار ہو گئی۔

▼ ▼

بے بی شاپ کے باہر کھڑے کھڑے، وہ ایک بار پھر خوف و ہراس اور بے چینی محسوس کرنے لگی۔ اُسے خود کو سنبھالنے کے لیے، پال کا ہاتھ تھام لینا پڑا۔

"پال . . ." اُس نے بھرّائی ہُوئی آواز میں کہا۔ "اگر وہ سب کچھ ایک بار پھر شروع ہو گیا تو کیا ہو گا؟ مَیں اسے برداشت نہیں کر سکوں گی اور . . ." یہ کہتے کہتے اس کے ذہن میں وہ قاتل نوجوان گھُوم گیا جس کے ہاتھوں کی پُشت پر بدنُما مُسّے تھے اور وہ سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔ "یقین کرو پال!" اس نے لرزیدہ لہجے میں سرگوشی کی۔ "مَیں اسے برداشت نہیں کر سکوں گی۔"

پال نے اُسے تسلّی دی کہ اَب ایسا نہیں ہو گا۔

. . . اور پھر پال کا خیال دُرست ہی ثابت ہُوا۔ چند منٹ بعد جب وہ تینوں تہ خانے سے نکل کر باہر سڑک پر آئے تو مارے خوشی کے، جُولی بچّوں کی طرح خوش ہو ہو کر کبھی تو پال سے لپٹتی تھی اور کبھی جیمز کا ہاتھ تھام کر جھُول جاتی تھی۔ راہ گیر اُس کی یہ حالت دیکھ کر مُسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

"سب کچھ ختم ہو گیا۔" وہ چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔ "مصیبت ٹل گئی۔ اَب سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

خوف و ہراس کی ویسی حالت اُس پر دوبارہ کبھی طاری نہ ہُوئی اور کرسمس کے موقعے پر اُس نے ایک خوب صورت بچّے کو جنم دیا . . . لیکن نرسیں حیران و ششدر تھیں کہ یہ نوعمر عورت کتنی سنگ دِل ہے جس نے اپنے نوزائیدہ بچّے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ ایک مکمل بچّہ تھا اور اس کی صورت بہت ہی پیاری تھی لیکن سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اُس کے ہاتھوں کی پُشت پر، پیدائشی نشانات جیسے سیاہ مُسّے تھے . . . بدنُما سیاہ مُسّے۔

ماں کی آغوش بیٹے کے لیے ترس رہی تھی لیکن
اس کے مجازی خدا نے بیٹے کو ایک عفریت
میں بدل دیا تھا، ایک دلچسپ تخیل

آغوش

اقبال کاردار

”لیکن میں تو مر چکا تھا“، اُس نے اپنے آپ سے کہا۔

اُس کا باپ سامنے کھڑا اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ اُس کا چہرہ جذبات و احساسات سے بالکل عاری تھا۔ وہ اپنے بیٹے کے بستر کے قریب کھڑا تھا۔

لیکن یہ بستر تو نہیں تھا۔

اُس نے باپ کے چہرے سے نظریں ہٹالیں اور اپنے پلنگ کی طرف دیکھا۔ مگر یہ پلنگ نہیں تھا۔ یہ تو اُس کے باپ کی تجرباتی میز تھی۔ گویا وہ لیبارٹری میں تھا۔

اُس نے ایک بار پھر اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ اُسے اپنا وجود بھاری اور سخت محسوس ہو رہا تھا۔

”یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟“ اُس نے اپنے آپ سے پوچھا۔

لیکن یہ کیا۔۔۔؟ اُس کی آواز کو کیا ہو گیا ہے؟ یہ ایک دم سے کیوں بدل گئی ہے؟ میں اپنی آواز کو خوب پہچانتا ہوں۔ یہ آواز میری نہیں ہے، اُس نے سوچا۔ یہ آواز کسی انسان کی آواز تو نہیں ہے۔۔۔!

”اشوک بیٹے۔۔۔!“ اُس کے باپ نے آہستہ سے کہا۔ ”اشوک بیٹے، مجھے معلوم ہے کہ تم مجھے کبھی معاف نہیں کرو گے کیوں کہ میں نے کام ہی ایسا کیا ہے۔ تم مجھ سے یقیناً نفرت کرنے لگو گے خود مجھے بھی اپنے آپ سے نفرت ہو گئی ہے۔“

لیکن اشوک نے اپنے باپ کی باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ اپنے ہی خیالوں میں گم تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اُس کا وجود اتنا بوجھل کیوں ہو گیا ہے۔۔۔؟ اور وہ سر اُٹھانے سے قاصر کیوں ہے؟

”مجھے آئینہ چاہیے۔“ اُس نے کہا۔

لیکن یہ کیسی آواز تھی! ایک ناگوار سا شور!

اُس پُرشور آواز پر وہ کانپ سا گیا۔

”یقین جانو اشوک بیٹے، میں قطعی بے قصور ہوں۔“ اُس کے باپ نے کہا۔ ”مجھے سمجھنے کی کوشش کرو میرے بیٹے، میں نے جو کچھ کیا ہے تمہاری۔۔۔“

”مجھے آئینہ چاہیے۔ آئینہ!“

اُس کے باپ نے کوئی جواب نہ دیا اور پل بھر کے توقف کے بعد لیبارٹری سے نکل گیا۔

اشوک نے اٹھ بیٹھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ ”یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟ مجھ سے اُٹھا کیوں نہیں جاتا؟“ اس نے خود سے سوال کیا۔

اُس نے ایک بار پھر اُٹھنے کی کوشش کی اور اس مرتبہ کامیاب ہو گیا لیکن اُٹھتے وقت اُسے یوں لگا جیسے اُس کے بجائے کمرہ حرکت پذیر ہو۔ اُسے یہ تو پتہ تھا کہ وہ میز پر بیٹھا ہوا ہے لیکن اُٹھنے بیٹھنے کے درمیان جو حرکت کا مختصر سا احساس ہوتا ہے، وہ یکسر غائب تھا۔

”سمجھ میں نہیں آتا یہ سب کیا ہے؟“ اشوک نے سوچا۔ ”میرے ساتھ کیا گڑبڑ ہے، کون سی خرابی آگئی ہے مجھ میں، میرے اعصاب کو کیا ہو گیا ہے؟ میری حرکات و سکنات کا ان پر کوئی اثر کیوں نہیں ہوتا۔۔۔؟“

اُس نے نظریں جھکا کے دیکھنے کی کوشش کی اور اُسی دم اُس کا باپ آئینہ لیے کمرے میں واپس آگیا۔

لیکن اب اُسے آئینے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اُس نے اپنے ہاتھ دیکھ لیے تھے۔

دھات سے بنائے گئے ہاتھ!

دھاتی بازو۔۔۔ دھاتی شانے۔ دھاتی سینہ، دھاتی گردن۔ دھاتی ٹانگیں اور دھاتی پاؤں اور دھاتی انسان!

یہ حقیقت روشن ہوتے ہی وہ لرز کر رہ گیا لیکن فلزاتی جسم پر کوئی اثر نہ ہوا۔ احساسات کی لہریں اس میں سرایت نہ کر سکیں۔

وہ خاموش بیٹھا رہا۔

اور اُس کا جسم۔۔۔؟ دھات کا جسم۔ فلزاتی وجود ہر احساس سے عاری تھا۔

اُس نے اپنی آنکھیں بند کرنا چاہیں لیکن نہ کر سکا۔ وہ آنکھیں اُس کی نہ تھیں۔ کچھ بھی تو اُس کا نہیں رہا تھا۔

اب وہ محض ایک روبوٹ تھا، ایک مشینی انسان تھا۔

*

اُس کا باپ تیزی سے اُس کے قریب آیا۔

”یقین کرو اشوک، میں یہ سب کچھ نہیں کرنا چاہتا تھا۔“ اُس کے باپ نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”میں بالکل بے خطا ہوں میرے بیٹے۔ یہ سب کچھ تمہاری ماں کی ضد کا نتیجہ ہے۔ اُسی نے مجھے اس کام پر مجبور کیا تھا۔“

”ماں۔۔۔؟“ مشین کی کھوکھلی آواز اُبھری۔

”تمہاری ماں کا اصرار تھا کہ وہ تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔“ اُس کے باپ نے کہا۔ ”یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ وہ تمہیں کتنا چاہتی ہے۔“

”مجھے چاہتی ہے؟“ مشین کی صدائے بازگشت دھاتی وجود سے ٹکرا کر رہ گئی اور اُس نے اپنا مُنہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اُس کا دھاتی بدن مخصوص انداز سے حرکت کر رہا تھا۔ حرکت پذیر مشین کی آواز اشوک کے دھاتی نیچوں سے متصادم ہو رہی تھی۔

”تو آپ نے مجھے مرنے نہیں دیا؟“ مشین کے اندر سے مدھم سی آواز اُبھری۔

اُس کا ذہن بھی میکانکی ہوتا جا رہا تھا۔ اُسے یہ جان کر بہت دُکھ ہوا تھا کہ اُس کا اپنا جسم ہمیشہ کے لیے اُس سے بچھڑ گیا ہے اس صدمے نے اُس کا ذہن مسلوب سا کر دیا۔

”میں لوٹ آیا ہوں،“ اُس نے سوچا۔ ”لیکن کیوں؟“ اُس نے سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

لیکن اُس کے باپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اُس نے ٹیبل سے اترنے کی کوشش کی لیکن اُس کے بازوؤں میں کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی . . . . پھر ہلکی سی ٹک ٹک ہوئی تو اُس کے بازو اور شانے اُوپر اُٹھ گئے۔ وہ اپنی چھوٹی چھوٹی بلوری آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ ذہن کی مدد سے اُسے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ بازو اور شانے واقعی حرکت پذیر ہوئے ہیں۔

یک بارگی اُسے یوں لگا۔ جیسے اُس کے دماغ میں آگ سی دہک اُٹھی ہو۔

"لیکن میں تو مر چکا ہوں . . ." اُس نے پوری قوت سے چیخنا چاہا لیکن یہ چیخ نہ جانے کہاں گھُٹ کے رہ گئی تھی۔ اُس کے ذہن نے بتایا کہ اب تُو چیخنے پر بھی قادر نہیں ہے، چیخنے کی کوشش میں جو آواز اُس کے حلق سے نکلی وہ بہت ہی نرم تھی اور جھنجلاہٹ کے باوجود اُس میں غصّے کی ہلکی سی بھی آمیزش نہ تھی:

"تم زندہ ہو اشوک،" اُس کے باپ نے کہا۔ "تم نہیں مرے، تمھارا جسم مرا ہے۔"

"نہیں . . . میں مر چکا ہوں،" اُس نے ایک بار پھر چیخنا چاہا . . . لیکن مشین نے اُس کا ساتھ نہیں دیا۔ اس کی چیخ کو مدھم سی آواز میں بدل دیا گیا تھا۔ اُس کے دماغ نے سمجھایا، چیخنے کی کوشش بے سود ہے۔ مشین بول تو سکتی ہے، چیخ نہیں سکتی۔

اُس کے ذہن میں ایک طوفان سا اُٹھنے لگا تھا۔ اپنی ہیئت کی اس بھیانک تبدیلی پر اُس میں ایک ہیجان سا پیدا ہو چلا تھا یہ انہونی کایا پلٹ اُس کے ذہن کو مضطرب کیے دیتی تھی۔

"تو یہ میری ماں کی خواہش تھی؟" اُس نے اپنے آپ سے کہا اور مشین کے اندر گونجنے والی آواز نے اُسے خوف زدہ سا کر دیا لیکن خوف کی یہ لہریں صرف دماغی نسیجوں نے محسوس کی تھیں۔

اُس کے باپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ غم زدہ سا خاموش کھڑا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں گہرے غم و اندوہ کی پرچھائیاں سی تیر رہی تھیں اور چہرے پر حزن و ملال کی زردی سی کھنڈ گئی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اُس کی شب و روز کی محنت یکسر رائگاں گئی ہے اُسے اپنی بیوی کی ضد کے آگے یوں مجبور نہیں ہو جانا چاہیے تھا۔

مشینی اشوک دھیرے دھیرے حرکت کرتا ہوا کھڑکی کے قریب پہنچ کے رُک گیا تھا اور ڈاکٹر کیدار شرما نے اپنے بیٹے کے مشینی جسم کو . . . حسرت آلود نظروں سے دیکھا۔

"کیا میں نے اپنے بیٹے کو زندہ کر لیا ہے؟" ڈاکٹر شرما نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔ "نہیں، اُسے زندہ نہیں کہا جا سکتا۔" اُس نے خود کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ "کیا زندگی محض دماغ ہی کے زندہ رہنے کا نام ہے؟ نہیں۔ میں نے صرف اپنے بیٹے کے دماغ ہی کو زندہ رکھا ہے کاش میں اس کے جسم کو بھی زندہ رکھ سکتا . . .! اب وہ محض ایک روبوٹ یا مشینی انسان ہے، ایسا مشینی . . . انسان جس کی دھاتی کھوپڑی میں انسانی دماغ بند ہے۔ میرا بیٹا مر چکا ہے۔"

اشوک نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ دماغ نے بتایا، "یہ یونیورسٹی کیمپس ہے۔ وہی یونیورسٹی کیمپس جہاں وہ انگریزی ادبیات کا استاد تھا۔

"آج کیا دن ہے . . .؟" اُس نے پوچھا۔

"آج سنیچر ہے،" اُس کے باپ نے جواب دیا۔ "آج مارچ کی دس تاریخ ہے اور شب کے دس بجے ہیں۔"

"سنیچر . . .؟"

"ہاں . . . اور یہ حادثہ سوموار کو پیش آیا تھا۔ میں نے اُسی روز سے تمھارے جسم کی تشکیل شروع کر دی تھی۔"

"سوموار . . .!" اُس نے طنزیہ لہجے میں کہنے کی کوشش کی مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔ مشین احساسات کے تابع نہیں ہوتی۔

"مجھے یاد ہے۔ میں نے سوموار ہی کو خودکشی کی تھی۔"

□

اُس کا باپ ایک سرد آہ بھر کے رہ گیا اور اپنے بیٹے کی طرف افسردہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ اُسے اپنی بے بسی پر رونا آ رہا تھا۔ اُس کی تمام تر محنت اور فنی مہارت ناکامی اور کامیابی کے درمیان معلق ہو کے رہ گئی تھی۔ اُس کا بیٹا زندگی اور موت کے درمیان منجمد ہو کے رہ گیا تھا۔

ڈاکٹر کیدار شرما نے اپنے بیٹے کو موت کی آغوش سے کھینچ لینا چاہا تھا لیکن وہ اس میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکا انسان دو حصّوں میں بٹ گیا۔ جسم فنا کی آغوش میں جا سویا اور دماغ بقا کی گود میں پڑا رہا۔

"کیا مجھے اس حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہیے کہ میں موت کو شکست نہیں دے سکا؟" ڈاکٹر شرما نے خود سے پوچھا۔ "نہیں، نہیں۔ میں موت سے نہیں ہارا۔" وہ اپنی انا کو تسکین دیتے ہوئے بولا۔ "میں نے اپنے بیٹے کا دماغ تو مرنے نہیں دیا۔ تو کیا میرا بیٹا زندہ ہے؟ نہیں نہیں، یہ محض خود فریبی ہے۔ انسان محض جان کا نہیں، جسم و جان کے مجموعے کا نام ہے . . . دماغ، وجودِ انسانی کا محض ایک جزو ہے اور کوئی بھی جزو اپنے کل کا بدل نہیں ہو سکتا۔ بالکل اسی طرح جیسے انسان کائنات کا ایک جزو ہے کائنات نہیں ہے اور کائنات بھگوان کی فکر کا ایک جزو ہے بھگوان نہیں ہے تو کیا میں اپنی ذات کو دھوکا دے رہا ہوں۔ شاید . . ." اُس نے جھنجلا کر سر جھٹک دیا۔

مشینی اشوک اب بھی کھڑکی کے پاس کھڑا تھا۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ ماں نے اُسے کیوں مرنے نہیں دیا؟ لیکن مجھے زندہ بھی تو نہیں کہا جا سکتا . . .؟ میرے ماں باپ نے مجھے عذابِ الیم میں مبتلا کر دیا ہے۔ زندگی سے چھٹکارا پانا آسان ہے مگر اس زنداں سے فرار ناممکن ہے۔ ایسا زنداں جو زندگی اور موت کے سنگم پر معلق کر دیا گیا ہے۔

اس ہولناک تصوّر پر وہ حلق پھاڑ کے چیخا۔

مگر یہ حلق گوشت پوست کا نہیں، اسٹیل کا تھا سو چیخ گھُٹ کے رہ گئی۔ اس بے بسی پر اشوک کے دماغ میں بھنور سے پڑنے لگے اور جی چاہا کہ اپنے باپ کا گلا گھونٹ کر رکھ دے۔ اُسے اپنی ماں پر بھی بہت غصّہ آیا کہ اُس نے اپنی محبت کی آڑ میں اسے جہنم میں جھونک دیا ہے۔ "اس زندگی میں رکھا ہی کیا ہے؟" اُس نے اپنے آپ سے کہا۔ "جب اُوشا ہی نہ رہی تو زندگی سے محبت کیسی؟"

اُوشا اس کی محبوبہ کا نام تھا جس سے وہ محض اس لیے شادی نہیں کر سکا تھا کہ اس کی ماں کو وہ لڑکی پسند نہ تھی اور جس کے غم میں اُس نے خودکشی کر لی تھی۔

"یقین کرو اشوک کہ میں نے یہ سب کچھ اپنی مرضی سے نہیں کیا،" اُس کے باپ نے قریب آتے ہوئے کہا۔ "میں نے تمھاری ماں کی خواہش پوری کی ہے۔"

اشوک نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس کی بلوری آنکھیں اب بھی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھیں۔

"میں نے تمھاری ماں سے وعدہ کیا تھا کہ میں اشوک کو مرنے نہیں دوں گا،" اُس کے باپ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اگر میں ایسا نہ کرتا تو وہ پاگل ہو جاتی۔"

"آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ آپ نے یہ سب کچھ محض تجرباتی نقطۂ نظر سے کیا ہے۔" اشوک نے کہا۔ "میں مرنا چاہتا ہوں میرا دماغ نکال لیجیے۔ میں اس زنداں میں نہیں رہنا چاہتا۔"

"نہیں، میں ایسا نہیں کر سکتا،" اُس کے باپ نے جواب دیا۔

"مجھے ایسی جامد و ساکت زندگی نہیں چاہیے۔" اشوک نے کہا۔

"مجھے سمجھنے کی کوشش کرو، بیٹے ابھی تو . . ."

"ابھی تو آپ کو مزید تجربات کرنا ہیں مجھ پر . . .؟"

"میں تمھاری ماں کو دکھانا چاہتا ہوں کہ میں نے اُس کے بیٹے کو نئی زندگی دی ہے۔"

"آپ کو میری ماں سے کوئی محبت نہیں۔"

"اگر اُس نے اجازت دی تو میں تمھارا دماغ نکال لوں گا۔" ڈاکٹر شرما نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"بصورتِ دیگر میں اپنا دماغ خود نکال پھینکوں گا۔" اور اُس کے دھاتی ہاتھ دھیرے دھیرے اُٹھنے لگے۔

"تم ایسا نہیں کر سکتے،" اُس کا باپ چیخا۔ "میں تمھیں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔"

"ہٹ جاؤ۔" مشین نے چیخنے کی کوشش کی مگر یہ چیخ ایک بار پھر گھُٹ کے رہ گئی۔

▼ ▼

"کیا میں آپ کو قتل کر سکتا ہوں؟" اشوک نے دھیرے سے کہا۔ اُس کے دھاتی ہاتھ باپ کے شانوں تک پہنچ چکے تھے۔

"ہاں، تم چاہو تو مجھے گلا گھونٹ کر قتل کر سکتے ہو۔" ڈاکٹر شرما نے اپنے مشینی بیٹے سے کہا۔

اور مشین کے تمام پُرزے دھیرے دھیرے واپس گھومنے لگے اُٹھے ہوئے دھاتی بازو آہستہ آہستہ نیچے آتے گئے اور . . . زندہ و بیدار انسانی ذہن میں اطاعت و محبت کی لہریں سرایت کرنے لگیں۔

"آپ کا تجربہ کامیاب رہا ہے۔" مشین کے حلق سے ہلکی سی آواز اُبھری۔ "آپ نے اپنے ہی بیٹے کو مشین میں تبدیل کر دیا؟"

اور ڈاکٹر شرما خاموش کھڑا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں حزن و ملال کے بادل سے تیرنے لگے تھے۔

"آپ نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے ڈیڈی۔" مشین بولی۔ "اب تو آپ کو نوبل پرائز سے نوازا جانا چاہیے۔ انسان کو مشین میں تبدیل کر کے آپ نے تو بھگوان کو بھی شرمندہ کر دیا ہے۔"

"اپنی ماں سے نہیں ملو گے؟" ڈاکٹر شرما نے آزردہ لہجے میں کہا۔

لیکن اشوک نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اپنے مشینی جسم کو حرکت دیتا ہوا دیوار گیر آئینے کے مقابل جا کھڑا ہوا۔ اپنے سراپا پر نظر پڑتے ہی اس کا جی چاہا کہ اپنے دماغ کو نوچ پھینکے۔ یہ مشینی جسم بے ساختہ بھدا اور بھیانک لگتا تھا۔ نہ مُنہ، نہ ہونٹ، نہ ناک اور نہ رخسار۔ سپاٹ پلیٹ پر جھلملاتی ہوئی دو بلوری آنکھیں۔ ٹوکری جیسا سر اور

جا بجا اسکرو جڑے ہوئے تھے۔

"کیا میری ماں نے یہی چاہا تھا کہ اُس کے بیٹے کو مشین میں تبدیل کر دیں۔" مشین بولی "آپ جھوٹ بولتے ہیں۔" اُس نے حقارت سے کہا "آپ نے مجھے اپنی مرضی سے روپ دیا ہے۔ آپ نے محض ایک تجربہ کیا ہے۔"

"تم یقین کیوں نہیں کرتے میرے بیٹے...!"

"آپ مجھے ماں سے کیوں ملوانا چاہتے ہیں؟" اشوک نے کہا "آپ سمجھتے ہیں، وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوں گی؟ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ فرطِ جوش سے میری طرف دوڑ پڑیں گی، مجھے اپنی ممتا بھری آغوش میں بھر لیں گی؟ اور اسٹیل کے اس ٹھنڈے اور بے جان جسم کو چوم چوم لیں گی؟ میری نیلی نیلی آنکھوں میں جھانک کر یہ کہیں گی کہ تم تو بہت خوب صورت ہو گئے ہو میرے بیٹے!"

"میں بہت شرمندہ ہوں میرے بچے۔"

"کیا میں خوب صورت نہیں؟" اشوک بولا "میرے ہونٹوں کو چومیے نا۔ آپ کو تو مجھ سے بہت محبت ہے نا؟ پھر آپ میرے گالوں کو کیوں نہیں چومتے؟"

ڈاکٹر شرما نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس کا دل غم سے بوجھل ہو رہا تھا۔

"کیا ماں مجھے اپنے سینے سے لگائے گی؟" اشوک نے کہا "میرا منہ چومے گی؟ مگر آپ نے تو مجھے ایک بھی بوسہ نہیں دیا۔"

ڈاکٹر شرما کی رنگت زرد پڑنے لگی تھی اور ہاتھوں پر رعشہ سا طاری تھا اُس کے ہونٹ جیسے سِل گئے تھے۔

"آپ بولتے کیوں نہیں؟" مشین بولی "آپ اس قدر افسردہ کیوں ہیں؟ آپ کو تو بہت مسرور ہونا چاہیے تھا کہ آپ کی محنت رائیگاں نہیں گئی۔"

"تمہاری ماں تمہاری منتظر ہے بیٹے۔" ڈاکٹر شرما نے کوٹ اوڑھتے ہوئے کہا۔

"میں نہیں جاؤں گا..."

"بیٹے... وہ تمہارا انتظار کر رہی ہے۔"

"میں ہرگز نہیں جاؤں گا۔" اُس نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ماں کا خیال آتے ہی اُس کے دماغ میں درد کی لہریں سی اُٹھنے لگیں۔ "ماں، ماں... میں تمہیں کیوں کر دیکھ پاؤں گا؟ کن آنکھوں سے تمہارے درشن کروں گا؟ ان مشینی آنکھوں سے؟ جو ہر احساس سے عاری ہیں؟ جو اشکوں سے محروم ہیں۔ اشک، جو ہماری مسرتوں اور غموں کے ترجمان ہیں؟" اس کا ذہن غم سے پھٹا جا رہا تھا۔

"مجھے مت لے جائیے ماں جی کے سامنے۔" مشین نے التجا کی۔ "مجھے اس حالت میں دیکھ کر اُنھیں بہت دکھ ہوگا۔"

"وہ کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہے بیٹے۔"

"میں نہیں جاؤں گا۔ ہرگز نہیں جاؤں گا۔"

"وہ تم سے بہت پیار کرتی ہے۔"

اور وہ بادلِ نخواستہ دھیرے دھیرے حرکت کرنے لگا۔

* * *

اشوک کی ماں برآمدے میں ایک بنچ پر بیٹھی اپنے بیٹے کی منتظر تھی۔ اُس پر نظر پڑتے ہی وہ ایک دم سے کھڑی ہو گئی اور غیر اختیاری طور پر اُس نے اپنا ایک ہاتھ منہ پر رکھ لیا اُس کے چہرے کی رنگت اڑنے لگی تھی۔

"اشوک۔" وہ مدھم سی آواز میں بولی۔

اشوک نے اپنا ٹوکری جیسا دھاتی سر اُٹھا کے ماں کی طرف دیکھا۔ اُس کے بھورے بالوں کی طرف دیکھا، اُس کے چہرے اور آنکھوں کو دیکھا۔ اُس کے نرم و نازک ہاتھوں کو دیکھا۔

"ماں...!" مشین دھیرے سے بولی۔

اور اُس کی ماں کے پورے وجود پر ایک لرزہ سا طاری ہو گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ ماں کے اندر بھونچال سا اُٹھ رہا ہے۔ وہ یہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ وہ خود کو مار ڈالنا چاہتا تھا۔

"اشوک..." ماں نے ایک بار پھر پکارا۔

وہ کچھ نہیں بولا۔ ماں اُسے دیر تک تکتی رہی۔ پھر اُس کے ہونٹ کپکپائے "تم... کیسے ہو، میرے بیٹے۔ میرے اشوک!"

جواب میں اشوک کا جی چاہا کہ حلق پھاڑ کے قہقہہ لگا اپنی ماں کے بھول پن پر جی بھر کے ہنسے، اتنے زور سے ہنسے کائنات گونج اُٹھے لیکن مشین کیوں کر قہقہے لگا سکتی تھی۔

"جواب دو، اشوک..."

"بند کرو یہ بکواس۔" ڈاکٹر شرما حقارت سے چیخا "یہ اشوک نہیں ہے، روبوٹ۔ اسے بیٹا مت کہو... میں اسے ابھی ختم کیے دیتا ہوں۔"

"نہیں نہیں، ایسا مت کرنا۔" وہ ملتجیانہ انداز میں بولی... "سب ٹھیک ہو جائے گا۔" پھر وہ مسکراتی ہوئی اپنے اشوک کی طرف بڑھنے لگی۔

"تم بولتے کیوں نہیں میرے لال..." وہ پیار بھری آواز میں بولی۔

"کیا میں تمہیں اچھا لگتا ہوں ماں...؟" اشوک نے کہا۔

"واقعی میں خوب صورت ہوں۔ کیا تم مجھے اپنے سینے سے لگاؤ گی؟"

"...سنو تو بیٹے۔"

"تو کیا تم مجھے پیار نہیں کرو گی ماں؟ میرے ہونٹوں کو نہیں چومو گی؟"

اور اُس کی ماں کے ہونٹ فرطِ غم سے کپکپا اُٹھے۔ آنکھیں بھیگ سی گئیں اور پھر اشکوں کی لڑیاں ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرنے لگیں۔

"ماں جی، آپ رو کیوں رہی ہیں؟" اشوک نے درد بھرے لہجے میں کہنے کی کوشش کی تھی مگر مشین اس کے جذبات کا ساتھ نہ دے سکی۔

"آپ مجھے پیار نہیں کریں گی ماں جی...؟ کیا میں آپ کا بیٹا نہیں ہوں؟"

اور اُس کی ماں نے اپنے لرزیدہ ہونٹ اسٹیل پر ثبت کر دیے۔ اُس نے ماں کے ہونٹوں کو اسٹیل سے مس ہوتے ہوئے تو دیکھا لیکن اس حرارت، اس حلاوت اور اس محبت کو نہ محسوس کر سکا جو ماں کے ممتا بھرے بوسوں کے لمس میں ہوتی ہے۔ اُس کے دماغ نے کہا "اب تو ماں کے بوسوں کی حلاوت کو کبھی محسوس نہ کر سکے گا، ممتا بھری حرارت کبھی تیری رگوں میں نہ اُتر سکے گی۔ تیرا مشینی جسم جذبات و احساسات کی نزاکت اور لطافت کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ تجھے جیتے جی جہنم میں جھونک دیا گیا ہے۔ تیرا وہ جسم تجھ سے چھن گیا ہے جو بھگوان کی کلپنا کا روپ تھا اور بے نظیر شاہکار ہے۔ اسٹیل کے ڈھانچے میں انسانی دماغ رکھ دینے سے وہ انسان نہیں بن جاتا۔ آتما اور شریر کے سنگم کا نام ہی منش ہے تو اب منش نہیں، کیول روبوٹ ہے اور بس۔ تیرے لیے ہر جذبہ بے معنی، ہر احساس منجمد اور ہر رشتہ ختم ہو چکا ہے۔"

"میں جانتی ہوں کہ تو ہم دونوں سے خفا ہے۔" ماں نے... آب دیدہ ہو کر کہا "کیا تو ہمیں معاف نہیں کرے گا بیٹے؟"

"معاف کر دوں؟ مشین بھلا کسی کو کیا معاف کرے گی؟" اُس نے اپنے سے کہا۔

پھر وہ اُسے عمارت سے باہر لے آئے... اور کار میں بٹھانے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن وہ دھڑام سے فرش پر گر گیا اور اُس کی ماں کا دل اُچھل کر حلق میں اٹک گیا۔

ڈاکٹر شرما نے اپنے مشینی بیٹے کے جسم کے ایک سوئچ پر ہاتھ رکھا تو وہ دھیرے دھیرے کھڑا ہو گیا۔

"تمہارے دماغ کو تو کوئی ضعف نہیں پہنچا؟" ڈاکٹر شرما نے بیٹے سے پوچھا، مگر وہ خاموش کھڑا رہا۔

"آؤ کار میں بیٹھ جاؤ، ہم تمہیں گھر لے جا رہے ہیں۔" اُس کے باپ نے کہا۔

"نہیں۔ میں نہیں جاؤں گا۔"

"ضد مت کرو بیٹے۔"

"میں کہیں نہیں جاؤں گا۔"

"مان جاؤ بیٹے، اپنی ماں کا کہا تو مان لو۔" اُس کی ماں نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔

"نہیں ماں جی۔ میں یہیں رہوں گا۔" اُس کی آواز میں کسی درندے جیسی غراہٹ تھی۔

"تم ضرور چلو گے۔" اُس کے باپ نے آگے بڑھتے ہوئے کہا اور اس کے مشینی جسم کا ایک اور سوئچ آن کر دیا تو روبوٹ اشوک کسی فرماں بردار ملازم کی طرح کار کی طرف چل پڑا۔ اُس وقت ڈاکٹر شرما کو اپنے آپ پر بہت غصہ آیا اور وہ اپنے آپ کو کوسنے لگا۔ اپنی بیوی کا کہا مان کے اُس نے فاش غلطی کی تھی۔

جب وہ تینوں کار میں بیٹھ چکے تو ڈاکٹر شرما نے اپنی بیوی کی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "اب تو خوش ہو نا؟ اب یہ ساری زندگی تمہارا مطیع و فرماں بردار رہے گا۔ تمہارا ہر حکم مؤدب غلام کی طرح بجا لایا کرے گا۔ جو کہو گی وہی کرے گا۔ یہی چاہتی تھیں نا تم؟"

وہ جواب میں کچھ نہ بولی۔ شوہر کی طنز کے زہر میں بجھی باتوں نے اُسے عجیب سے کرب میں مبتلا کر دیا تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنے شوہر کی باتوں کا کیا جواب دے؟

"تم نے کوئی جواب نہیں دیا اشوک کی ماں۔" ڈاکٹر شرما نے کہا "کیا تم مطمئن نہیں ہوئیں؟ میں نے اسے پورے طور پر تمہارے کنٹرول میں دے دیا ہے۔"

"میں خاموش رہنا چاہتی ہوں۔"

"میں تمہیں بولنے پر مجبور کر دوں گا پاربتی۔" ڈاکٹر شرما نے غصے سے کہا "تمہیں میری باتوں کا جواب دینا ہی پڑے گا۔ اب تم نے کیا سوچا ہے؟ میرا مطلب ہے اس مشین سے کیا کیا کام لو گی؟"

"خاموش رہیے۔ میں پہلے ہی بہت آزردہ ہوں۔" پاربتی نے جواب دیا۔

"میں خاموش نہیں رہ سکتا، پاربتی۔" ڈاکٹر شرما نے کہا "میں سمجھتا ہوں کہ مجھے تمہاری اس احمقانہ تجویز کو عملی شکل نہیں دینی چاہیے تھی۔ مجھے اپنے مُردہ بیٹے کو مشین میں تبدیل نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"آپ میری ممتا کو احمقانہ تجویز کہہ رہے ہیں؟"

"بے شک،" ڈاکٹر شرما نے جواب دیا "تم نے اپنے بیٹے پر بہت ظلم کیا ہے پاربتی۔ جب تک وہ زندہ رہا تم اُسے حکم کا غلام بنانے پر تُلی رہیں اور جب اُس نے موت کو گلے لگانا چاہا تو تم نے یہ خواہش پوری نہ ہونے دی۔ کاش تم نے اُسے آزادی سے مرنے تو دیا ہوتا... کاش وہ تمھاری خود غرض محبت کے چُنگل سے آزاد ہو گیا ہوتا۔"

"کیا میں کوئی ڈائن ہوں، کوئی چڑیل ہوں... ؟ میں اس کی ماں ہوں،" وہ روتے ہوئے بولی۔

"تم ڈائن نہیں ہو اور نہ کوئی چڑیل ہو،" وہ آہستہ سے بولا۔ "لیکن میری مدد سے تم نے اپنے بیٹے کو عفریت ضرور بنا دیا ہے۔"

"بھگوان کے لیے خاموش رہیے۔ میں بہت پریشان ہوں۔" اشوک کی ماں نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔

"اس عفریت سے محبت کر سکو گی، اسے گلے سے لگا سکو گی؟"

"میں نے ایسا نہیں چاہا تھا۔ میرا کوئی دوش نہیں،" وہ آنسو پونچھتی ہوئی بولی۔

"تم اپنے بیٹے کو اپنی خواہشات کا غلام دیکھنا چاہتی تھیں،" ڈاکٹر شرما نے کہا "تم نے اس کی ہر آرزو کا گلا گھونٹ دیا، ہر خواہش کو کچل دیا۔ تم اسے اپنی مرضی پر چلانا چاہتی تھیں۔ اُس نے امریکا جانا چاہا تو تم نے اسے روک دیا۔ اُس نے افسانہ نگاری شروع کرنا چاہی تو تم نے اُسے ڈانٹ دیا۔ اُس نے اوشا سے شادی کرنا چاہی تو تم اُس کی راہ میں چٹان بن کر کھڑی ہو گئیں۔ میں پوچھتا ہوں کیا خرابی تھی اُس بھولی بھالی لڑکی میں... ؟ پڑھی لکھی نہیں تھی؟ دولت مند باپ کی بیٹی نہ تھی اور تمھیں میرے دوستوں سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ اگر تم اوشا کو اپنی بہو بنا لیتیں تو یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔"

اُوشا کے نام پر اشوک کے دماغ میں بھونچال سا آ گیا۔ اس نے زور زور سے چیخنا چاہا لیکن اب تو وہ چیخنے چلّانے پر بھی قادر نہیں رہا تھا۔

"تمھارے ظالمانہ برتاؤ ہی نے اشوک کو خودکشی پر مجبور کیا تھا،" ڈاکٹر شرما نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا "تم نے اُسے اپنی اَنا کے زنداں میں مقید کر رکھا تھا۔ کاش وہ اس زنداں سے نکل گیا ہوتا!"

"وہ میرا لختِ جگر تھا۔ میں اُسے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھنا چاہتی تھی۔"

"مگر اب وہ تمھارا بیٹا نہیں رہا،" ڈاکٹر شرما نے کہا۔

"نہیں نہیں... وہ اب بھی میرا بیٹا ہے۔ میرا اشوک۔ میرا لال،" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"تم اس مشین کو اپنا بیٹا کہتی ہو؟" ڈاکٹر شرما نے طنزیہ لہجے میں کہا "اس مشینی عفریت کو اپنا لال سمجھتی ہو؟"

"اس مشین کے اندر دماغ تو میرے بیٹے ہی کا ہے نا... اور انسان کے وجود میں دماغ ہی تو سب سے اہم شے ہوتا ہے،" وہ آنسو پونچھتی ہوئی بولی۔

"اور اس کے جسم کے متعلق کیا کہتی ہو؟" ڈاکٹر شرما نے طنزیہ انداز میں کہا "اس کے بازوؤں اور ہاتھوں کے متعلق کیا خیال ہے؟ کیا تم اس مشینی جسم کو اپنی آغوش میں لے سکو گی؟ اسٹیل کے ان بازوؤں کو چھو سکو گی؟ کیا اس میں تمھارے ممتا بھرے بوسوں کی حلاوت سرایت کر سکے گی؟ کیا یہ جسم تمھارے پیار بھرے لمس کی حرارت محسوس کر سکے گا... ؟ کیا تم ان مصنوعی آنکھوں میں جھانک سکو گی؟ نہیں۔ یہ محض خود فریبی ہے۔ ہمارا بیٹا مر چکا ہے۔ یہ کبھی ہمارے بیٹے کا بدل نہیں ہو سکتا۔"

"ایسا مت کہیے... مت کہیے... میرا دل ڈوبنے لگتا ہے۔"

"اس کے چہرے کو غور سے دیکھو،" ڈاکٹر شرما نے کہا "کیا یہ ہمارے اشوک کا چہرہ ہے؟ کیا یہ آنکھیں ہمارے اشوک کی آنکھیں ہیں؟ کیا تم اسے پیار کر لو گی؟ کیا تمھارا بیٹا ایسا ہی... بدہیئت تھا؟ تم بہت ظالم عورت ہو۔ تمھیں اپنے بیٹے سے مطلق پیار نہ تھا۔ تم اس سے نفرت کرتی تھیں،" ڈاکٹر شرما کا لہجہ کرخت ہوتا جا رہا تھا "تم نے اُسے مغلوب کر رکھا تھا اور آخر تم نے اُسے تباہ کر دیا۔"

"میں نے اُسے تباہ نہیں کیا... ؟" وہ درد بھری آواز میں بولی۔

"ہاں۔ آپ نے مجھے تباہ کر دیا ماں جی،" مشینی اشوک نے کہا اور دونوں میاں بیوی چونک کر اُس کی طرف دیکھنے لگے "میں اب آپ کے ہر حکم کی تعمیل کروں گا۔ آپ جیت گئیں ماں جی۔ میں مر کر بھی آپ کی اَنا کے زنداں سے نجات نہیں پا سکا۔ چلیے اپنے مشینی بیٹے کو گھر لے چلیے ماں جی..."

(ماخوذ)

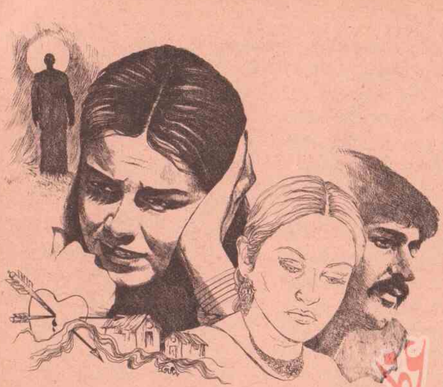

ناصر چغتائی

دو قالب

محبت جب جنون کی حدوں کو چھونے لگتی ہے تو کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے، محبت کرنے والوں کے لیے ایک دلگداز تحریر، ایک منفرد افسانہ

آپ نے رُوحوں کا ذکر کیا تو یاد آیا کہ میں نے بھی ایک رُوح یا ایسی ہی کوئی چیز دیکھی تھی لیکن جب میں اُسے دیکھ رہا تھا، اس وقت یہ احساس بالکل نہ ہوا کہ وہ رُوح... صرف رُوح ہی ہے۔ البتہ اب میں اکثر سوچتا رہتا ہوں کہ وہ ایک رُوح ہی تھی کیونکہ اس کے علاوہ اب میں اسے کچھ اور نہیں کہہ سکتا۔ تاہم اب مجھے اس بات پر بھی حیرت ہوتی ہے کہ اس کے ساتھ جو شخص تھا، وہ اُسے کیسی والہانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

میں کوئی پڑھا لکھا شخص نہیں ہوں، بارہ سال کی عمر میں مجھے اسکول سے اُٹھوا کر فنی کام... سیکھنے پر لگا دیا گیا تاکہ میں کچھ کھا کما سکوں۔ ہمارا خاندان دس افراد پر مشتمل تھا، میرے والد اس جہانِ فانی سے کوچ کر چکے تھے اور ماں کو ہم سب کا پیٹ بھرنے کے لیے مختلف گھروں میں کام کرنا پڑتا تھا لہٰذا جب ننھے خان نے ماں کو

یہ مشورہ دیا کہ وہ مجھے اس کے ہاں کام پر لگا دیں تو وہ فوراً رضامند ہوگئیں۔ ننھے خان الیکٹریشن تھا۔ اُس نے ایک بڑی دُکان کھول رکھی تھی، جہاں اندھی کمائی ہوتی تھی اور اماں کو یہ توقع تھی کہ میں بھی بجلی کا کام سیکھ کر کسی نہ کسی روز ننھے خان کی طرح مال دار ہو جاؤں گا...
مجھے ننھے خان کے حوالے کر دیا گیا اور میں بجلی کے تاروں، سوئچ، فیوز، ٹیوب لائٹوں، تاروں کی تنصیب اور ایسے ہی دیگر کاموں کی تربیت حاصل کرنے لگا۔ یہ برسوں پہلے کی بات ہے۔ اُس زمانے میں وادیٔ نیلم کے بہت سے گھر بجلی کی آسائش سے محروم تھے لیکن دریا پر عظیم الشان بند کی تکمیل کے ساتھ ہی بجلی کی فراہمی شروع ہوگئی تھی اور بیشتر لوگوں نے بجلی کے لیے درخواستیں دی تھیں... اسی باعث ننھے خان یا میرے اُستاد کے عیش تھے۔ ہمیں نہ صرف وادیٔ نیلم کے مکانات اور بنگلوں میں بجلی کی فٹنگ کے آرڈر ملتے تھے بلکہ ہمیں دُور دراز کے علاقوں میں بھی جانا پڑتا تھا کیونکہ اُن دنوں بجلی والوں کی زیادہ دکانیں نہیں کھلی تھیں۔ بہر حال مجھے اُستاد کے پاس کام کرتے کرتے آٹھ نو سال ہوگئے اور میں بھی ماہر کاریگر بن گیا اور لوگ مجھے چھوٹے اُستاد کہہ کر پکارنے لگے تھے۔

میں اُن دنوں بیس اکیس سال کا صحت مند، توانا اور مضبوط نوجوان تھا۔ اُستاد کے ٹھیکے چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے اور مجھے اُن کی دیکھ بھال کے لیے مختلف وادیوں، قصبوں اور چھوٹے شہروں کا سفر کرنا پڑتا تھا۔ ان دنوں مجھے اس کام میں بہت مزہ آتا تھا۔ سفر کے دوران مناظرِ فطرت، وادیوں کا حُسن دیکھنے اور مختلف لوگوں سے ملنے جُلنے کا اتفاق ہوتا تھا لیکن بعض اوقات سفر اور کام کی وجہ سے تھکن بھی ہو جاتی تھی... ممکن ہے جب اس عورت سے میری مُلاقات ہوئی ہو تو میں بہت تھکا ہُوا ہوں۔

وادیٔ نیلم سے کچھ دُور، خان بستی برف پوش پہاڑیوں، سرسبز میدانوں اور دل ترل بہنے والے چشموں کا علاقہ تھا۔ غرضیکہ قدرت نے خان بستی کو ہر نعمت سے نواز رکھا ہے۔ اسی خان بستی میں جمال خان بھی رہتا تھا جس نے دس سال قبل اُستاد ہی سے اپنے چھوٹے سے بنگلے کی وائرنگ کروائی تھی۔ میں اُستاد کی بُرائی نہیں کرتا لیکن دُنیا جانتی ہے کہ وہ کبھی اچھا الیکٹریشن نہیں رہا لیکن دیکھتے ہی دیکھتے وہ سرکاری ٹھیکیدار بھی بن گیا تھا۔

بہر حال، ایک روز جمال خان نے اُستاد کو خط لکھا کہ اُس کے بنگلے کی فٹنگ ناقص نکلی اور تار وغیرہ نکلنے اور گرنے لگے ہیں۔ اُستاد نے دعوا کیا تھا کہ فٹنگ بیس سال تک بہترین حالت میں رہے گی لہٰذا جمال خان کا اصرار تھا کہ وہ اپنے کسی آدمی کو بھیج کر فٹنگ ٹھیک کرا دے۔ جواباً اُستاد نے اُسے معذرت نامہ لکھ بھیجا کہ وادیٔ نیلم میں کام کا بہت دباؤ ہے لہٰذا جونہی ممکن ہُوا، وہ اپنا کوئی الیکٹریشن خان بستی ضرور بھیجے گا۔ اُستاد کے مطابق وہ ایک بُوڑھا آدمی تھا اور فوج سے ریٹائرمنٹ کے بعد خان بستی میں آباد تھا...

کچھ دنوں بعد اُستاد نے اپنا وعدہ پُورا کیا اور مجھے خان بستی جانے کا حُکم دے دیا۔

میں خان بستی پہنچا تو جمال خان کا گھر تلاش کرتے کرتے شام کے سات بج گئے۔ بارش ہو رہی تھی اور سرد ہواؤں کے جھکڑ چل رہے تھے۔ جمال خان کا خوبصورت بنگلا اپنے تمام تر حُسن کے باوجود اُجاڑ اور ویران لگ رہا تھا۔ اُس پر تاریکی مسلط تھی۔ اندر بھی مکمل اندھیرا تھا۔ احاطے میں سرو قامت درخت پُراسرار انداز میں جھوم رہے تھے، اُن کی سرسراہٹ سے مجھے خوف محسوس ہونے لگا لیکن میں نے ہمّت کی اور احاطے میں داخل ہو کر دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔

تین مرتبہ دستک دی تو جمال خان نے دروازہ اتنا ہی کھولا کہ باہر جھانک سکے۔ اُس کی چمک دار آنکھوں میں شکوک کے سائے تھے۔ مجھے دیکھ کر اُس نے دروازہ کچھ اور کھولا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک لالٹین دبی ہُوئی تھی۔

"میں حشمت ہوں خان صاحب!" میں نے اپنا تعارف کرایا۔

"مجھے ننھے خان اُستاد نے بھیجا ہے۔"

یہ سُنتے ہی جمال خان کے چہرے سے تشویش دُور ہو گئی اور اُس نے دروازہ پُورا کھولتے ہوئے، مجھے اندر آنے کی اجازت دے دی۔

بنگلے کے اندر کا ماحول بھی بے حد پُراسرار تھا۔ ہواؤں میں عجیب سی خوشبو رچی ہُوئی تھی۔ ایسی خوشبو جسے میں کوئی نام نہیں دے سکتا۔ بس یُوں سمجھ لیں کہ کافور سے ملتی جلتی خوشبو تھی۔ فرش اور دیواریں گیلی گیلی لگ رہی تھیں لیکن پانی کا ایک قطرہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ سب سے پہلے مجھے باورچی خانے میں لے گیا جہاں کی فٹنگ مجھے بے حد ناقص حالت میں ملی۔ تاروں کے ٹکڑے دیواروں پر جھول رہے تھے۔ میں نے فوراً اپنا کام شروع کر دیا تاکہ واپسی میں تاخیر نہ ہو جائے۔

میں نے ایک گھنٹے کے اندر اندر کچن اور زینے کی فٹنگ تبدیل کر دی۔ اس دوران جمال خان سائے کی طرح میرے ساتھ ساتھ رہا۔

"خواب گاہ کی فٹنگ بھی ٹھیک کرالیں جناب۔" میں نے مشورہ دیا...

"خواب گاہ! ہاں... ہاں کیوں نہیں..." جمال نے بے حد عجیب اور پُراسرار لہجے میں جواب دیا۔ شاید وہ کچھ اور بھی سوچ رہا تھا... "ہاں، خواب گاہ... وہاں کی فٹنگ بھی تبدیل ہونی چاہیے۔ آؤ... آؤ... چلو..."

میں اُس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ کمرے کے دروازے پر پہنچتے ہی اُس نے پلٹ کر مجھے اس طرح دیکھا جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو لیکن پھر اُس نے بولنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ یہ خاصا بڑا کمرہ تھا جس میں داخل ہوتے ہی مجھے ایک نئی مگر نسبتاً زیادہ پُراسرار بُو کا احساس ہُوا لیکن یہ بُو ناگوار ثابت ہُوئی۔ پُورے کمرے کا ماحول ہی ناپسندیدہ لگ رہا تھا۔

آتش دان میں لکڑیاں چٹخ رہی تھیں۔ میں نے آتش دان کی طرف دیکھا تو لرز کر رہ گیا۔ میری یہ کیفیت کسی خوف کے باعث نہیں تھی۔ دراصل میں یہ فرض کر کے آیا تھا کہ جمال خان گھر میں تنہا رہتا ہوگا۔ جب میں گھر میں داخل ہُوا تو بھی مکمل خاموشی نے... ثابت کر دیا کہ وہ تنہا ہی ہے لیکن... لیکن خواب گاہ میں آتشدان کے قریب ایک عورت بیٹھی دکھائی دے رہی تھی۔ اچانک یُوں محسوس ہُوا جیسے اس پُراسرار بُو کا تعلق اُسی عورت سے... ہے۔ عمر میں وہ جمال خان سے دس پندرہ سال چھوٹی لگ رہی تھی۔ اُس کا جسم متناسب اور چہرہ سپاٹ تھا لیکن ہونٹوں پر تبسّم رقصاں تھا۔ وہ سیاہ لباس میں تھی۔ اُس کے ہاتھ گود میں رکھے ہوئے تھے اور وہ صوفے پر بالکل سیدھی بیٹھی تھی۔ اُس کی آنکھیں کسی نقطے پر جمی ہُوئی تھیں۔ اُس نے میری طرف بھی نہیں دیکھا۔ لالٹین کی مدّھم روشنی میں وہ مجھے اچھّی طرح نظر نہیں آئی... لیکن... لیکن اُسے دیکھتے ہی مجھے یُوں لگا جیسے اس کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ اس کے باوجود وہ غیر معمولی طور پر تروتازہ لگ رہی تھی بلکہ کچھ زیادہ ہی صحت مند نظر آ رہی تھی۔ جمال خان نے شاید میرا تجسّس محسوس کر لیا... "یہ میری اہلیہ ہیں۔" اُس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

میں نے بیگم صاحبہ کو سلام کیا اور مُسکراتے ہوئے اُس کی طرف دیکھا لیکن جواباً وہ خاموش ہی رہی۔

"اس کی موجودگی سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں..." جمال نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ اُس کی آنکھیں لالٹین کی لَو کی طرح چمک رہی تھیں۔ "یہ..." اُس نے رُک کر کچھ سوچا پھر ایک طویل سانس لے کر بولا... "چلو... اپنا کام کرو۔" یہ کہہ کر وہ خود عورت کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گیا۔ اُس نے عورت کی طرف جھکتے ہوئے کہا... "بجلی والا آ گیا ہے، خانم! بجلی ٹھیک ہو جائے گی... تو میں تمھیں زیادہ واضح طور پر دیکھ سکوں گا...؟" یہ کہہ کر اُس نے قہقہہ لگایا لیکن وہ عورت اپنی جگہ سے نہ تو ہلی اور نہ اُس نے اپنے شوہر کی طرف دیکھنا گوارہ کیا۔

میں اپنے کام میں مصروف ہو گیا اور جمال خان مجھے دیکھتا رہا۔ شاید اُس کی نظروں میں یہ انتباہ بھی پوشیدہ تھا کہ میں بار بار اُس کی بیوی کی طرف نہ دیکھوں۔ میں بھی جلد از جلد کام مکمّل کر کے وہاں سے فرار ہو جانا چاہتا تھا کیونکہ وہ ناپسندیدہ بُو میرے اعصاب کو درہم برہم کر رہی تھی۔

بالآخر میں نے کام مکمّل کر لیا اور اوزار تھیلے میں رکھتے ہوئے کہا... "میں ذرا سوئچ آن کر کے دیکھ لُوں کہ بجلی آ رہی ہے یا نہیں، پھر میں چلوں گا۔"

جمال خان اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ "نہیں... تم رہنے دو... تمھارے جانے کے بعد میں خود ہی بتیاں روشن کر کے دیکھ لُوں گا۔"

"مگر احتیاطاً مجھے تو دیکھ لینے دیں جناب؟" میں نے حیرت اور قدرے برہمی سے کہا۔

"نہیں... بس... اب تم جاؤ..." جمال خان نے خالصتاً فوجی انداز میں حُکم دیا پھر اُس نے مُسکراتے ہوئے اپنی بیوی سے کہا... "بجلی والے نے اپنا کام مکمّل کر لیا ہے خانم۔ بس جانے والا ہے..."

میں ساکت کھڑا رہا کیونکہ چیکنگ کے بغیر چلے جانا میرے اصُول کے خلاف تھا لیکن جمال خان سوئچ بورڈ سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ "اُستاد سے کہنا کہ بل ڈاک سے بھیج دے، میں چیک ارسال کر دُوں گا۔" اُس نے ہدایت کی۔

میں نے اُکتا کر بیگ اُٹھایا، ایک نظر عورت کی طرف دیکھا جو اب بھی زیرِ لب تبسّم کے ساتھ کسی خیالی نقطے کو گھور رہی تھی اور پھر اس پُراسرار گھر سے نکل کر میں نے تازہ اور مہک دار ہوا میں لمبی لمبی سانسیں لیں تاکہ اس بُو سے پھیپھڑوں کو نجات مل سکے... جمال خان کے گھر سے نکلتے وقت میں خوشگوار موڈ میں نہیں تھا بلکہ میری پیٹھ پر قمیص پسینے سے تر ہو چکی تھی جو باہر کی ٹھنڈی ہوا لگتے ہی خشک ہونے لگی۔ میں بس اسٹینڈ کی طرف چل دیا۔ راستے میں مجھے ایک قہوہ خانہ نظر آیا۔ بس آنے میں ابھی دیر تھی لہٰذا میں چائے پینے کے لیے قہوہ خانے میں داخل ہو گیا۔

کچھ دیر بعد ایک اور شخص آ کر میرے قریب بیٹھ گیا... وہ گپ شپ کا عادی لگتا تھا لہٰذا چند ہی لمحے بعد ہم دونوں میں کسی

بھی تعارف کے بغیر بات چیت شروع ہو گئی۔ گفتگو موسم، بسوں کی کمی اور بے روزگاری کے موضوع پر ہو رہی تھی کہ اچانک اُس نے میرا بیگ دیکھ کر پُوچھا کہ میں کس کام سے خان بستی آیا تھا... پھر ظاہر ہے کہ جمال خان کا بھی ذکر چھڑ گیا۔ میں نے اُسے پُوری کہانی سُنائی اور پھر یہ کہہ کر خوب ہنسا کہ بُوڑھا کس قدر حاسد ہے..." وہ مجھے خواب گاہ میں نہیں لے جانا چاہتا تھا لیکن ظاہر ہے کہ مجبوری تھی۔ وہاں لے جائے بغیر کمرے کی فٹنگ تبدیل نہیں ہو سکتی تھی۔ اُس نے دل پر جبر کر کے اپنی بیوی سے میرا تعارف کرایا... قسم لے لو کہ وہ مجھے اُس کی چھوٹی بہن یا لڑکی نظر آتی تھی۔ کم بخت نے اتنی کم عمر لڑکی سے شادی کی ہے؟"

اجنبی دوست کی آنکھیں یہ سب کچھ سُنتے ہی پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور اُس کا مُنہ کُھلا کا کُھلا رہ گیا... وہ مجھے گھُورنے لگا... چائے کی پیالی اُس کے ہاتھ میں کانپنے لگی... "بیوی؟" اس ایک لفظ میں حیرت، تجسّس، خوف اور بے یقینی شامل تھی۔ "اُس کی بیوی؟ جمال خان کی بیوی؟"

"ہاں بھئی، جمال خان کی بیوی... مگر تمھیں اتنی حیرت کیوں ہو رہی ہے؟ اگر اُس نے اپنی عمر سے دس بیس سال کم عمر کی عورت سے شادی کر لی ہے تو تمھیں اتنا تعجّب کیوں ہو رہا ہے؟"

"کیا تم نے اُس عورت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا؟" یہ کہہ کر اُس نے پیالی میز پر رکھ دی۔

"ہاں... لیکن سب سے عجیب بات یہ محسوس کی کہ وہ اپنی جگہ پر ساکت بیٹھی ہُوئی تھی۔"

"میرے خُدا...!" اُس نے سر تھام لیا۔ "جمال خان کی بیوی کو مرے ہُوئے تو دس سال ہو گئے ہیں، دوست!"

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور جسم میں خوفزدہ کرنے والی پھریریاں سی محسوس ہونے لگیں۔ "مگر... وہ... وہ اُس عورت کو اپنی بیوی کہہ رہا تھا۔ اُس ساکت عورت کو اُس نے اہلیہ کہہ کر متعارف کرایا تھا... وہ اُسے بار بار خانم کہہ رہا تھا!"

"خانم کا انتقال دس برس قبل ہُوا تھا۔" اُس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ "جس روز وہ اِس جہانِ فانی سے رُخصت ہُوئی تھی، وہ ہم سب کے لیے سوگ کا دن تھا۔ خانم ایک ہر دل عزیز ہستی تھی۔ اُس نے خان بستی کے یتیم بچّوں کی تعلیم کے لیے وظائف مقرّر کر رکھے تھے۔ وہ یتیم بچیوں کی شادیاں کراتی تھی۔ جمال خان اور خانم کو ایک دوسرے سے اتنا عشق تھا کہ اس کی کوئی اور مثال ہی نہیں مل سکتی۔ وہ یک جان دو قالب مشہور تھے۔ جس روز خانم کا انتقال ہُوا، جمال خان کی حالت ناقابلِ بیان تھی، وہ روتے روتے کئی بار بے ہوش ہُوا تھا۔"

میں گُم صُم بیٹھا یہ سب کچھ سُنتا رہا۔

"خانم کی موت کے بعد جمال، پہلے والا جمال خان نہیں رہا۔ اُسے اتنا غم تھا کہ اُس نے روزمرّہ کی سرگرمیوں سے بھی کنارہ کشی اختیار کر لی... اگر اُس کے بس میں ہوتا تو وہ خانم کو واپس لے آتا۔ موت کے دوسرے دن ہم نے تجویز پیش کی کہ خانم کو کسی قریبی قبرستان میں سپُردِ خاک کر دیا جائے لیکن شاید وہ نہیں چاہتا تھا کہ خانم کی قبر، گھر سے اتنی قریب ہو لہٰذا وہ میّت کہیں اور لے گیا... پھر اس کی واپسی تین ماہ بعد ہُوئی۔ وہ ایک بڑی وین میں واپس آیا۔ اس کے بعد سے آج تک پھر کبھی گھر سے نہیں نکلا... بے چارہ جمال خان... بڑا ہی نیک انسان ہے وہ۔"

میں چائے کی دوسری پیالی سے ایک بھی گھُونٹ لیے بغیر اپنا تھیلا اُٹھا کر قہوہ خانے سے نکل آیا... بس اپنے اسٹینڈ پر پہنچ چکی تھی۔ مجھے وادیٔ نیلم واپس جانا تھا۔

میں نے دونوں کو ایک ساتھ دیکھا تھا۔ وہ خواب گاہ میں آتش دان کے قریب بیٹھی تھی لیکن خان بستی کے باشندے کا کہنا تھا کہ اُسے مرے ہُوئے دس سال بیت گئے ہیں۔

... پھر میں کانپنے لگا۔ مجھے سردی لگنے لگی۔

اب میں یقین سے کہہ سکتا ہُوں کہ میں نے رُوح نہیں... بلکہ ایک جسم دیکھا تھا لیکن اُس اجنبی سے بات چیت سے پہلے مجھے یہ احساس نہیں تھا کہ میں نے ایک بے رُوح جسم دیکھا ہے۔

... جمال خان شہر گیا تھا تو وہاں اُس نے پُورے تین ماہ گزارے تھے۔ اچانک ہی مجھے ایک خیال نے سر سے پاؤں تک کانپ جانے پر مجبور کر دیا۔ وہ خانم نہیں تھی بلکہ اُس کی لاش تھی... لیکن اُس کا سراپا تر و تازہ لگ رہا تھا۔ وہ زندہ لگتی تھی اور اس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ جمال خان نے شہر جا کر کسی نہ کسی طرح خانم کی لاش کو حنوط کیا ہوگا اور پھر اُسے خان بستی لا کر خواب گاہ میں سجا دیا ہوگا۔

آخر دونوں ایک دوسرے سے محبّت کرتے تھے، نا...

وقار اعظم پاکستانی ڈائجسٹ ڈاٹ کام

انگلی کے دھندے

سید احتشام

ایک ننھے سے تابُوت میں بند ایک کٹی ہُوئی اُنگلی کا فساد۔ اِس انگلی کی قیمت پچاس ہزار ڈالر تھی؛ تجسس پسندوں کے لیے تجسس آمیز تحریر

سحر طلوع ہونے والی تھی اور فضا میں سرمئی اُجالا پھیل رہا تھا۔ سارجنٹ پٹن
میلے گٹر میں پڑے بے جان لاشے کو، پھر پاس کھڑے ہُوئے گشتی
لیس مین اوبرین کو دیکھا۔ "کیا تم نے اسی کو شکار کیا ہے؟"

"نہیں سارجنٹ!" اوبرین نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں نے جسے شکار کیا ہے، وہ اُس گلی میں پڑا ہے۔ ہُوا یوں کہ میں اپنی ڈیوٹی پر آ رہا تھا، میں نے ان دونوں کو سڑک پر ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہُوئے دیکھا۔ ان میں سے ایک نے دیکھتے ہی دیکھتے پستول نکال کر دوسرے کو گولی مار دی۔ میں نے قاتل کو للکارتے ہُوئے دو ہوائی فائر کیے لیکن رُکنے کی بجائے اُس نے پلٹ کر مجھے نشانہ بنانا چاہا لہٰذا مجھے

سب سے پہلے مجبوراً اسی کی خبر لینی پڑی۔ مَیں نے اس کی گردن میں گولی ماری ہے۔"

پٹن نے لاش کا جائزہ لیا۔ "مَیں اس شخص کو نہیں جانتا۔ آؤ دوسرے کو ایک نظر دیکھتے ہیں۔" وہ بولا اور دونوں تیز تیز قدم اُٹھاتے ہُوئے وہاں سے تقریباً سو گز دُور پڑے ہُوئے لاشے کی جانب بڑھے۔ قریب پہنچ کر پٹن نے ایک گھٹنے کے بل جُھک کر لاش کا چہرہ اپنی جانب موڑا۔ "اچھا شکار ہے۔" وہ ادبرین سے بولا۔ "یہ برڈی ہے۔ قتل سمیت تین جرائم میں مطلوب تھا اور اس کی گرفتاری پر انعام بھی رکھا گیا تھا۔ تم انعام کے مستحق ہو، ادبرین! لیکن یہ معاملہ سمجھ میں نہیں آیا۔" اس نے لاش کے بائیں ہاتھ کی بے جان اُنگلیوں کا معائنہ کرتے ہُوئے کہا جنھوں نے تقریباً چھ اِنچ لمبے اور تین اِنچ چوڑے ایک سیاہ ڈبّے کو جکڑ رکھا تھا۔ اس نے اُنگلیوں کی گرفت ڈھیلی کر کے ڈبّا آزاد کرالیا اور سیدھے کھڑے ہو کر اسے کھولنے کی کوشش کی لیکن اس کی اُنگلیاں ڈھکن کا کیچ تلاش کرنے میں ناکام رہیں۔ اس نے بڑبڑاتے ہُوئے ادبرین کے ہاتھ میں پکڑی ہُوئی فلیش لائٹ کی روشنی میں ڈبّے کا جائزہ لیا۔ ڈبّا سربمہر تھا۔ اس نے اُسے جیب میں ڈال لیا پھر واپس اپنی کار میں بیٹھ کر ڈبّے کا قریب سے معائنہ کرنے لگا۔ یہ زیورات کے ڈبّے سے مشابہہ ایک لمبا، پتلا اور سیاہ رنگ کا ڈبّہ تھا۔ پٹن نے جیب سے قلم تراش چاقو نکالا اور اس کی مدد سے مُہر اُکھاڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس عمل میں پانچ منٹ لگ گئے پھر ڈبّے کا ڈھکن کھولتے ہی وہ خود کو یقین دلانے کی کوشش کرنے لگا کہ اس کی ذہنی کیفیت دُرست ہے اور وہ جو کچھ بھی دیکھ رہا ہے، غلط نہیں ہے۔ ڈبّے کے ننھے مُنّے سے سیاہ مخملی بستر پر فقط ایک سالم اُنگلی استراحت فرما رہی تھی، جو بڑی صفائی سے اپنے آخری جوڑ سے جُدا کی گئی تھی۔ اُنگلی خوب اچھی طرح دُھلی ہُوئی اور بہترین حالت میں تھی۔ اسی لمحے ڈبّے سے ایک عجیب سی بُو نکل کر اس کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ اس نے ناک سکیڑ کر اُنگلی کو چھُو کر دیکھا، جو بالکل سرد، نم آلود۔۔۔ اور حنوط شدہ تھی۔ وہ بُو اسی کی تھی۔ برڈی نے یقیناً یہ اُنگلی حاصل کرنے کے لیے دوسرے شخص کو ہلاک کیا ہوگا، اس نے سوچا لیکن سوال یہ تھا کہ یہ کس شخص سے تعلق رکھتی تھی اور اس کے ہاتھ سے جُدا کر دیے جانے کے بعد اس کی کیا اہمیت رہ جاتی تھی؟ اس نے سوچ میں ڈُوب کر کار اسٹارٹ کی اور ہیڈ کوارٹر کی سمت روانہ ہو گیا۔ صبح کے اس اوّل پہر سڑکوں پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا لیکن اپنے خیالوں میں مستغرق وہ اپنے ساتھ بھاگتی ہُوئی لمبی چوڑی سیڈان پر توجہ نہ دے سکا جس نے تیزی سے آگے نکل کر اس کا راستہ روک دیا تھا۔ اُسے مجبوراً کار روکنی پڑی۔ قبل اس کے کہ وہ اپنا ریوالور نکالتا، دوسری جانب کا دروازہ کھُلا اور دو افراد نظر آئے۔ ان کے ہاتھوں میں دو ریوالور اور سرد آنکھوں میں موت کا پیغام تھا۔

"اندر آجاؤ۔" پٹن نے دوستانہ پیش کش کی۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس کی جانب اُٹھے ہُوئے دو ریوالور نہ صرف اپنے مالک کا تعارف کرا رہے تھے بلکہ سفارش بھی کر رہے تھے۔ پہلا شخص غرّا کر اس کے ساتھ بیٹھ گیا اور پٹن کی گود میں پڑے ہوئے سیاہ ڈبے پر نگاہ پڑتے ہی اس کے لبوں پر ایک کُشادہ مُسکراہٹ پھیل گئی۔

"اپنا کھلونا نکالنے کی کوشش مت کرنا، ورنہ تمھارے جسم میں سُوراخ ہو جائے گا۔" اس کا لہجہ دھمکی آمیز تھا۔

"کیا مَیں دیوانہ ہُوں؟" پٹن مُسکرایا۔ "تمھیں جس چیز کی ضرورت ہے، لے کر نَو دو گیارہ ہو جاؤ۔ مَیں تم سے بعد میں ملوں گا۔"

"اچھا۔۔۔؟" ریوالور بردار نے تمسخر سے بھویں اُچکائیں۔ "تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"کیوں کہ اس شہر میں کسی پولیس والے کو نقصان پہنچانا صحت کے لیے خاصا ضرر رساں تصوّر کیا جاتا ہے۔" پٹن کا لہجہ سرد تھا۔ "بہرحال تم کیا چاہتے ہو؟"

"تمھارا کیا خیال ہے؟" پہلے شخص نے غرّا کر ڈبّا پٹن کی گود سے اٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔ "تم اب تک ایک فرماں بردار بچّے ثابت ہوئے لیکن تمھاری فرماں برداری مشکوک ہے، لہٰذا تم اس کے مستحق ہو۔" اس کے ساتھ ہی اس نے ریوالور کا دستہ شدّت سے پٹن کی پیشانی پر مارا۔ پٹن کی آنکھوں کے سامنے سُرخ و سیاہ دھبّے ناچنے لگے۔ ساتھ ہی اس کے کانوں میں قہقہے کی آواز آئی پھر اس کی لہریں دُور ہوتی ہُوئی کہاں گم ہو گئیں اور اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔ آنکھ کھلی تو خود کو کسی اسپتال کے بستر پر پڑا ہُوا پایا۔ کمرے کی سفید دیواریں اس کی دکھتی آنکھوں کو تازگی نہیں بخش رہی تھیں۔ مضروب پیشانی سے دَرد کی ہلکی ہلکی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں لیکن چوٹ شدید ثابت نہیں ہوئی تھی، وہ دو تین دِن میں پوری طرح صحت یاب ہو سکتا تھا۔

"دو تین دِن؟" اس نے ناگواری سے بڑبڑا کر کروٹ بدلی۔ "لعنت ہو۔" لیکن دوسرے ہی دِن وہ چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا۔۔۔ تاہم کمزوری کے باعث پولیس کار میں سوار ہوتے ہُوئے اس کے گھٹنے کپکپا گئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ ہیڈ کوارٹر پہنچ گیا جہاں کیپٹن بروس اس کا منتظر تھا۔ پٹن کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کے لبوں پر ایک سرد مُسکراہٹ پھیل گئی۔ "تم نے اس شخص کو اپنا مُنہ رنگنے کا موقع کیوں دیا؟" اس کا لہجہ کاٹ دار تھا۔ "تم کاٹھ کے اُلّو بنے بیٹھے رہے اور دونوں قاتل تمھاری لمبی سی ناک کے نیچے سے نکل گئے۔ آخر ایسا کیوں ہُوا پٹن؟"

"جیسا کہ میری رپورٹ سے ظاہر ہے۔" پٹن نے کیپٹن کی تلخی میں اپنی مسکراہٹ کی مٹھاس گھولی۔ "انھوں نے جبراً مجھے کار روکنے پر مجبور کیا اور دو عدد ریوالور کی نالیں میرے نتھنوں سے لگا کر ڈبّا اُٹھا لیا پھر جاتے جاتے مجھے آرام کرنے کا موقع فراہم کر گئے اور اب مَیں آرام کرنے کے بعد تمھارے سامنے کھڑا ہوں۔"

"پیشانی پر بدنامی کا داغ لگا کر۔۔۔" کیپٹن نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔ "بہرحال۔۔۔ کوئی بات نہیں۔ اس معاملے کی تفتیش جاری رکھو۔ بہتر ہو کہ انھیں پکڑ کر یہاں لے آؤ۔ میرا خیال ہے کہ وہ برڈی کے ساتھی ہیں۔ ہم نے اس کے بعض ساتھیوں کو ٹٹولا ہے۔ تمھارا کہنا ہے کہ تم ان دونوں سے واقف نہیں ہو۔ ممکن ہے یہ اطلاع تمھارے لیے سُود مند ہو کہ دو ماہ سے برڈی، سان فرانسسکو کے ایک گروہ کے لیے کام کر رہا تھا۔ یہ گروہ یہاں سرگرمِ عمل ہے۔ ممکن ہے تم اس حملہ آور کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاؤ۔ اگر ہماری مدد کی ضرورت پیش آئے تو یاد کر لینا۔"

"مجھے صرف دو عدد اسٹریچر کی ضرورت پڑے گی۔ وقت پر فراہم کر دینا۔" پٹن نشست سے اُٹھتا ہُوا بولا۔

▽

سان فرانسسکو کے گروہ کو تلاش کرنا کوئی مشکل ثابت نہیں ہُوا لیکن اُسے جن دو افراد کی تلاش تھی وہ نگاہوں سے اوجھل تھے۔۔۔ [illegible] تلاشِ بسیار کے بعد وہ الحمرا نامی ایک سستے سے ہوٹل میں مل گئے۔ پٹن کے ہوٹل کی لابی میں داخل ہوتے ہی، کچھ افراد فوراً اپنی نشست سے اُٹھ کر باہر نکل گئے۔ شاید انھوں نے اس "پولیس والے" کو پہچان لیا تھا۔ پٹن ایک نشست پر جا بیٹھا اور خاموشی سے میز کو گھورنے لگا لیکن وہ اپنے اطراف سے بے خبر نہیں تھا۔ اس کی تیز نگاہوں نے کاؤنٹر کلرک کو ہوٹل کے ایک ملازم چھوکرے کو آنکھ کے اشارے سے بلاتے اور اس چھوکرے کو اس کی جانب بڑھتے دیکھ لیا تھا۔ پھر کلرک نے اسے سرگوشیوں میں کچھ ہدایت دیں اور وہ سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔ پٹن اپنی جگہ سے تیزی سے اُٹھ کر چھوکرے کے پیچھے لپکا۔۔۔ زینے کے قریب پہنچ کر وہ کلرک کی جانب مُڑا۔ کلرک کا چہرہ کفن کی مانند سفید پڑ گیا۔۔۔ گویا وہ صحیح راہ پر لگ گیا تھا۔ چھوکرا زینے طے کر رہا تھا۔ اس نے اس کے پیچھے زینے طے کرتے ہُوئے جوتے سے [illegible] سی آواز پیدا کی۔ چھوکرا پلٹ کر دیکھے بغیر پہلے سے کہیں زیادہ تیزی سے زینے طے کرنے لگا اور کمرہ نمبر ۵۱۱ کے قریب پہنچ کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ [illegible] ہی دروازہ تھوڑا سا کھُلا، پٹن چھوکرے کو ایک طرف ہٹا کر بجلی کی سی پھرتی سے کمرے میں داخل ہو گیا اور اس کے ہاتھ میں دبے ہُوئے ریوالور نے کمرے میں موجود تین افراد کو زد میں لے لیا۔ تینوں نے خاموشی سے اپنے ہاتھ اُٹھا دیے۔

"اپنے کھلونے نکالنے کی کوشش مت کرنا، ورنہ جسم چھلنی ہو جائے گا۔" پٹن کا لہجہ دھمکی آمیز تھا۔ ان میں سے دو کو وہ اچھی طرح پہچان گیا تھا۔ یہ وہی تھے جنھوں نے اس سے بکس چھین کر اس کی پیشانی پر ضرب لگائی تھی۔

"کیا مطلب؟ کہیں تم پاگل تو نہیں ہو گئے؟" ان میں سے ایک سراسیمہ ہو کر بولا۔

"ہاں۔۔۔" پٹن نے دانت پیس کر کہا۔ "اس وقت سے جب سے تم نے میری پیشانی پر ضرب لگائی تھی۔ مَیں وہ ننھا سا بکس واپس لینے اور اس سے منسلک چٹ پٹی کہانی سُننے کی حد تک پاگل ہو گیا ہُوں۔۔۔ کون اُگلے گا؟"

"یہ کوئی پولیسیا معلوم ہوتا ہے۔" دوسرے نے ہونٹ پچکا کر خیال آرائی کی۔

"اور گوشت پوست کا۔" پٹن نے غرّا کر تائید کی۔ "قصور میری ماں کا ہے جس نے ڈھیر سارا مچھلی کا تیل کھلا کھلا کر میری کھوپڑی کو شاک پروف بنا دیا ہے لیکن مجھے حیرت ہے۔ کیا تمھاری ماؤں نے تم لوگوں کو بُلٹ پروف بنا دیا ہے؟"

"سُنو۔۔۔" تیسرا شخص، جسے پٹن نہیں جانتا تھا، خوف زدہ ہو کر بول پڑا۔ وہ چھوٹے قد کا، خوشامدی انسان نظر آتا تھا۔ "ہم کچھ بھی نہیں جانتے۔ ہم صرف دو روز قبل سان فرانسسکو سے آئے ہیں۔ ہم نے تمھیں اس سے قبل کبھی نہیں دیکھا۔ یقین کرو ہم۔۔۔"

"کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اُس ضرب نے مجھے اندھا کر دیا ہے؟" پٹن غرّایا۔ "تم تینوں ہیڈ کوارٹر کو مطلوب ہو۔ تمھیں پتہ ہے کہ ہم پولیس پر حملہ کرنے والوں کا کیا حشر کرتے ہیں؟"

"لیکن ہم نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔" منحنی شخص ہاتھ پھیلا کر پُرزور

چہرہ اور پیشانی کے بالوں کو ہمیشہ کیلئے ختم کرکے رنگت نکھارئیے

آجکل خواتین اور لڑکیوں کے چہروں پر بال نکلنے کی عام شکایت پیدا ہو رہی ہے ان لڑکیوں اور عورتوں کو چاہیئے کہ ہربخن بیوٹی کریم اور بیوٹی پلاسٹر استعمال کریں جو فالتو بالوں کو بالکل ختم کر دیتی ہے۔ قیمت فی ڈبیہ ۵۰/-۔ ۵۰/- روپے

چہرہ ہمیشہ کیلئے دلکش اور خوبصورت بنائیے

بیوٹی لوشن کیل، مہاسے، چھائیاں، داغ، دھبّے اور جھرّیوں کو بالکل ختم کرکے چہرہ دلکش اور شفاف سفید بناتا ہے۔ بے ضرر ہے۔ قیمت -/۵۰ روپے۔ ایک خط لکھکر منگوائیے

پتہ:- وکٹر انٹرنیشنل پوسٹ بکس نمبر ۶۳۱ کراچی ۱

لہجے میں بولا۔ "ہم تازہ تازہ شہر میں وارد ہُوئے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" پٹن نے سر ہلایا۔ "تم ان دونوں کو خوب اچھی طرح کس کر باندھو اور میرے ساتھ چلو۔ مَیں دیکھتا ہوں تم اپنی اس کھال میں کس طرح سان فرانسسکو واپس جاتے ہو۔ میں تمھاری کھال اُدھیڑ کر سِٹی ہال کے دروازے پر ٹانگ دوں گا۔"

منحنی شخص نے کانپ کر بے بسی سے اپنے دونوں ساتھیوں کی جانب دیکھا۔ جواب میں اُنھوں نے اُسے گھورا۔ "کوئی بات نہیں، اُلّو کے پٹھے۔" ان میں سب سے قدآور غُصّے سے بل کھا کر بولا۔ "جو کچھ جانتے ہو، وہ سب اُگل دو پھر تم شاید کبھی نہ بول سکو۔"

لیکن منحنی شخص نے اس کی دھمکی سُنی ان سُنی کر کے باری باری ان دونوں کو ایک رسّی سے خوب کس کر باندھ دیا۔ پٹن نے بڑھ کر بندش کا معائنہ کیا، مطمئن ہو کر منحنی شخص کا بازو تھام لیا اور اسے تقریباً کھینچتا ہُوا کمرے سے نکل گیا۔ اسے شک تھا کہ اس شہر میں ان کے اور بھی ساتھی ہوں گے کیوں کہ انھیں شہر کے دیگر جرائم پیشہ کے ساتھ نہیں دیکھا گیا تھا۔ غالباً یہ کسی خاص مقصد کے تحت یہاں وارد ہوئے تھے۔

◆

باہر نکل کر اس نے گزرتی ہُوئی ٹیکسی کو رُکنے کا اشارہ کیا۔ اسے یقین تھا کہ کمرے میں بندھے ہُوئے وہ دو افراد جلد ہی رہا کر دیے جائیں گے۔ لہٰذا اس سے پیشتر کہ وہ رہا ہو کر اس منحنی شخص کا تعاقب شروع کر دیں جس نے انھیں ڈبل کراس کیا تھا، اسے ان کی پہنچ سے بہت دُور نکل جانا تھا۔ وہ اُسے لے کر جلدی سے ٹیکسی میں سوار ہو گیا اور جب ٹیکسی پُرہجوم ٹریفک میں شامل ہو گئی تو اس نے اپنے قیدی سے سوال کیا۔ "تمھارا کیا نام ہے؟"

"اوٹو ویر…" اس نے جواب دیا اور پٹن کو رحم طلب نظروں سے دیکھنے لگا۔ "تم مجھے مارو گے تو نہیں؟ ایں…؟"

"اگر اپنے ڈیڈی کو ساری بات بتا دو تو نہیں ماروں گا… آخر تم لوگ اپنے شہر سے ہزار میل دُور یہاں کیا لینے آئے ہو۔ تمھیں کس چیز کی اتنی شدّت سے تلاش ہے؟"

"قسم لے لو، جو مجھے معلوم ہو۔ یہ مجھے اپنے ساتھ سان فرانسسکو سے کھینچ لائے ہیں لیکن مَیں پولیس والوں کے پھندے میں پڑنا نہیں چاہتا۔ نہیں جناب… ہرگز نہیں۔ مَیں نے زندگی میں ایک ہی بار سان کوئنٹن میں ایک واردات کی تھی اور جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا گیا تھا۔ اب مَیں دوبارہ وہ سلاخیں دیکھنا نہیں چاہتا۔"

"اپنے قیام کے دوران انھوں نے کس کس سے ملاقات کی ہے؟" پٹن نے استفسار کیا۔ اس کی ساری اُمیدیں اسی چُوہے سے وابستہ تھیں۔

"وہ گزشتہ روز ایک شخص سے ملنے گئے تھے اور مجھے روک دیا تھا لیکن مَیں نے ان کے بعض جُملے سُن لیے تھے۔ وہ رقم کے سلسلے میں گفتگو کر رہے تھے۔ خاصی بڑی رقم کے بارے میں کسی کو پچاس ہزار ڈالر کہتے سُنا تھا۔ مجھے مکان کا نمبر معلوم نہیں لیکن وہاں پہنچنے پر میں اس کی نشاندہی کر سکتا ہوں۔"

"او کے…" پٹن نے کہا اور ڈرائیور کو ایک سو بیسویں چلنے کی ہدایت کر کے آرام سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس نے کی باتوں پر زیادہ یقین نہیں کیا تھا تاہم یہ شخص اس سے تعاون آ رہا تھا پھر نہ جانے کیا سوچ کر اس نے ٹیکسی کی کھڑکی کو اُنگلی کھٹ کھٹایا۔

"جس پولیس کار پر تمھاری سب سے پہلی نظر اس کے قریب روک دینا۔" اُس نے ڈرائیور کو ہدایت کی۔

"تم مجھے اس کے حوالے تو نہیں کر دو گے… نہیں" اوٹو خوشامدانہ لہجے میں بولا۔ "مَیں تمھیں اس مکان پر لے چلوں کرو… مَیں تمھیں بے وقوف نہیں بناؤں گا، سارجنٹ!"

"مَیں جانتا ہُوں۔" پٹن نے گہرے یقین سے سر ہلایا۔ "مَیں تمھیں ابھی جیل نہیں بھیجوں گا۔ مَیں اس پولیس کار کو ان دو بندھے ہُوئے ساتھیوں کو ہیڈ کوارٹر پہنچانے کی ہدایت کروں مجھے یہ کام پہلے ہی انجام دینا چاہیے تھا۔" وہ جانتا تھا کہ وہ دونوں ان کی روانگی کے بعد بمشکل تین منٹ تک بندھے رہے ہوں گے۔ ٹیکسی سڑک کے ایک طرف رُک گئی اور سُرخ چہرے والا ایک کانسٹیبل سڑک عبور کر کے ان کی جانب بڑھنے لگا۔

پٹن ٹیکسی سے اُتر پڑا اور اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے ٹریفک کو ایک جانب لے کر دھیمے لہجے میں باتیں کرنے لگا پھر دونوں ٹیکسی کی جانب آنے لگے۔ دوسرے پولیس مین نے بڑھ کر پٹن ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور اس کے اندر بیٹھنے کے بعد بند کر کے سلیوٹ کیا۔ "فکر نہ کریں سارجنٹ! مَیں ریڈیو کار روانہ کرتا ہوں پہنچنے پر آپ انھیں اپنا منتظر پائیں گے۔" اس نے کہا اور ٹیکسی گئی۔ پٹن نے اوٹو کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑتی ہوئی کی۔ باقی سفر خاموشی سے کٹا… ٹیکسی کے ایک سو بیسویں پہنچتے ہی اوٹو کی حرکات سے اضطراب جھلکنے لگا لیکن پٹن کی طرف توجہ نہیں دی۔ "جناب یہ رہا وہ مکان۔" اچانک کھڑکی سے باہر جھانکتے ہُوئے ایک مکان کی جانب اشارہ کیا۔

اس کی راہداری سے پہچان گیا۔ یقیناً یہ وہی مکان ہے۔ مَیں تمھیں آسانی اس کے اندر لے جا سکتا ہوں۔ دروازے پر کھڑا ہُوا چھوکرا مجھے پہچان جائے گا۔"

"وہ بھول بھی کیسے سکتا ہے؟" پٹن مُسکرایا اور ڈرائیور کو ٹیکسی روکنے کی ہدایت کی۔ ٹیکسی رُک گئی۔ پٹن نے اپنی جیب سے سگریٹ نکال کر سُلگایا اور اچانک اوٹو سے سوال کیا۔ "اوٹو تم مجھے دھوکا تو نہیں دو گے؟"

"کون… مَیں؟" اوٹو ششدر رہ گیا۔ "تمھیں دھوکا دوں گا؟ نہیں… ہرگز نہیں۔ مجھے پولیس والوں کی خوب پہچان ہے۔ مَیں پہلی جان گیا تھا کہ تم ایک سخت گیر پولیس والے ہو۔ مَیں ہیڈ کوارٹر پہنچ کر اپنی کھال کھنچوانا پسند نہیں کروں گا۔ نہیں جناب… یہ ممکن نہیں۔ اگر تم مجھے اس ہنگامے سے دُور رکھنے کا وعدہ کرو تو میں تمھیں اس مکان کے اندر لے جانے کو تیار ہُوں۔ مَیں سان فرانسسکو واپس جانا چاہتا ہوں۔ میرا سب کچھ وہیں ہے۔"

"او کے۔" پٹن نے اپنی رسٹ واچ پر ایک اچٹتی ہُوئی نگاہ ڈالی۔ "مَیں تمھیں اس ہنگامے سے دُور رکھوں گا۔ تم میرے لیے اہمیت ہو، لہٰذا مَیں تمھیں گنوانا پسند نہیں کروں گا۔" اس کے ساتھ ہی نے جیب سے ایک جوڑی ہتھکڑی نکال کر لہرائی۔

"کیا تم مجھے ہتھکڑی پہنانا چاہتے ہو؟ اوہ نہیں… مَیں نے بھی نہیں کیا ہے۔" اوٹو گھگھیانے لگا۔

"اور نہ ہی کچھ کرو گے۔ آؤ اب اچھے بچّوں کی طرح بات مان جاؤ۔"

اوٹو نے بادلِ نخواستہ اپنا ایک ہاتھ اس کی جانب بڑھا دیا… پٹن نے دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے ایک رنگ سا کر گزر گیا تھا لیکن اس نے توجہ دیے بغیر اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی ڈال دی اور اس سے منسلک دوسری ہتھکڑی اپنی بائیں کلائی میں ڈال کر قفل لگانے کے بعد اپنے قیدی کو ٹیکسی کے باہر کھینچ لیا۔ پھر ہتھکڑی کی چابی ڈرائیور کو تھماتے ہوئے ہدایت کی۔ "ہیڈ کوارٹر چلے جاؤ۔ یہ چابی ڈیسک سارجنٹ کے حوالے کر دینا اور اس سے کہنا کہ میں جلد ہی اس ریوڑ کو ہانکتا ہُوا پہنچ رہا ہوں۔ مجھے زیادہ اُمید نہیں ہے کیونکہ یہ چوہا میرے کان کترنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔" اس کے ساتھ ہی اس نے پانچ ڈالر کا نوٹ اُسے تھما دیا اور ٹیکسی ہَوا ہو گئی۔

وہ اوٹو کو لے کر اس اپارٹمنٹ کی سمت بڑھنے لگا۔ اوٹو عجلت بھرے انداز میں تیز تیز قدم اُٹھاتا ہُوا اُس سے آگے نکلنے کی کوشش میں مصروف تھا لیکن ہر مرتبہ پٹن اُسے پیچھے کی جانب کھینچ لیتا۔ اپارٹمنٹ کے بیرونی دروازے پر پہرے دار موجود تھا اور نہ ہی اندرونی دروازہ مقفل تھا۔ اوٹو اس طرح آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا گویا اس کے اندرونی حصّے سے بخوبی واقف ہو۔ وہ زینہ طے کرتے ہُوئے تیسری منزل پر پہنچے۔ ہال میں پہنچ کر اوٹو ارادتاً رُک گیا پھر ایک دروازے کی جانب اشارہ کر کے بولا۔ "یہ رہا… مجھے اچھی طرح یاد ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ آؤ…" پٹن اُسے اپنے ساتھ کھینچتا ہُوا بولا۔ اور دروازے پر رُک کر سُن گُن لینے کی کوشش کی لیکن اندر خاموشی چھائی ہُوئی تھی۔ دروازے سے کچھ فاصلے پر شیشے کا ایک دروازہ تھا جو کہ آگ سے بچاؤ کی گیلری میں کھلتا تھا۔ وہ اس دروازے کی طرف بڑھ گیا اور دروازہ کھول کر گیلری میں قدم رکھا۔ نیچے سڑک پر ٹریفک رواں دواں تھا۔ اُس نے جھک کر نیچے نگاہ ڈالی… پھر اوٹو کو اپنے ساتھ کھینچتا ہُوا ہال میں واپس آ گیا اور اپارٹمنٹ کے دروازے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا۔ دروازہ بہ آہستگی کھُل گیا۔ اس نے اُسے مزید وا کر کے اندر قدم رکھا۔ دروازہ اس کے پیچھے بند ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی اُس کی پُشت سے ریوالور کی نال آ لگی اور ایک آواز کانوں سے ٹکرائی۔ "آ جاؤ سارجنٹ۔" پٹن آگے بڑھا پھر گردن موڑ کر اُس قدآور کو دیکھتے ہُوئے خوشگواری سے مُسکرانے لگا جسے وہ ہوٹل کے کمرے میں بندھا ہُوا چھوڑ آیا تھا اور جب گردن سامنے کے رُخ گھمائی تو دوسرے پر نظر پڑی۔ اُسی لمحے اُسے اوٹو کا قہقہہ سُنائی دیا۔ وہ حلق پھاڑ کر بُری طرح قہقہے لگا رہا تھا۔ گویا اپنے مذاق سے جی کھول کر محظوظ ہو رہا ہو۔ "کیا خوب سارجنٹ ہے۔" وہ قہقہے کے دوران بولا۔ "کہتے ہیں نیویارک کی پولیس آفت کی پرکالہ ہے لیکن بعض اتنے احمق بھی ہوتے ہیں، اس کا تجربہ آج ہُوا ہے۔" اب پٹن کو کھینچنے کی، اس کی باری تھی۔ وہ اسے کھینچتا ہُوا کمرۂ نشست میں لے گیا۔ پٹن اس کے ساتھ کھنچتا اور اذیت سہتا ہُوا کمرۂ نشست میں پہنچ گیا۔ اس نے کمرے کی کھلی ہُوئی کھڑکیوں پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی۔ اوٹو نے اُسے دیکھا اُس کے لبوں پر ایک طنزیہ مُسکراہٹ بکھر گئی۔ "اس سے کُودنے کی حماقت نہ کرنا ذہین سارجنٹ۔ خیال رہے کہ مَیں بھی تمھارے ساتھ منسلک ہُوں۔"

اس کے لب و لہجے اور اندازِ گفتگو سے پٹن کو یہ سمجھنے میں دُشواری نہیں ہُوئی کہ دراصل گینگ لیڈر وہی تھا اور بہترین اداکار تھا۔ اس نے خود کو مظلوم اور خوف زدہ ظاہر کر کے کتنی خوب صورتی سے پٹن کے گرد ایک جال بُنا تھا اور خود اُس کی رضامندی سے اُسے اپنے ٹھکانے پر لے آیا تھا۔ جہاں وہ ہر طرح سے محفوظ تھا۔ اگر وہ لوگ

اسے گولی بھی مار دیتے تو کسی کے فرشتوں کو خبر نہ ہوتی۔

"ہم دونوں ہی ایک دوسرے سے فرار حاصل نہیں کر سکتے، اوٹو۔" پٹن نے نرمی سے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "کیوں کہ ہم ایک ہی ڈور میں بندھے ہوئے ہیں۔"

"ہاں. . ." اوٹو نے اپنی نیکوٹین سے آلودہ سڑی ہوئی بتیسی کی نمائش کی۔ "اُلّو کے پٹھے۔ تم نے اس کی چابی ہیڈ کوارٹر بھیج کر عقلمندی کا ثبوت ضرور دیا ہے تاہم میں نہیں سمجھتا کہ وہ آئندہ کئی گھنٹے تک کوئی عملی قدم اُٹھانے کا قصد کریں. . . وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہوں گے کہ تم کوئی زبردست معرکہ سرانجام دینے میں مصروف ہو گے اور اُن کی بے جا مداخلت کام بگاڑ سکتی ہے لیکن جب وہ تم تک پہنچیں گے تو اس وقت ہم دونوں ایک دوسرے سے منسلک نہیں ہوں گے۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ تمھاری کلائی تمھیں ہلاک کرنے کے بعد کاٹوں گا یا پہلے۔"

"جس طرح ایک اُنگلی کاٹی تھی۔ ہے نا؟" پٹن نے اندھیرے میں تیر چلایا۔

"ایں؟" اوٹو کا مُنہ کھل گیا۔ "گویا تم اس کے بارے میں جانتے ہو؟"

"یقیناً جانتا ہوں۔" پٹن مسکرایا۔ اوٹو کو اس امر کی توقع نہیں تھی۔ دوسرے ہی لمحے اس کی حیرت، برہمی میں بدل گئی۔

"ہوش کی دوا کرو۔" وہ غرّایا۔ "جب میں یہ ہتھکڑی نکالوں گا تو تم کسی اور ہی طریقے سے چیخو گے۔ جیکی، ایک چاقو دینا۔ اگر کُند ہو تو بھی فکر کرنے کی ضرورت نہیں. . . میں اس کُند چاقو سے اس کی کلائی کاٹ کر جُدا کر دوں گا۔" اس نے آخری الفاظ اپنے ایک ماتحت سے مخاطب ہو کر کہے تھے۔ جیکی اپنے باس کے حکم کی تعمیل کے لیے فوراً حرکت میں آ گیا۔ جب کہ دوسرا قد آور شخص کھڑکی کی جانب اپنی پُشت کیے پٹن پر ریوالور تانے کھڑا رہا۔ اُس کے لبوں پر ایک سفاک مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی. . . "خیر. . . یہ بتاؤ کہ تم بے ہوش ہونا پسند کرو گے یا اپنے ہوش و حواس میں اس اذیت سے گزر سکو گے؟" اوٹو نے تیکھے لہجے میں دریافت کیا۔

"اس قسم کے کسی بھی عمل سے گزرنے سے پہلے میں اس کھڑکی سے خوب اچھی طرح باہر کا جائزہ لینا چاہوں گا۔ میرا خیال ہے کہ اس سے ملحق ایک دوسرا اپارٹمنٹ واقع ہے اور غالباً اس میں کھڑکیاں بھی ہیں۔"

"کیا مطلب؟" اوٹو نے تیزی سے سوال کیا اور کھڑکی کی طرف بڑھا لیکن پھر اچانک ہی رُک گیا کیوں کہ پٹن نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی تھی۔ قد آور شخص نے تیزی سے بڑھ کر کھڑکی کا پردہ کھسکا دیا اور اس کے مُنہ سے ایک اُلجھی اُلجھی سی سانس نکل گئی۔ اُن کے عین والی عمارت کی دو کھڑکیاں، ان کھڑکیوں کے مقابل تھیں۔ اوٹو، کھینچتا ہوا کھڑکی کی جانب بڑھا اور باہر نگاہ ڈالتے ہی اس کا چہرہ گیا۔ اس عمارت کی سامنے والی کھڑکی سے ایک مشین گن کا دہانہ جھانک رہا تھا جس کا رُخ ٹھیک اسی کمرے کی طرف تھا۔ اس کے عقب میں وردیاں نظر آ رہی تھیں۔ نیچے سڑک کے فٹ پاتھ پر پولیس کی ایک بھاری جمعیت موجود تھی۔ جب کہ دوسری طرف ایک ہنگامی ٹرک کھڑا تھا۔ اس سے منسلک آہنی سیڑھی بلند کی جا رہی تھی اور کچھ چاق و چوبند نوجوان ہاتھوں میں آنسو گیس بم لیے سیڑھی پر چڑھنے کے لیے بالکل تیار تھے۔

"کہو. . . کیسی رہی؟" پٹن مسکرایا۔ "تم نے مجھے بے وقوف خود بن گئے۔ جب میں نے اس ٹریفک کانسٹیبل سے بات کی تھی دراصل اپنا تعاقب کرنے کی ہدایت کی تھی تاکہ وہ اس جگہ سے ہو جائے اور پھر یہاں ایک ہنگامی اسکواڈ بھیج دے۔ جب میں گیلری میں گیا تھا تو میرا مقصد اسے اس منزل پر اپنی موجودگی سے آگاہ کرنا

"تم خود کو بے حد عقل مند سمجھتے تھے۔ تمھاری اس عقلمندی ہم تینوں کو بے موت مار ڈالا۔" اوٹو، قد آور پر برہم ہو کر چیخا۔ "بتاؤ اب ہم کیا کریں؟"

جواب میں اوٹو کے ریوالور نے شعلہ اُگلا اور اس کا بھاری بھرکم جسم فرش پر آ رہا۔ وہ کچھ دیر تک تڑپتا رہا اور پھر ٹھنڈا ہو گیا۔ پٹن نے ہتھکڑی کی زنجیر کو جھٹکا دے کر اس کا نشانہ خالی دینے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے ہاتھ کے حرکت میں آنے سے قبل ہی گولی چل چکی تھی اور اس نے قد آور کو چاٹ لیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اُس نے ریوالور پر ہاتھ ڈال دیا اور اس کا دستہ تھام کر اوٹو کے سر پر شدید ضرب لگائی۔ اسی لمحے تیسرا شخص کمرے میں داخل ہوا۔ اُس نے ایک لمحے کے لیے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بدلی ہوئی صورتِ حال کا جائزہ لیا اور دوسرے ہی لمحے بے تحاشہ بھاگ کھڑا ہوا۔ پٹن نے اسے روکنا چاہا لیکن وہ کمرے سے نکل کر دیوانہ وار گیلری کے شیشے کا دروازہ ایک دھماکے سے کھول کر گیلری میں بھاگا۔ دفعتاً گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے فضا تھرّا اُٹھی۔ وہ زخمی ہو کر گرتا پڑتا ہال میں واپس آیا اور فرش پر ڈھیر ہو کر ساکت ہو گیا۔ پٹن اپنے ہونٹ چبانے لگا۔ اس منحوس اُنگلی کی خاطر اب تک چار افراد اپنی جان سے ہاتھ دھو چکے تھے۔ پہلے ایک شخص قتل ہوا تھا پھر اس کے قاتل کو ہلاک کر دیا گیا تھا خود اس کے سر پر شدید ضرب لگا کر اسے اسپتال پہنچا دیا گیا تھا اور اب مزید دو ہلاک ہو چکے تھے جبکہ ایک ضرب کھا کر فرش پر بے ہوش پڑا تھا۔ ابھی وہ انھی خیالات میں غلطاں و پیچاں تھا کہ پولیس فور

ہال میں آ گئی۔ پٹن نے اپنے پاس موجود فاضل چابی سے اپنی ہتھکڑی کھولی جو کہ ہر وقت اس کے پاس ہی رہتی تھی اور ایک پولیس مین کو تھما دی۔ "اسے لے جا کر بستر پر لِٹا دو۔" اس نے بے ہوش اوٹو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں تھوڑی دیر کے بعد آ کر اسے سُلانے والی کہانیاں سُناؤں گا۔"

پولیس کے جانے کے بعد اس نے کمرے کی تلاشی لینی شروع کر دی۔ آخر کار اسے بیڈ روم کی ایک دراز میں وہ سیاہ بکس بے پروائی سے رکھا ہوا مل گیا۔ اس نے اس کا ڈھکن کھولا . . . اور بڑبڑانے لگا۔ ڈبا خالی تھا۔ وہ دوبارہ کمرۂ نشست میں آیا جہاں اب تک اُس جسیم شخص کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس نے نیم دلی سے لاش کی جیبوں کی تلاشی لی اور کوٹ کی اندرونی جیب سے اس کا خوب پھولا ہوا پرس نکال لیا پھر اُسے کھولتے ہی اس کے مُنہ سے ایک نحیف سانس آزاد ہو گئی اور آنکھیں پرس میں موجود ہزار ڈالر والے پچاس نوٹوں پر جم کر رہ گئیں۔ گویا اوٹو غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ سان فرانسسکو کے جرائم پیشہ افراد کے ایک چھوٹے موٹے گروہ نے اس غیر اہم حنوط شدہ اُنگلی سے پچاس ہزار ڈالر کمائے تھے۔ وہ ایک بار پھر بیڈ روم تک گیا اور اُسے مناسب روشنی میں کھول کر اس کی مخملی تہہ اُکھاڑنے لگا۔ مخملی تہہ اُکھڑی تو اندر سے بغیر پالش کی ہوئی لکڑی کا فریم نمایاں ہو گیا۔ اس لکڑی پر بھی باہر کی طرح مُہر لگی ہوئی تھی اور اس پر کسی اُنگلی کا نشان ثبت تھا۔ گویا جب مُہر نرم تھی تو اس پر وہ اُنگلی رول کرنے کی صورت میں پھیر دی گئی تھی۔ اس طرح اس پر سالم اُنگلی کا نشان ثبت ہو گیا تھا لیکن جب اُنگلی اُس ڈبے میں موجود تھی تو اس کے باوجود ایسا کیوں کیا گیا تھا؟ اس نے جیب سے محدّب عدسہ نکالا اور اُنگلی کے نشان کا بغور معائنہ کرنے لگا۔ معاً اُسے ٹیلی فون کا خیال آیا اور اس نے بڑھ کر ریسیور اُٹھا لیا۔

"جمی . . ." نمبر ڈائل کرنے کے بعد وہ ماؤتھ پیس میں بولا۔ "میں ایک فنگر پرنٹ کی تفصیل بتا رہا ہوں . . . ذرا فائل دیکھ کر بتاؤ۔" اتنا کہہ کر اس نے جمی کو اس فنگر پرنٹ کی تیکنیکی تفصیل سے آگاہ کیا جسے بعد ازاں جمی نے دُہرایا اور وہ ریسیور تھام کر انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر بعد جمی کی آواز دوبارہ سُنائی دی۔

"ہماری فائلوں میں یہ فنگر پرنٹ موجود نہیں ہے۔ کیا میں واشنگٹن سے رابطہ ملاؤں۔ ان کے پاس سب سے بڑا ذخیرہ ہے۔ ہر وہ پرنٹ موجود ہے جو کبھی لیا گیا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔" پٹن نے رضامندی کا اظہار کیا۔ "میں اس نمبر پر تمھارے فون کا انتظار کروں گا لیکن جلدی کرو۔ یہ بے حد اہم معاملہ ہے۔"

"او کے . . ." جمی نے جواب دیا۔

پٹن نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور سگریٹ سُلگانے لگا۔ ابھی اس نے سگریٹ کے دو ہی کش لیے تھے کہ فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اُٹھا لیا۔ "کامیابی ہوئی؟" وہ ماؤتھ پیس میں بولا لیکن دوسری طرف سے بولنے والا جمی نہیں تھا۔ اس نے یہ آواز پہلے کبھی نہیں سُنی تھی۔ وہ یکبارگی چوکنا ہو گیا۔

"کیا تم اوٹو ہو؟" اجنبی نے دریافت کیا۔

"ہاں . . ." پٹن نے اپنی آواز اوٹو جیسی بنانے کی کوشش کی لیکن وہ جانتا تھا کہ اُسے کامیابی نہیں ہوئی ہے۔

"میں اوٹو سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ تم جیسے چوہے سے نہیں، کیا وہ موجود ہے؟"

"میں اوٹو بول رہا ہوں۔" اس نے دوبارہ کوشش کی۔

"کیا تم نے مجھے احمق تصور کیا ہے؟ اوٹو آئے تو اُسے کہنا کہ وہ مجھ سے فی الفور رابطہ قائم کرے۔" اس کے ساتھ ہی کلک کی آواز آئی اور رابطہ منقطع ہو گیا۔

اس نے ریسیور رکھ کر سینٹرل ٹیلیگراف کا نمبر ملایا اور آپریٹر کو اس کال کا پتہ چلانے کی ہدایت کر کے ریسیور رکھ دیا۔

اسی لمحے فون دوبارہ چیخ اُٹھا۔ اس دفعہ ہیڈ کوارٹر سے جمی مخاطب تھا۔ "معلوم ہوتا ہے، تمھارا دماغ اپنی جگہ سے تھوڑا سا کھسک گیا ہے، سارجنٹ۔" وہ قہقہہ مار کر بولا۔ "یہ دُرست ہے کہ واشنگٹن کی فائل میں یہ فنگر پرنٹ موجود ہے لیکن آج تک یہ شناخت نہیں ہو سکی . . . کہ یہ پرنٹ کس کا ہے۔ تقریباً آٹھ سال قبل سان فرانسسکو میں لیسٹر نامی ایک شخص چاقو مار کر ہلاک کر دیا گیا تھا۔ اس چاقو پر یہ فنگر پرنٹ پایا گیا تھا یعنی صرف اسی ایک اُنگلی کا پرنٹ اور بس . . . کیا تمھیں یقین ہے کہ تم صحیح راہ پر لگ گئے ہو؟"

"کیا اس کی تفتیش کی گئی تھی؟" پٹن نے اس کا آخری جملہ نظر انداز کر کے دریافت کیا۔

"ہاں . . ." جمی قدرے توقف کے بعد بولا۔ وہ واضح طور پر فائلیں کھنگال رہا تھا۔ "پولیس نے ایک شخص بیجر کو گرفتار کیا تھا لیکن دلچسپ اُمر یہ ہے کہ جب وہ گرفتار کیا گیا تو اُس کے ہاتھ کی وہ اُنگلی اُس کے پنجے سے ہی غائب تھی جس کا نشان آلۂ قتل پر پایا گیا تھا اور اس نے یہ ثابت کیا تھا کہ اس قتل سے دو ہفتے قبل ایک ڈاکٹر نے وہ اُنگلی اس کے پنجے سے کاٹ کر علیحدہ کر دی تھی کیوں کہ کسی زخم کی وجہ سے اس میں زہر پھیلنے لگا تھا۔ چنانچہ پولیس کو اسے رہا کرنا پڑا۔ حالانکہ انھیں یقین تھا کہ درحقیقت قاتل وہی تھا۔"

"کیا تم بیکر کے حلیے سے واقف ہو؟"

"نہیں۔۔۔ اس کے لیے سان فرانسسکو پولیس سے رابطہ قائم کرنا پڑے گا۔ کیا ان سے بات کروں؟"

"نہیں۔۔۔" پٹن نے ریسیور رکھ دیا۔

فون ایک بار پھر چیخ پڑا۔۔۔ اس نے ریسیور اُٹھا لیا۔ دوسری جانب سے سینٹرل ٹیلیگراف آفس سے آپریٹر بول رہا تھا۔ "وہ کال ہوٹل ایلائٹ سے کی گئی تھی۔ میں نے اس آپریٹر سے رابطہ قائم کیا تھا جس نے یہ کال ریسیو کی تھی۔ وہ کہتی ہے کہ اس کی سماعت سے اس قسم کے شور شرابے اور قہقہے کی آوازیں ٹکرائی تھیں گویا وہاں کوئی پارٹی ہو رہی ہو۔ میں نے ہوٹل کو چیک کیا۔ وہاں ٹیلی فون بوتھ کے چار سیکشن ہیں۔ ان میں سے ایک سیکشن ضیافتی ہال میں واقع ہے۔"

"ہوٹل ایلائٹ۔۔" وہ بڑبڑایا۔ یہ ایک بہت ہی عالی شان ہوٹل تھا اور وہاں تفتیش کرنا ایک مشکل اَمر تھا۔ اس نے ریسیور رکھ دیا اور کچھ دیر تک غور و فکر میں ڈوبا کھڑا رہا پھر جب عمارت سے نکل کر ٹیکسی میں بیٹھا تب بھی اس کی آنکھیں گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال لہرایا اور وہ مطمئن نظر آنے لگا۔۔۔

ٹیکسی کچھ دیر کے بعد ہوٹل ایلائٹ کے پارکنگ لاٹ میں رُک گئی اور وہ اُتر کر ہوٹل کی عظیم الشان لابی میں داخل ہو گیا۔ ڈیسک کلرک کی جانب بڑھتے ہوئے وہ ہلکے سُروں میں سیٹی بجا رہا تھا۔ ڈیسک کلرک خاصا مصروف نظر آ رہا تھا چنانچہ ایک بیل بوائے نے اس کی رہنمائی کی اور وہ اس کا شکریہ ادا کر کے لفٹ کی جانب بڑھ گیا۔ لفٹ میں ایک نیا بیل بوائے موجود تھا۔ جب پٹن نے ایک بڑا نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ میں تھمایا تو وہ اس کی ہدایت پر عمل کرنے پر تیار ہو گیا۔ لفٹ تیسری منزل پر رُکی اور وہ دونوں ساتھ ہی لفٹ سے برآمد ہوئے۔

ضیافتی ہال کے اندر سے مسلسل شور شرابے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس نے نیم وَا دروازے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا تو وہ پورا کھل گیا اور وہ اندر داخل ہو گیا۔ اُسی لمحے ایک کوتاہ قامت شخص تیزی سے اس کی جانب بڑھا۔ پٹن نے اسے اپنا بیج نکال کر دکھایا۔ "میں محض مہمانوں کا جائزہ لینے آیا ہوں۔ اگر تم نے لوگوں کو میری موجودگی سے آگاہ کیا تو زندگی بھر پچھتاؤ گے۔" اس کا لہجہ کافی تُند تھا۔

وہ شخص بادلِ نخواستہ مُڑ کر چلا گیا۔ اس کے ہونٹ سختی سے بھنچے ہوئے تھے۔ وہ ہوٹل کا کوئی ذمے دار کارکن تھا۔ بیل بوائے، پٹن کے شانے سے لگ کر کھڑا ہو گیا اور معنی خیز انداز میں سر ہلا کر بلند آواز میں پکارا۔ "مسٹر امیٹی امپ۔ سان فرانسسکو کے مسٹر امیٹی امپ۔"

"ہاں لڑکے کیا بات ہے؟" ایک نفیس شخص اپنی نشست سے اُٹھ کر متوجہ ہوا۔ "میں سان فرانسسکو سے آیا ہوں لیکن میرا نام براؤن ہے۔"

لیکن لڑکا غائب ہو چکا تھا۔ اس شخص نے حیرانی سے اپنے اردگرد کا جائزہ لیا اور کندھے اُچکا کر دوبارہ اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ پٹن خاموشی سے مہمانوں کے درمیان جگہ بنا کر آگے بڑھتا ہوا مسٹر براؤن کی پشت پر جا رُکا اور اس کے کندھے کو ہلکے سے تھپ تھپایا۔ براؤن نے اس کی طرف گردن موڑی۔

"اُنگلی۔۔" پٹن نے جھک کر سرگوشی کی۔ "ساتھ والے کمرے میں۔"

براؤن کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور اُن میں اُلجھن کے سائے لہرانے لگے۔ اس نے ایک رُکی رُکی سی سانس لی اور جلدی سے اُٹھ کر پٹن کے پیچھے چل پڑا۔ پٹن اس کی رہنمائی کرتا ہوا ایک خالی کمرے میں لے آیا۔۔۔ اور دروازہ مقفل کر کے براؤن کے سامنے بیٹھ گیا۔

"کیا بات ہے؟" براؤن کے لہجے میں تحیر تھا۔ "تم مجھے یہاں کیوں لے آئے ہو؟"

"کچھ اہم باتیں کرنی تھیں۔" پٹن نے عام سے لہجے میں جواب دیا۔ "پچاس ہزار ڈالر کے سلسلے میں۔"

"پچاس ہز۔۔۔ا۔۔۔ر۔ کیا تم کوئی دیوانے ہو؟"

"اب تک تو بالکل ٹھیک ہوں لیکن ممکن ہے جلد ہی بن جاؤں۔" پٹن نے مسکرا کر جواب دیا۔ "کبھی اوٹو وِنز کا نام سُنا ہے؟"

"اوٹو۔۔۔؟" براؤن اسے پاگلوں کی طرح گھورنے لگا۔ "سُنو مسٹر! تم جو کوئی بھی ہو۔ میں کسی اوٹو موٹو کو نہیں جانتا۔ نہ پچاس ہزار ڈالر کے بارے میں جانتا ہوں۔ نہ تمہیں جانتا ہوں اور نہ ہی یہ جانتا ہوں کہ تم مجھے یہاں لے کر کیوں آئے ہو۔ میرا نام آرتھر براؤن ہے۔ میں اس ہال میں منعقد ہونے والی پارٹی کا ایک اہم رُکن ہوں اور اگر۔۔۔"

پٹن نے اپنی مٹھی کھول کر اُسے ہتھیلی پر رکھا ہوا سُنہرا بیج دکھایا۔

"سُراغ رساں۔۔" اس کے لبوں نے ہلکی سی جنبش کی۔ "اوٹو نے تمہارے متعلق سب کچھ اُگل دیا ہے اور اب سان فرانسسکو میں برقی کُرسی تمہارا انتظار کر رہی ہے، بیکر!"

"بیکر۔۔۔؟" براؤن برہمی سے کہہ اُٹھا۔ "غالباً تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے آفیسر۔۔۔ میں تمہیں اپنی شناخت پیش کر سکتا ہوں اور کروں گا۔ یہ بیکر کون ہے؟"

"یہ وہ چوہا ہے جس نے چند سال قبل لیسٹر نامی ایک شخص کو قتل کیا تھا تو چاقو پر اپنی ایک اُنگلی کا بہت ہی واضح پرنٹ چھوڑ گیا تھا اور اپنی اِس حماقت سے وہ جلد ہی آگاہ ہو گیا تھا۔ غالباً چاقو کو صاف کرتے وقت اس پر بہت زیادہ گھبراہٹ طاری ہو گئی تھی۔ اس اُنگلی کا واحد پرنٹ اسے پھانسی پر لٹکا سکتا تھا، لہٰذا اُس نے ایک ڈاکٹر سے رابطہ قائم کیا اور اُنگلی علیحدہ کرا لی۔ اس صورت میں یہ اسکیم اور بھی کامیاب ثابت ہوتی ہے۔ جب ڈاکٹر بذاتِ خود یہ بیان دیتا ہے کہ اس نے وہ اُنگلی واقعۂ قتل سے دو ہفتے پہلے کاٹی تھی۔ اس کیس پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ پولیس، قاتل کی اُنگلی کا زخم تقریباً مندمل ہونے کے بعد ہی اس تک پہنچ سکی تھی۔ لہٰذا کسی کے لیے بھی یہ بتانا ناممکن تھا کہ اُنگلی ارتکابِ جرم سے پہلے نہیں کاٹی گئی تھی۔ یہ اُنگلی خاصی اہمیت کی حامل تھی۔ وہ ڈاکٹر اس کی اہمیت سے خوب واقف تھا اور قاتل کو بلیک میل کرنے کی استعداد بھی رکھتا تھا۔ چنانچہ اس نے اُنگلی کے عوض قاتل سے پچاس ہزار ڈالر کا مطالبہ کیا۔ یہ رقم ادا کر دو یا برقی کُرسی کو اپنا مقدر بنا لو۔ اُس کے مطالبے نے تمہیں کافی پریشان کر دیا ہو گا۔ ہے نا بیکر؟"

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔" براؤن کے لہجے میں اصرار تھا لیکن پٹن اس کی آنکھوں میں خوف کی ایک جھلک دیکھنے میں کامیاب ہو گیا۔

"نہیں۔۔۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں۔" پٹن نے پُر زور لہجے میں تردید کی۔ "میں تمہیں بتاؤں کہ تم نے اس اُنگلی کے حصول کے عوض سرجن کو پچاس ہزار ڈالر ادا کیے تھے اور اوٹو تمہارے اس راز سے آگاہ ہو گیا تھا۔ تم نے ڈاکٹر کو وہ اُنگلی یہاں بھیجنے کی ہدایت کی اور اس نے تمہاری ہدایت کے عین مطابق تمہاری اُنگلی ایک خصوصی ایلچی کے ذریعے یہاں بھیج دی۔ وہ ایلچی یہاں پہنچا تو اوٹو کے آدمی نے جو کہ وہیں سے اس کے پیچھے لگا ہوا تھا، اُسے گولی مار دی لیکن اُنگلی حاصل کرنے سے پہلے ہی وہ ایک گشتی سپاہی کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ تاہم وہ اُنگلی اوٹو تک پہنچ گئی اور پھر اُس نے تمہیں بلیک میل کیا۔ تم نے آج ہی اُسے پچاس ہزار ڈالر ادا کیے ہیں اور اس کے عوض اُس نے اُنگلی تمہیں لوٹا دی ہے لیکن اُس نے تمہیں صحیح اُنگلی نہیں لوٹائی۔۔۔ وہ اُنگلی اِس وقت میری جیب میں ہے اور وہ سیاہ ڈبا بھی، جس میں تمہارے سرجن دوست نے وہ اُنگلی حنوط کر کے محفوظ کر رکھی تھی۔ اوٹو نے دوسری اُنگلی کہیں سے حاصل کی ہو گی تاکہ تمہیں اصلی اُنگلی کے عوض دوبارہ بلیک میل کر سکے۔"

"تم۔۔۔" براؤن اس کی جانب اُنگلی اُٹھا کر چیخا۔ "تم۔۔۔ تم پاگل معلوم ہوتے ہو۔ پہلے تم نے مجھے بیکر بنایا پھر کہا کہ میں نے ایک شخص کو قتل کیا ہے اور اب کہہ رہے ہو کہ تمہارے پاس میری ایک اُنگلی موجود ہے۔ ایک اُنگلی۔۔۔ اور میں تمہیں بتاؤں کہ میرے ہاتھوں میں پوری دس اُنگلیاں ہیں۔ ایک کم نہ زیادہ۔" اس نے اپنے دونوں ہاتھ پٹن کے سامنے پھیلا دیئے۔

پٹن کا دل بیٹھنے لگا۔۔۔ اُس کے ہاتھوں میں واقعی دس اُنگلیاں تھیں لیکن دائیں ہاتھ کی پہلی اُنگلی میں سونے کی انگوٹھی پڑی ہوئی تھی۔ "تم نے مجھے تقریباً قائل کر دیا ہے۔" پٹن مایوس لہجے میں بولا۔ "اب ذرا اپنی اُنگلی سے یہ انگوٹھی اُتار دو تاکہ میرے قائل ہونے میں جو کسر رہ گئی ہے، وہ پوری ہو جائے۔ میں مصنوعی ٹانگوں اور بازوؤں کے بارے میں جانتا ہوں۔ ممکن ہے مصنوعی اُنگلیاں بھی جوڑی جاتی ہوں۔"

"تم بے شک دیکھ سکتے ہو۔" براؤن اپنے ہاتھ سینے پر لے جا کر اس اُنگلی سے انگوٹھی نکالنے لگا لیکن یہ ایک تکلیف دہ اَمر تھا، جس کا اظہار اُس کے چہرے کے تاثرات سے ہو رہا تھا۔ پٹن کی نگاہیں اُس کے ہاتھوں پر جمی ہوئی تھیں۔ اگر وہ اُس کے چہرے کی جانب دیکھ رہا ہوتا تو چوکنا ہو جاتا، جو کہ سخت نفرت اور غصّے کی ملی جلی کیفیت کے تحت بگڑ گیا تھا۔ اچانک اُس کا دایاں ہاتھ کوٹ کی اندرونی جیب میں رینگ کر نکل آیا اور اُس میں ایک پستول دبا ہوا تھا۔

پٹن کے لیے کوئی راہِ فرار نہ تھی۔

"بے حس و حرکت بیٹھے رہو۔" براؤن نے للکارا۔ "تم سُراغ رساں نہیں ہو بلکہ کوئی ذہنی مریض ہو۔ میں کسی کو بُلا کر تمہیں اس کے حوالے کر دوں گا لیکن اگر تم نے ذرا سی بھی حرکت کی تو بے دریغ گولی مار دوں گا۔"

"رہنے بھی دو بیکر۔" پٹن استہزائیہ لہجے میں بولا۔ "میں جانتا ہوں تمہاری یہ اُنگلی مصنوعی ہے۔ ذرا اپنی اُنگلیوں کی جانب دیکھو۔ تم نے پستول کا ٹریگر درمیانی اُنگلی سے دبا رکھا ہے۔ تم پہلی اُنگلی استعمال کیوں نہیں کرتے؟"

"لعنت ہو تم پر۔" براؤن غصّے سے پھنکارا۔ اس کے چہرے پر چڑھا ہوا شرافت کا خول اُتر چکا تھا۔ اَب وہ لندن کے گھٹیا ترین جرائم پیشہ اور قاتل کے رُوپ میں نظر آ رہا تھا۔ "اپنی جیب سے وہ ڈبا اور اُنگلی خاموشی سے نکال کر رکھ دو۔" وہ غرایا۔ "لیکن اگر اس دوران کوئی حماقت

اپنا قد بڑھایئے
ایس ایس کے استعمال سے چھوٹے قد کی عورتیں اور مرد اپنا قد ایک انچ سے تین انچ تک بڑھ سکتی ہیں۔ جدید آزمودہ ایس ایس کی صرف ۴۵ گولیوں کا کورس استعمال کر کے اپنا قد ۳ انچ تک بڑھایا جا سکتا ہے۔ بے ضرر ہے۔ قیمت ۵۰/- روپے
موٹاپا ہمیشہ کیلئے ختم کیجئے
ایس سی کریم استعمال کر کے موٹاپا ہمیشہ کیلئے ختم کریں۔ کمر جتنی پتلی ہو گی عمر اتنی ہی طویل ہو گی۔ ایس سی کریم پیٹ، کولہے اور جسم کے کسی بھی حصے کا موٹاپا دور کر کے جسم کو دبلا، پتلا اور سیڈول بناتا ہے۔
بے ضرر ہے۔۔۔ قیمت ۵۰/- روپے۔ خط لکھ کر منگا لیجئے
پتہ:- وکٹر انٹرنیشنل پوسٹ بکس ۶۱۳۱ کراچی ۱

کرنے کی کوشش کی تو یاد رہے کہ یہاں آرکسٹرا کی موسیقی زور شور سے گونج رہی ہے۔ کوئی بھی میری گولی چلنے کی آواز نہیں سُن سکے گا۔ اب نیک بچے کی طرح میری ہدایت پر عمل کرو۔"

پٹن نے آہستہ سے اپنا ہاتھ کوٹ کی جیب میں داخل کیا اور سیاہ ڈبا نکال کر میز پر رکھ دیا۔ بیکر آہستہ آہستہ قریب آگیا۔

"اب اُلٹے قدموں چلتے ہُوئے دیوار سے لگ جاؤ۔" اُس نے تحکم آمیز لہجے میں کہا۔ "اس دوران تمھارے ہاتھ اُوپر اُٹھے ہُوئے ہونے چاہئیں۔ مَیں ڈبا کھول کر دیکھنا چاہتا ہُوں۔" وہ ڈبا اُٹھا کر جائزہ لینے لگا۔ "مجھے اسی چیز کی ضرورت تھی۔ دیکھتا ہُوں، اُس چوہے اوڈو نے مجھ سے کیسی چال چلنے کی کوشش کی ہے۔ مَیں اس نقلی اُنگلی کو اُس اُنگلی کے ساتھ ہی جلا ڈالوں گا تو میرے اور تمھارے سوا کوئی بھی اس راز سے آگاہ نہیں ہو سکے گا اور تم کبھی بھی اپنی زبان نہیں کھولو گے۔"

"ممکن ہے، ڈبا اندر سے خالی ہو۔" پٹن نے کہا۔ وہ بہرحال اس قاتل سے خوف زدہ تھا۔ وہ واقعی اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنا کر پُرہجوم اور پُرشور ہوٹل سے بہ آسانی نکل سکتا تھا۔

"تمھارا مطلب۔۔۔؟" بیکر نے اس کی جانب دیکھا اور اس کی آنکھوں میں ایک لحظے کے لیے خوف اُتر آیا۔

"مطلب یہ کہ ممکن ہے، مَیں نے وہ اُنگلی ہیڈکوارٹر بھیج دی ہو۔"

"اگر تم نے ایسا کیا ہے۔" براؤن ایک ایک لفظ پر زور دیتا ہُوا بولا۔ "تو یقین کرو کہ مَیں تمھیں اسی جگہ گولی مار دوں گا اور گھنٹوں تمھاری لاش کا پتہ نہیں چل سکے گا۔" اس دوران اس کا بایاں ہاتھ ڈبے کو کھولنے میں مصروف تھا لیکن یہ ممکن نہ تھا اور پٹن اس سے بخوبی آگاہ تھا۔ بیکر نے ڈبے کو واپس میز پر رکھ دیا اور پستول پر اپنی گرفت برقرار رکھ کر ڈبے پر دوبارہ طبع آزمائی کرنے لگا۔ اس کوشش میں اس کے پستول کا رُخ فرش کی جانب ہو گیا۔۔۔ پٹن نے ایک گہری سانس لی اور بجلی کی مانند تڑپ کر بیکر کو ایک شدید ٹکر ماری۔ پستول بیکر کے ہاتھ سے چھوٹ کر دُور جا گرا اور وہ خود بھی اُچھل کر دیوار سے جا ٹکرایا لیکن دوسرے ہی لمحے حیرت انگیز پھرتی سے خنجر نکال کر پٹن پر چھلانگ لگائی۔ پٹن نے دائیں جانب جُھکائی دے کر اُس کا وار خالی دیا اور اس کی کلائی پکڑ کر خنجر کا رُخ اُسی کے چہرے کی جانب کر کے جھٹکا دیا تو تیز خنجر اس کے رُخسار پر زخم کا ایک لمبا نشان بناتا ہُوا، اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دُور جا گرا۔ اس کے ساتھ ہی پٹن نے اس کے جبڑے پر پُوری قوت سے گھونسا مارا۔ وہ دُور تک قلابازیاں کھاتا چلا گیا اور پھر نہ اُٹھ سکا۔ اس کا جبڑہ ٹوٹ گیا تھا اور وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ پٹن اُسے چھوڑ کر فون کی جانب بڑھا اور ہیڈکوارٹر کا نمبر ڈائل کر کے کیپٹن برونس کو داستان سُنانے لگا۔

"بیکر قاتل ہے۔ اس نے سان فرانسسکو میں لیسٹر نامی ایک شخص کو قتل کیا تھا لیکن ایک ڈاکٹر کے ذریعے اپنے دائیں ہاتھ کی وہ اُنگلی کٹوا لی تھی جس کا فنگر پرنٹ آلۂ قتل پر پایا گیا تھا اور اس طرح بری الذمہ قرار پایا تھا لیکن ڈاکٹر جرائم کی دُنیا میں اس کی واپسی کا منتظر تھا اور جب بیکر جرائم کی دُنیا میں ایک نئی شخصیت کے ساتھ اُبھرا تو اس نے اُسے بلیک میل کرنے کی ٹھان لی کیوں کہ اس نے اس کی وہ کٹی ہُوئی اُنگلی اسی مقصد سے حنوط کر کے اپنے پاس محفوظ کر لی تھی۔ آخر کار معاملہ پچاس ہزار ڈالر میں طے پایا اور اس نے بیکر کی ایما پر ایک خصوصی ایلچی کے ذریعے وہ اُنگلی اُسے بھجوا دی لیکن اس دوران اوڈو کو اس کی بھنک مل گئی۔ وہ اس معاملے میں کُود پڑا اور اس کے ایک گرگے نے اس ایلچی کو گولی مار دی لیکن اوبرین نے اس گرگے کو ہلاک کر دیا اور وہ اُنگلی میرے قبضے میں آگئی لیکن اس کے دوسرے ساتھیوں نے وہ اُنگلی مجھ سے چھین کر مجھے اسپتال پہنچا دیا۔"

"اس وقت تم کون سے اسپتال سے بول رہے ہو؟" کیپٹن نے دریافت کیا۔

"پہلے مجھے پُوری بات مکمل کر لینے دو۔" پٹن نے جواب دیا۔ "ہاں تو اوڈو نے وہ اُنگلی حاصل کر لی اور بیکر کو دکھا کر اس سے پچاس ہزار ڈالر کا مطالبہ کیا جو اُس نے ادا کر دیا لیکن ڈاکٹر نے ایک عقلمندی یہ کی تھی کہ ڈبے کے مخملی تہ کے نیچے لکڑی پر مہر پگھلا کر اس پر اس اُنگلی کا پرنٹ ثبت کر دیا تھا تا کہ بیکر اس کی جگہ کوئی دوسری اُنگلی پیش کر کے اُسے جُھٹلا نہ سکے کہ اُس نے اصل کی بجائے کوئی دوسری اُنگلی اُسے بھیجی تھی۔ جب ہم ڈاکٹر کو پکڑیں گے تو ہمیں بہرحال اس کا شکریہ ادا کرنا پڑے گا کیوں کہ اسی نکتے نے مجھے صحیح راہ دکھائی تھی۔"

شکیل صدیقی

پیمانۂ نفرت

ایک خط سے شروع ہونے والی خوفناک کہانی۔ مکتوب الیہ یہ خط پڑھ کر ایسی راہ پر چل نکلتا ہے جہاں پھانسی کا پھندا منتظر تھا

مَیں اسٹیڈیم میں جس جگہ بیٹھا تھا وہاں سے میرے دفتر کی عمارت واضح طور پر نظر آ رہی تھی۔ میرا دھیان اُسی طرف تھا اور مَیں چاہنے کے باوجود کھیل میں دلچسپی نہیں لے پا رہا تھا۔ نہ جانے کیوں میری کیفیت اضطراب آشنا ہو رہی تھی۔ کھیل ختم ہُوا تو مَیں دل میں اضطراب سمیٹے، دفتر آ گیا اور کمرے میں داخل ہوتے ہی دروازے کے قریب، فرش پر پڑے ہُوئے ایک لفافے نے میری توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ مجھے حیرت نہیں ہُوئی بلکہ اس اضطراب کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ مَیں نے لفافہ اُٹھا کر کھولا۔ اس میں ایک خط تھا اور پچاس ڈالر کے چھ نوٹ اس سے نتھی کیے ہُوئے تھے۔ مَیں نے خط کھول کر پڑھا۔ تحریر تھا:

"ڈیئر مسٹر ڈکس! اس سے قبل کہ وہ مجھے ہلاک کر دے، فوراً میرے پاس پہنچ جاؤ۔ میری نگرانی کی جا رہی ہے۔ اگر تم میری مدد کر سکو، تو یہ رقم تمھاری ہے۔ مزید رقم کی توقع بھی کر سکتے ہو۔ فوراً پہنچو۔

وقار اعظم

فقط گاڈفرے ہارنی۔"

میں نے وقت دیکھا۔ کافی دیر ہو چکی تھی۔ اُس کے زندہ ہونے کا امکان کم تھا لیکن تین سو ڈالر میری رگوں میں گردشِ خون تیز کرنے کے لیے کافی تھے۔ میں اُلٹے قدموں 'سب وے' کی جانب دوڑ پڑا۔

جب میں خط میں درج پتے پر پہنچا تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ ابھی میں ٹلسٹن ایونیو پر واقع اس مکان سے نصف بلاک کے فاصلے پر تھا کہ مکان کا دروازہ ایک دھماکے سے کھلا اور دو عورتیں عالمِ بدحواسی میں بُری طرح چیختی ہوئی نیم تاریک سڑک پر بے تحاشہ دوڑتی نظر آئیں۔ میں تیزی سے دوڑتا ہوا اُن تک پہنچا۔ "دوڑو... پکڑو... اُسے پکڑو۔" ایک عورت 'ایسٹ چیسٹر اسٹریٹ' کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ہذیانی انداز میں چیخ پڑی۔

میں نے بوکھلا کر اس طرف دیکھا لیکن اِرد گرد کسی متنفس کا نام و نشان تک نہیں تھا اُلبتہ ایک کار ضرور موڑ کاٹ رہی تھی۔ میں کار کے پیچھے ہی بگٹٹ بھاگ اُٹھا لیکن کسی تیز رفتار کار سے مقابلہ کرنا انسان کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ شام کے پھیلتے ہوئے اندھیرے میں، میں اس کی لائسنس پلیٹ تک پڑھنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اسی لمحے دو افراد دوڑتے ہوئے میرے قریب آ گئے۔ میں ان سے کہنا چاہتا تھا کہ کار کے پیچھے بھاگنے کا کوئی فائدہ نہیں لیکن میرے بولنے سے قبل ہی وہ مجھ پر ہلہ بول چکے تھے۔ نتیجتاً ہم تینوں سڑک پر اس طرح گرے کہ میں سب سے نیچے تھا۔ "پکڑ لیا..." اُن میں سے ایک چیخا اور دونوں اُٹھ کر مجھے مہلت دیے بغیر گھسیٹتے ہوئے اُن دونوں خواتین تک لے گئے۔ اس وقت تک بہت سارے پڑوسی ہمارے گرد جمع ہو چکے تھے اور ہم تینوں ہی ہانپ رہے تھے۔ "مس میرس! کیا یہ وہی ہے؟" ان میں سے ایک نے خاتون کو مخاطب کیا۔

"ہاہاہا... ہاہاہا..." وہ خاتون ہسٹیریائی انداز میں چیخنے لگی۔ ... دوسری خاتون نے اپنا چہرہ دستانہ پوش ہاتھوں سے چھپا کر تیزی سے اثبات میں سر ہلایا۔

"یہ اپنے حواس میں نہیں ہے۔" میں نے چیخ کر احتجاج کیا۔ "اس کا اشارہ میری طرف نہیں ہے۔"

مجھے گھسیٹ کر لانے والوں نے مجھ پر ایک ناقدانہ نگاہ ڈالی اور کہا۔ "تو پھر تم اتنی تیزی سے کیوں دوڑ رہے تھے؟"

میں نے اُسے جواب دینے کی بجائے ایک خاتون کا بازو تھام لیا۔ "کیا گاڈفرے ہارنی یہیں رہتا ہے؟"

ایک شخص سینہ تان کر ہمارے درمیان آ گیا تو میں اس کی گردن کے عقب سے چیخا۔ "مجھے گاڈفرے سے ملنا ہے۔"

"ہاہاہا... ہاہاہا..." وہ خاتون دوبارہ ہسٹیریائی انداز میں چیخنے لگی۔ جب کہ دوسری، پُرسکون دوشیزہ نے اپنی کٹورے جیسی آنکھیں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔ "درندے... تم نے مسٹر ہارنی کو کیوں قتل کیا؟" وہ دانت پیس کر چیخی۔ اُسی لمحے ایک پولیس کار قریب آ کر رُک گئی اور اس سے دو پولیس والے... پھلی میں سے مٹر کے دانوں کی مانند اُچھل کر نمودار ہوئے۔ میرے دونوں فاتحین نے مجھے بازوؤں سے جکڑ لیا تو مجمع میرے اور پولیس کے سپاہیوں کے گرد، ٹوٹی بوتل میں سے بہتی ہوئی بیئر کی مانند پھیلنے لگا۔ دونوں مجھے کالر سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے ہارنی کے مکان میں لے گئے۔

گاڈفرے ایک اونچی پُشت والی کُرسی پر سکون سے براجمان تھا اور اس کے سینے میں ایک قلم تراش چاقو دستے تک پیوست تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور ان میں حیرت سمٹ کر منجمد ہو گئی تھی۔ اس کے عقب میں کافی فاصلے پر کھلی کھڑکی کا ریشمی پردہ گرم ہوا کے جھونکوں سے پھڑپھڑا رہا تھا اور خاصے فاصلے پر واقع اس پارکنگ لاٹ کا دلکش منظر پیش کر رہا تھا جو اس وقت سنسان تھا اور شہر کی نیون سائن کی روشنیوں میں غیر واضح نظر آ رہا تھا... دونوں خواتین سُنہری زلفوں کی مالک تھیں اور اپنی اپنی جگہ دہشت سے گنگ تھیں۔ ان کے چہروں پر خوف اس طرح جم گیا تھا کہ اسے چاقو سے کاٹ کر علیٰحدہ کیا جا سکتا تھا۔ ان میں سے ایک 'ڈورا میرس'، جو کہ اس گھر کی ملازمہ تھی، ان عورتوں میں سے ایک نظر آتی تھی جو دروازہ بند ہونے کی آواز سُن کر دہشت سے اُچھل پڑتی ہیں۔ اس کی چینیوں جیسی نیلی، بڑی اور نرم و ملائم آنکھیں، پولیس آفیسر پر جمی ہوئی تھیں اور ہاتھ کی مضطرب اُنگلیاں، زلفوں سے اُلجھ رہی تھیں۔ دوسری خاتون میری جانب گاہے بہ گاہے مشتبہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ عُمر میں ملازمہ سے بڑی نظر آتی تھی۔ تقریباً تیس سال کی رہی ہو گی۔ خوف نے اس کی حالت خراب کر رکھی تھی۔ چہرے کا میک اپ اس کے سفید دستانوں میں منتقل ہو گیا تھا۔ اس نے اپنا نام کلیئر بوہیم بتایا تھا۔ وہ مس ڈورا کی سہیلی تھی اور دونوں کا سراپا سوئمنگ سُوٹ کے اشتہار کے لیے مناسب ترین تھا۔

جب ہومی سائیڈ اسکواڈ والے پہنچے تو میں پھپھوندی لگے فرنیچر سے آراستہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ دیو قامت، گنجا، سُرخ رُو لیفٹیننٹ ہنری دندناتا ہوا کمرے میں گھس آیا۔ اُس کے بازو فضا میں لہرا رہے تھے۔ "میڈیسن ڈکس! کیا تمہیں اس سلسلے میں مدعو کیا گیا تھا؟" اس نے مجھ سے سوال کیا۔

میں نے اس پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ اس کی آنکھوں میں تمسخر جھلک رہا تھا۔ "لوگوں کا خیال ہے کہ میں نے اس بڈھے کو قتل کیا ہے۔" میں نے کہا۔

اُس کی آنکھوں سے وہی تنفر جھلکنے لگا جسے وہ ہمیشہ مجھ پر نچھاور کرنے کے لیے محفوظ رکھتا تھا پھر وہ پولیس کے سپاہی کی جانب مُڑا۔ "کیا تم نے اس شخص کو پکڑ رکھا ہے؟"

"ہاں۔ ان خواتین میں سے ایک کہتی ہے کہ..."

"کوئی بات نہیں۔" اس نے ہاتھ لہرا کر اس کا جملہ کاٹ دیا اور ان دو خواتین کے سامنے جا کھڑا ہوا جو اب سر سے پیروں تک کانپ رہی تھیں اور ان کے چہرے زرد پڑ چکے تھے۔ "کیا یہی ہے وہ شخص جسے تم نے دیکھا تھا؟"

ملازمہ نے بے بسی سے اپنی سہیلی کی جانب دیکھا تو سہیلی بے بسی سے میری جانب دیکھنے لگی۔ "ان آدمیوں نے اسی کو پکڑا تھا۔"

"لیکن قاتل کو ان لوگوں نے نہیں بلکہ تم نے دیکھا تھا... کیا یہ وہی ہے؟"

کلیئر بوہیم نے اپنا ایک دستانہ پوش ہاتھ رُخسار پر رکھ کر ملازمہ پر متذبذب نگاہ ڈالی۔ "ہم نے صرف اس کی پُشت دیکھی تھی۔" وہ ہچکچا کر بولی۔ "وہ اس جیسا نہیں تھا۔ ہے نا ڈورا؟"

مس ڈورا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ہنری نے ہاتھ اُٹھا کر اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ "ٹھیک ہے، ہم شروع سے اس واقعے کا جائزہ لیتے ہیں۔ تم فلم دیکھ کر ایک ساتھ یہاں آئیں تو کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور کوئی شخص اس کے ذریعے فرار ہو رہا تھا پھر وہ بھاگتا ہوا ایسٹ چیسٹر روڈ کے پارکنگ لاٹ تک جا پہنچا۔ تم نے مسٹر ہارنی کو دیکھا جس کے سینے میں چاقو پیوست تھا۔ ہمارے ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ اسے ایک دو منٹ قبل ہلاک کیا گیا ہے۔ تم دونوں گھر سے نکل کر مدد کے لیے چیختی ہوئی سڑک پر دوڑنے لگیں۔"

"اور عین اسی وقت میں اس منظر میں شامل ہوا تھا۔" میں بول پڑا۔ ہنری خاموش رہا تو میری ہمت بڑھی۔ "کلیئر چیخ کر اُس شخص کو پکڑنے کی ہدایت کر رہی تھی۔ میں نے ایک بیوک روانہ ہوتے دیکھی لیکن اس تک پہنچنے میں ناکام رہا۔ دو پڑوسیوں کو میرے بارے میں مغالطہ ہو گیا اور وہ میرے پیچھے دوڑ پڑے۔" میں نے اُسے حقیقتِ حال سے آگاہ کیا۔

"تو یہ وہ شخص نہیں ہے۔ کیوں؟" ہنری نے خواتین کی جانب استفہامیہ نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔ "تم دونوں نے قاتل کو دیکھا تھا لہٰذا مجھے قاتل کا صحیح حلیہ بتاؤ۔"

"وہ دراز قامت تھا۔" ڈورا پلکیں جھپکا کر منمنائی۔

"قدرے موٹا بھی تھا۔" اس کی سہیلی کلیئر نے ٹکڑا لگایا۔ "اور اُس نے سبز مائل بھورا ہیٹ پہن رکھا تھا۔ ہے نا ڈورا؟"

ملازمہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اُس کا سُوٹ ڈھیلا ڈھالا تھا۔" کلیئر ذہن پر زور دیتے ہوئے بولی پھر ایک لمحے توقف کے بعد مزید کہا۔ "اس کا رنگ بھورا تھا... مجھے اتنا ہی یاد ہے کیوں کہ یہ سب کچھ بہت عجلت میں پیش آیا تھا۔"

ہنری، مس ڈورا کی جانب متوجہ ہوا۔ "تم ہارنی کے بارے میں کیا جانتی ہو؟"

"وہ کسی پریشانی میں مبتلا تھا۔" اس نے نگاہ اُٹھا کر ہنری کی جانب دیکھا۔ "شاید کسی سے خائف تھا۔ اکثر خود کلامی کیا کرتا تھا۔"

"کس سے خائف تھا؟"

"ایک شخص سے جو قید میں ہے... لیکن یہ میرا قیاس ہے۔" اس نے انکشاف کیا۔

"اس کا نام؟"

"ویبس یا اسی طرح کا کوئی نام ہے۔ مسٹر ہارنی کو اس بات کا خوف تھا کہ ویبس انھیں قتل کر دے گا۔"

ہنری نے اپنا نچلا لب دانتوں تلے دبا لیا۔ "لیکن ویبس اُسے کیوں قتل کرنا چاہتا تھا؟" اس نے دریافت کیا۔

"میں نہیں جانتی۔"

ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی۔ یوں محسوس ہوا کہ سوال اور جواب کا باب ختم ہو گیا ہو... ہنری کے چہرے پر برہمی کے واضح آثار تھے۔ اس نے اُنگلی سے میری جانب اشارہ کیا۔ "تم اس معاملے میں کس طرح ملوث ہوئے؟"

میں نے جیب سے وہ خط اور تین سو ڈالر نکال کر اس کے حوالے کر دیے جو میری جیب میں انگاروں کی طرح دہک رہے تھے۔ ہنری نے خط کے مضمون کا سرسری جائزہ لیا۔ "ہوں..." اس کے مُنہ سے غراہٹ نکلی۔ "تمہارا مؤکل شدید خطرے سے دوچار تھا۔" اس کا لہجہ مزید سرد ہو گیا۔ اُسی لمحے ایک سپاہی کمرے میں داخل ہوا۔ "کیا ملازمہ کو اس کی سہیلی کے ساتھ رہنے کی اجازت دے دی جائے؟" اس نے دریافت کیا۔

"انھیں جانے دو۔" ہنری نے حکم دیا۔ "لیکن نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دینا۔" وہ میری جانب مُڑا۔ "اب تمہارے کیا ارادے ہیں؟"

"میں اپنی فیس حلال کرنا چاہوں گا۔" میں نے جواب دیا۔

اس کے چہرے پر شکنیں پڑ گئیں۔ "ٹھیک ہے لیکن میری راہ

میں روڑے اٹکانے کی کوشش نہ کرنا۔" وہ مجھے خونخوار نظروں سے گھورتا ہوا بولا اور فون کی جانب بڑھ گیا پھر کوئی نمبر ڈائل کر کے ماؤتھ پیس میں تیزی سے بولنے لگا۔ "دو باتوں کا پتہ چلاؤ۔ سرِدست اتنی ہی معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ ایک نام ہے ویبس۔ آخری حصہ نامعلوم ہے۔ وہ جیل میں ہے... یا تھا۔ یہ معلومات حاصل کر کے مجھے اطلاع دو۔" وہ ریسیور رکھ کر میری جانب مڑا۔ "تم نے اس سے قبل ہارنی کو کبھی نہیں دیکھا تھا؟"

"زندہ نہیں دیکھا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد فون چیخ اٹھا۔ ہنری نے بڑھ کر ریسیور اٹھا لیا اور چند لمحوں تک دوسری جانب سے کی جانے والی گفتگو سن کر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "ویبس کا پورا نام ہیوگو ویبس ہے۔ لگتا ہے کہ وہ آس پاس ہی کہیں، ہماری ناک کے عین نیچے موجود ہے۔" پھر خاموشی سے گفتگو سننے کے بعد اس نے ریسیور رکھ دیا۔ "اچھا تو ڈکس... پس منظر یہ ہے کہ ہیوگو ویبس کو سات سال سے دس سال تک کی سزا سنائی گئی تھی جس میں سے اس نے پانچ سال کاٹے تھے۔ اس نے حسابات میں کوئی گڑبڑ کی تھی... اس کے مالک نے اسے مجرم قرار دیا اور قانونی معاملات کی مکمل پیروی کی تھی۔ تم اس کے آجر کو تو جانتے ہی ہو گے؟"

"گاڈفرے ہارنی؟" میں نے دریافت کیا۔

اس نے تائید یا تردید کی ضرورت نہیں سمجھی اور اپنا بیان جاری رکھا۔ "اس کا مالک کنوارا تھا۔ بظاہر اچھا انسان نہیں تھا۔ ویبس شادی شدہ ہے لیکن اس کی بیوی کے بارے میں کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے۔ ان لوگوں نے اس کا اتا پتہ کھو دیا ہے۔"

"کیا تمھیں ویبس کا حلیہ معلوم ہوا؟"

"ہاں... عمر پینتیس سال، قد پانچ فٹ دس انچ، جسم موٹاپے کی طرف مائل، بے حد جذباتی، بھورے ہوتے ہوئے بال، جگہ جگہ گنجے پن کے نشانات۔ کیا ان خواتین نے ایسا کوئی شخص تو نہیں دیکھا تھا؟"

"انھوں نے صرف ایک ایسے شخص کی پشت دیکھی تھی جو سبزی مائل بھورے ہیٹ اور ڈھیلے ڈھالے بھورے سوٹ میں ملبوس تھا۔" میں نے جواب دیا۔

اس کے تھوڑی ہی دیر بعد جب میں گھوم پھر کر مکان کا جائزہ لے رہا تھا تو ہنری میرے پاس آیا۔ "میں اس کیس میں تم سے کام لینا چاہتا ہوں۔" اس نے کہا۔ "کلیئر بوہیم کی نگرانی کرنے والے سپاہی نے ابھی ابھی فون پر بتایا ہے کہ ان میں سے ایک چند لمحے پیشتر نیچے اتری ہے۔ یہ پتہ لو اور اس اپارٹمنٹ کے آس پاس موجود رہو۔ سپاہی اس کے تعاقب میں روانہ ہو چکا ہے۔"

"او۔ کے..." میں نے کہا اور مکان سے نکل گیا۔ وہ اپارٹمنٹ قریب ہی فشر ایونیو پر واقع تھا۔ رات کے دس بج رہے تھے اور مجھے بھوک ستانے لگی تھی۔ اسی لمحے میری نگاہ مس ڈورا پر پڑی جو واپس آ رہی تھی۔ اس کا جسم تنا ہوا تھا۔ وہ میری جانب متوجہ ہوئے بغیر سیدھی اپنے اپارٹمنٹ میں داخل ہو گئی۔ اس کا تعاقب کرنے والا سپاہی دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا میرے قریب آ گیا اور اس نے میری جانب دیکھ کر سر ہلایا۔ "یہ کہاں گئی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"دو بلاک دور..."

"کس لیے؟" میں نے سوال کیا۔

"یہ تو میں نے اس سے نہیں پوچھا۔ وہ ایک پیکٹ لے کر آ تھی۔ میرا خیال ہے، وہ لانڈری کا پیکٹ تھا۔" اس نے وضاحت اور ایک پتہ میری جانب بڑھا دیا۔ میں اس سے پتہ لے کر روانہ ایک بورڈنگ ہاؤس کا پتہ تھا۔

میں نے اطلاعی گھنٹیوں کے ساتھ لگی ہوئی نیم پلیٹس کو پڑھا لیکن کوئی بھی نام میرے پلے نہیں پڑا۔ میں نے اندر جا کر پہلے درو کو آزمایا اور صاحبِ خانہ سے پوچھا کہ کیا مس ڈورا غلطی سے یہاں پیکٹ چھوڑ گئی ہے؟ جواب نفی میں ملا۔ میں نے مزید دو دروازوں پر قسمت آزمائی لیکن وہاں سے بھی وہی جواب ملا۔ میں نے دوسری منزل کا رخ کیا۔ یہاں بھی کوئی مس ڈورا سے واقف نہیں تھا... تیسرے فلور پر مجھے کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی کیوں کہ وہ پیکٹ مجھے ایک دروازے کے باہر رکھا نظر آ گیا تھا۔ کرد گرس لانڈری کا مجرایا ہوا تازہ ترین پیکٹ تھا اور اس کا کاغذ دبیز تھا۔ میں نے اطلاعی گھنٹی بجائی لیکن جواب ندارد... ایسے میں میں ہر احتیاط بالائے طاق رکھ دیتا ہوں۔ سو اس وقت بھی میں نے ایسا ہی کیا اور انگلی کے ذریعے پیکٹ کا ایک کونہ پھاڑ کر دیکھا تو سے چند زیرِ جامے، قمیص، ایک سبزی مائل بھورا ہیٹ اور ایک بھورے رنگ کا سوٹ برآمد ہوا... یہ بات طے تھی کہ سوٹ ڈھیلا ڈھالا گا۔ چنانچہ میں نے اسے نہیں چھیڑا پھر میں نے جیب سے چابیوں کا ایک گچھا نکال کر قفل میں 'ماسٹر کی' آزمائی۔ دروازہ کھل گیا۔ میں بہ آہستگی کواڑ کھولتے ہوئے پیکٹ کو ہلکی ٹھوکر رسید کر کے کمرے پہنچا دیا اور خود بھی داخل ہو کر دروازہ بند کر کے مڑا تو ایک بڑا سا کو ریوالور میری جانب اٹھا ہوا تھا اور اس کے عقب میں دو کینہ پرور آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔

"میں نہیں جانتا تھا کہ گھر میں کوئی موجود ہے۔" میں نے سے لہجے میں کہا۔

وہ ایک ہٹا کٹا شخص تھا۔ طویل قد و قامت، سر کے بال سنہرے اور جگہ جگہ سے اڑے ہوئے، اس کی آنکھوں کا تاثر ایسا تھا گویا اس کا ریوالور کسی بھی لمحے شعلہ اگل سکتا ہے۔ "تم کون ہو؟ پولیس؟" اس کی آنکھیں مجھے برچھی کی مانند اپنے جسم میں پیوست ہوتی محسوس ہونے لگیں۔

"میں ایک نجی نوعیت کا سراغ رساں ہوں۔" میں نے مضطرب ہو کر کہا۔ "میں تم سے ہارنی کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔"

اس کی آنکھوں میں شبہہ اتر آیا۔ "اس کے بارے میں کس قسم کی گفتگو کرنا چاہتے ہو؟"

"کیا تم ہیوگو ویبس ہو۔ مجھے تمھاری بیوی نے بھیجا ہے۔"

جواب میں وہ پھنکارا اور ریوالور کو انگلیوں پر گردش دینے لگا۔ میں گویا نشانہ بازوں کے درمیان جلتی ہوئی شمع کی مانند کھڑا تھا۔ ایک ایسے شخص سے صبر و تحمل کی توقع فضول تھی جو چھ مختلف استوں میں خون کی ہولی کھیلتا رہا ہو۔ "ریوالور رکھ دو۔" میں نے دایت کی۔ "تم جیل توڑ کر فرار ہونے سے بھی بڑی مصیبت میں مبتلا چکے ہو۔"

جواب میں اس کے نتھنے پھولنے اور پچکنے لگے اور میری لیں بے ربط ہو گئیں۔ اب صرف اس کی دھڑکتی رگ پر ہاتھ نے کی ضرورت تھی۔ "تمھارے اور ہارنی کے درمیان کیا معاملات تھے؟"

"تم بہت زیادہ بولتے ہو۔" وہ غرآیا۔ "اگر میری بیوی نے تمھیں بھیجا ہے تو... خیر تم گھوم جاؤ۔"

میں رخ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔ دانش مندی کا تقاضا یہی تھا کہ اس کی ہدایت پر عمل کیا جائے۔ کوئی بھی غلط حرکت میرے سینے میں جان لیوا سوراخ کر سکتی تھی۔ میرے کانوں سے اس کے محتاط قدموں کی آواز ٹکرائی جو لمحہ بہ لمحہ میرے قریب آتی جا رہی تھی پھر جونہی میرے دل میں فطری طور پر پلٹنے کی خواہش جاگی، اگلی ہی ساعت ریوالور کا دستہ میرے سر پر پڑا اور نہ جانے وہ خواہش کہاں کھو گئی۔ صرف اتنا یاد رہا کہ فرش میری نگاہوں میں الٹ گیا ہے۔

ہوش آیا تو میں نے خود کو رسیوں سے بندھا ہوا پایا لیکن بندشیں نرم تھیں۔ شاید یہ فرض بڑی عجلت میں سرانجام دیا گیا تھا۔ میں نے رسیوں سے آزاد ہو کر اپنے سر کے ایک مضروب حصے کو ٹٹولا آنکھوں کے سامنے پھلجھڑیاں سی چھوٹتی محسوس ہونے لگیں۔ میں نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ فرنیچر نہ ہونے کے برابر تھا۔ کہیں کہیں خشک غذا کے کاغذ بکھرے ہوئے تھے۔ شاید جیل سے فرار ہونے کے بعد وہ اپنے ساتھ کوئی سامان لے کر نہیں آیا تھا۔ میں نے اٹھ کر نچلی منزل کا رخ کیا اور اپارٹمنٹ کے سپرنٹنڈنٹ کے لیے اطلاعی گھنٹی بجائی۔ چند لمحے بعد دروازہ کھلا اور ایک خمار آلودہ چہرے نے باہر جھانکا۔ "اوپری منزل کے تیسرے اپارٹمنٹ میں کون رہتا ہے؟" میں نے پوچھا لیکن وہ تعاون کرنے والوں میں سے نہیں لگتا تھا۔ چنانچہ میں نے ریوالور کی نال اس کے نتھنوں سے لگا دی۔ اس طرح بعض حالات میں وقت کی بڑی بچت ہو جاتی ہے۔

"اوہ... وہ... ایک خاتون ہے۔" وہ فوراً ہی بولنے لگا۔

"مسز ویبس۔"

"کیا اس نے تمھیں یہی نام بتایا تھا؟ اس کا حلیہ تو بتاؤ۔"

اس نے حلیہ بتا دیا تو میں وہاں سے رخصت ہو گیا۔ اس کا بیان کردہ حلیہ ان دونوں میں سے کسی ایک خاتون کا ہو سکتا تھا۔ میری نگاہوں میں ڈورا کا حلیہ گھوم گیا اور میرے سر کی تکلیف نے آگاہ کیا کہ مجھے جلد از جلد کوئی عملی قدم اٹھانا چاہیے۔

ڈیوٹی پر وہی سپاہی موجود تھا جسے میں چھوڑ کر گیا تھا۔ وہ خاصا بور نظر آ رہا تھا۔ میں نے اسے قاتل کی آس پاس ہی موجودگی سے باخبر کرتے ہوئے ہوشیار رہنے کی ہدایت کی۔ "کیا اس نے جیل کا دھاری دار لباس پہن رکھا ہے؟" اس نے پوچھا۔

میں جواب دیے بغیر اوپر چلا گیا اور ایک دروازے کے سامنے کلیئر کی نیم پلیٹ تلاش کر لی۔ دروازہ نیم وا تھا اور خلا سے زرد روشنی پھوٹ رہی تھی۔ میں نے اسے مزید وا کر کے جونہی ایک قدم اندر رکھا، ویسے ہی اندر سے دیگچی، رکابی اور کچن کے دوسرے برتن دروازے پر برسنے لگے۔ ایک برتن میری پیشانی سے بھی ٹکرایا۔ یہ بارش تھمی تو کلیئر کی چیخنے کی آوازیں آنے لگیں۔ "چیخنا بند کرو۔" میں نے بلند آواز میں کہا تو چیخیں تھم گئیں۔

میں کمرے میں داخل ہوا اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ گالوں کی رنگت اڑی ہوئی تھی۔ پیشانی زخمی تھی اور ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی مکے باز نے اس کے منہ پر جی بھر کر گھونسے برسائے ہوں۔ "تمھیں کیا ہوا؟" میں نے کہا۔

"جو کچھ بھی ہوا، بہت برا ہوا۔" وہ آستین سے، ناک سے بہتا ہوا خون پونچھ کر بولی۔ "ایک شخص آیا تھا۔ غالباً اسے مجھ پر مس ڈورا کا مغالطہ ہوا ہو گا۔ میں نہیں جانتی کہ یہ سب کیا ہے۔ اس نے آتے ہی مجھ پر مکے برسانے شروع کر دیے۔ ساتھ ہی فحش گالیاں بھی دینے لگا۔ میں بے ہوش ہوتے ہوتے بچی... پھر وہ چلا گیا۔"

"کیا اُس کا حلیہ اُس شخص سے مشابہہ تھا جسے تم نے ہارنی کی کھڑکی سے چھلانگ لگا کر فرار ہوتے دیکھا تھا؟"

"ہاں . . ." وہ اپنے بازو کی خراش پر آہستہ آہستہ اُنگلیاں پھیر کر بولی پھر ایک جھرجھری سی لے کر رہ گئی۔ "مجھے یقین ہے کہ یہ وہی تھا۔"

"تم نے پولیس کو کیوں طلب نہیں کیا؟"

"مَیں بے حد خوف زدہ ہو گئی تھی۔ وہ ایک قاتل ہے اور مَیں تنہا تھی۔"

"اگلی بار اس سے بھی زیادہ بلند آواز میں چیخنا۔ اس معاملے میں تم کافی تجربہ کار لگتی ہو۔" مَیں نے کہا اور وہاں سے نکل کر نیچے آیا۔

"کیا تم اُس وقت سے اَب تک یہیں موجود تھے جب مَیں یہاں سے رُخصت ہُوا تھا؟" مَیں نے نگران سپاہی سے پُوچھا۔

اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"مجھے شک ہے۔" مَیں نے اُسے گھُورتے ہُوئے کہا۔

"میری نگاہیں ہمیشہ صحیح مقام پر مرکوز رہتی ہیں۔" وہ بڑبڑایا۔

"آئندہ کسی حسینہ کا تعاقب نہ کرنا ورنہ ہو سکتا ہے تمھیں شبینہ ڈیوٹی پر لگا دیا جائے۔"

◆

جب مَیں ہارنی کے اپارٹمنٹ میں داخل ہُوا تو ڈورا ایک کرسی پر سہمی سمٹائی بیٹھی تھی۔ اُس کی زُلفیں پیشانی پر بکھری ہُوئی تھیں اور ہنری انگشتِ شہادت سے اُس کی جانب اشارہ کر کے کچھ کہہ رہا تھا۔ میری آہٹ سُن کر وہ میری جانب متوجّہ ہُوا۔ "اوہ تو یہ تم ہو۔" اُس کے چہرے پر برہمی چھائی ہُوئی تھی۔ "یہ چوہیا کہیں فرار ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔"

"کہاں . . .؟" مَیں نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

"یہ نہیں بتاتی۔ ہمارے ایک سپاہی نے اُسے پنسلوانیا کا ٹکٹ خریدتے ہُوئے پکڑا ہے۔"

ڈورا نے اپنا چہرہ میری جانب گھُمایا جس پر دہشت پھیلی ہُوئی تھی۔ "مَیں . . . مَیں خوف زدہ ہُوں۔ مَیں قتل ہونا نہیں چاہتی۔" وہ خوف سے ہکلانے لگی۔

"بس یہ اُس وقت سے یہی جُملہ دُہرائے جا رہی ہے۔" ہنری نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

"ممکن ہے یہ سچ ہی کہہ رہی ہو۔" مَیں نے خیال آرائی کی۔

ہنری جواب میں غرّایا۔ "ادھر آؤ۔" اُس نے چند قدم آگے بڑھ کر اُس کا سُوٹ کیس کھول دیا۔ یہ ایک پُرانا اور عام سا سُوٹ کیس تھا جسے وہ کبھی اپنے شہر پنسلوانیا سے لے کر یہاں آئی تھی . . .

"دیکھو یہ اس سُوٹ کیس میں کیا لے کر فرار ہو رہی تھی۔" ہنری نے سُوٹ کیس کی جانب اشارہ کیا۔

میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ سُوٹ کیس کرنسی نوٹوں سے بھرا ہُوا تھا۔

"دو لاکھ ڈالر۔" ہنری تمتماتے ہُوئے چہرے سے بولا۔

مَیں نے اُسے ویبس سے اپنی مُلاقات سے آگاہ کرتے ہُوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ وہ واپس آئے گا۔ خصوصی طور پر اس شے کے حصول کے لیے جس کی اُسے تلاش تھی۔" مَیں نے کرنسی نوٹوں کی جانب اشارہ کیا۔

"ہم شکار کو قابو میں کرنے کے لیے مزید چارہ ڈالیں گے . . ." ہنری نے کہا اور مُلازمہ کی جانب مُڑا۔ "مِس میرس۔" اُس کا لہجہ نرم تھا۔ "تم جا سکتی ہو۔ اپنی سہیلی کے ساتھ ٹھہرنا۔"

وہ بادلِ نخواستہ اُٹھی۔ اُس کے نشست چھوڑنے کا انداز اُس کی اندرُونی کیفیّت کی غمّازی کر رہا تھا۔ وہ سرتاپا سہمی ہُوئی تھی۔ ہنری نے اپنے ماتحتوں کو بُلا کر جلدی جلدی صُورتِ حال سے آگاہ کیا اور پھر ہم مِس ڈورا کے تعاقب میں روانہ ہو گئے۔ وہ کسی جانب دیکھے بغیر اپنی سہیلی کلیئر کے اپارٹمنٹ کی سمت بڑھ رہی تھی اور ہم شکاریوں کی مانند اس کا تعاقب کر رہے تھے۔ وہ کلیئر کے اپارٹمنٹ میں داخل ہو گئی اور ہم سڑک کے اُس پار رُک کر انتظار کرنے لگے۔ یہ انتظار کافی طویل ثابت ہُوا . . .

آدھی رات کے وقت ایک ٹیکسی رینگتی ہُوئی آ کر موڑ پر رُکی، کوئی شخص اندر سے اُچھل کر برآمد ہُوا اور سیدھا اپارٹمنٹ میں داخل ہو گیا۔ "تم نے کچھ دیکھا؟" ہنری بے چین ہو کر بول پڑا۔ اُس کی سانس تیز چلنے لگی تھی۔ "سبزی مائل بھُورا ہیٹ اور بھُورے رنگ کا سُوٹ۔" وہ طمانیت سے غرّایا۔

"ہوشیار رہنا۔" مَیں نے تنبیہہ کی۔ "اس کے پاس ایک کولٹ ریوالور ہے اور یہ خاصا جذباتی آدمی ہے۔"

ہنری جواب دِیے بغیر تیز تیز قدم اُٹھاتا ہُوا اپارٹمنٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔ مَیں نے اُس کا ساتھ دیا۔ اپارٹمنٹ کے اندر سے گرجنے برسنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ہنری نے دروازے پر دستک دی۔ آوازیں تھم گئیں لیکن دروازے تک کوئی نہیں آیا البتّہ اپارٹمنٹ کے عقبی حصّے سے فائر کی آواز گونجی۔ "وہ آگ سے بچاؤ کا زینہ استعمال کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔" ہنری غرّایا۔

. . . مَیں چابیوں کا گچھا نکال کر ماسٹر کی تالے میں آزمانے

لگا۔ ہنری زور زور سے دروازہ پیٹنے لگا۔ "ویبس باہر آ جاؤ۔ تم چاروں طرف سے گھِرے ہُوئے ہو۔ فرار کی کوشش بے کار ہو گی۔" اُس نے چیخ کر کہا لیکن اندر سے کوئی جواب نہ مِلا۔ ہنری نے اپنے طاقت وَر بازُو دروازے پر آزمانے شروع کر دیے لیکن دروازہ ٹَس سے مَس نہ ہُوا پھر اچانک ہی دروازہ کھُل گیا۔ ہمارے سامنے مِس ڈورا کھڑی تھی۔ اُس کی آنکھیں دہشت سے پھٹی ہُوئی تھیں اور چہرہ دُھلے ہُوئے کپڑے کی مانند سفید ہو رہا تھا۔ اُس کے ہونٹ وَا تھے اور وہ ہمیں یُوں گھُور رہی تھی گویا ہم موت کے فرشتے ہوں۔ اُس کے عقب میں ویبس، کلیئر کو ڈھال کے طور پر اپنے سامنے تھامے کھڑا تھا اور کلیئر کے شانے کے عقب سے ایک پستول کی نال ہمیں گھُور رہی تھی۔ کلیئر کے چہرے پر بے بسی اور خوف کا گہرا امتزاج تھا۔ ویبس اُسے دھکیلتا ہُوا آگے بڑھا۔ "مَیں نکل رہا ہُوں۔" اُس کی آواز میں غرّاہٹ اور سختی تھی۔

"بہتر ہو گا کہ ہتھیار ڈال دو۔ باہر تمھیں اپنی جانب اُٹھی ہُوئی بے شمار رائفلوں کا سامنا کرنا پڑے گا اور تم اُن سے نمٹ نہیں سکو گے۔" ہنری نے کہا۔

لیکن وہ غیر متزلزل تھا۔ "میرے راستے سے ہٹ جاؤ . . ." اُس کی آنکھوں سے شعلے نکلتے ہُوئے محسوس ہو رہے تھے۔ ہنری ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ مَیں بھی دروازے کی ایک جانب کھسک گیا۔ کلیئر کے چہرے کی رنگت خوف سے زرد پڑ گئی۔

"اِسے جانے دو۔ خُدا کے لیے اسے جانے دو۔ ورنہ یہ مجھے ہلاک کر دے گا . . . یہ زیادہ دُور نہیں جا سکے گا۔" کلیئر گڑگڑانے لگی۔

"آگے بڑھو۔" ہنری تاثّر سے عاری لہجے میں بولا۔ "آگے بڑھو۔"

ویبس، کلیئر کو اسی طرح تھام کر دروازے سے نکلا اور فوراً ہی دیوار سے چپک گیا۔ اُس نے کلیئر کو اپنے اور بندوقوں کے درمیان تھام رکھا تھا۔ ہال میں اُس نے لات مار کر دروازہ کھولا اور چوکنّے انداز میں سڑک پر نظریں دوڑائیں۔ اچانک کلیئر اپنے جسم کو بَل دے کر اُس کی گرفت سے آزاد ہو گئی۔ ویبس کے ریوالور نے شعلہ اُگلا اور دروازے کے شیشے چکنا چُور ہو گئے۔ اسی افراتفری میں ریوالور ویبس کے ہاتھ سے چھُوٹ کر فرش پر گر پڑا۔ مَیں تیزی سے ریوالور کی جانب لپکا۔ ساتھ ہی وہ بھی لپکا اور ریوالور دوبارہ اُٹھانے میں کامیاب ہو گیا لیکن میرا ہاتھ اُس کی کلائی پر پڑ چکا تھا۔ اُس کا بازُو میری گرفت سے آزاد ہونے کے لیے فضا میں لہرایا اور ٹریگر دب گیا۔ دوسرے ہی لمحے ہال کا روشن بلب ٹُوٹ گیا . . . اور ہال کے سنّاٹے میں گولی کی آواز دُور دُور تک گُونج گئی۔ ہال نیم تاریک ہو گیا۔ مَیں نے اُسے دیوار پر دے مارا۔ ہنری تیزی سے آگے بڑھا لیکن کلیئر نے اُس سے زیادہ پھُرتی دکھائی۔ اُس نے اپنا سینڈل اُتار کر اُس کی نوکیلی ایڑی سے ویبس کے ہاتھ پر شدید چوٹ لگائی اور ریوالور اُس کے ہاتھ سے چھُوٹ کر دُور جا پڑا . . .

"بہت خوب۔" ہنری کے مُنہ سے بے ساختہ نکلا اور اُس نے بڑھ کر ویبس کا بازُو مضبوطی سے اپنی گرفت میں لے لیا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم سب دوبارہ اپارٹمنٹ میں جمع تھے۔ ویبس تھکا ہُوا اور غصّے میں بھرا ہُوا نظر آ رہا تھا۔ ڈورا، اُس سے ممکنہ حد تک دُور ہٹ کر کمرے کے ایک گوشے میں دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اُسے یہ ہوش بھی نہیں تھا کہ اُس کے جسم پر نا کافی لباس ہے۔ ہنری کے چہرے پر فتح کی چمک تھی۔ "مَیں تمھیں گاڈفرے ہارنی کے قتل کے الزام میں گرفتار کرتا ہُوں اور مِس ڈورا، جہاں تک تمھارا تعلق ہے تو جب تک تم ان دو لاکھ ڈالروں کی وضاحت نہیں کرتیں، مَیں تمھیں شریکِ جُرم ہی تصوّر کروں گا . . ." ہنری مستحکم لہجے میں بولا۔

ڈورا نے اپنا نائٹ گاؤن جسم کے گرد یُوں لپیٹ لیا گویا اُسے اچانک ہی سردی محسوس ہونے لگی ہو۔

"بہت خوب۔" ویبس ہونٹ بھینچ کر بولا۔ "تم مجھے پھانسنے کی کوشش کر رہے ہو لیکن تم یہ کس طرح ثابت کر سکتے ہو کہ مَیں نے ہارنی کو قتل کیا ہے؟"

"تمھارے لباس کے ذریعے۔" ہنری نے ہنس کر کہا۔

"اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قاتل یہ نہیں ہے . . ." مَیں نے مداخلت کی۔

ہنری کی جبیں شکن آلود ہو گئی۔

"ویبس اس وقت تک وہ لباس استعمال نہیں کر سکتا تھا جب تک کہ ڈورا وہ لباس اُس تک نہ پہنچا دیتی اور یہ مَیں تمھیں پہلے ہی بتا چکا ہُوں۔" مَیں نے کہا۔

ہنری نے آستین سے پیشانی کا پسینہ پونچھتے ہُوئے کہا۔ "تو پھر ان عورتوں نے آخر کسے دیکھا تھا؟"

"کسی کو بھی نہیں۔ ویبس ٹھیک کہتا ہے۔ اُسے اس قتل کے کیس میں پھانسنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ممکن ہے، اُسے یہ کہہ کر جیل سے فرار ہونے پر آمادہ کیا گیا ہو کہ جو رقم اُنھوں نے لُوٹی تھی وہ ہارنی لے کر فرار ہونا چاہتا ہے۔"

"لیکن جب ہم نے ہارنی کو دیکھا تو وہ قتل ہو چکا تھا۔" کلیئر بول پڑی۔

"اِسی جھوٹ کی بنیاد پر پوری عمارت تعمیر کی گئی ہے۔" مَیں نے جواب دیا۔ "وہ موقعے ہی پر اِن دو میں سے ایک خاتون کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔"

"نہیں، نہیں۔" ڈورا دہشت سے چیخ پڑی۔ ہنری اُس کی جانب بڑھنے لگا...

"وہ نہیں، بلکہ یہ۔" مَیں نے کلیئر کی جانب اشارہ کیا۔ "تم نے ہارنی کو قتل کیا ہے جب تم فلم دیکھ کر واپس آئیں تو تم نے ڈورا کو سرگوشی میں بتایا کہ کوئی شخص کھڑکی پر موجود ہے۔ ڈورا جائزہ لینے چلی گئی تو تم نے قلم تراش چاقو اُٹھا کر اُونگھتے ہوئے ہارنی کے دل میں پیوست کر دیا اور ڈورا کو چیخ چیخ کر آوازیں دینے لگیں... وہ ایک چھوٹے سے شہر کی سادہ لوح اور جذباتی لڑکی ہے تم نے چیخ چیخ کر اُسے اِس قدر دہشت زدہ کر دیا کہ وہ تمھارے سُر سے سُر ملا کر چیختی ہوئی سڑک پر نکل گئی۔ تم نے مکمل طور پر آخر تک اُسے اِس قدر دہشت زدہ رکھا کہ وہ تمھاری ہر بات کو حقیقت سمجھ کر اُس کی تائید کرتی چلی گئی۔ تم نے اُسے یہ بھی یقین دلایا... کہ اگر قاتل نے اُسے ہلاک نہیں کیا تو پولیس اُس پر قتل کا الزام عائد کر دے گی۔ کیا تم نے اِس معصوم دوشیزہ کو اپنے شوہر کی اُس خفیہ پناہ گاہ میں اُن کپڑوں کے پیکٹ کے ساتھ نہیں بھیجا تھا جو اُس نے اس وقت پہن رکھے ہیں اور جس کا ذکر تم نے اُس کا حلیہ بیان کرتے وقت کیا تھا پھر تم نے اُسے خوف زدہ کر کے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اِس شہر سے فرار ہو جانا ہی اُس کے حق میں بہتر ہے...؟"

"تمھاری باتیں محض بکواس ہیں۔ یہ مجرم میرا شوہر نہیں ہے۔" کلیئر غصّے سے چیخی۔

"تمھارا کیا خیال ہے ویلیس؟" مَیں نے ویلیس سے پوچھا۔

وہ تذبذب میں پڑ گیا۔ "ٹھیک ہے۔" مَیں نے دوبارہ بولنا شروع کیا۔ "ویلیس مجھے ضرب لگا کر بے ہوش کرنے کے بعد یہاں آیا تھا۔ تم نے قتل کی رات ایک اجنبی کو کس طرح اپنے مکان میں داخل ہونے کی اجازت دی۔ تم سڑک پر کھڑی ہو کر اتنی بلند آواز میں چیخ سکتی ہو کہ تمھاری چیخ کئی بلاک تک سُنی جا سکتی ہے لیکن ایک اجنبی آ کر تمھیں زدوکوب کرتا ہے تو تمھارے مُنہ سے ہلکی سی آواز بھی نہیں نکلتی۔ اُس نے تمھارے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا... کیا اس رقم کی بنا پر جو تم نے ڈورا کے سُوٹ کیس میں چھپا دی تھی، ایک شہادت بھی ایسی نہیں ہے کہ ڈورا نے تمھاری جانب دیکھے بغیر کسی بات کی تصدیق کی ہو۔ ذرا اس کی طرف دیکھو، اُس کی صُورت اس بات کی چغلی کھا رہی ہے کہ تم نے اُسے کسی سبزی مائل بھورے ہیٹ اور ڈھیلے ڈھالے بھورے رنگ کے سُوٹ میں ملبوس قاتل کا یقین دلایا تھا؟"

ویلیس اپنی جگہ سے اُٹھ کر کلیئر کی جانب بڑھا تو ہنری نے اُسے دھکیل کر دوبارہ صوفے پر گرا دیا لیکن وہ بڑبڑا رہا تھا۔ "تم... تم نے ایسا کیوں کیا...؟"

"مجھے تم دونوں سے نفرت تھی۔ کیا تم سمجھتے تھے کہ مَیں تمھارا سات سال تک انتظار کرتی؟" اُس نے ویلیس کو نفرت سے گھورتے ہوئے کہا... "حتّیٰ کہ زندگی کی رعنائیاں لُوٹنے کا وقت گزر جاتا۔" اُس نے کہا اور ڈورا کی جانب سفّاک نگاہوں سے دیکھا۔ "اس کے دماغ میں تو بھُس بھرا ہُوا ہے... اچھا اب تم لوگ پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو جاؤ۔" اُس کے ہاتھ میں ویلیس کا کولٹ ریوالور تھا۔ جسے ہم اُس سے لینا بھُول گئے تھے۔ اچانک ہنری نے بجلی کی سی تیزی سے اُس کی کلائی پر ہاتھ مارا... اور ریوالور اُس کے ہاتھ سے اُڑتا ہُوا دُور جا گرا۔ وہ ریوالور کی جانب لپکی لیکن ہنری نے اُس کا بازو اپنی گرفت میں لے لیا اور یہ گرفت بے حد مضبوط تھی۔ یکایک وہ چیخ چیخ کر رونے لگی۔ ڈورا بھی اس معاملے میں اُس سے پیچھے نہ رہ سکی وہ ایک بار پھر ہسٹریائی انداز میں چیخنے لگی تھی۔

"خُدا کے لیے۔" ہنری انھیں خاموش کراؤ۔" مَیں اپنے کانوں میں اُنگلیاں ٹھونس کر چیخ پڑا...

قانون کے اس محافظ کو عجیب امتحان سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کی منگیتر کی شرط یہ تھی کہ وہ ملازمت چھوڑ دے، پھر ایک عجیب صورتحال سامنے آئی

[illegible]

آغاز الدین

رضا کو اچھی طرح علم تھا کہ ایسا ضرور ہو گا... لیکن یہ بات اُس کے لیے بہت تکلیف دہ تھی کہ ایسا ہو رہا تھا... اور اسی باعث اُس کے جسم و رُوح دونوں زخمی ہو رہے تھے۔ نیلوفر اِن تمام رشتوں کو توڑ دینے کے درپے تھی جو پہلی ہی مُلاقات میں اُستوار ہوئے تھے، خوشیوں اور مُسرّتوں کے رشتے... وہ تو قسمیں، وعدے بھی توڑنا چاہتی تھی، اُن تمام منصوبوں کو خاک میں مِلانے پر تُلی ہُوئی تھی جو خود اُس نے رضا کے شانے پر سر رکھ کر مستقبل کے لیے بنائے تھے... وہ ہر خواب کو جھُوٹا ثابت

کرنے پر آمادہ تھی۔

خیابانِ سعدی کے اس خوبصورت کیفے میں... جہاں وہ مستقبل کے خواب دیکھتے تھے اب ایک دوسرے کے لیے اجنبی بننے والے تھے۔

کیفے کا خوبصورت ماحول سحر انگیز مشرقی دُھن کی مدّھم مدّھم سرگوشیاں اور ہلکی روشنی کے باعث بہت رُومانٹک لگ رہا تھا۔ ہال میں اُن کے علاوہ صرف دو اور افراد تھے، ایک تو کاؤنٹر مین، دوسرا کوئی گاہک... جو تین میزیں چھوڑ کر چوتھی میز پر سر جھکائے اخبار پڑھ رہا تھا اور اُس کی میز پر گرم گرم کافی کی پیالی رکھی ہُوئی تھی...

"سب بے کار ہے رضا... سب کچھ فضول ہے۔" نیلوفر نے اپنی بڑی بڑی کالی آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھتے ہُوئے ایک بار پھر کہا۔ اُس کے ریشمیں کالے بال شانوں پر پھسل رہے تھے، شہد رنگ چہرے پر حُزن و ملال کی پرچھائیاں تھیں اور نازک ہاتھ کانپ رہے تھے۔

"کیا تم سوچ سمجھ کر کہہ رہی ہو؟" رضا نے بڑے پُروقار لہجے میں سوال کیا لیکن اُس کا دل خُون کے آنسو رو رہا تھا۔

"ہاں... مَیں سوچ سمجھ کر کہہ رہی ہُوں کہ سب کچھ بے کار ہے۔" نیلوفر نے اپنے اضطراب اور دُکھ کو چھپانے کے لیے مُٹھیاں بھینچ لیں۔ "مَیں جانتی ہُوں کہ تعلق کس طرح بوجھ بن جاتا ہے..." نیلوفر کی آنکھیں چغلی کھا رہی تھیں کہ اُس نے یہ تلخ جُملے کتنے کرب کے ساتھ ادا کیے ہیں۔

وہ دُبلی پتلی لڑکی تھی۔ اُس نے زندگی کی اکیس بہاریں دیکھی تھیں۔ اُس کا کردار رضا کو اچھی طرح معلوم تھا۔ وہ دوسری لڑکیوں کی طرح ہوائی دیدہ اور فلرٹ کرنے کی شوقین نہیں تھی۔ لباس کے انتخاب میں حالات اور روایات کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھتی تھی... وہ اتنی خوبصورت اور سادہ تھی کہ رضا نے اُسے پہلی ہی مُلاقات میں اپنا بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن اس وقت حالات بہت مختلف اور تکلیف دِہ تھے۔ نیلوفر کی طرح رضا بھی اپنے فیصلے پر قائم تھا۔ لہٰذا اُس نے اُس کے ملیح چہرے سے نظریں ہٹا لیں کیونکہ جب بھی وہ اُس کی طرف دیکھتا تھا تو فیصلہ تبدیل کرنے پر غور کرنے لگتا تھا...

"مَیں بھی اپنے فیصلے پر قائم ہُوں، نیلو! مَیں پولیس کی مُلازمت نہیں چھوڑ سکتا۔" اُس نے پیالیوں کی طرف دیکھتے ہُوئے کہا۔

"ہاں... مَیں جانتی ہُوں۔" نیلوفر کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔ "مَیں جانتی ہُوں... پولیس والے کتنے پتھّر دل ہوتے ہیں۔"

"... اور بہت نیک بھی ہوتے ہیں۔ اس پہلو کو فراموش مت کرو..." اُس نے اپنے لہجے کو نرم رکھنے کی کوشش کی تھی مگر اس میں ناکام رہا تھا۔

"اس وقت تم وردی میں نہیں ہو، تب بھی سخت گیری... تمھارے لہجے سے عیاں ہے۔"

"وہ دن بھی ضرور آئے گا جب مَیں وردی سے مستثنیٰ ہو جاؤں گا، مَیں بہت بڑا افسر بن جاؤں گا۔ سادہ لباس والے اسکواڈ میں میری تقرری اب زیادہ دنوں کی بات نہیں۔" رضا نے جواب دیا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ یہ کوئی جواب نہیں ہُوا۔

"لیکن اس سے بھی بات نہیں بنے گی رضا۔" نیلوفر کی سیاہ آنکھوں میں وحشت ناک چمک پیدا ہو گئی... "تم پھر بھی پولیس والے رہو گے۔ لوگوں کو پریشان کرتے رہو گے، محوِ خواب لوگوں کو گھروں سے گرفتار کرنا تمھارا فرض ہو گا... اور بس..."

رضا کندھے اُچکا کر رہ گیا۔ نیلوفر کی یہ دلیل اب پُرانی ہو چکی تھی اور ایسی ہی باتوں نے ان کی محبت کے شفاف آیئنے پر دھبّے ڈال دیے تھے۔ وہ اس دلیل کا کوئی توڑ بھی تلاش نہیں کر سکا تھا۔ گزشتہ ایک ماہ سے نیلوفر کا یہی اصرار تھا کہ رضا پولیس کی مُلازمت چھوڑ کر اُس کے والد کے کاروبار میں پارٹنر کی حیثیت سے شامل ہو جائے لیکن رضا انکار کرتا رہا تھا، انکار کی پہلی وجہ تو اَنا تھی اور دوسری پولیس کی مُلازمت سے خلوص اور شوق... اسی انکار و اصرار نے دونوں کے درمیان تلخیوں کو جنم دیا تھا اور آج وہ اس سلسلے میں کوئی حتمی فیصلہ کرنا چاہتے تھے۔ اب تک کی گفتگو میں کسی نے بھی معقولیت کا راستہ اختیار نہیں کیا تھا، دونوں ہی انتہا پسندی پر قائم تھے... کوئی جُھکنے پر تیار نہ تھا... حالانکہ دونوں ہی نرم خُو اور محبت کے مارے تھے۔ نیلوفر کے لیے پولیس والے ظالم اور بے رحم تھے جبکہ رضا پولیس کو بُرائیوں کا قاتل سمجھتا تھا۔

اگرچہ رضا کو نیلوفر کی کہانی معلوم تھی لیکن وہ اُس کے اس تجزیے سے متفق نہیں تھا کہ رحم دل اور نیک آدمی بھی پولیس میں شامل ہو کر بے رحم اور بدعنوان بن جاتا ہے۔

نیلوفر کو پولیس سے جو نفرت تھی اُس کے پسِ منظر میں ایک المناک واقعہ تھا۔

برسوں پہلے، نیلوفر کے بہت ہی پیارے چچا نے بدنامی کے خوف سے پولیس کار میں خُودکشی کر لی تھی۔ عباس آفندی نامی اُس تاجر کو انکم ٹیکس کی چوری کے معمولی الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔ عباس آفندی نے عدالت میں پیشی کی ذِلت سے بچنے کے لیے عین اُس وقت خود کو گولی ماری تھی جب پولیس والے اُسے اپنی کار میں پولیس اسٹیشن لے جا رہے تھے۔

نیلوفر اُس وقت آٹھ سال کی تھی اور پھر وہ اسی المناک قصّے کو سُنتے سُنتے جوان ہو گئی اور پولیس سے نفرت اُس کی رَگ رَگ میں سرایت کر گئی۔ رضا کو اچھی طرح یاد تھا کہ جب نیلوفر نے اُسے پہلی مرتبہ پولیس کی وردی میں دیکھا تھا تو اُس کی آنکھوں میں کیسی وحشت ناچنے لگی تھی۔ اُس نے بمشکل کہا تھا۔ "تم اس وردی میں احمق لگ رہے ہو رضا۔"

"تمھارا کام لوگوں کو پریشان اور خوف زدہ کرنا ہے رضا..." نیلوفر نے کافی کی پیالی کو ایک طرف رکھتے ہُوئے کہا۔

"تم جاہلوں کی طرح سوچتی ہو۔" اُس نے قدرے تلخ لہجے میں جواب دیا۔ "بعض اوقات بالکل بے وقوفوں کی طرح باتیں کرتی ہو..."

وہ اپنی جگہ کانپ کر رہ گئی۔ اُس کے گال شعلہ رنگ ہو گئے اور آنکھوں میں برہمی جھانکنے لگی... "مجھے اس طرح مت جھڑکو جس طرح بازاری عورتوں سے بات کی جاتی ہے... مَیں تمھاری داشتہ نہیں ہُوں۔" اس مرتبہ اُس کی آواز قدرے اُونچی ہو گئی تھی...

رضا نے چونک کر اُس شخص کی طرف دیکھا جو چوتھی میز پر اخبار پڑھنے میں مصروف تھا لیکن رضا کی پیشہ ورانہ تربیت نے اُسے یہ اندازہ لگانے میں مدد دی کہ اجنبی اخبار کے مطالعے کی آڑ میں اُن کی باتیں سُن رہا ہے۔ اس میں اجنبی کا کوئی قصور بھی نہ تھا، وہ دونوں یقیناً سرگوشیوں کے بجائے معمول کے مطابق لہجے میں باتیں کر رہے تھے لہٰذا اجنبی کی توجّہ مرکوز ہونے میں انھی کا قصور تھا۔

رضا نے اپنے غصّے اور برہمی کو چھپانے کے لیے سگریٹ سُلگائی۔ وہ غیر معمولی حد تک وجیہہ تھا اور اُس کی کوتاہ قامتی بھی اس وجاہت کو چھپانے میں ناکام رہی تھی۔ وہ تیس سال کا تھا لیکن قد و قامت اور چہرے کی وجہ سے اُس کی عمر پچیس سال سے زیادہ نہیں لگتی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں عزم و حوصلے کی چمک تھی۔

"سُنو نیلو۔" اُس نے سرگوشی کی۔ "ایک بار یہ فرض کر لو... کہ پولیس کا فرض عوام کو تحفّظ فراہم کرنا ہے تو..."

"مَیں جانتی ہُوں کہ پولیس عوام کو کس طرح تحفّظ فراہم کرتی ہے..." نیلوفر کے لہجے میں تلخی، کرب اور نفرت تھی۔ وہ اپنے سامنے لگے ہُوئے قدِ آدم آیئنے کی طرف دیکھنے لگی۔

"میرا مطلب یہ ہے کہ پولیس کی کوتاہیوں کو کچھ دیر کے لیے فراموش کر دو کیونکہ صرف پولیس ہی طاقت کی علامت نہیں، اور بھی بہت سی قوتیں ہماری دُنیا میں سرگرم ہوتی ہیں۔"

"مَیں کسی ایسی کوتاہی کو فراموش نہیں کر سکتی جس کے باعث میرے خاندان کو برسوں تک کرب کی منزلوں سے گزرنا پڑا..."

"بعض اوقات انسان کو اپنی آنکھ کا شہتیر بھی تلاش کرنا چاہیے۔" رضا نے انکم ٹیکس کی چوری کے واقعے کا ذکر کیے بغیر کہا۔ "اگر کسی نے خُودکشی کی تو اس میں پولیس کا قصور نہیں... اگر قصور ہے تو صرف اتنا کہ متعلقہ افسر نے تلاشی نہیں لی اور ریوالور جیب میں رہنے دیا ورنہ عدالت دُودھ کا دُودھ اور پانی کا پانی کر دیتی۔ عدالت میں پیش ہو کر اپنی صفائی پیش کرنا ذِلت نہیں۔"

نیلوفر نے ایک لمحے تک اُسے بغور دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں شکوے تھے، شکایتیں تھیں کہ وہ اُس پر ذاتی طنز کر رہا ہے لیکن پھر اُس نے ایک لمبی سانس لے کر جوابی حملہ کیا۔ "یہ تو بتاؤ کہ تمھیں اس مُلازمت سے اتنا عشق کیوں ہے؟"

"کیونکہ مَیں اس بات پر یقین رکھتا ہُوں کہ پولیس ظُلم کے خلاف ایک قوّت ہے۔ مَیں ظُلم اور بُرائی سے نفرت کرتا ہُوں اور مَیں ان بُرائیوں کے خلاف جدّوجُہد کرنا چاہتا ہُوں۔" یہ کہتے ہُوئے رضا نے نیلو کے افسردہ چہرے سے نظریں ہٹا لیں جو لاشعوری طور پر ایک بار پھر اجنبی پر مرتکز ہو گئیں۔ رضا کو ایسا لگا کہ اجنبی کسی خاص مقصد سے یہ باتیں سُننے کی کوشش کر رہا ہے... اُسے اجنبی پر شک ہونے لگا اور وہ پیشہ ورانہ عادت سے مجبور ہو کر اجنبی کے بارے میں غور کرنے لگا جو اس کے خیال میں کسی عام گاہک سے زیادہ بے چین نظر آ رہا تھا۔ اُس کی اُنگلیاں اخبار کو دبوچے ہُوئے تھیں۔ وہ بالکل ساکت بیٹھا تھا اور اُس کی کوشش یہی تھی کہ چہرہ اخبار کی آڑ میں چھپا رہے۔

"شاندار رضا! تم شاید نیکی اور بدی کی طاقتوں کو پہچاننے پر قدرت رکھتے ہو..."

"کیا مطلب؟" رضا نے سپاٹ لہجے میں پُوچھا کیونکہ اب وہ نیلوفر میں زیادہ دلچسپی نہیں لے رہا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس کی چھٹی حِس کسی خطرے کا احساس دِلا رہی تھی۔ اس

کے ذہن میں مختلف اور خطرناک مُلزموں کی تصویریں کلبلا رہی تھیں۔ وہ اجنبی کا پُورا چہرہ تو ابھی تک نہیں دیکھ سکا تھا... لیکن آغاز میں جو ہلکی سی جھلک نظر آئی تھی اُس پر غور کر کے رضا اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اُس نے اس مضبوط جبڑے والے سانولے شخص کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے... اب مسئلہ صرف یہ تھا کہ وہ اُس کا پُورا چہرہ کس طرح دیکھے، صرف اسی طرح وہ اُسے پہچان سکتا تھا...

رضا نے پہلو میں ریوالور کی موجودگی محسوس کرنا چاہی لیکن ناکام رہا۔ وہ نیلوفر سے مُلاقات کے لیے آتے وقت ہمیشہ غیر مسلح رہتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ اس وقت بھی نہتّا تھا۔

"تم پولیس میں رہ کر بُرائی کے خلاف جنگ نہیں کرسکتے رضا۔" نیلوفر نے ایک بار پھر طعنہ دیا... "چھوٹے چھوٹے جُرم کرنے والے لوگ بُرائی کی تعریف میں نہیں آتے اور شیطانوں تک تمھاری پہنچ نہیں ہوتی..."

"ہم بڑوں پر بھی ہاتھ ڈالتے ہیں۔"

"ممکن ہے، تم ایسے بڑوں کی بات کر رہے ہو جن کو معاشرہ حزبِ اختلاف کا لیڈر کہتا ہے۔" وہ اب سیاسی دلائل دے رہی تھی۔

"چھوڑو نیلوفر۔ تم کبھی نہیں سمجھ سکوگی..."

"ہاں... چھوڑو بھی... ہم دونوں میں سے کوئی بھی کبھی نہیں سمجھ سکے گا..." نیلوفر کی آنکھیں ایک بار پھر بھیگنے لگیں۔ رضا کا دل پُرنم آنکھیں دیکھ کر کٹنے لگا، اُس نے آگے جُھک کر اُس کے ہاتھ تھام لیے۔ نیلو نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی مگر رضا نے گرفت اور مضبوط کرلی۔ وہ اُسے گھُورنے لگی۔ اُس کی آنکھوں میں اب محض نمی نہیں بلکہ آنسو تھے پھر نیلوفر نے مُنہ دوسری طرف پھیر لیا تو رضا نے اُس کے ہاتھ چھوڑ دیے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ نیلو کو اُس کے ہاتھوں کے لمس سے کوئی راحت نہیں مل رہی ہے۔

"نیل!" اُس نے بڑے پیار سے کہا... "اس وقت تم بہت تلخ ہو رہی ہو، میرے بارے میں پھر کبھی فیصلہ کرنا۔"

"میرے تلخ ہونے کی بھی معقول وجہ ہے۔"

"میں جانتا ہُوں لیکن اُن کی خُودکشی میں پولیس کا کوئی قصور نہیں تھا۔"

چند لمحوں تک نیلوفر نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن پھر وہ بہت دھیمی آواز میں فرش کی طرف دیکھتے ہُوئے بولی: "رضا! میں نے خود کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی... بہت چاہا کہ اُس المیے کو فراموش کردوں کہ وہ واقعہ میرے دل و دماغ میں کسی جراثیم کی طرح پلتا اور بڑھتا رہا ہے... میں جانتی ہُوں کہ اس المیے سے میرے پاپا کتنی جلدی بُوڑھے ہو گئے تھے، میری امّی کو چچا سے بڑی محبت تھی، وہ اُنھیں اپنا بھائی کہتی تھیں، وہ ابھی صدمے سے مر گئیں۔ پاپا نے پولیس کو پیش کش کی تھی... کہ وہ ایک گھنٹے کے اندر اندر انکم ٹیکس کے سارے واجبات ادا کر دیں گے لیکن پولیس والوں نے کہا کہ وہ انتظار نہیں کرسکتے اور اُنھیں صرف یہ حکم ملا ہے کہ عباس آفندی کو گرفتار کر لیا جائے۔"

"میں سمجھتا ہُوں نیلوفر۔ بعض اوقات محکمہ جاتی ضابطے خواہشات کی راہ میں حائل ہو جاتے ہیں۔"

"اور میرے انھی منفی خیالات کے باعث ہم دونوں ایک ہو کر بھی خوش نہیں رہ سکتے رضا..."

"اب تم معقولیت سے بات کر رہی ہو نیل!" رضا نے نرم لہجے میں جواب دیا۔ "تم سمجھتی ہو کہ تمھارا رویّہ منفی ہے اور یہی میرے لیے نیک فال ہے، مجھے یقین ہے کہ ایک نہ ایک روز تم میرے پیشے کے بارے میں بھی اپنے ان خیالات کو تبدیل کر لوگی..."

"نہیں... میں... میں ان خیالات میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرسکتی۔ یہ تو خون کے ساتھ گردش کر رہے ہیں۔"

نیلوفر کے لہجے میں اتنا یقین تھا کہ رضا سُن سا ہو گیا۔ جُدائی اور دُکھ کی سرد ترین چُبھن ہڈیوں تک محسوس ہونے لگی۔ اُس کا ذہن منجمد ہونے لگا لیکن پھر اچانک ہی ذہن میں جھماکے ہونے لگے۔ ذہن پر جمی ہُوئی برف پگھلنے لگی اور اس اچانک تبدیلی کی وجہ چوتھی میز والا اجنبی تھا۔ اُس نے ایک ہی لمحے کے لیے سر اُٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا تھا، اُس کا چہرہ دیکھتے ہی رضا کو ایسا لگا جیسے کسی نے ڈائنا مائٹ سے ذہن کے بند گوشوں کے مقفل دروازے توڑ دیے ہوں۔ وہ اُسے پہچان گیا۔ وہ مُحسن مشہدی تھا... مُحسن مشہدی... قاتل، لُٹیرا، جاسوس... مفرور اشتہاری ملزم جس کے سر کی قیمت مقرر کی جاچکی تھی۔ رضا کے جسم میں خوف کی ایک سرد ترین لہر اترتی چلی گئی۔ نبض تیز اور دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں اور نظروں میں وہ اَن گنت پوسٹر گھوم گئے جن پر مُحسن مشہدی کی تصویریں اور اُس کا حُلیہ ہوتا تھا۔

رضا کا دایاں ہاتھ ایک بار پھر اپنے پہلو کو ٹٹولنے لگا لیکن وہاں نہ تو ہولسٹر تھا اور نہ ریوالور... اُس کے عضلات تن گئے... اب سوال صرف یہ تھا کہ کیا مُحسن مشہدی کو یہ شک ہو گیا ہے کہ اُس نے اُسے پہچان لیا ہے؟ وہ مُحسن مشہدی سے اچھی طرح واقف تھا... ظالم مُحسن نے اب تک اَن گنت قتل کیے تھے اور یہ سب ہی کو معلوم تھا کہ جس نے بھی اُسے گرفتار کرنے کی کوشش کی وہ اس دُنیا سے گُزر گیا۔

رضا نے منصوبہ بندی کرنے کے لیے کیفے کے ہال کا... جائزہ لیا لیکن وہاں ایسی کوئی چیز نہ تھی جو اُس کی مدد کرسکتی۔ کاؤنٹر مین اُونگھتی ہُوئی آنکھوں سے کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا... اُس سے رضا کو کوئی مدد نہیں مل سکتی تھی۔ ہال میں اور کوئی نہ تھا اور اس وقت کسی کے آنے کی بھی توقع نہ تھی۔ باہر سڑک پر کاریں پُوری رفتار سے دوڑ رہی تھیں۔

"یہ کون ہے رضا؟" نیلوفر نے سرگوشی کی۔ یہ الفاظ بے ضرر تھے لیکن جب رضا نے جواب دینے کے لیے نیلوفر کی طرف دیکھا تو اُسے اُس کی آنکھوں میں خوف اور خدشات نظر آئے۔ اُسے خود پر غصّہ آنے لگا کہ اُس کے چہرے پر ایسے تاثرات نے کیوں جنم لیا جن سے نیلوفر جیسی معصوم اور سادہ لوح لڑکی بھی خطرے کا احساس کرنے لگی... "کون؟" رضا نے وقت گزاری کے لیے بے پروائی سے پُوچھا۔

"وہی... جو میرے عقب میں چوتھی میز پر بیٹھا ہے۔ تم اُسے بار بار دیکھ رہے ہو۔ مجھے قدِ آدم آئینے میں سب کچھ نظر آرہا ہے۔" نیلوفر نے پہلی مرتبہ ہلکے سے تبسّم کے ساتھ کہا۔

"مُحسن مشہدی۔" رضا نے لمبی سی سانس لیتے ہُوئے جواب دیا۔ "لیکن تم اس کو نہیں جانتیں۔"

"ہاں... لیکن تم جس طرح اُسے دیکھتے رہے ہو اس سے میں بہت کچھ سمجھ سکتی ہُوں۔"

"میرا ایک دیرینہ دوست ہے۔"

"دوستوں سے جا کر ملا جاتا ہے، اُن کی نگرانی نہیں کی جاتی اور اُن سے باتیں چھپانے کے لیے اس طرح سرگوشیاں نہیں کی جاتیں۔"

"دوستی دُشمنی میں بھی بدل سکتی ہے، اس نے ایک خُوبصورت لڑکی مجھ سے چھین لی تھی۔" رضا نے مُسکراتے ہُوئے جواب دیا... لیکن نیلوفر مطمئن نہیں ہُوئی۔ وہ ذہن میں کوئی واضح منصوبہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس دوران میں یہ بات ضروری تھی کہ وہ نیلو سے باتیں کرتا رہے اور کسی نہ کسی طرح مُحسن مشہدی کو بے بس کر کے ہیڈ کوارٹر لے جائے۔ یہ بات کہنے کو تو بہت آسان تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ مُحسن مشہدی پر ہاتھ ڈالنے کا مطلب تصادم ہوگا جس میں فائرنگ بھی شامل ہوگی۔ موجودہ صُورتِ حال میں فائرنگ یک طرفہ ہی ہوگی۔ مشہدی کو باؤلا کُتّا بھی کہا جاتا تھا اور لوگ کہتے تھے کہ وہ راہ میں آنے والے ہر شخص کو خون میں... غلطاں کر دیتا ہے۔

مشہدی بیٹھا رہا۔ اس کے صرف دو مطلب ہوسکتے تھے۔ پہلا تو یہ کہ اُسے اس بات کا شک نہیں ہُوا ہے کہ اُسے پہچانا جاچکا ہے اور وہ جوڑے کے رُخصت ہونے کا انتظار کر رہا ہے تاکہ خود بھی اپنی راہ لے یا پھر یہ کہ وہ بھی رضا کو پہچان کر اپنا منصوبہ بنا رہا ہے۔

رضا نے ایک بار پھر کَن اَنکھیوں سے چوتھی میز کی طرف دیکھا۔ مشہدی اخبار پر بدستور جُھکا ہُوا تھا۔

رضا کے لیے صرف ایک راستہ کھُلا ہُوا تھا... کہ وہ کوئی قدم اُٹھانے سے قبل نیلوفر کو باہر بھیج دے۔ اس طرح نیلوفر مدد کرسکتی تھی۔ باہر پبلک فون بوتھ تھا، وہ وہاں سے ہیڈ کوارٹر فون کر کے کمک طلب کرسکتی تھی۔ اُس نے اس نکتے پر غور کیا اور اسی پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے علاوہ

اُردو میں پہلی بار فنِ ستارہ شناسی پر
ایک مکمل دستاویزی کتاب
مستقبل شناسی
طاہر قریشی
آپ کے ماضی، حال اور مستقبل کا آئینہ
قیمت ۱۸/- روپے
ناشر
احباب ادب
اے ۵ - ۲۸۰ - [illegible] کراچی

اور کوئی چارہ نہ تھا۔

"رضا! مجھے سچ سچ بتادو کہ یہ کون ہے اور تم اتنے مضطرب کیوں ہو...؟" نیلوفر نے اُس کے پیکٹ سے سگریٹ نکالتے ہوئے کہا۔ وہ سگریٹ نہیں پیتی تھی لیکن اس وقت اُس نے بالکل اُسی کے انداز میں سگریٹ سُلگایا اور ماچس کی تیلی پھونک مار کر بجھا دی...

"یہ پولیس کا دردِ سر ہے نیل!" اُس نے سرگوشی کی۔ "اور تمھیں پولیس کے کام میں کوئی دلچسپی نہیں۔"

"مجھے اعتماد میں لیے بغیر تم کچھ نہیں کرسکتے۔" نیلوفر نے... دُھواں چھوڑتے ہوئے کہا۔ "ہم دونوں کے لیے کوئی متبادل راستہ نہیں۔ صرف ایک ہی راستہ ہے کیونکہ میں بھی یہاں موجود ہوں۔"

رضا کو اس جملے سے ناقابلِ بیان مسرت ہوئی۔ وہ یہ سوچ ہی کر خوشی سے جھوم اُٹھا کہ نیلوفر اُس کے پیشہ ورانہ مسئلے میں... دلچسپی لے رہی ہے۔ محسن مشہدی کوئی چھوٹا موٹا مجرم نہیں تھا، وہ شارک کی طرح بڑی اور ظالم مچھلی تھا اور اُسے قانون کی رسیوں میں جکڑ کر رضا، نیلوفر پر یہ ثابت کرسکتا تھا کہ پولیس کا کام قاتلوں، ڈاکوؤں اور جاسوسوں کو بھی گرفتار کرنا ہے۔

"مجھے مشہدی کے بارے میں کچھ بتاؤ رضا؟" نیلو نے سرگوشی کرتے ہوئے پیالیوں کی ترتیب بدل دی۔ شاید وہ بھی مصروف رہنا چاہتی تھی۔

"بس یہ سمجھ لو کہ محسن مشہدی قاتل ہونے کے علاوہ مُلک کا دُشمن بھی ہے۔ اس نے نہ صرف بینک لوٹے ہیں بلکہ ہمارے قومی راز بھی ایک سرمایہ دار مُلک کو فراہم کیے ہیں جس کی وجہ سے ہماری سلامتی کئی کئی بار خطرے میں پڑ چکی ہے۔"

نیلو کی حسین آنکھیں پھیل سی گئیں، اُس کے چہرے پر خوف کے تاثرات نے جنم لیا لیکن اُس نے فوراً ہی خود پر قابو پالیا۔

"اس پر پندرہ افراد کے قتل کا الزام ہے۔" رضا سرگوشی میں کہتا رہا... "چار اعلا سرکاری افسروں کو اس نے اغوا کرکے اُن پر بھیانک تشدد کے ذریعے انتہائی اہم ترین قومی راز حاصل کیے تھے اور تازہ ترین اطلاعات کے مطابق اب یہ ایک عالمی کانفرنس کے مندوبین کو اغوا کرنے کے لیے یہاں آیا ہے تاکہ انھیں یرغمال بنا کر خلیج کے ممالک سے اُن کی رہائی کے عوض رقم بٹور سکے۔" رضا نے اپنا سگریٹ نیلوفر کی سگریٹ سے سُلگاتے ہوئے ٹھنڈی سانس لی... "لیکن دو ماہ قبل اس نے ایک فاش غلطی کی تھی۔ اس سے پہلے ہمیں اس کا حُلیہ نہیں معلوم تھا لیکن دو ماہ قبل جب اس نے ایک شہر میں بینک پر ڈاکا ڈالا تو وہاں کے ایک مُلازم نے زخمی ہونے کے باوجود اسپا کیمرے سے اُس کی تصویر اُتار لی۔ مُلازم بعد میں مر گیا لیکن وہ قوم و وطن کے لیے اس تصویر کی شکل میں تحفہ چھوڑ گیا۔ مجھے یقین ہے کہ اس کی قربانی رائگاں نہیں جائے گی۔"

نیلوفر نے سگریٹ ایش ٹرے میں بجھا کر اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھیں بہت سنجیدہ تھیں۔ "اب تم کیا کرو گے...؟" اُس نے ایش ٹرے سے کھیلتے ہوئے پوچھا۔

"اسے گرفتار کروں گا۔"

"مگر تم تو نہتے ہو۔" نیلو کے لہجے میں بے چینی اور خوف نمایاں تھا۔

"انسانی عقل، کسی بھی جدید ہتھیار سے زیادہ مؤثر ہوتی ہے نیلو..."

نیلوفر کے اس مضطرب لہجے سے رضا کو ایک نئی طاقت ملی۔ اُسے یقین ہوگیا کہ اختلافات کے باوجود وہ اُسے چاہتی ہے تاہم چند لمحے قبل ہونے والی بحث کی تلخی اب بھی ذہن میں تھی۔

"تم میرا ایک کام کرسکتی ہو؟" اُس نے پوچھا۔

"مجھ سے ایسے سوال مت کیا کرو رضا!"

"شکریہ... تب پھر باہر جاکر ہیڈ کوارٹر فون کردو... وہاں کرنل احمد ہوں گے، اُنھیں یہاں کے حالات سے مطلع کردینا۔"

رضا نے مشہدی کی طرف دیکھا جو ساکت بیٹھا تھا اور پھر نیلوفر پر آنکھیں مرتکز کردیں، وہ بھی بے حِس و بے حرکت بیٹھی تھی۔

"سامنے والے بوتھ سے فون مت کرنا ورنہ ہمارا دوست تمھیں دیکھ لے گا۔" رضا نے ہدایت کی۔

"نہیں...؟" نیلوفر نے سرسراتی ہوئی سرگوشی میں جواب دیا۔ "میں نہیں جاؤں گی۔ میں تمھیں تنہا چھوڑ کر فرار نہیں ہوسکتی رضا!"

"پلیز نیل! ایسا ہی کرو جیسا میں کہہ رہا ہوں۔ مجھے بھی بعد از مرگ تمغے حاصل کرنے کا کوئی شوق نہیں۔ میں اپنی زندگی سے اسی طرح پیار کرتا ہوں جیسے تم سے پیار ہے۔"

وہ چند لمحوں تک اُسے اس طرح گھورتی رہی جیسے رضا کے اندر چھپی ہوئی کوئی خاص صلاحیت تلاش کررہی ہو۔ اُسے یقین تھا کہ رضا میں کوئی اہم ترین چیز پوشیدہ ہے... "تم... تم پولیس کے اس کام کے لیے اپنی زندگی داؤ پر لگا کر خطرہ مول لے رہے ہو۔"

"ہاں... اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ مجھے قاتلوں اور جاسوسوں سے کوئی محبت نہیں۔"

"اوہ... رضا!" نیلوفر نے اُس کے ہاتھ تھام لیے، اُس کی آنکھوں میں اس مرتبہ خوف اور دہشت کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ وہ اُسے چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی تھی۔

"وقت تیزی سے گزر رہا ہے نیل! اب تم چلی جاؤ... آہستہ آہستہ قدم اُٹھانا... تاکہ اُسے تم پر شک نہ ہوجائے۔ اس طرح چلنا جیسے تمھیں کسی کی کوئی پروا نہیں۔"

نیلو نے ٹھنڈی سانس لے کر اپنے بیگ سے لپ اسٹک اور دستی آئینہ نکالا، ہونٹوں پر لپ اسٹک کی تہ جمائی، آئینے میں دیکھا اور دھیرے سے بولی۔ "ٹھیک ہے نا...؟"

"ہاں... لیکن باتیں کرتی رہو..."

نیلو نے بلاؤز سے سگریٹ کی راکھ کے ذرّے جھاڑے اور پھر اُس کی طرف جھکتی ہوئی بولی۔ "اُس کے بارے میں کچھ اور بتاؤ۔"

"اوہ... مشہدی کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ جب یہ کسی کو قتل کرنے کا ارادہ کرلیتا ہے تو سیٹی بجانے لگتا ہے۔ بینک کے مقتول مُلازم نے اُس کی سیٹی سُن کر ہی تصویر کھینچی تھی۔"

"میرے خدا! ایسے لوگ کتنے ظالم ہوتے ہیں۔"

"ہاں... اور میں ایسے ہی لوگوں سے مُلک کو پاک کرنے کے لیے پولیس میں شامل ہوا ہوں۔"

یہ سُن کر وہ سُرخ ہوگئی۔ ایسا لگا جیسے سیلابی پانی کو روکنے والے دروازے کھل جائیں گے پھر اُس نے نظریں جھکا کر اپنا آپ سنبھالا۔ "کوئی حماقت نہ کرنا رضا... میں جلد واپس آنے کی کوشش کروں گی۔"

"ایک منٹ رُکو... وہ بھی اُٹھ رہا ہے۔" رضا نے مضطرب ہوکر سرگوشی کی۔ اُس کے لہجے میں جو بے چینی تھی اُسے محسوس کرتے ہوئے نیلو نے بیگ پھر میز پر رکھ دیا۔

رضا کا چہرہ کسی سخت پتھر کی طرح ہوگیا۔ اُس نے اپنی دائیں ٹانگ میز سے نکال کر کرسی کے باہر لٹکا دی اور اپنے بازوؤں پر جھک گیا۔ اس طرح وہ کسی بھی حملے کا جواب دینے کے لیے پھرتی سے اُٹھ سکتا تھا۔

نیلوفر نے پہلے کبھی رضا کو اس کیفیت میں نہیں دیکھا تھا۔ رضا کی آنکھوں میں بے چینی تھی جسے دیکھ کر نیلوفر مشہدی کی طرف سے محسوس ہونے والا خوف بھول گئی۔ اُسے ایسا لگا... کہ رضا ناقابلِ تسخیر ہے، مشہدی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

"کیا اُسے شک ہوگیا ہے؟" نیلوفر نے پوچھا۔

"پتہ نہیں لیکن اسے ہماری گفتگو کے آغاز ہی میں یہ علم ہوگیا تھا کہ میں پولیس سے تعلق رکھتا ہوں کیونکہ اس وقت ہم بلند لہجے میں بات کررہے تھے۔" رضا نے کن انکھیوں سے مشہدی کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "اب تم یہیں ٹھہرو گی، یہ باہر جائے گا... اور میں اس کا تعاقب کرکے باہر ہی نمٹنے کی کوشش کروں گا۔ اگر فائرنگ کی آواز سُنائی دے تو کچن کے راستے عقبی گلی میں نکل جانا۔"

"مگر میں... میں تمھارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔"

"ہرگز نہیں... اب ذرا برہمی سے مجھ سے گفتگو کرو۔ آواز اُونچی رہے۔ وہ اسی طرف آرہا ہے۔"

نیلوفر محض ایک لمحے کو ہچکچائی لیکن پھر اس کے چہرے پر طیش کے آثار اُبھر آئے... "تم... تم نے میری توہین کی ہے رضا..." اُس نے چیخ کر کہا۔ "تم نے مجھے گالی دی ہے۔"

"تم نے خود ہی ایسی حرکت کی تھی۔" رضا نے میز پر ہاتھ مار کر کہا... "تمھاری بے وفائی کے جواب میں میں تمھارے پیر تو چاٹنے سے رہا۔"

محسن مشہدی کے قدموں کی چاپ اب قریب سُنائی دے رہی تھی۔ رضا نے کسی بھی عام آدمی کے ردِ عمل کا اظہار کرنے کے لیے پلٹ کر دیکھا لیکن اسی لمحے مشہدی نے قریب آکر اُس کی پیٹھ کے ساتھ کوئی چیز لگا دی۔ "ہلنا مت آفیسر!" اُس نے حکم دیا... کوئی بھی غلط حرکت کی تو لڑکی ماری جائے گی۔"

مشہدی کے دائیں ہاتھ میں کالے رنگ کا پستول تھا جس کی زد میں رضا ہی نہیں نیلوفر بھی تھی۔

رضا کو یقین ہوگیا کہ اُس کی کسی حرکت نے مشہدی کو یہ احساس دلا دیا تھا کہ وہ اُسے گرفتار کرنے کے چکر میں ہے۔

وہ، رضا کی توقعات کے برعکس دراز قد تھا۔ اُس کے شانے چوڑے تھے اور جبڑے پر کسی پُرانے زخم کا نشان تھا۔ آنکھیں کسی بھی سفاک قاتل کی طرح سپاٹ اور بے تاثر تھیں۔

... اور وہ ہلکے ہلکے سُروں میں سیٹی بجا رہا تھا۔

"ہم... ہم نے تمھیں کیا نقصان پہنچایا ہے؟" رضا نے اپنی حکمتِ عملی میں فوراً تبدیلی کردی۔

محسن مشہدی نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ کاؤنٹر مین کو حکم دیا کہ وہ باہر آکر فرش پر لیٹ جائے۔ وہ بے چارہ کانپتا ہوا کاؤنٹر سے نکلا اور فرش پر اوندھا لیٹ گیا۔ "تم نے ذرا سی

بھی حرکت کی تو تمہارے بیوی بچے زندگی بھر محتاج رہیں گے۔“ قاتل نے کاؤنٹر مین کو دھمکی دی جو اب بھی کانپ رہا تھا۔

مشہدی نے نیلوفر کی طرف دیکھا جو زرد ہو رہی تھی۔

رضا کا خون کھول اُٹھا لیکن وہ نہتا تھا لہٰذا اُس نے جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی حماقت نہ کی۔

بچت کا راستہ صرف یہ تھا کہ مشہدی کو باتوں میں لگا کر اُسے لبلبی دبانے سے روکا جائے۔

”کھڑے ہو جاؤ...“ قاتل نے غرا کر حکم دیا۔ ”پہلے تم کھڑے ہو، پھر لڑکی کھڑی ہو گی۔“

”مگر تم ہمیں کہاں لے جا رہے ہو؟“ رضا نے پوچھا۔

”باہر...“ مشہدی نے سفاکانہ انداز میں مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”دیکھنا یہ ہے کہ باہر تمھارے ساتھی تو نہیں ہیں؟“

رضا پُرتفکر انداز میں کچھ سوچتا ہوا بیٹھا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ مشہدی جیسے ملزم کوئی موقع نہیں دیتے لیکن ہر ملزم کی کوئی نہ کوئی کمزوری ضرور ہوتی ہے۔ اسی کمزوری سے فائدہ اُٹھانے کی ضرورت تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ باہر یقیناً کچھ لوگ موجود ہوں گے لیکن وہ بھی اُسی کی طرح نہتے ملیں گے اور اگر کسی نے جرأت کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی تو مشہدی اُسے فوراً گولی مار دے گا۔

”کھڑے ہو جاؤ۔“ وہ پھر غرایا۔ ”جلدی کرو۔“

رضا، بہت آہستہ سے اُٹھا، اُس کا ذہن مختلف ترکیبوں پر عمل کرنے کے لیے منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ باہر نکلتے ہی مشہدی انھیں گولی مار دے گا۔ اب رضا کو اپنی نہیں، نیلوفر کی فکر تھی۔

”تم غلطی پر ہو صدر الدین!“ رضا نے ایک نئی حکمتِ عملی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے تمھیں گرفتار نہیں کرایا تھا۔“

”صدر الدین؟“ مشہدی کی کالی آنکھوں میں عجیب سی اُلجھن پیدا ہو گئی اور بھویں آپس میں مل گئیں۔

”ہاں... میں تمھیں پہچان گیا ہوں۔ میں جانتا تھا کہ تم میرے علاقے میں نقب زنی کے ارادے سے موجود ہو۔“

”اوہ...“ مشہدی کچھ سوچنے لگا۔

”مجھے معلوم ہے کہ گزشتہ ہفتے تم نے خیابانِ شیرازی کے چوک میں مجھ پر گولی بھی چلائی تھی لیکن مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں۔ ماضی کو بھول جاؤ، میں بھی بھول جاؤں گا۔ میں یہاں ڈیوٹی پر نہیں ہوں، اپنی منگیتر کے ساتھ آیا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ مسکرانے لگا۔ نیلوفر اُسے حیرت سے دیکھ رہی تھی لیکن وہ ذہین بھی تھی لہٰذا سمجھ گئی کہ رضا یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ وہ مشہدی کو نہیں پہچانتا۔

مشہدی واقعی کچھ سوچنے لگا، اُس کی پیشانی پر سلوٹیں پڑ گئیں، ایسا لگا جیسے وہ کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اُس نے اپنے ہونٹ اس طرح سکیڑے جیسے سیٹی بجانے والا ہو لیکن پھر ارادہ ترک کرتے ہوئے زبان ہونٹوں پر پھیری۔ اُس کی زبان بھی کسی سانپ کی زبان کی طرح پتلی اور گول تھی لیکن اُسی کے ساتھ اُس کی آنکھوں میں نفرت عود کر آئی...

”میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ تم پولیس والے ہو۔“ وہ غرانے لگا۔ ”میں تمھیں چھوڑ کر کوئی خطرہ مول نہیں لوں گا۔“

”ٹھیک ہے... جیسی تمھاری مرضی۔“ رضا نے مایوسی سے کندھے اُچکاتے ہوئے جواب دیا۔ اس کا منصوبہ اور نئی حکمتِ عملی بھی ناکام ہو گئی تھی۔

”چلو... آگے بڑھو۔“ مشہدی نے حکم دیا اور رضا اُس کی تعمیل میں میز کے دوسری طرف سے اس طرح بڑھا کہ اچانک مشہدی کے عقب میں پہنچ جائے۔ وہ جانتا تھا کہ اگر یہ ترکیب بھی ناکام ہو گئی تو بڑا مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔

”ہوشیاری کا مظاہرہ مت کرو۔“ مشہدی نے اُس کے پہلو میں پستول کی نال گاڑتے ہوئے کہا۔ ”اِس طرف سے آؤ۔“

رضا نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے اپنے منصوبے کے ناکام ہونے کا ماتم کیا۔ وہ مشہدی سے محض چند انچ دُور کھڑا ہو گیا۔ اُس نے پستول کی طرف دیکھنے کی کوشش نہیں کی... آنکھیں مشہدی پر مرتکز رکھیں، اُن آنکھوں کو دیکھ کر رضا کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ چمکیلے پتھروں کو دیکھ رہا ہو۔ اِن آنکھوں میں کچھ بھی نہ تھا۔

تبھی مشہدی دھیمے سُروں میں سیٹی بجانے لگا۔

رضا کو یقین ہو گیا کہ اب بہت کم وقت رہ گیا۔ اُسے علم ہو گیا کہ مشہدی کی سیٹی سزائے موت کا حکم سُنا رہی ہے۔

”صدر الدین! میں تمھارا بہت بُرا حشر کروں گا۔“ دھوکا کے لیے رضا نے اپنے پُرانے منصوبے کی ڈوری پھر تھام لی۔

”تم صدر الدین کے ٹکڑے ٹکڑے بھی کر ڈالو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا...“ مشہدی نے پستول کی نال اُٹھاتے ہوئے بے رحمی سے جواب دیا۔ اب اُس کی آنکھیں کسی سرد عالم میں چمک رہی تھیں۔

رضا کے اعصاب تڑخنے لگے۔ وہ جانتا تھا کہ اب کچھ کرنے کا آخری موقع ہے۔ پستول کی نال کچھ زیادہ ہی بلند ہو گئی تھی لہٰذا وہ مشہدی کو دھکا دے کر اُس کے پیروں پر لات مار سکتا تھا اس صورت میں گولی نہ لگنے کے کسی حد تک امکانات تھے اور صرف یہی آخری موقع تھا۔

اُس نے اپنی سانس روک کر جسم کو آنے والی آزمائش کے لیے تیار کر لیا۔

...لیکن اُسی لمحے مشہدی ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ شاید وہ ذہن کو بھی پڑھ لیتا تھا۔

سیٹی کی آواز اُونچی ہو گئی۔

رضا کا منصوبہ ایک بار پھر ناکام ہو گیا کیونکہ مشہدی نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر خود کو اُس کی پہنچ سے دُور کر لیا تھا۔

رضا کے چہرے پر پسینے کی بُوندیں جھلملانے لگیں۔

موت اُس کے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔

مشہدی کی آنکھوں میں زہریلی چمک تھی اور پستول کی لبلبی پر اُس کی اُنگلی کا دباؤ بڑھنے والا تھا۔

اُسی لمحے ہال میں نیلوفر کی چیخ گونج اُٹھی۔ ”بچاؤ... بچاؤ... مشہدی... مشہدی...“

نیلوفر کی تیز پکار میں نہ جانے کتنی دہشت پوشیدہ تھی کہ مشہدی اپنے فوری نشانے کو بھول کر ایک ہی لمحے کے لیے نیلوفر کی طرف پلٹا، پستول کا رُخ بھی دوسری طرف ہو گیا اور رضا نے ابھی یا کبھی نہیں کے اُصول پر عمل کرتے ہوئے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں فیصلہ کیا اور مشہدی پر حملہ کر دیا۔

اُس کا زوردار مُکا عین اُس وقت مشہدی کی دائیں کلائی پر پڑا جب وہ لبلبی دبا رہا تھا... ہال میں فائر کی زوردار آواز گونجی اور گولی بھٹک کر دیوار میں گھس گئی۔ اُسی لمحے رضا نے اپنا گھٹنا مشہدی کے پیٹ پر دے مارا... اور قاتل دُہرا ہوتا چلا گیا... وہ شدید تکلیف میں تھا، رضا نے موقعے سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کراٹے کا زوردار ہاتھ اُس کے سَر پر مارا... وہ تڑپنے لگا۔ ایک زوردار تھپڑ گُدّی پر پڑا تو وہ ڈگمگانے لگا۔ رضا اُسے سانس لینے کی مُہلت دینے کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا لہٰذا اُس نے گرے ہوئے پستول کو ٹھوکر سے ایک طرف کرتے ہوئے مشہدی پر لاتوں اور تھپڑوں کی بارش کر دی۔

مشہدی کی آنکھیں دُھندلانے لگیں پھر وہ مزید برداشت نہ کر سکا اور فرش پر گر گیا۔ اُس کے گرتے ہی رضا نے پستول اُٹھا لیا اب وہ نیلوفر کی طرف دیکھ سکتا تھا جو اپنی سڈول باہیں وا کیے اُس کی طرف دوڑی آ رہی تھی۔

”رضا... میرے رضا!“ اُس نے اپنی باہوں کے حصار میں رضا کو چھپا لیا۔ اُس کا سر پولیس والے کے سینے پر ٹِک گیا...

”رضا... ڈارلنگ... تم... تم ٹھیک ہو نا؟“

”ہاں... میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ اُس نے نیلو کے ریشمیں بالوں پر گال رکھتے ہوئے کہا۔

اُن سے چند قدم دُور فرش پر لیٹا ہوا کاؤنٹر مین اب بھی کانپ رہا تھا۔ ”ہیڈ کوارٹر فون کرو احمق۔“ رضا نے اُسے حکم دیا... ”میرا تعلق پولیس سے ہے۔“

”ب... بہتر آقا۔“ کاؤنٹر مین بڑی مشکل سے اُٹھ کر کاؤنٹر کی طرف چلا گیا۔ اُس کی ٹانگیں تنکوں کی طرح کانپ رہی تھیں...

رضا نے نیلوفر کی آنکھوں میں جھانکا جو اب بھی اُس کے بازوؤں میں تھی۔

وہ پژمُردہ انداز میں مسکرانے لگی۔ ”میں بے وقوف نہیں ہوں رضا... اب میں کچھ بھی نہیں کر سکتی۔“ اُس نے دِھیرے سے کہا۔

”میں نے کبھی کسی پر جبر نہیں کیا نیلو۔“ رضا نے سنجیدگی سے جواب دیا... ”اور میں تمھیں بھی مجبور نہیں کروں گا۔ تم پولیس سے نفرت کرتی ہو تو میں...“

”نہیں... نہیں...“ وہ بسورنے لگی۔ ”میں تو اب کچھ بھی نہیں کر سکتی رضا۔ میں پولیس افسر کی بیوی بننا چاہتی ہوں۔“

”کک... کیا...؟“ وہ اُچھل پڑا۔ ”کیا تم سوچ سمجھ کر کہہ رہی ہو؟ میں تمھارا مطلب نہیں سمجھا۔“

”سمجھ جاؤ گے۔“ نیلو نے مسکراتے ہوئے اُس کے سینے میں مُنہ چھپا لیا... ”مجھے بھی حقیقت کو سمجھنے میں کافی دیر لگ گئی... لیکن اب میں پولیس افسر کی بیوی بننا چاہتی ہوں۔“

”خدایا...“ رضا نے ایک طویل سانس لے کر اپنے ہونٹ اُس کی ریشمی زُلفوں پر رکھ دیے۔ وہ بہت خوش تھا... اُسے آج دُنیا جہان کی نعمتیں مل رہی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ مُحسن مشہدی کو گرفتار کرانے کے صِلے میں اُسے جہاں ترقی ملے گی... وہیں نیلوفر بھی مل جائے گی اور اُسے یہ بھی علم تھا کہ نیلوفر ہی اُس کا سب سے بڑا انعام ہو گی...

◆

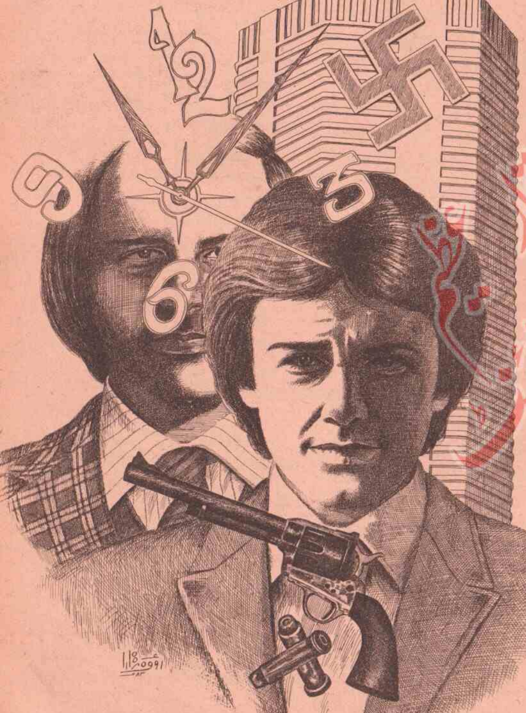

تھکے تھکے سے اور بوجھل لمحوں کے لیے اکسیر
ابنِ صفی کی زندہ جاوید تحریر، عمران کا ایک
شوخ اور دلچسپ کارنامہ، ایک مکمل ناول

بزدل سورما

★

ابنِ صفی

جوزف کا خیال تھا کہ شرابی نہ ہونے کے باوجود بھی جیمسن ایک اچھا آدمی ہے... انگریزی زبان کے توسط سے دونوں ایک دوسرے کو بخوبی سمجھ سکتے تھے اور دراصل یہی چیز ان دونوں کی یکجائی کا سبب بنی تھی۔

جیمسن کو کلاسیکس کا خبط تھا... اور جوزف اپنے قبیلے، اپنے ملک اور اپنے برِاعظم سے متعلق ڈھینگیں مارنے کا رسیا ٹھہرا۔ وہ ان کے بارے میں طرح طرح کی بکواس کرتا اور جیمسن بڑی دل جمعی سے سُنتا رہتا۔ کبھی کسی بات کا منطقی جواز نہ طلب کرتا۔ خرافات پر اس طرح سر ہلاتا جیسے پہلے ہی سے ان پر تحقیق و تصدیق کر رکھی ہو...

دونوں اکثر ساتھ دیکھے جاتے۔ آج ظفر الملک نے شہر سے باہر... جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ جیمسن نے جوزف کو بھی مدعو کر دیا اور پھر وہ تینوں پکنک کے لیے نکل کھڑے ہوئے تھے۔

ظفر کو اس کی پروا نہیں تھی کہ ساتھی کون ہیں وہ تو اپنی کھال میں مست رہنے والوں میں سے تھا۔ راستے بھر دونوں کی بکواس غیر متعلقانہ انداز میں سُنتا رہا اور ان دونوں میں سے بھی کسی نے اُسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

اس وقت جیمسن نے فسانۂ عجائب کا ذکر چھیڑ رکھا تھا اور جوزف محویت کے عالم میں کبھی دانت نکال دیتا اور کبھی سر ہلانے لگتا...

جیمسن کہہ رہا تھا: "جانِ عالم کا توتا نہ صرف آدمیوں کی طرح بولتا تھا بلکہ حُسن کا نقّاد بھی تھا... ایک مُلک کی شہزادی کے حسن کی ایسی تعریف کی کہ جانِ عالم ہزار جان سے عاشق ہُوا اور راج پاٹ چھوڑ کر نکل کھڑا ہُوا، اُس حسینہ کی تلاش میں!"

" محض توتے کے کہنے میں آکر...؟" جوزف نے خشک لہجے میں پوچھا۔

" توتا تو ایک خوبصورت پرندہ ہے۔ بہتیرے لوگ گدھوں کے کہنے میں آکر پتہ نہیں کیا کچھ کر گزرتے ہیں۔"

" تو کیا بولنے والے گدھے بھی ہوتے ہیں؟"

" بولنے ہی والے گدھے ہوتے ہیں۔"

" بہت دیر سے آوازیں سن رہا ہوں۔" ظفر بول پڑا اور دونوں یک لخت خاموش ہو گئے...

جیمسن اپنی جھاڑ جھنکاڑ داڑھی میں انگلیوں سے خلال کرنے لگا اور جوزف سختی سے ہونٹ بھینچے ہوئے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا...

وہ دونوں پچھلی سیٹ پر تھے اور ظفرالملک گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا...

پتہ نہیں جوزف کو کیا سوجھی کہ اس نے باس کی تعریفیں شروع کر دیں... اور ظفر بائیں آنکھ دبا کر مسکرانے لگا... اچھی طرح جانتا تھا کہ جواباً اس کا ملازم اس کی تعریف ہرگز نہیں کرے گا لیکن خلافِ توقع اس نے جیمسن کی آواز سنی۔

" میرا باس بھی کسی زمانے میں بہت اچھا آدمی تھا۔"

" اوہو... نہیں..." جوزف جلدی سے بولا۔ " مسٹر ظفر اب بھی اچھے آدمی ہیں۔"

" تمہارے نزدیک اچھائی کا کیا معیار ہے؟" جیمسن نے سخت لہجے میں کہا۔

" معیار... یہ تو بڑا مشکل سوال کر دیا تم نے۔"

" بہرحال میں تمہیں بتاتا ہوں... تمہارے باس کی صحبت نصیب ہونے سے پہلے میرا باس ایک زندہ آدمی تھا۔"

" اب بھی زندہ ہے..." جوزف نے احمقانہ انداز میں دانت نکال دیے...

" غلط... اب یہ کسی لڑکی کو دیکھ کر سیٹی نہیں بجاتے۔"

" یہ تو بڑی اچھی بات ہے مسٹر جیمسن۔"

" افریقہ میں اچھی بات ہو گی... غالبؔ اور مومنؔ کے برِصغیر میں نہیں۔"

" یہ کون لوگ ہیں؟"

" عاشق... انھوں نے زندگی بھر عشق کے علاوہ اور کچھ نہیں کیا۔"

" اچھا... میں سمجھا۔ ہاں میرا باس عشق جیسی فضولیات میں نہیں پڑتا...!"

" اسی لیے میں اسے اچھا آدمی نہیں سمجھتا۔ میر تقی میرؔ کے والد ان سے کہا کرتے تھے۔ بیٹا عشق کرو۔ عشق جلاتا ہے اور عشق رلاتا ہے۔"

" یہ دونوں کون تھے؟"

" دونوں ہی عاشق تھے۔"

" باپ بیٹا دونوں...؟" جوزف نے حیرت سے پوچھا۔

" اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ اچھا میں سمجھا۔ نہیں دونوں کسی ایک پر عاشق نہیں تھے۔ الگ... الگ..."

" اچھا... اچھا..."

" ہاں... تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ میرا باس ایک اچھا آدمی تھا... لڑکیاں اسے بہت پسند کرتی تھیں۔"

" اب بھی کرتی ہوں گی؟"

" لڑکیاں مَردوں کو پسند کرتی ہیں مُردوں کو نہیں۔"

" اب خاموش بھی رہو۔ لڑکیوں کے بچے۔" ظفر نے اونچی آواز میں کہا۔

" لینگویج پلیز..." جیمسن برا سا منہ بنا کر بولا۔ " آزادیٔ رائے کا گلا نہ گھونٹیے یور ہائی نس!"

" اچھا کیے جاؤ بکواس..."

" ہاں تو مسٹر جوزف... مجھے ذاتی طور پر لڑکیوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔" جیمسن پھر جوزف کی طرف متوجہ ہو گیا۔

" پھر اپنے باس میں یہ برائی کیوں دیکھنا چاہتے ہو؟"

" اگر مجھے کسی چیز سے دلچسپی نہ ہو تو وہ بری کیوں کر ہو سکتی ہے؟"

" اچھا یہی بتا دو کہ تمھیں کیوں دلچسپی نہیں؟"

" انھیں مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں اس لیے مجھے بھی نہیں ہے..."

" کل ہی ایک لڑکی اسے دیکھ کہتی ہوئی قریب سے گزر گئی تھی۔" ظفر بولا...

" یور ہائی نس اس نے محض آپ کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے مجھے ٹارگٹ بنایا تھا۔"

" تم نے اسی وقت یہ بات کیوں نہیں بتائی؟"

" میں درمیانی آدمی بننا پسند نہیں کرتا۔"

" ہاں تو مسٹر جیمسن وہ توتے والا قصہ؟" جوزف نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

" قصہ جانِ عالم کا ہے... مرکزی کردار توتا نہیں ہے۔"

" خیر... خیر... پھر کیا ہوا تھا؟"

" وہ شہزادی جانِ عالم کو مل گئی تھی!"

" لیکن توتے کا کیا ہوا؟"

" کچھ بھی نہیں... وہ بے چارا پھر پنجرے کی نذر ہو گیا تھا۔ آدمی ہوتا تو کم از کم اپنا کمیشن ہی وصول کر لیتا۔"

جوزف نے دانت نکال دیے اور بوتل سے کاک نکالنے لگا... دو تین گھونٹ لے کر جیمسن سے بولا۔ " میرا باس بہت وضعدار آدمی ہے کہ مجھ جیسے ناکارہ لوگوں کو پال رہا ہے۔"

جیمسن آنکھیں بند کر کے کچھ سوچنے لگا تھا۔ اس ریمارک پر خاموش ہی رہا۔

کار تیزی سے مسافت طے کر رہی تھی لیکن ان دونوں کو معلوم نہیں تھا کہ جانا کہاں ہے۔

وہ سورج طلوع ہونے سے قبل روانہ ہوئے تھے اور اب اچھی خاصی دھوپ پھیل گئی تھی... نومبر کے اواخر کا سورج اپنی قہرمانی کھو چکا تھا۔ اس لیے یہ سفر ناخوشگوار بھی نہیں معلوم ہو رہا تھا...

" ہم جا کہاں رہے ہیں یور ہائی نس؟" دفعتاً جیمسن نے سوال کیا...

" اپنے ہی ملک میں بنا ہوا جاپانی کپڑا خریدنے۔"

" میں نہیں سمجھا..."

" وہیں پہنچ کر سمجھ لینا، بس دو ڈھائی میل اور چلنا پڑے گا۔"

" لیکن آپ تو پکنک پر تشریف لائے تھے۔"

" برا آدمی سمجھ کر معاف کر دو..." ظفر نے کہا اور گاڑی کے بریک چرچرائے۔ اس نے گاڑی یکلخت روک دی تھی... کیونکہ سامنے ایک لڑکی ہاتھ اٹھائے کھڑی نظر آئی۔ بائیں جانب سڑک کے کنارے ایک گاڑی بھی کھڑی ہوئی تھی۔

جیمسن نے لڑکی کو ستائشی نظروں سے دیکھا کیونکہ وہ اسی کے قبیلے کی معلوم ہوتی تھی... بال بے ترتیبی سے پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے اور وہ جین اور جیکٹ میں ملبوس تھی۔ رنگت کی بنا پر کسی مغربی ملک کی معلوم ہوتی تھی...

" کیا بات ہے؟" ظفر نے گاڑی سے اتر کر پوچھا۔

" ٹائر فلیٹ ہو گیا۔" لڑکی نے گاڑی کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا... " میرے پاس جیک نہیں ہے۔"

" فالتو پہیہ..."

" وہ ہے۔"

" اچھی بات ہے۔" ظفر نے کہا۔ " اتفاق سے اس وقت میری گاڑی میں بھی جیک موجود نہیں ہے... لیکن پہیہ بدل دیا جائے گا۔ تم فکر نہ کرو۔"

اس نے جوزف اور جیمسن کو گاڑی سے اترنے کا اشارہ کیا...

" دیکھا تم نے؟" جیمسن نے بے حد خوش ہو کر جوزف سے کہا۔ " جیک کے بغیر پہیہ بدلا جائے گا۔"

" یہ کیسے ممکن ہے؟"

" ممکن ہو یا نہ ہو... اس وقت میرے باس نے زندگی کا ثبوت دیا ہے۔"

دونوں گاڑی سے اتر آئے...

لڑکی نے اپنی گاڑی کی ڈکی سے فالتو پہیہ نکالنے کے لیے کنجی ظفر کے حوالے کر دی تھی۔ وہ ڈکی کھول کر پہیہ نکالنے لگا۔ جوزف اور جیمسن اس کے قریب آ کھڑے ہوئے تھے...

" مگر یور ہائی نس... جیک کے بغیر کیسے کام چلے گا؟" جیمسن نے پوچھا۔

" جانِ عالم کا توتا سب کچھ کرے گا... تم دونوں گاڑی کے نیچے لیٹ کر اس کا پچھلا حصہ اوپر اٹھاؤ گے اور میں پہیہ بدل دوں گا۔"

جوزف نے اس پر بڑی نفرت سے لڑکی کی طرف دیکھا تھا، جو قریب ہی کھڑی ادھر ادھر نظر دوڑا رہی تھی... ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس معاملے کا اس کی ذات سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ دفعتاً جیمسن زور سے ہنس پڑا۔

" اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟" جوزف غرّایا۔

" اب میرا باس خود کو ایک اچھا آدمی ثابت کر رہا ہے۔"

لڑکی جیمسن کے قہقہے پر ایک پل کے لیے اس کی طرف متوجہ ہو کر مسکرائی تھی اور پھر پاگلوں کے سے انداز میں ادھر ادھر دیکھنے لگی تھی...

" تم بہت طاقت ور ہو..." ظفر نے جوزف کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا...

" وہ تو ٹھیک ہے مسٹر... لیکن..."

" تمھارا باس بھی مجبوروں کے کام آتا ہے... اس کے لیے صنف کی شرط نہیں ہے۔"

" اچھا..." جوزف طویل سانس لے کر بولا اور گاڑی کے نیچے گھسنے کی تیاری کرنے لگا۔

ظفر اس کی طرف متوجہ تھا۔ اچانک اس نے جیمسن کی

تحیر زدہ سی "ارے ارے" سُنی...

اور پھر جتنی دیر میں وہ اس کی طرف توجہ دیتا۔ لڑکی اُس کی گاڑی لے کر فرار ہو چکی تھی۔

دونوں ہی دُور تک اس کے پیچھے دوڑتے چلے گئے... لیکن وہ خاصی تیز رفتاری سے گئی تھی۔

"تم مردود..." ظفر دوڑتے دوڑتے رُک کر جمیسن کی طرف مُڑا...

"لینگویج پلیز... مَیں نے کیا کیا ہے...؟" جمیسن ہانپتا ہُوا بولا۔

"ارے... ارے... کرتے رہ گئے... دوڑ کر اُسے روکا نہیں تھا..."

"یور ہائی نس... مَیں اتنا پھرتیلا نہیں ہُوں... ارے ارے ہی بمشکل تمام میری زبان سے نکل سکا تھا۔"

پھر وہ مُردہ سی چال چلتے ہُوئے جوزف کی طرف پلٹے تھے... جوزف اس طرح دانت نکالے کھڑا تھا جیسے اُس واقعے سے بے حد محظوظ ہُوا ہو...

"اب میرے باس کے بارے میں کیا خیال ہے مسٹر جمیسن۔"

"مجھے اتنے چالاک آدمی پسند نہیں ہیں جنھیں لڑکیاں بے وقوف نہ بنا سکیں۔"

ظفر پُرتشویش نظروں سے گاڑی کی طرف دیکھے جا رہا تھا جمیسن کے اس ریمارک پر جوزف کو متوجہ کر کے بولا۔ "مجھے اس پر کوئی افسوس نہیں ہے کیونکہ دو سال پہلے لندن میں مجھ سے بھی ایک ایسی ہی حرکت سرزد ہُوئی تھی۔"

"اوہو...!" جمیسن ہنس پڑا... ہنستا رہا اور پھر بولا۔ "مجھے وہ بوڑھی عورت یاد ہے... بے چاری... چیختی رہ گئی تھی... ہماری طرح دوڑ بھی نہیں سکتی تھی..."

"خیر مجھے کیا...؟" جوزف نے بے پروائی سے شانوں کو جنبش دے کر کہا۔ "اب مجھے کیا کرنا ہے... مسٹر...!"

"پہیہ تو بدلنا ہی پڑے گا... اوہ... ہاں... کنجی اگنیشن میں موجود ہے۔" وہ اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر گاڑی میں بیٹھتا ہُوا بولا... "ذرا مَیں فیول پوزیشن دیکھ لوں...!"

اس کے بعد وہ "ٹھیک ہے" کہتا ہُوا اُتر آیا تھا۔

پہیہ بدلنے میں بیس بائیس منٹ صرف ہُوئے۔ جوزف اور جمیسن دونوں کو زور لگانا پڑا تھا۔

روانگی کے وقت جمیسن ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "اپنی گاڑی میں تو کھانے پینے کا سامان بھی تھا یہاں کچھ بھی نظر نہیں آتا...!"

"میرا خیال ہے کہ وہ بہت جلدی میں تھی۔" ظفر نے کہا۔

"مَیں تو بے موت مر گیا...!" جوزف کی آواز کانپ رہی تھی۔

"کیوں...؟"

"میری ڈھائی بوتلیں..."

"مجھے افسوس ہے جوزف...!" ظفر نے نرم لہجے میں کہا۔

جوزف کچھ نہ بولا... اُس کے چہرے پر گہری اُداسی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ابھی ابھی اپنے کسی عزیز کو دفن کر کے قبرستان سے واپس آیا ہو...

کار تیزی سے راستہ طے کرتی رہی اور دو ڈھائی میل کی مسافت طے کرنے کے بعد وہ سڑک سے کچے راستے پر موڑ دی گئی۔

یہاں چاروں طرف بے شمار چھوٹے بڑے ٹیلے بکھرے ہُوئے تھے...

دس منٹ بعد وہ ایک ایسی جگہ جا پہنچے جہاں دس بارہ کاریں کھڑی تھیں اور اُن کے آس پاس متعدد اُونٹ بھی کھڑے دکھائی دیے۔ کچھ اُونٹوں پر بے حد فیشن ایبل قسم کی خواتین سوار تھیں اور وہ مغرب کی طرف چلے جا رہے تھے۔

"کلاسیک...!" جمیسن خوش ہو کر چیخا... "ارے یہ کاروں سے اُتر کر اُونٹوں پر بیٹھ رہی ہیں۔"

"جہاں یہ جا رہی ہیں... ادھر کاریں نہیں جا سکتیں... پانچ میل لمبا دُشوار گزار راستہ طے کر کے یہ منزل مقصود پر پہنچ جائیں گے۔"

"مسٹر... آپ کو اپنی گاڑی کے لیے سڑک پر ہی سفر جاری رکھنا چاہیے تھا..." جوزف بولا۔

"فکر نہ کرو...!"

"کیا اب ہمیں بھی اُونٹ پر بیٹھنا پڑے گا؟" جمیسن نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔

"اگر اپنے ہی مُلک میں بنا ہُوا جاپانی کپڑا خریدنا ہے تو ضرور بیٹھنا پڑے گا۔ دیکھو کیسی اُونچی اُونچی خواتین اُونٹوں پر نظر آ رہی ہیں... یہ غیر مُلکی کپڑا خریدنے کے لیے اُونٹوں پر بھی بیٹھ سکتی ہیں... سستا اور عمدہ کپڑا...!"

"مطلب یہ ہے کہ اسمگل کیا ہُوا...!"

"ہرگز نہیں... یہ کپڑا اپنے ہی مُلک کی مِلوں میں بنتا ہے اور اس پر دوسرے ممالک کی مُہر ڈال کر اس طرح فروخت کیا جاتا ہے... سستا یوں ہے کہ اس پر ایکسائز ڈیوٹی ادا نہیں کی جاتی۔"

"سوال تو یہ ہے کہ آپ یہاں کیوں آئے ہیں یور ہائی نس۔"

"اُونٹ پر بیٹھی ہُوئی خواتین مجھے بہت اچھی لگتی ہیں... افسوس کہ میرا مینڈولن بھی گاڑی ہی میں رہ گیا ورنہ مَیں اس پر اس وقت ایک صحرائی دُھن چھیڑ دیتا۔"

"اُونٹ مجھے دُور ہی سے اچھے لگتے ہیں۔" جمیسن بولا۔ "دُور کے اُونٹ سہانے۔"

"کیا واقعی مسٹر... تم ایسا کپڑا خریدو گے جس پر ایکسائز ڈیوٹی ادا نہ کی گئی ہو؟" جوزف نے پوچھا۔

"مَیں صرف تفریح کی غرض سے آیا ہُوں تم مطمئن رہو!"

"مجھے تو یہیں رُکنا ہے۔" جوزف جماہی لے کر بولا... "تم دونوں شوق سے اُونٹ پر بیٹھو مَیں گاڑی میں پڑا رہوں گا۔ خدا اُس سفید سور یا سے سمجھے... میری ڈھائی بوتلیں...!"

"کیا مَیں یہاں تمھارے لیے کسی سے بھیک مانگوں؟" جمیسن بولا۔

"نہیں جاؤ... تفریح کرو... مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔" جوزف نے کہا اور گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لیٹنے کی کوشش کرنے لگا...

ظفر نے جمیسن کو وہاں سے چل دینے کا اشارہ کرتے ہُوئے کہا۔ "ٹھیک ہے جوزف کو آرام کرنے دو۔"

وہ دونوں اب اُونٹوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ایک ٹولی مغرب کی جانب جا چکی تھی اور اب دوسری تیار ہو رہی تھی... اس ٹولی میں ایک بھی مرد نہیں تھا۔ ان خواتین کے ساتھی گاڑیوں میں بیٹھے رہ گئے تھے۔

"یور ہائی نس... ہم بالکل احمق لگیں گے۔" جمیسن بولا۔

"شٹ اپ...!"

"ایز یو پلیز...!"

وہ قریب پہنچے تو خواتین انھیں ایسی نظروں سے دیکھنے لگیں جیسے وہ سچ مچ لفنگے ہوں... آپس میں اُن کی کھسر پھسر بھی ہُوئی تھی لیکن ظفر اُن کی طرف توجہ دیے بغیر ایک اُونٹ والے سے گفتگو کرنے لگا...

کرایہ طے ہو جانے کے بعد اُونٹ بٹھایا گیا۔

"مَیں آگے بیٹھوں گا...؟" جمیسن نے متفکرانہ لہجے میں کہا۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اُونٹ پر سب برابر ہیں...!" ظفر بولا۔ انھیں اُونٹ پر بیٹھتے دیکھ کر کچھ مرد بھی گاڑیوں سے اُتر کر ادھر چلے آئے تھے...

"دیکھا آپ نے یور ہائی نس۔" جمیسن بولا۔ "انھیں اُونٹ والوں پر اعتماد ہے اور ہمیں ڈاکو سمجھتے ہیں...!"

"تیری شکل ہی ڈاکوؤں جیسی ہے...!"

آٹھ اُونٹوں کا یہ چھوٹا سا قافلہ چل پڑا تھا...

"یہ سواری بھی ہے اور جھولا بھی..." جمیسن بڑبڑایا۔ "مجھے اپنا مینڈولن یاد آ رہا ہے۔"

"مجھے اس وقت صرف خدا یاد آ رہا ہے... اگر یہ اُونٹ دوڑنا شروع کر دے تو ہم کہاں ہوں گے...!"

صرف ایک سَو روپے میں!

الیکٹرانک اصلی گھڑی
آٹومیٹک زنانہ و مردانہ

خوبصورت گھڑی، اعلیٰ کارکردگی، آٹومیٹک گارنٹی ۱۰ سال، خوبصورت ڈیزائن، الیکٹرانک ٹیکنالوجی کا حیرت انگیز کمال، ہر گھنٹے ٹائم سگنل درآمد شدہ، پانی گرد اور جھٹکا لگنے سے متاثر نہیں ہوتی۔ جاپان چائنا سوئٹزرلینڈ سے درآمد شدہ۔ ایک منٹ کا بھی ٹائم میں فرق نہیں دیتی، پاکستان میں پہلی دفعہ صرف ہمارے ہاں دستیاب ہے۔ قیمت صرف ایک سَو روپے محصول ڈاک ۱۰ روپے علاوہ۔ ایک خط لکھ کر منگائیے۔

منگانے کا پتہ } ایمپائر کارپوریشن پوسٹ بکس نمبر ۲۰ کراچی نمبر ۱

"یا گر پڑیں گے یا نہ گریں گے...!"

"اتنی اونچائی سے گرنے کا مطلب ہوا فریکچر...!"

"فوری طور پر دم بھی نکل سکتا ہے۔" ظفر بولا۔

"کیا واقعی آپ محض تفریح کی غرض سے اِدھر آئے ہیں؟" جمیسن نے پوچھا...

"نہیں...!"

"بعض اوقات میں سوچتا ہوں کہ...!"

جمیسن جملہ پورا نہیں کر سکا تھا کیونکہ اونٹ نے ٹھیک اُسی وقت کسی ناہموار جگہ پر پاؤں رکھ دیا تھا...

"کیا ہم پیدل نہیں چل سکتے؟" اُس نے کچھ دیر بعد ظفر سے کہا...

"اِس کلاسیکل سواری سے تمھاری بیزاری میری سمجھ میں نہیں آتی...!"

"صاحب میں حقہ نہیں پی سکتا۔ پان بھی نہیں کھا سکتا اور ڈیڑھ تھان کا پاجامہ بھی نہیں پہن سکتا۔ زری کی جوتیاں تو شاید میرے فرشتے بھی نہ پہن سکیں...!"

"اونہہ... ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میں یہاں اس مبلغ کو دیکھنے آیا ہوں جو صرف عورتوں میں تبلیغ کرتا ہے اور ہر اُس جگہ پہنچ جاتا ہے، جہاں بہت سی عورتیں پائی جاتی ہیں۔"

"ڈیوٹی...؟"

"نہیں نجی طور پر... سنا ہے اپنے ہی قبیلے سے تعلق رکھتا ہے۔"

"ہپی ہے؟"

"ہاں... لیکن باتیں ہپیوں کی سی نہیں کرتا۔"

"تب تو واقعی دیکھنے کی چیز ہوگا...!"

◆

جوزف کی حالت تباہ تھی۔ جماہیوں پر جماہیاں آ رہی تھیں۔ آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ جھنجلاہٹ کا یہ عالم تھا کہ دل ہی دل میں خود کو گالیاں دینے لگا تھا۔ آخر وہ ان کے ساتھ آیا ہی کیوں؟ یہ بھی کوئی پکنک کی جگہ ہے... یہ لوگ بھی اوّل درجے کے احمق معلوم ہوتے ہیں۔ عورتوں کو اونٹ پر دیکھنے کے شوق میں دوڑے چلے آئے... عورتوں کا کیا ہے۔ وہ سستی چیزیں خریدنے کے سلسلے میں اپنی زندگی تک داؤ پر لگا سکتی ہیں۔ اگر اس پکنک کا مقصد پہلے سے معلوم ہو گیا ہوتا تو وہ ہرگز نہ آتا۔ اب پتہ نہیں وہ دونوں کتنی دیر میں واپس ہوں... اس کا کیا حشر ہوگا...

اچانک ایک گاڑی اُس کے برابر آ رکی اور جوزف چونک کر اُس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

پھر اُس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا... کیونکہ یہ ظفر الملک کی گاڑی تھی اور اسٹیرنگ کرنے والی لڑکی بھی وہی تھی۔ جوزف سے نظر ملتے ہی اُس نے خوش دلی سے ہاتھ ہلا دیا...

جوزف نے جھٹکے کے ساتھ اپنا منہ بند کیا اور اُس کے جبڑے بھنچ کر رہ گئے۔

وہ کھڑکی سے سر نکال کر بولی: "میں مقامی زبان نہیں بول سکتی۔ کیا تم میری بات سمجھ رہے ہو؟"

"میں انگریزی میں گفتگو کر سکتا ہوں۔" جوزف نے بُرے لہجے میں کہا۔

"تب تو مجھے خوشی ہے۔ میں ایک دشواری میں پڑ گئی ہوں۔"

"دوسروں کو مصیبت میں مبتلا کرنے والے خود بھی بڑے عذاب میں پڑ جاتے ہیں۔ کیا تم کرسچین ہو؟"

"کیوں نہیں..." لڑکی نے فخریہ کہا۔

"لیکن تم نے لٹیروں جیسی حرکت کی تھی۔"

"کبھی کبھی مجبور بھی ہو جانا پڑتا ہے... وہ لوگ میرا پرس چھین بھاگے تھے جس میں ایک بڑی رقم تھی۔ مجھے اُن کے پیچھے جانا تھا..."

"تو پھر کیا ہوا...؟"

"میں نے انھیں جا لیا... لیکن اپنا پرس واپس نہ لے سکی۔ اُنھوں نے میرا مضحکہ اُڑا دیا...!"

"تم سے غلطی ہوئی تھی۔ اگر ایسی کوئی بات تھی تو ہماری گاڑی لے بھاگنے کی بجائے ہم سے مدد مانگی ہوتی!"

"میں شرمندہ ہوں... اور تمھاری گاڑی واپس کرنا چاہتی ہوں...!"

"اچھا... اچھا... ہماری کوئی چیز ضائع تو نہیں ہوئی؟"

"قطعی نہیں چیک کر لو...!"

جوزف گاڑی سے اُتر کر ظفر کی گاڑی کے قریب پہنچا۔ ہر چیز جوں کی توں موجود تھی۔ اپنی بوتلوں پر نظر پڑتے ہی اُس کا چہرہ کھل اُٹھا...

"اچھا بہتی... اب تم اپنی گاڑی سنبھالو۔"

لڑکی اُسے گاڑی کی کنجی دے کر اپنی گاڑی میں جا بیٹھی۔ پھر جوزف نے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا کہ وہ کدھر گئی...

سکٹ میں ہاتھ ڈال کر آدھی بوتل نکالی تھی اور دوبارہ خوش اخلاق بننے کی کوشش کرنے لگا تھا...

کسی قدر آنکھیں کھلیں تو اُس نے آس پاس کے لوگوں کو حقارت سے دیکھا کیونکہ وہ عورتوں کے چکر میں پڑ کر اس ویرانے میں آئے تھے "کتنی گھٹیا زندگی گزارتے ہیں، یہ شادی شدہ لوگ!" اُس نے سوچا...

کچھ اور بھی سوچتا لیکن اُسی وقت ایک پولیس کار قریب آ کر رکی اور اس پر سے ایک آفیسر ریوالور تانے اُترا۔ ریوالور کا رُخ جوزف کی طرف تھا۔

"گاڑی سے باہر آؤ...!" جوزف کو حکم دیا گیا۔

"کیوں..." جوزف غرایا۔

"باہر آؤ... ورنہ شوٹ کر دوں گا!"

وہ اُسے قہر آلود نظروں سے گھورتا ہوا گاڑی سے اُتر آیا لیکن اُس نے اپنے ہاتھ نہیں اُٹھائے تھے۔

کچھ اور لوگ بھی اپنی گاڑیوں سے اُتر کر اُن کے قریب آ گئے۔

"لڑکی کہاں ہے؟" آفیسر نے جوزف سے سوال کیا۔

"میں نہیں جانتا...!"

"اس کے ہتھکڑیاں لگا دو..." آفیسر نے اپنے پیچھے کھڑے ہوئے کانسٹیبلوں کو مخاطب کیا۔

"آخر کیوں...؟ وجہ بھی تو بتاؤ!" جوزف نے دماغ ٹھنڈا رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا...

"یہ گاڑی لڑکی چلا رہی تھی؟"

"ہاں... وہی لائی تھی اور اپنی گاڑی لے گئی۔"

"کیا مطلب؟"

"اِدھر راستے میں اُس کی گاڑی کا ٹائر فلیٹ ہو گیا تھا۔" جوزف نے طویل سانس لے کر کہا اور لڑکی کی کہانی دہرانے لگا۔

آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں نے بھی بتایا کہ ایک غیر ملکی لڑکی کچھ دیر پہلے اس سے گاڑی بدل کر وہاں سے گئی ہے...

"تم بھی تو غیر ملکی ہی معلوم ہوتے ہو؟" آفیسر جوزف کو گھورتا ہوا بولا...

"ہوں! یقیناً ہوں... لیکن ایک بہت بڑے آدمی کا ملازم ہوں... اسے جب یہ معلوم ہوگا کہ میں کسی ناگہانی مصیبت میں پھنس گیا ہوں تو وہ زمین آسمان ایک کر دے گا...!"

"وہ دونوں کہاں ہیں جن کا ذکر تم نے ابھی کیا ہے؟"

"اونٹ پر بیٹھ کر اُدھر گئے ہیں..." جوزف نے مغرب کی طرف ہاتھ اُٹھا کر کہا۔

"تمھیں ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔" آفیسر نے سخت لہجے میں کہا

"گاڑی کی کنجی میرے پاس ہے اس لیے ان لوگوں کی... واپسی سے قبل میں کہیں نہ جا سکوں گا..."

پھر جوزف انھیں دھمکیاں ہی دیتا رہ گیا تھا اور اس کے ہتھکڑیاں لگ گئی تھیں۔

*

خیموں اور چھولداریوں کی یہ بستی کپڑا بازار کے نام سے مشہور تھی... شہر میں جو کپڑا دس روپے گز بکتا تھا یہاں اُس کی قیمت چار پانچ روپے گز سے زیادہ نہیں ہوتی تھی...

شہر سے یہاں تک آنے والوں کو خاصی دشواریاں پیش آتی تھیں لیکن اس کے باوجود سستے اور غیر ملکی کپڑوں کی کشش انھیں کھینچ ہی لاتی تھی...

جمیسن تحیر آمیز نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ دفعتہً چہک کر بولا... "اُنیسویں صدی کے کسی فوجی پڑاؤ کا بازار معلوم ہوتا ہے... بس کٹورا کھنکانے والے سقوں کی کمی محسوس ہوتی ہے...!"

"ہے نا کلاسیکل چیز...!"

"بالکل ہے... یور ہائی نس... میں آپ کا ممنون ہوں۔"

"اب کچھ خریدنا بھی چاہیے... ورنہ وہ خواتین سمجھیں گی کہ ہم اُنھی کے لیے آئے تھے..."

"سمجھنے دیجیے...!"

"ہم یورپ میں نہیں ہیں...!"

"لیکن وہ کہاں ہیں... جس کے لیے آپ آئے تھے؟"

"دیکھیں گے... چلو پہلے دکانیں دیکھیں... تمھارے سوٹ کے لیے چار خانے کا کوئی پیس ہاتھ آ جائے شاید۔"

"یہاں کے ہپیوں کو غرارہ سوٹ پہننا چاہیے۔"

"ضرور لیکن داڑھی مونچھیں صاف کرا کر تاکہ یہاں کے کلچر کے مطابق کم از کم ہیجڑے تو نظر ہی آ سکیں...!"

"آپ اپنے دماغ کی خبر لیجیے یور ہائی نس...!"

"چلو..." ظفر اُسے دھکیلتا ہوا آگے بڑھا...

خیموں میں اعلا قسم کے کپڑوں کی دکانیں تھیں۔ وہ ایک ایک خیمہ دیکھتے پھرے لیکن کہیں بھی مردوں کے استعمال کے کپڑے نہ دکھائی دیے...

"یہ کیا قصہ ہے... یور ہائی نس..."

"مرد... یہاں کہاں ہیں... صرف خواتین آتی ہیں۔ اس لیے انھی کے استعمال کے کپڑے ہی ملیں گے۔"

"تو ہم یونہی... خوامخواہ..."

"بکواس مت کرو... ابھی کچھ دیر پہلے تم نے خوشی کا اظہار کیا تھا..."

"میں سمجھا تھا کہ یہاں کسی خیمے میں نان بائی کی دکان بھی ہوگی۔" ظفر کچھ نہ بولا... وہ ایک مجمعے کی طرف متوجہ ہو گیا تھا جہاں عورتوں کے سروں کے اوپر ایک مردانہ ہپی چہرہ دکھائی دیا۔ وہ کچھ کہہ رہا تھا...

یہ دونوں بھی تیزی سے آگے بڑھے...

ہپی گدھے پر سوار تھا... یہ دونوں مجمعے سے کسی قدر ہٹ کر کھڑے ہوئے کیونکہ یہاں صرف عورتیں ہی عورتیں تھیں۔

ہپی اُن سے کہہ رہا تھا۔ "سمجھاتا رہا ہوں گا۔ سمجھاتا رہوں گا... تم اگر چاہو تو یہ سوسائٹی آدمیوں کی سوسائٹی بن سکتی ہے۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ تمھارے مرد کس قسم کی کمائی گھر لاتے ہیں اگر تم گندی کمائی کو گندی نالیوں میں بہانا شروع کر دو تو یہ سارا انتشار ختم ہو سکتا ہے۔"

"تم پہلے اپنی شکل تو دیکھو..." کسی عورت نے چیخ کر کہا۔

"اس شکل میں تو تم میرے گرد اکٹھا ہو گئی ہو جبکہ دوستانہ میں آتا تو اس قابل بھی نہ سمجھتیں۔ میں کہتا ہوں قبل اس کے کہ بڑی تباہی کشت و خون کی شکل میں تم پر نازل ہو جائے ہوش میں آ جاؤ۔ ورنہ دیکھو میں تمھاری اولادوں کو تم سے جدا کر دوں گا۔"

"مت بکواس کرو..." کئی آوازیں ابھریں۔

"اچھی بات ہے... تم دیکھ لینا... وہ تمھارے گھر چھوڑ دیں گے... بھیک مانگتے پھریں گے لیکن رشوت یا کسی دوسرے ناجائز طریقے سے حاصل کی ہوئی دولت کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔"

اچانک کئی دکاندار گالیاں بکتے ہوئے مجمعے کی طرف دوڑ پڑے... عورتیں تتر بتر ہو گئیں اور ہپی کو گدھے سے دھکیل کر پٹائی شروع کر دی گئی۔

ظفر اور جیمسن اسے بچانے کے لیے دوڑ پڑے تھے۔

"اوہو... ایک اور بھی ہے۔" ایک دکاندار نے جیمسن کا گریبان پکڑتے ہوئے کہا...

"یہ کیا بے ہودگی ہے..." جیمسن نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"تم ادھر کیوں آئے ہے... ہمارا دھندا خراب کرنے؟"

"ہم لوگ تو خریداری کے لیے آتے ہیں۔"

"جھوٹے ہو... بھاگ جاؤ یہاں سے۔"

دوسری طرف ظفر نے بدقت ہپی کو دکانداروں کے [illegible] نکال کر دوبارہ گدھے پر سوار کر دیا تھا۔

"چلو..." اس نے گدھے کی لگام پکڑتے ہوئے [illegible] کو پکارا...

اُن کے وہاں سے ہٹتے ہی عورتوں نے زور زور [illegible] قہقہے لگائے تھے...

"کیوں بھائی... تم کون ہو... اور یہ سب کیا تھا..." [illegible] نے ہپی کو مخاطب کیا، جو پلکیں جھپکائے بغیر فضا میں [illegible] جا رہا تھا...

اس نے چونک کر انھیں یونہی سرسری طور پر دیکھا اور پھر پلٹ کر قہقہہ لگانے والی خواتین کو دیکھا۔

"ایک دن تمھیں رونا پڑے گا۔" وہ ہاتھ اٹھا کر چیخا [illegible]

"اے بھائی اب بس بھی کرو... کہیں یہ عورتیں ہی نہ تم [illegible] ٹوٹ پڑیں..." ظفر نے اس کا شانہ تھپک کر کہا۔

"سنو دوستو... میں حقیقتاً تم میں سے نہیں ہوں..." [illegible] نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔

"وہ تو تمھارے اطوار ہی سے ظاہر ہے۔" جیمسن نے [illegible] بڑھ کر کہا۔ "ہم نہ بچاتے تو یہ دکاندار تمھیں زندہ نہ چھوڑتے۔"

"میں مرنے ہی کے لیے گھر سے نکلا ہوں۔"

"گدھے پر سوار ہو کر...؟"

"میرا مضحکہ نہ اڑاؤ دوست... میں تمھاری طرح بے [illegible] زندگی گزارنے کے لیے ہپی نہیں بنا... یقین کرو... میرے [illegible] اتنے پیسے نہیں ہوتے کہ بال ترشوا سکوں... میرے تن پر [illegible] میلے کچیلے کپڑے دیکھ رہے ہو۔ ان کے علاوہ اور کچھ نہیں میرے پاس...!"

"میرے ساتھ چلو۔ میں تمھارے بال بھی ترشوا دوں گا... [illegible] کم از کم چار جوڑے کپڑوں کا بھی انتظام کر دوں گا۔" جیمسن [illegible]

"تب تم بھی ہپی نہیں معلوم ہوتے... پھر یہ بہروپ کس لیے؟"

"مجھے بال ترشوانے کا وقت نہیں ملتا۔"

ہپی کچھ نہ بولا۔

"اب کہاں جاؤ گے؟" ظفر نے پوچھا۔

"کہیں بھی نہیں... موت سے نہیں ڈرتا... اگر یہ عورتیں [illegible] چاہیں تو پوری قوم سدھر سکتی ہے۔"

"کیا قوم قوم کی رٹ لگا رکھی ہے۔ کلاسیکی لٹریچر پڑھو اور آثار قدیمہ میں دلچسپی لو... سارے دکھ دور ہو جائیں گے۔" جیمسن اسا منہ بنا کر بولا...

"تم لوگوں کا ذریعہ معاش کیا ہے؟" دفعتاً ہپی نے سوال کیا۔

"ٹھگی..." ظفر اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا مسکرایا۔

"تو پھر تم بھی اپنے برے انجام کے منتظر رہو۔"

"اگر تم ہم کو سیدھی راہ پر لگا دینے کا وعدہ کرو تو ہم تم کبھی کبھی ملتے رہا کریں گے..." ظفر بولا۔

"مجھ سے کہاں ملو گے؟ میرا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔"

"فی الحال ہمارے ساتھ چلو۔"

"یہاں میں نے ایک ہفتے کا پلان تیار کیا ہے جس کے اختتام کو ابھی تین دن باقی ہیں۔ اس سے پہلے میں کہیں نہ جا سکوں گا..."

"اچھی بات ہے۔ میرا کارڈ اپنے پاس رکھو۔" ظفر نے اپنا وزٹنگ کارڈ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا... "جب کبھی ت ملے... میرے پاس ضرور آنا... شاید میں تمھارے کسی کام آ سکوں...!"

"کوئی ٹھگ میرے کس کام آ سکتا ہے۔"

"چلو تو پھر تم ہی میرے کام آ جانا... میں تمھاری باتیں سننا چاہتا ہوں... یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ ان کی اولادوں کو ان سے کس طرح جدا کر سکو گے؟"

"نیکی اور صداقت کے نام پر..." جواب ملا۔

"میرا خیال ہے کہ اس کے ہاتھ پیر باندھ کر کسی اونٹ پر لادیں اور لے بھاگیں۔" جیمسن بولا۔

"تم خاموش رہو۔" ظفر نے اسے گھونسا دکھا کر کہا۔ "اس کے بھلے کو کہہ رہا ہوں۔ ورنہ یہ لوگ اسے مار ڈالیں گے..."

"چار دن سے برابر پٹ رہا ہوں۔" ہپی مسکرا کر بولا۔

"تب تو ہمیں چپ چاپ کھسک جانا چاہیے یور ہائی نس"

"ہوں... اچھا..." ظفر ہپی کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتا ہوا بولا...

"ہر جگہ ہاتھ ہی ہاتھ ملتے ہیں... دل نہیں ملتے..." ہپی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا اور ایسا منہ بنایا جیسے مصافحہ بے حد ناگوار گزرا ہو...

واپسی کے سفر میں اُن کا اونٹ تنہا تھا...

"آپ کو گاڑی کی فکر بھی ہے یا نہیں؟" جیمسن اونگھتے... اونگھتے چونک کر بولا۔

"ملنی ہوگی مل جائے گی..." ظفر نے بے پروائی سے کہا۔

"میں نے اکثر مفلسی میں بھی آپ کو نواب زادہ ہی پایا ہے۔"

"شکریہ جیمسن... نواب زادگی کے علاوہ میرے پاس اور کچھ نہیں ہے۔"

"تو پھر مجھے اس نواب زادگی ہی میں سے کم از کم دس فی صد عطا فرمایے۔ تنخواہ تو بڑھنے سے رہی۔"

"آج سے اپنے نام کے ساتھ دس فی صد نواب زادہ لکھا کرو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

"شکریہ یور ہائی نس۔"

"ویسے تمھیں اونٹ پر تنخواہ کیوں یاد آتی ہے؟"

"اونٹ کی سواری ایک ایسی مشقت ہے جس کا کوئی صلہ نہیں۔"

"حوصلہ جیمسن حوصلہ...!"

"کس برتے پر... لڑکی کی گاڑی میں کھانے کی کوئی چیز نہیں دکھائی دی تھی...!"

"اس ہپی کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟"

"فراڈ معلوم ہوتا ہے...!"

"کس قسم کا فراڈ...؟"

"عورتوں کے ہاتھوں پٹنے کا شائق معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے ایسی باتیں کرتا ہے... ورنہ حرام خوری تو ایک آفاقی واقعیت ہے۔ ایک ہپی اور ایک گدھا اس سلسلے میں کیا کر سکے گا...!"

ظفر خاموش رہا۔ تھوڑی دیر بعد جیمسن پھر بولا... "یہ سفر اس کے باوجود بھی میری سمجھ میں نہیں آ سکا...!"

"میں اسے بس ایک نظر دیکھنا چاہتا تھا۔" ظفر نے جواب دیا۔

"مقصد؟"

"تم بھی ہپی نہیں ہو لہٰذا اپنے اس حلیے کا مقصد بیان کرو...!"

"میں سو فی صد ہپی ہوں۔ اپنی کھال میں مست رہنے والا۔"

"یہ بکواس ہے... تم ہپیوں کی طرح گندے نہیں رہتے۔"

"ہو سکتا ہے میرے والدین دھوبی رہے ہوں۔"

ساربان اونٹ کی نکیل پکڑے پیدل چل رہا تھا...

جیمسن اُسے غور سے دیکھتا ہُوا بولا۔ "میرا خیال ہے کہ اب ہم اسے اُونٹ پر بٹھا دیں اور خود اُونٹ کی نکیل پکڑ کر پیدل چلیں۔"

"اس سے فائدہ؟"

"اُونٹ سے پہلے وہاں پہنچ جائیں گے۔"

دراصل واپسی کا سفر دونوں ہی کے لیے تکلیف دہ ثابت ہو رہا تھا۔

اور پھر جب وہ اس جگہ پہنچے جہاں کاریں پارک تھیں تو اُنھیں لڑکی کی گاڑی کی بجائے اپنی گاڑی نظر آئی جس کے قریب دو مسلح کانسٹیبل کھڑے تھے۔

"اوہو... ہماری پولیس کتنی تیز ہے۔" جیمسن خوش ہو کر بولا۔

◆

عمران کہیں جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ کسی نے باہر سے کال بیل کا بٹن دبایا...

"آجاؤ... دروازہ کھلا ہُوا ہے۔" عمران نے اُونچی آواز میں کہا اور پھر کیپٹن فیاض کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر سر سہلانے لگا۔

"میں جلدی میں ہُوں۔" فیاض نے خشک لہجے میں کہا۔ "میرے ساتھ چلو۔"

"جلدی میں صرف لوٹا اُٹھایا کرتے ہیں کسی کو ساتھ نہیں لے جاتے...!"

"پچھتاؤ گے... تمھارا ہی معاملہ ہے...!"

"مجھے یاد نہیں پڑتا کہ مجھ سے دَوا لے گئے ہو...!"

"اچھی بات ہے... تو پھر اب عدالت ہی میں ضمانت کے منتظر رہنا۔" فیاض واپسی کے لیے مُڑتا ہُوا بولا۔

"ٹھہرو...!" عمران نے جھپٹ کر اُس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا... "پان کھاتے جاؤ۔"

"گاڑی ہی میں بیٹھ کر باتیں کر سکوں گا۔ وقت نہیں ہے۔" فیاض نے خشک لہجے میں کہا۔

"اچھا اچھا میں چل رہا ہُوں۔" عمران بولا۔

فیاض کی گاڑی میں اُس کا ایک ماتحت انسپکٹر بھی موجود تھا... عمران فیاض کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا... فیاض ہی ڈرائیو کر رہا تھا... کچھ دُور چل کر فیاض بولا۔ "ہم شاہ آباد کے پولیس اسٹیشن کی طرف جا رہے ہیں۔"

"وہاں پہنچ کر میرے لیے چیونگم منگوا دینا۔"

"کسی ماتحت کی موجودگی میں تمھاری کوئی بے ہُودگی پسند نہیں کروں گا...؟" فیاض نے غصیلے لہجے میں آہستہ سے کہا۔

"تب پھر وہیں چل کر بتانا کہ وہاں میری موجودگی کا کیا مطلب ہے...؟"

"میں یہیں بتلائے دیتا ہُوں۔"

"نہیں... یہاں نہیں..." عمران نے غیر ضروری سنجیدگی کا مظاہرہ کیا...

اس پر فیاض نے اُسے کن انکھیوں سے دیکھ کر کہا...

"کیوں؟ کوئی خاص بات ہے؟"

"میں تمھیں اس لذت سے محروم نہیں کرنا چاہتا جو پھر متحیر دیکھ کر محسوس کرو گے۔ لہٰذا فی الحال یونہی چلنے دو...؟"

"تو تم جانتے ہو؟" فیاض غرّایا۔

"میں کیا جانتا ہُوں؟" عمران کے لہجے میں حیرت تھی۔

"اچھی بات ہے، وہیں پہنچ کر دیکھ لینا۔" فیاض جھنجھلا کر بولا...

اس کے بعد بقیہ راستہ خاموشی ہی سے طے ہوا... شاہ آباد پولیس اسٹیشن کے انچارج نے جس انداز میں ان کا استقبال کیا تھا۔ اس میں کسی قدر حیرت بھی شامل تھی۔

"اُن تینوں کو بُلوایئے۔" فیاض نے اس سے کہا۔

"جی...!" اُس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"اس کا کیا مطلب ہے؟" فیاض اُسے گھورتا ہُوا بولا۔

"جناب عالی... آپ ہی نے تو بعد میں فرمایا تھا کہ انھیں چھوڑ دو... میں تصدیق کر چکا ہُوں لڑکی سچ مچ ان کی کار سے بھاگی تھی...!"

"بکواس مت کرو..." فیاض دانت پیس کر بولا۔ "اس اطلاع کے بعد کہ میں پہنچ رہا ہُوں... میں نے تمھیں دوبارہ فون نہیں کیا تھا...!"

"نہیں..." انچارج کے چہرے پر سراسیمگی کے آثار تھے۔

عمران اس دوران میں احمقوں کی طرح ایک ایک کا منہ تکتا رہا تھا۔ دفعتہً فیاض کو مخاطب کر کے بولا۔ "تم نے چیونگم منگوا دینے کا وعدہ کیا تھا...!"

"خاموش رہو۔" فیاض بپھر گیا... اور عمران نے سہم جانے کی ایکٹنگ کرتے ہُوئے سختی سے ہونٹ بھینچ لیے۔

"ان میں سے کسی نے کسی کو فون تو نہیں کیا تھا؟" عمران نے انچارج سے پوچھا...

"نن... نہیں جناب عالی!"

"کیا وہ میری ہی آواز تھی؟"

"اگر میں نے آپ کی آواز پہچانی نہ ہوتی تو مجھ سے ایسی غلطی سرزد نہ ہوتی... بہرحال میں شرمندہ ہُوں۔"

"خیر... خیر... اچھا... میرے ساتھ آؤ..." فیاض اُٹھتا ہُوا بولا۔ وہ اُسے دوسرے کمرے میں لے گیا تھا...

عمران نے فیاض کے ماتحت انسپکٹر شکیل کی طرف دیکھا اور شکوہ کرنے کے سے انداز میں بولا۔ "تمھارے صاحب سے مجھے ایسی توقع نہیں تھی...؟"

"کیسی توقع جناب؟"

"گھر سے وعدہ کر کے چلے تھے کہ شاہ آباد پہنچ کر چیونگم منگوا دوں گا..."

"میں اس سلسلے میں کیا عرض کر سکتا ہُوں...!"

"کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا..." عمران ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "صاحب اختیار ٹھہرے...!"

کچھ دیر بعد فیاض واپس آ گیا... اُس کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو رہی تھیں...

"چلو اُٹھو..." اُس نے عمران سے کہا اور وہ سہمے ہوئے سے انداز میں اُٹھ کھڑا ہُوا...

واپسی کے سفر میں فیاض نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ عمران بھی کچھ نہ بولا... فیاض کبھی کبھی کن انکھیوں سے اُسے دیکھنے لگتا تھا...

شہر میں پہنچ کر اُس نے اپنے ماتحت کو ایک جگہ گاڑی سے اُتار دیا۔

"تم مجھے وہاں کیوں لے گئے تھے؟" عمران نے طویل سانس لے کر سوال کیا...

"تم اچھی طرح جانتے ہو..." فیاض غرّایا۔

"اچھا اب براہِ کرم آدمیوں کی طرح گفتگو کرو... ورنہ میں چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا دُوں گا۔" عمران نے کہا۔

"اگر تم نہیں جانتے تو پھر وہ کون تھا جس نے میری آواز میں اسٹیشن انچارج کو غلط مشورہ دیا...؟"

"تمھارا ہی ریکارڈ کہیں سے بج گیا ہو گا۔"

"تم جھوٹے ہو... ان میں سے کسی نے یقیناً تمھیں اطلاع دی ہو گی... انچارج بھی جھوٹ بول رہا ہے اُس نے انھیں فون استعمال کرنے کی اجازت دے دی ہو گی؟"

"ان میں سے کسی کا نام بھی لو پیارے... پہیلیاں نہ بُجھواؤ۔"

"جوزف... ظفرالملک اور اُس کا ملازم جمن...!"

"اُس کے مُنہ پر جمن نہ کہہ دینا بُرا مان جائے گا۔ جیمسن کہلاتا ہے... ہاں تو خیر... قصّہ کیا ہے؟"

"یہ تینوں ایک الزام کے تحت گرفتار کیے گئے تھے اور انچارج نے مجھے اطلاع دی تھی۔"

"بھلا تمھیں کیوں اطلاع دی تھی... اپنے حلقے کے ڈی۔ ایس۔ پی یا ایس پی کو اطلاع دینی چاہیے تھی۔"

"تمھیں اس سے کیا سروکار...!"

"کس الزام کے تحت اُنھیں گرفتار کیا گیا تھا؟"

"یہ میں نہیں بتاؤں گا!"

"تو اب تم میرے دوستوں کے پیچھے پڑ گئے ہو... گاڑی روکو میں یہیں اُتروں گا۔"

"تم میرے ساتھ دفتر چل رہے ہو؟"

"وہاں منگوا دو گے چیونگم؟"

"تمھیں اعتراف کرنا پڑے گا کہ ان میں سے کسی نے تم سے فون پر رابطہ قائم کیا ہو گا!"

"فون پر رابطہ... شش... میرے اور جوزف کے درمیان ٹیلی پیتھی چلتی ہے...!"

"عمران سنجیدگی سے گفتگو کرو... ورنہ بڑے خسارے میں رہو گے...!"

"نیوز پرنٹ پر کنٹرول ہو جانے کی بنا پر ویسے ہی خسارے میں چل رہا ہُوں تم کون سا بڑا تیر مارو گے؟"

"اچھی بات ہے اُتر جاؤ گاڑی سے... اب ان تینوں کے حُلیے مشتہر کراؤں گا۔ مجھ سے بچ کر کہاں جائیں گے۔"

"تم سے بچ کر تو میں بھی کہیں نہیں جا سکتا... وہ بے چارے کیا مال ہیں!"

"بہتری اسی میں ہے کہ اعتراف کر لو!"

"کیپٹن فیاض... میں پھر بے حد نرمی سے پوچھتا ہُوں کہ اصل واقعہ کیا ہے!"

"دفتر چل کر بتاؤں گا...!"

"اچھی بات ہے... اگر تم یہی سمجھتے ہو کہ وہاں پہنچ کر زیادہ بااختیار ہو جاؤ گے تو یہ تمھارا اپنا اندازِ فکر ہے!"

فیاض کچھ نہ بولا۔

بالآخر وہ دفتر بھی پہنچ گئے... فیاض نے بیٹھتے ہی میز کی دراز سے ایک تصویر نکال کر عمران کے سامنے ڈال دی۔

"اسے پہچانتے ہو...؟"

"کوئی یوروپین لڑکی ہے۔" عمران نے احمقانہ انداز میں کہا۔

"اس کا ظفرالملک سے کیا تعلق ہے؟"

"یہ لڑکی ہے اور وہ لڑکا ہے...!"

"عمران! سنجیدگی سے۔" فیاض نے آنکھیں نکالیں۔

"تم گھاس تو نہیں کھا گئے... اگر کوئی تعلق بھی ہوگا تو مجھے اس کا علم کیونکر ہو سکتا ہے؟"

"خیر... خیر... بہتری اسی میں ہے کہ ان تینوں کو فوراً حاضر کرو...!"

"اگر یہ بات ہے کیپٹن فیاض تو اسے نوٹ کرو۔ تین گھنٹے کے اندر اندر ان تینوں کا سراغ مجھے ملنا چاہیے!"

"کیا مطلب...؟"

"اگر وہ تین گھنٹے کے اندر اندر مجھے نہ ملے تو تمھارے محکمے کو اُلٹ پلٹ کر رکھ دوں گا...!"

"دھمکی دے رہے ہو؟"

"محض دھمکی نہیں... اس پر عمل بھی کروں گا۔" عمران اٹھتا ہوا بولا۔

"بیٹھو... بیٹھو... یقین آگیا کہ تم لاعلم ہو..." فیاض کے ہونٹوں پر جھینپتی ہوئی سی مسکراہٹ نظر آئی...

"میرے پاس وقت نہیں ہے..." عمران دروازے کی طرف بڑھتا ہوا بولا...

"تمھیں بعد میں افسوس ہوگا اگر تم نے میری بات نہ سُنی۔ اب مجھے یقین آگیا ہے کہ وہ تینوں کسی سازش کا شکار ہوئے ہیں...!"

عمران واپس آکر بیٹھ گیا۔

"یہ لڑکی ظفرالملک کی گاڑی میں دیکھی گئی تھی اور پھر وہ گاڑی اس جگہ کھڑی دیکھی گئی جہاں سے کپڑا بازار کے لیے اونٹ ملتے ہیں... صرف جوزف گاڑی میں موجود تھا... ظفر اور جمسن کپڑا بازار میں تھے... واپسی پر وہ بھی پکڑ لیے گئے۔"

"سوال تو یہ ہے کہ پکڑے کیوں گئے؟"

"ہمیں عرصے سے اس لڑکی کی تلاش ہے۔"

"کس بنا پر...؟"

"تفصیل نہیں بتائی جاسکتی۔"

"ان تینوں نے اس سلسلے میں کیا بیان دیا تھا؟"

"لڑکی اپنی گاڑی چھوڑ کر ان کی گاڑی لے بھاگی تھی۔"

"اور تمھیں اس پر یقین نہیں ہے!"

"جب تک کہ اپنے طور پر ان سے سوالات نہ کرلوں مطمئن نہیں ہو سکتا..."

"اور شاہ آباد کے اسٹیشن انچارج نے تمھارے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے انھیں چھوڑ بھی دیا۔"

"میں نے ایسا کوئی حکم نہیں دیا تھا۔"

"اور میں بھی اتنا گدھا نہیں ہوں کہ ایسے موقع پر تمھارا بہروپ بھر کر متعلقہ لوگوں کی گردنیں پھنسوا دوں..."

"میرا یہی خیال تھا کہ تم نے میری آواز بنا کر اسٹیشن انچارج کو دھوکا دیا ہوگا..."

"میں اوّل درجے کا بے وقوف ہوں مجھ سے ایسی عقل مندی سرزد نہیں ہو سکتی۔"

■

ظفر کو حیرت تھی کہ یک بیک انھیں رہائی کیونکر مل گئی... پکڑے گئے تھے اس الزام پر کہ گاڑی کسی لڑکی کے پاس دیکھی گئی تھی... لیکن یہ نہیں معلوم ہو سکا... کہ لڑکی کا کیا قصور تھا...

پولیس اسٹیشن سے نکل کر سیدھے شہر کی جانب بھاگ

"یہ سب کیا تھا مسٹر...؟" جوزف نے ظفر سے سوال کیا۔

"تم نے اس لڑکی سے کیا معلوم کیا تھا...؟"

"وہ تو کہہ رہی تھی کہ مجبوراً اُس سے وہ غلط حرکت سرزد ہوئی تھی...!"

"کیا مجبوری تھی...؟"

"کچھ لڑکے اس کا پرس چھین بھاگے تھے۔ اُن کا تعاقب کرنا چاہتی تھی۔"

"پھر کیا ہوا...؟"

"ان سے پرس واپس لینے میں کامیاب نہیں ہوئی تھی، گاڑی واپس کر گئی..."

"خود اُس کے بارے میں تم نے کیا معلوم کیا تھا؟"

"کچھ بھی نہیں... لیکن جب اُس کے چلے جانے کے بعد پولیس پہنچی تو میں نے سوچا کہ مجھے اس لڑکی کو روکے رکھنا چاہیے تھا... یقیناً اُس نے خود ہی کوئی غیر قانونی حرکت کی ہوگی... تبھی تو پولیس کو اس کی تلاش تھی۔"

"تم اس وقت عقل مندی کی باتیں کر رہے ہو۔" جمیسن بولا۔

"لیکن ہمیں یک بیک رہائی کیسے نصیب ہوگئی؟" ظفر بڑبڑایا۔

"باس کو معلوم ہو گیا ہوگا..."

جمیسن ہنس پڑا، ہنسنے کا انداز جوزف کو پسند نہ آیا۔ اُس نے کہا... "کیا تم میرے باس کا مضحکہ اُڑانا چاہتے ہو...؟"

"نہیں... نہیں... جھگڑا نہیں...۔" ظفر نے دخل اندازی کی اور بات آگے نہ بڑھ سکی...

اچانک اگلے موڑ پر ظفر کو پورے بریک لگانے پڑے تھے۔ اگر ایسا نہ کرتا تو ایک بڑا حادثہ رُونما ہوتا... بائیں جانب سے آنے والی گاڑی بھی تیز رفتاری سے آئی تھی... غلطی اُسی کی تھی لیکن اسٹیئرنگ کرنے والے نے اُنھیں گندی گندی گالیاں دیں اور اپنی گاڑی آگے بڑھا لے گیا...

ظفر نے بھی اُسی سمت گاڑی موڑ دی تھی...

"کیوں... کیوں... یور ہائی نس...!"

"اس بے ہودہ کو سبق دوں گا..." ظفر بولا...

"کیوں خوامخواہ وقت ضائع کرتے ہیں... شہر چلیے...!"

"نہیں ہرگز نہیں..." جوزف بولا۔ "سبق دینا ہی چاہیے۔ غلطی اُسی کی تھی۔"

"ابھی کہاں سے آ رہے ہو...؟"

"حوالات سے..." جوزف نے بے پروائی سے کہا۔

"اس بار جیل جاؤ گے...!"

"بدتمیز آدمیوں کو ضرور سزا دینی چاہیے... خواہ کچھ ہو۔"

ظفر تھوڑے فاصلے سے اگلی گاڑی کا تعاقب کرتا رہا... گالیاں دینے والا اگر سفید فام غیر ملکی نہ ہوتا تو شاید جوزف کے کان پر جوں بھی نہ رینگتی...

"سبق ہی دینا ہے تو ذرا جلدی کیجیے جنابِ عالی"... جمیسن نے بُرا سا منہ بنا کر کہا...

"تمھیں کیا پریشانی ہے؟"

"ٹھیک تین بجے مجھ کو پبلک لائبریری پہنچنا ہے۔"

"پبلک لائبریری اتوار کو بند رہتی ہے۔"

"پبلک لائبریری کے قریب ایک پان والا رہتا ہے... جو ایک اچھا داستان گو ہے... اُسے طلسم ہوشربا کی تین جلدیں زبانی یاد ہیں۔"

"خاموش بیٹھے رہو...!"

"سوال تو یہ ہے کہ آپ کب تک اس کے پیچھے چلتے رہیں گے...؟"

"شٹ اپ...!"

"مسٹر ظفر کا خون گرم ہے..." جوزف بولا... "اور یہ ایک قابلِ قدر صفت ہے۔ خون ٹھنڈا ہو جائے تو آدمی کو خودکشی کر لینی چاہیے۔"

"مسٹر جوزف تمھیں میرے باس کو ورغلانے سے کیا مل جائے گا...؟"

"تم لکھنے پڑھنے والے آدمی ہو... ان باتوں کو کیا سمجھو گے... اگر بیٹا کسی سے شکست کھاتا ہے تو قبر میں باپ کی ہڈیاں کڑکڑاتی ہیں...!"

ظفر کو عقب نما آئینے میں تیسری گاڑی دکھائی دی اور وہ گاڑی پہلی ہی نظر میں پہچان لی گئی... کیونکہ وہی تو اُن کے موجودہ مصائب کا باعث بنی تھی۔

"جمیسن ذرا پیچھے دیکھنا... کیا لڑکی ہی ہے اس گاڑی میں" ظفر بولا...

جمیسن مُڑا اور بے ساختہ ہنس پڑا...

"ہے نا...؟"

"یس یور ہائی نس... اب فرمایے... دونوں میں سے پہلے کس سے انتقام لیجیے گا...؟"

"ٹھہرو بتاتا ہوں..." ظفر نے اپنی گاڑی کی رفتار کم کر کے پچھلی گاڑی کو آگے نکل جانے کا راستہ دیا اور وہ فراٹے بھرتی ہوئی آگے نکل گئی...

"کیا مطلب...؟" جمیسن بڑبڑایا...

"کوئی بڑا کھیل معلوم ہوتا ہے...!"

لڑکی کی گاڑی اگلی گاڑی سے بھی آگے نکل کر ترچھی ہوئی تھی اور دونوں کے بریک چرچرائے تھے...

جتنی دیر میں ظفر کی گاڑی قریب پہنچتی مرد اپنی گاڑی سے اُتر کر لڑکی کے پاس پہنچ چکا تھا... اُس نے اُس کے بال پکڑے اور گاڑی سے باہر کھینچ لیا... لڑکی اُس سے لپٹ پڑی۔

ظفر نے اپنی گاڑی سے چھلانگ لگائی اور مرد کا کالر پکڑ کر جھٹکا دیا...

وہ لڑکی کو چھوڑ کر پلٹ پڑا... لیکن اتنی دیر میں ظفر کا گھونسہ اُس کے جبڑے پر پڑ چکا تھا...

وہ دوسری طرف اُلٹ گیا... لڑکی پھر اپنی گاڑی میں بیٹھ کر رفوچکر ہو گئی...

"ٹھہرو..." ظفر ہاتھ اٹھا کر چیخا تھا... لیکن کون سُنتا ہے...

اتنے میں اُس نے جوزف کی آواز سُنی..." ارے... ارے... یہ تو مر گیا...؟"

"کیا... ؟" ظفر بوکھلا کر گرے ہوئے غیر ملکی کی طرف جھپٹا... وہ سڑک پر لمبا لمبا لیٹا ہوا تھا...

"اوہ... واقعی...!" ظفر سیدھا کھڑا ہوتا ہوا بولا۔ "بھاگو۔"

پھر وہ اپنی گاڑی میں بیٹھے تھے اور بڑی سراسیمگی کے عالم میں شہر کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔

* * *

عمران کمرے میں ٹہل ٹہل کر ظفر کی کہانی سن رہا تھا۔ اُس کے خاموش ہوتے ہی بولا...

"تم کیپٹن فیاض کو صرف اسی حد تک بتاؤ گے کہ رہائی کے بعد سیدھے شہر آئے تھے..."

"اور وہ بے چارہ جو ایک ہی گھونسے میں مر گیا... ؟" جیمسن بول پڑا...

"کیا تم اس کے ساتھ دفن ہونا پسند کرو گے ؟"

اس سوال پر جیمسن بغلیں جھانکنے لگا۔

"تم اپنی زبان قطعی بند رکھو گے... ظفر کے بیان سے تجاوز نہیں کرو گے۔" عمران اسے گھورتا ہوا بولا... پھر جوزف کی طرف مڑا۔

"میں سمجھتا ہوں باس۔" جوزف بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"اب تم اپنے کمرے میں جاؤ...!"

جوزف اٹھا اور وہاں سے چلا گیا۔

"تم ہپّی مُراد سے کیوں ملنا چاہتے تھے..." عمران نے ظفر سے سوال کیا۔

"بس یونہی... میں نے سنا تھا کہ وہ صرف عورتوں کے مجمعے میں تقریریں کرتا ہے۔"

"اس کے بارے میں کیا جانتے ہو ؟"

"کچھ بھی نہیں...!"

"لڑکی کا حلیہ بیان کرو..." ؟

ظفر کوشش کرنے لگا کہ یادداشت کے ہر گوشے کو کرید کر وضاحت کے ساتھ لڑکی کی تصویر پیش کر سکے۔

اس کے خاموش ہوتے پر عمران نے جیب سے ایک تصویر نکالی اور ظفر کی طرف بڑھا دی۔

"بالکل...!" ظفر اچھل پڑا... "سو فی صد یہی تھی...!"

عمران نے تصویر اُس سے لے کر جیب میں رکھ لی... ظفر متحیرانہ انداز میں اُسے دیکھے جا رہا تھا...

"میں فی الحال اس لڑکی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" عمران آہستہ سے بولا اور اُٹھ کر فون پر کسی کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔

"ہیلو... فیاض... میں بول رہا ہوں... وہ تینوں میرے پاس پہنچ گئے ہیں۔ تمہارے پاس بھیج دوں... یا تم خود آ رہے ہو... اچھا... اچھا... ٹھیک ہے...!"

ریسیور رکھ کر ظفر کی طرف مڑا...

"وہ خود ہی آ رہا ہے...!"

ظفر آرام کرسی کی پُشت گاہ سے ٹک گیا۔ جیمسن بُرا سا مُنہ بنائے بیٹھا تھا۔

بیس منٹ بعد فیاض وہاں پہنچ گیا... تینوں کے تحریری بیان لینے کے بعد اُس نے ظفر سے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ تم غیر شادی شدہ ہو... اور کپڑا بازار میں صرف عورتوں کے ملبوسات کے لیے کپڑا ہوتا ہے۔"

"مجھے اس کا علم نہیں تھا...!"

"تو خریدا نہیں... ؟"

"ظاہر ہے کہ میں غیر شادی شدہ ہوں...!"

"کیا تم بتا سکو گے کہ شاہ آباد کے انچارج نے کیا کہہ کر تمہیں رہا کیا تھا... ؟"

"شاید اُس نے کہا تھا تصدیق ہو گئی ہے کہ آپ لوگ بے قصور ہیں...!"

"تم نے پوچھا ہو گا... کہ کس طرح تصدیق ہوئی ہے ؟"

"جی نہیں... غیر ضروری باتوں سے احتراز کرتا ہوں۔"

"تمہارا ذریعہ معاش کیا ہے ؟"

"آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔"

"نہیں... میں نہیں جانتا..."

"نواب زادوں کا ذریعہ معاش پوچھا جا رہا ہے..." جیمسن بڑبڑا کر چھت کی طرف دیکھنے لگا۔

فیاض اُس کی طرف مڑا ہی تھا کہ عمران بول پڑا... "چچا کی دولت سلامت رہے...!"

"مجھے علم ہے کہ چچا نے ان سے سارے تعلقات منقطع کر لیے ہیں۔"

"وظیفہ بند نہیں کیا...!"

"خیر... بہر حال..." فیاض عمران کی طرف ہاتھ اُٹھا کر بولا "بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی... تم جانتے ہو کہ اب تمہیں کس قسم کی جواب دہی کرنی ہے ؟"

"تم بڑے خوش قسمت ہو سوپر فیاض!" عمران مسکرا کر بولا

"اس لیے شام کی چائے تمہارے ساتھ پیوں گا۔"

"ضرور..." فیاض کا لہجہ تلخ تھا۔

ٹھیک اُسی وقت فون کی گھنٹی بجی... عمران نے ریسیور اُٹھا کر کال ریسیو کی اور پھر فیاض سے بولا۔ "تمہاری ہے۔"

اس دوران میں اُس نے ظفر اور جیمسن کو چلے جانے کا اشارہ کیا تھا... اور انھوں نے خاموشی سے تعمیل کی تھی...

فیاض ریسیور رکھ کر عمران کی طرف مڑا... اُس کی آنکھوں میں جھنجلاہٹ کے آثار تھے...

"خیریت... ؟" عمران اُسے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھتا ہوا بولا...

"اب تم میرے ساتھ چائے نہیں پی سکو گے ؟" فیاض نے خشک لہجے میں کہا... "مجھے پھر شاہ آباد جانا ہے۔"

"تمہاری مرضی...!"

"چاہو تو تم بھی چل سکتے ہو...!"

"کوئی خاص بات... ؟"

"لاش... کسی غیر ملکی کی لاش سڑک پر پڑی ملی ہے۔"

"بہت دنوں سے کوئی لاش نہیں دیکھی... ضرور چلوں گا۔" عمران خوش ہو کر بولا...

"تم نے انھیں یک بیک رہائی کی وجہ تو نہیں بتائی..." فیاض نے عمران کو گھور کر پوچھا۔

"بچوں کی سی باتیں نہ کرو۔ اب اتنا احمق بھی نہیں ہوں۔"

دونوں باہر آئے... اس بار پھر فیاض ہی کی گاڑی میں سفر شروع ہوا لیکن اب کوئی تیسرا موجود نہیں تھا کہ جس کی وجہ سے وہ کھل کر گفتگو نہ کر سکتے...

"کیا اب تم اس لڑکی کے بارے میں کچھ بتانا پسند کرو گے ؟" عمران نے کہا...

"ایک سفارت خانے سے متعلق رکھتی تھی۔ اس کے کچھ اہم کاغذات چرا کر روپوش ہو گئی ہے...!"

"لیکن کیپٹن فیاض... تم ذاتی طور پر کیسے ملوث ہوئے ؟"

"کیا مطلب... ؟" فیاض کا لہجہ بدل گیا...

"ظفر وغیرہ کی رہائی کے لیے تم ہی تو استعمال کیے گئے تھے۔"

"اگر وہ تم نہیں تھے تو یقیناً میرے لیے یہ کسی بڑے خطرے کا پیش خیمہ ہے۔ دوسرا پوائنٹ اگر یہ تینوں اس لڑکی کے لیے اجنبی تھے تو انھیں اس طرح رہائی دلانے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے... ؟"

"ہاں... آں... میں زیادہ تر اسی پر غور کرتا رہا ہوں۔" عمران پُر تفکر لہجے میں بولا۔

"تو وہ تم نہیں تھے !"

"یار فیاض تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں کبھی قانون کو ہاتھ میں لینے کی کوشش نہیں کرتا... اور پھر اس طرح میں خود ہی ان تینوں کی گردنیں کیوں پھنسانے لگا... کیا تم اسی بنا پر اُن کے خلاف سخت ترین کارروائی نہیں کر سکتے ؟"

فیاض کچھ نہ بولا۔ گاڑی تیز رفتاری سے راستہ طے کرتی رہی۔

عمران نے تھوڑی دیر بعد پوچھا۔ "لڑکی کا نام کیا ہے ؟"

"ریٹا ولیمز...!"

"اچھا خاصا ہے۔"

"کیا تم نے یہ نام پہلے بھی کبھی سُنا ہے ؟"

"نہیں...!" مختصر سا جواب تھا... عمران کی پیشانی پر سلوٹیں اُبھر آئیں... ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے حافظے پر زور دینے کی کوشش کر رہا ہو۔

شاہ آباد پولیس اسٹیشن سے پہلے والے چوراہے پر ایک اسسٹنٹ سب انسپکٹر کھڑا نظر آیا... اسے عمران پولیس اسٹیشن پر بھی دیکھ چکا تھا۔ فیاض نے اس کے قریب ہی گاڑی روک دی...

اُس نے بائیں جانب ہاتھ اُٹھا کر کہا۔ "لاش سڑک پر پڑی ہوئی ہے... آپ کا انتظار تھا...!"

"بیٹھ جاؤ...!" فیاض نے پچھلی سیٹ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

بائیں جانب گاڑی موڑ کر ایک یا ڈیڑھ میل سے زیادہ چلنا نہیں پڑا تھا...

لاش سڑک پر پڑی دکھائی دی... اس کے آس پاس مسلح کانسٹیبل بھی کھڑے نظر آئے۔

فیاض گاڑی روک کر نیچے اُترا... اور جیسے ہی لاش کے قریب پہنچا۔ عمران نے اُس کے چہرے پر سراسیمگی کے آثار دیکھے...

"کیوں... ؟ کیا تم اسے پہچانتے ہو ؟" عمران نے آہستہ سے پوچھا...

"ہاں... یہ اُسی سفارت خانے کا فوجی اتاشی ہے۔"

"اوہو...!"

تھوڑے فاصلے پر سفید رنگ کی ایک اوپل کیپٹیان

کھڑی تھی...

عمران آگے بڑھ کر گاڑی کا جائزہ لینے لگا جس کا اسٹیئرنگ کی جانب والا دروازہ کھلا ہوا تھا...

فیاض نے شاہ آباد کے اسٹیشن انچارج کو کچھ ہدایات دیں اور خود بھی عمران کے پاس آ کھڑا ہوا...

"کیا دیکھا...؟" عمران نے اُس کی طرف دیکھے بغیر سوال کیا۔

"بظاہر... موت کی وجہ اتفاقیہ بھی ہو سکتی ہے۔"

"کیوں...؟"

"کہیں زخم یا کسی قسم کی چوٹ کے آثار نہیں پائے جاتے۔"

"اگر یہ گاڑی اسی کی ہے تو...!" عمران کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔

"کنجی اگنیشن میں موجود ہے... گچھے میں کچھ اور کنجیاں بھی نظر آ رہی ہیں... ڈیش بورڈ کے کسی خانے میں گاڑی کی کتاب تلاش کرو۔ اس کی بھی تصدیق ہو جائے گی...!" فیاض نے کہا...

عمران نے کنجی اگنیشن سے نکال کر ایک خانہ کھولا۔ گاڑی کی کتاب موجود تھی۔ فیاض اُس کی ورق گردانی کرنے لگا اور بولا۔

"گاڑی اُسی کی ہے۔"

"تو پھر یہ دیکھو کہ یہ بیچ سڑک پر کھڑی ہے اور اسٹیئرنگ کے قریب والا دروازہ بھی کھلا ہوا ہے... اگر وہ معمولی حالات میں کسی ضرورت کے تحت گاڑی سے اُترا ہوتا تو گاڑی سڑک کے کنارے کھڑی کی ہوتی...!"

"ہوں... اوں...!" فیاض کسی گہری سوچ میں تھا۔

"آہا..." دفعتہً عمران آگے بڑھا اور بائیں جانب سڑک سے نیچے اُتر کر کچے پر کچھ دیکھنے کے لیے جُھک پڑا...

پھر مُڑ کر فیاض کو قریب آنے کا اشارہ کرتا ہوا نیم دائرے کی شکل میں پیچھے ہٹنے لگا... نظر زمین ہی پر تھی...

"یہ دیکھو... یہاں کسی اور گاڑی کو سڑک سے نیچے اُتار کر اس کا رُخ موڑا گیا ہے۔"

"ہو سکتا ہے... یہی گاڑی ہو... کسی دوسری کی بات کیوں کر رہے ہو؟" فیاض بولا...

"اس گاڑی کے ٹائروں کے نشانات اس سے مختلف ہوں گے۔ یقین نہ ہو تو پھر اس کے ٹائر دیکھ آؤ..."

فیاض گاڑی کی طرف بڑھا... اُس کے ٹائروں کو بغور دیکھتا رہا اور پھر عمران کے پاس واپس آ کر بولا "تم ٹھیک کہتے ہو۔"

"اور نشانات کی پوزیشن بتاتی ہے کہ گاڑی اُدھر گئی ہوگی۔" عمران نے بائیں جانب ہاتھ اُٹھا کر کہا۔

"تو پھر یہ معلوم کر لینے کے بعد بھی ہم فوری طور پر کیا کر سکیں گے؟"

"اگر میری گاڑی بھی اس وقت موجود ہوتی تو میں اُدھر ضرور جاتا...!"

"چلو دیکھتے ہیں۔"

"یہاں تمھاری موجودگی ضروری تو نہیں؟"

"میں نے اُنھیں لاش اُٹھوا دینے کی اجازت دے دی ہے اور کہہ دیا ہے کہ سفارت خانے کو فون کر دیں۔"

"اس سلسلے میں یہ بھی ضروری ہے کہ یہ اطلاع ذرا محتاط انداز میں دی جائے۔"

"میں نہیں سمجھا...!"

"سفارت خانے کو یہ نہ بتایا جائے کہ لاش شناخت کر لی گئی ہے۔ بلکہ گاڑی کی کتاب کے حوالے سے بات کی جائے تم کیوں خواہ مخواہ جان پہچان اپنے سر لیتے ہو۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو... اگر میں اُسے شناخت کر چکا ہوں تو سفارت خانے کے کسی آدمی کے پہنچنے تک مجھے یہیں رُکنا پڑے گا...!"

"تعلیم کی ابتدا بغدادی قاعدے سے کی ہوتی تو اتنی سوجھ بوجھ ضرور رکھتے... چلو جاؤ اسٹیشن انچارج کو اچھی طرح سمجھا آؤ کہ اُسے کیا کرنا ہے..."

فیاض نے اُس وقت بڑی سعادت مندی سے تعمیل کی تھی... واپسی پر اپنی گاڑی اُسی طرف لیتا آیا اور وہ دونوں نامعلوم گاڑی کی متوقع سمت چل پڑے...

"میرا ذہن ابھی تک اسی میں اُلجھا ہوا ہے۔" فیاض کچھ دیر بعد بولا...

"کس میں...؟"

"تمھارے تینوں آدمیوں کی رہائی... آخر اس قسم کی ہدایت دینے والا کون تھا اور اُسے ان سے کیا ہمدردی ہو سکتی تھی۔ رہا ہوتے یا جہنم میں جاتے... سنو تم ذرا ظفرالملک کو ٹٹولنے کی کوشش کرنا...؟"

"مجھے اس پر اعتماد ہے سوپر فیاض!"

"مالی پریشانیوں میں مبتلا ہونے کے بعد اچھے اچھے بھی اپنے راستے سے ہٹ جاتے ہیں۔"

"خیر میں دیکھوں گا۔" عمران نے پُر تفکر لہجے میں کہا۔

دست شناسی کی ایک نایاب کتاب
قسمت کا حال
پنڈت شیوناتھ
برصغیر ہند و پاک کے نامور دست شناس پنڈت شیوناتھ کی مایہ ناز تصنیف آسان اور دلچسپ پیرایے میں دست شناسی کے اسرار و رموز بیان کیے گئے ہیں۔ آپ بھی اس کتاب کی بدولت اپنے ماضی، حال اور مستقبل سے آگاہ ہو سکتے ہیں اور دوسروں کی رہنمائی بھی کر سکتے ہیں
قیمت : ۱۰۰/روپے * علاوہ محصول ڈاک
احباب ادب ۵-۸/۲ ناظم آباد، کراچی

فیاض کے ہونٹ سختی سے بھنچے ہوئے تھے اور آنکھیں ونڈ اسکرین پر تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنی زبان روکنے کی کوشش کر رہا ہو۔ عمران اُسے کن انکھیوں سے دیکھے جا رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ مُڑ کر کھڑکی سے باہر بھی دیکھنے لگتا۔ دفعتہً بولا۔ "روکو ... روکو ...!"

فیاض نے پورے بریک لگائے اور عمران گاڑی سے اُتر کر پیچھے کی طرف دوڑتا چلا گیا ... پھر ایک جگہ رُک کر دائیں جانب سڑک کے نیچے اُتر گیا ... کچھ دُور تک خمیدہ ہو کر چلتے رہنے کے بعد فیاض کی طرف مُڑا ...

"گاڑی ادھر لاؤ۔" اُس نے ہاتھ ہلا کر اُونچی آواز میں کہا۔

اس جگہ بھی عمران نے اسے اسی گاڑی کے پہیّوں کے نشانات دکھائے۔ زمین کسی قدر نرم اور ریتیلی تھی۔ اس لیے نشانات بہت واضح تھے اور اُن کا سلسلہ دُور تک پھیلا نظر آ رہا تھا۔

اُن کی گاڑی انھی نشانات پر آگے بڑھنے لگی۔

"ہُوں ... تو یہ گاڑی ..." فیاض کچھ کہتے کہتے رُک گیا ...

◆

رات کے گیارہ بجے تھے ... ظفر تھوڑی ہی دیر پہلے سویا تھا۔ اچانک کسی آواز پر آنکھ کھُل گئی۔ کوئی دروازہ پیٹ رہا تھا۔ فلیٹ میں جیمسن کے علاوہ اور کون تھا ...؟ ظفر جھلّا کر اُٹھ بیٹھا ... اس کے بعد مار بیٹھنے ہی کے سے انداز میں اُس نے دروازہ کھولا تھا۔

"کیا ہے؟" اُس نے مؤدّب کھڑے ہوئے جیمسن سے پوچھا۔

"بُقراط صاحب تشریف لائے ہیں!" اُس نے بڑے ادب سے کہا ...

"کیا بکواس ہے۔"

"ڈرائنگ رُوم میں تشریف رکھتے ہیں۔"

"وہ سلیپنگ گاؤن پہن کر ڈرائنگ رُوم میں آیا اور عمران پر نظر پڑتے ہی اُسے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

"اوہو ... کیا مَیں بہت زیادہ احمق لگ رہا ہُوں؟" عمران نے سعادت مندانہ انداز میں پوچھا۔

"یہ بات نہیں ... کم بخت نے کہا تھا بُقراط صاحب تشریف لائے ہیں۔"

"رُتبہ شناس ہے ... خیر ہاں ... مَیں تمھیں یہ بتانے آیا ہُوں کہ وہ آدمی تمھارے گھونسے سے نہیں مَرا تھا ...!"

"پھر ...؟"

"زہر ... جو خارجی ذرائع سے دورانِ خون میں شامل ہُوا تھا۔"

"زہریلی سُوئی ...!"

"ممکن ہے ..." عمران اُسے دیکھتا ہُوا بولا ... "اور جلدی سے کپڑے پہن لو ... کافی پلاؤں گا ...!"

ظفر نے مزید استفسار کرنا مناسب نہ سمجھ کر جلدی جلدی لباس تبدیل کیا تھا ...

عمران کی گاڑی سڑک پر موجود تھی ... دونوں کسی نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گئے ...

"تم نے لڑکی کی گاڑی کا میک فیاٹ الیون ہنڈریڈ ہی بتایا تھا نا ...؟"

"جی ہاں ...!"

"گاڑی مِل گئی ہے۔ تمھیں اُس کی شناخت کرنی ہے۔ نمبر تم نے پہلے بھی نہیں بتائے تھے۔"

"کہاں ہے ...؟"

"بہت دُور ... سمندر کے کنارے ڈائمنڈ بیچ کے قریب ...!"

"اوہو ...!"

"گاڑی سمندر سے نکالی گئی ہے ...!"

"لل ... لیکن پتہ کیسے چلا ...؟"

"ٹائروں کے نشانات کے ذریعے ... جو ایک اُونچے ٹیلے تک چلے گئے تھے۔ وہیں سے گاڑی سمندر میں گری ..."

"لڑکی کی لاش ...؟"

"مجھے خوشی ہے کہ لڑکی کی لاش نہیں ملی ..." عمران نے سچ مُچ خوشی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "تصویر میں اِتنی دلکش لگی ہے کہ اُسے زندہ دیکھنے کی آرزو میں مَرا جا رہا ہُوں ...!"

"آپ ...!"

"کیوں ...؟ کیا مجھ میں آدمی بننے کی صلاحیت نہیں ہے؟"

"جیمسن کا یہی خیال ہے۔ آج جوزف سے کہہ رہا تھا کہ تمھارے باس کی صحبت میں میرا باس بالکل مُردہ ہو کر رہ گیا ہے۔ اب لڑکیوں کو دیکھ کر سیٹی نہیں بجاتا۔"

"نہیں بجاتے ...!" عمران نے حیرت سے پوچھا۔

"نن ... نہیں ...!"

"نالائق ہوتے جا رہے ہو ... حوّا کی بیٹی ہتّوا تو نہیں ہے۔"

"ماحول کی بات ہوتی ہے۔ یہاں اسے غنڈہ پن سمجھا جاتا ہے۔"

"اور وہاں ...؟"

"جس کے لیے سیٹی بجائی جاتی ہے صرف وہی متوجہ ہوتی ہے ...!"

"یہاں یہ دُشواری ہے۔" عمران مُردہ سی آواز میں بولا ... "سب کی سب متوجّہ ہو جائیں گی اور تم بوکھلا کر بھاگ کھڑے ہو گے ... خیر تو ہاں مَیں پوچھ رہا تھا۔ وہ شخص کون تھا جس نے اُس سے تمھارا تعارف کرایا تھا؟"

"کمال کر دیا آپ نے، کیا اب تک مجھے جھوٹا سمجھتے رہے ہیں ...؟"

"کبھی کسی ایسے آدمی سے ملے ہو ... جس کی آواز کیپٹن فیاض کی آواز سے مشابہہ ہو!"

"یہ اس سے بھی زیادہ چونکا دینے والا سوال ہے!"

"لہٰذا چونکے بغیر ذہن پر زور دو۔ شاید یاد آ جائے۔"

"میرے ملنے جُلنے والوں میں کوئی ایسا نہیں ہے ...!"

"کسی بیرُونی سفارت خانے میں بھی تمھارا کوئی دوست ہے ...؟"

"بہتیرے سفارت خانوں میں ہیں ..."

"اُنھی دوستوں کو ذہن میں رکھ کر سوچو ...!"

"اس کا جواب غور طلب ہے۔ فوراً نہیں دیا جا سکتا ..."

"اچھا دیکھنا ...!"

گاڑی تاریکی کا سینہ چیرتی تیز رفتاری سے ڈائمنڈ بیچ کی طرف چلی جا رہی تھی ...

"ہپّی مُراد میں آخر تم کیا دیکھنا چاہتے ہو؟" عمران نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

"یہی کہ وہ سماج سدھار کے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے۔ ہپیّوں کو اس سے کیا سروکار ... زندگی سے مایوس ہو کر ہی تو ہپّی بن جاتے ہیں۔"

"وہ ایک ہیڈ کانسٹیبل کا لڑکا ہے جسے رشوت ستانی کے الزام میں سزا ہو گئی تھی ...!"

"اوہو ...!"

"اُس کا خیال ہے کہ اگر اس کی ماں دولت سمیٹنے کی ... خواہش مند نہ ہوتی تو اس کا باپ کبھی اس حال کو نہ پہنچتا۔"

دفعتہً ظفر چونک پڑا ... عمران نے بھی اسے محسوس کیا۔ کچھ پوچھنے ہی والا تھا ... کہ ظفر بولا ... "کیا آپ اس سے کبھی ملے ہیں؟"

"نہیں مَیں نے اُس کے بارے میں سُنا تھا ...!"

"اُس کی آواز کیپٹن فیاض کی آواز سے مشابہہ ہے۔"

"ہُوں ... لیکن کیا اس کا امکان ہے کہ وہ گدھے پر بیٹھ کر اتنی جلدی کسی ایسی جگہ پہنچ سکے گا جہاں فون موجود ہو؟"

"ہاں ... یہ بات قابلِ غور ہے۔"

ڈائمنڈ بیچ پہنچ کر ظفر نے گاڑی کی شناخت کی اور کچھ افسُردہ سا نظر آنے لگا ...

تھوڑی دیر بعد بولا ... "یہ تو خودکُشی ٹھہری ...!"

"جب تک لڑکی کی لاش نہ ملے ایسی کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی ...!"

"پھر یہ گاڑی ...!"

"اُس ٹیلے پر روکی گئی اور پھر انجن بند کیے بغیر وہیں سے پانی میں دھکیل دی گئی ... انجن کا سوئچ آن تھا لیکن گاڑی گیئر میں نہیں تھی ... اس وقت بھی اسی پوزیشن میں ہے۔"

"یہ معاملہ ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آ سکا۔" ظفر بڑبڑایا۔

"کیا سمجھنا چاہتے ہو؟"

"ہمیں رہائی کیسے ملی تھی ...؟"

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم ..."

"آپ نے یہ کیوں پوچھا تھا ... کہ میرے کسی شناسا کی آواز کیپٹن فیاض جیسی تو نہیں ..."

"اب اس وقت واپسی ممکن نہیں!" عمران اُس کی بات اُڑا کر بولا۔

"بیچ ہوٹل کے قریب ایک ہٹ میں رات بسر کریں گے۔" ظفر اُسے کن انکھیوں سے دیکھ کر رہ گیا۔

✵

غیر مُلکی سفارت خانے کے فوجی اتاشی کی موت معمّہ بنی ہُوئی تھی، لیکن کیپٹن فیاض سے زیادہ باخبر ہونے کی بِنا پر عمران حالات کا کسی قدر اندازہ لگا سکتا تھا۔

رینا ولیمز دراصل اس فوجی اتاشی کی پرسنل اسسٹنٹ تھی اور کاغذات اسی کی تحویل سے لے بھاگی تھی ... عمران کو یہ بات فیاض سے معلوم ہُوئی ... اُس نے یہ بھی بتایا کہ فوجی اتاشی پاگلوں کی طرح اُس کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا تھا ...

لیکن عمران نے فیاض کو اس سے لاعلم رکھا کہ فوجی اتاشی کی موت کا باعث رینا ولیمز ہی بنی تھی۔ ظفر، جیمسن اور جوزف کو بھی ہدایت کر دی گئی تھی کہ وہ اس مسئلے پر کسی کے سامنے

بھی زبان نہ کھولیں...

■ ابھی کچھ ہی دیر پہلے عمران نے ظفر اور جیمسن کو رُخصت کیا تھا... پھر خود کہیں جانے کی تیاری کر رہا تھا، کہ فیاض آدھمکا...

اُس کے چہرے پر جھلاہٹ کے آثار تھے۔ چھوٹتے ہی بولا... "میں ان تینوں کو دوبارہ حراست میں لے رہا ہوں...!"

عمران کے ہونٹوں پر شرارت آمیز مُسکراہٹ نمودار ہوئی۔

اُس نے کہا۔ "معاملے کی بات کرو... بیوہ عورتوں کی طرح سَر پیٹنے سے فائدہ... اگر کسی دُشواری میں ہو تو مجھے بتاؤ...!"

"اس سے بڑی اور کیا دُشواری ہوگی کہ محض تمھارے خیال سے ان تینوں کو حراست میں نہیں لے سکتا...!"

"اب ہُوئی نہ کوئی بات۔ بولو... کیا چاہتے ہو...؟"

"رینا ولیمز کی لاش نہیں دستیاب ہوسکی...!"

"کسی بھی عورت کی لاش لاؤ۔ میں اُس پر رینا ولیمز کا... میک اَپ کردوں گا...!"

"میرا مضحکہ نہ اُڑاؤ...!"

"آخر تم لاش دستیاب کرنے کے چکّر میں کیوں پڑ گئے ہو...؟"

"اس کے بغیر کیس کا فائل بند نہیں ہوسکتا...!"

"لیکن وہ تو نہیں مَری... میں ثابت کرچکا ہُوں کہ صرف کاڑی پانی میں گرائی گئی تھی اور پانی میں گرتے وقت وہ بالکل خالی تھی...!"

"اس سلسلے میں تمھاری دلیل کسی طرح پریس تک پہنچ گئی ہے... تم نے آج کا اخبار تو دیکھا ہی ہوگا...؟"

"دیکھا ہے... لیکن پریس کی معلومات کا ذریعہ میں نہیں ہُوں۔"

فیاض اُٹھتا ہُوا بولا۔.. "اگر ان تینوں کی خیریت چاہتے ہو تو رینا ولیمز کو تلاش کرو... صرف تین دن کی مُہلت دے سکتا ہُوں...!"

قبل اس کے کہ عمران کچھ کہتا فیاض نکلا چلا گیا تھا...

عمران ٹھنڈی سانس لے کر مُنہ چلانے لگا پھر سلیمان کو آواز دی...

"جناب...!" سلیمان کمرے میں داخل ہوکر بولا۔ اُس کے ہاتھوں میں کفت گیر تھی... شاید ہانڈی بھون رہا تھا...

"اگر کسی لڑکی کی تلاش ہو تو کیا کرنا چاہیے؟" عمران نے اُسے گھورتے ہُوئے پُوچھا۔

"تلاش کرنا چاہیے...!"

"بہت اچھا جواب ہے۔ شکریہ! بعض اوقات سامنے کی بات بھی سمجھ میں نہیں آتی...!"

"آٹا ختم ہوگیا ہے... پیسے دلوایئے... ورنہ دوپہر کو صرف شوربا پینا پڑے گا!"

"میں نے کتنے دِنوں سے کھانا نہیں کھایا؟"

"ایک ہفتے سے...!"

"پھر اتنی جلدی آٹا کیسے ختم ہوگیا...؟"

"میں نے چُرا کر پڑوسی کے ہاتھ بیچ دیا تھا...!" سلیمان جھنجلا کر بولا...

"کس حساب سے بیچا تھا؟"

"چار آنے سیر...!"

"قوم کا ہمدرد معلوم ہوتا ہے... جی خوش کردیا تُو نے... خود کس حساب سے خرید کر لائے گا؟"

"بارہ آنے سیر!"

"اچھی بات ہے... میں تیرا بستر بھی پڑوسی کے گھر بھجوائے دیتا ہُوں...!"

"ہانڈی جل جائے گی... جلدی سے نکالیے دس روپے"

"سلیمان...؟"

"جنابِ عالی...!"

"مجھے تو لیڈر ہونا چاہیے تھا!"

"پیسے جناب... میں اس وقت تفریح کے موڈ میں نہیں ہُوں...!"

عمران نے دس دس کے دو نوٹ اُس کے حوالے کیے لیکن سلیمان ایک نوٹ واپس کرتا ہُوا بولا۔ "خیرات نہیں چاہیے!"

"ہائیں... تو اتنا شریف کہاں سے ہوگیا ہے؟"

"جب سے محترمہ جوزف سے آپ کا نکاح ہُوا ہے!"

"کیا بکواس ہے؟"

"اگر آپ کی کوئی بیگم ہوتیں تو بھی میں اتنا زِچ نہ ہوتا... جتنا وہ رُوسیاہ کر رہا ہے!"

"ابے کچھ کہے گا بھی یا جدید ترین شاعری ہی کرتا رہ جائے گا؟"

"میری پلیٹ کی بوٹیوں تک پر نظر رکھتا ہے... اُس کے باس کا دیوالہ نکالے دے رہا ہُوں... اور خود چھ بوتلیں یومیہ!"

"یہ بات ہے...؟ اچھا میں دیکھوں گا... باس کی بھتیجیاں [illegible] وہ کون ہوتا ہے دخل دینے والا...!"

"آپ بھی وہی کہہ رہے ہیں جو وہ کہتا ہے...!"

"اچھا... بس چلتے پھرتے نظر آؤ...!"

"ذرا اس سے پوچھ لیجیے گا... ساری رات بھوں بھوں روتا کیوں رہا تھا... چین سے سونے بھی تو نہیں دیتا کم بخت...!"

سلیمان چلا گیا اور عمران نے جوزف کے کمرے کے دروازے پر جا دستک دی...

اُس نے دروازہ کھولتے ہی گلوگیر آواز میں اُسے سلام کیا۔

"کیا رات پیٹ میں درد تھا؟" عمران نے پوچھا۔

"نہیں تو باس...!"

"پھر کیوں روتا رہا تھا...؟"

"وہ سفید سؤر یا خواب میں نظر آئی تھی...!"

"ارے تو اس میں رونے کی کیا بات تھی...؟"

"کون کہتا ہے کہ رو رہا تھا... میں تو دُعا پڑھ رہا تھا... تاکہ تم پر کوئی مصیبت نازل نہ ہو... اور باس اب مجھے کچھ کچھ یاد آتا ہے کہ میں نے شاید اسے کہیں مادام روشی کے ساتھ دیکھا تھا!"

"اب یاد آئی ہے یہ بات... تین دن بعد...؟"

"میرا خیال ہے کہ خواب ہی میں کوئی ایسی چیز بھی نظر آئی جس نے مجھے یاد دلا دیا...!"

"سچ مچ باکمال آدمی معلوم ہوتا ہے...!"

جوزف نے دانت نکال دیے...!

ڈرائنگ رُوم میں واپس آکر اُس نے فون پر روشی سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی... پہلے گھر کے نمبر رنگ کیے پھر آفس کے... وہ آفس میں موجود تھی... عمران کی آواز سُنتے ہی چہکی... "جب بھی شدّت سے تمھاری ضرورت محسوس ہوتی ہے تم خود ہی متوجّہ ہو جاتے ہو...!"

"کوئی خاص بات...؟"

"بے حد خاص...!" روشی نے جواب دیا۔ "کیوں نہ ہم ساتھ ہی لنچ کریں...!"

"ایک گھنٹے بعد لنچ سے زیادہ خاص بات اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی...!"

"ہانگ کانگ کیسا رہے گا؟"

"وہاں کا چکن سوپ مجھے پسند ہے...!"

"تو پھر ٹھیک ایک بجے...!"

"او کے...!" عمران نے ریسیور رکھ دیا...

وہ مسلسل اس آواز کے بارے میں سوچے جا رہا تھا جس نے ظفرالملک، جوزف اور جیمسن کو شاہ آباد پولیس اسٹیشن سے رہائی دلوائی تھی۔

اگر وہ لڑکی ہی کا کوئی ساتھی تھا تو اس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ لڑکی ٹائر فلیٹ ہو جانے کے بہانے راستے میں ظفرالملک کی ہی منتظر تھی...

اگر یہ حقیقت تھی تو ظفر کسی سازش کا شکار ہُوا ہے، جو شاید یہیں تک محدود نہ رہے...

ٹھیک ایک بجے وہ ہانگ کانگ ریستوران پہنچ گیا جہاں روشی اُس کی منتظر تھی...

"تم نے مجھے کیوں فون کیا تھا...؟" وہ اُسے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھتی ہُوئی بولی...

"قصّہ ہے رینا ولیمز کا...!"

"خُداوندا... کیا تم سچ مچ بھوت ہو...؟"

"ایسا بھوت جس کی لنگوٹی ہر جگہ رہ جاتی ہے...!"

"نہیں بتاؤ... تمھیں کیونکر معلوم ہُوا کہ میں تم سے اسی سلسلے میں ملنا چاہتی ہُوں؟"

"کسی نے کبھی تمھیں اُس کے ساتھ دیکھا تھا...!"

"کس نے دیکھا تھا؟"

"کیا یہ بتانا ضروری ہے؟"

"نہیں... لیکن تم اُس کے بارے میں مجھ سے کیا معلوم کرنا چاہتے تھے؟"

"میری بات چھوڑو... تم اپنے کسی مسئلے کے لیے مجھ سے ملنا چاہتی تھیں...؟"

روشی کچھ کہنے ہی والی تھی کہ ویٹر آگیا۔ وہ اسے مطلوبہ اشیا تحریر کرانے لگی...

اُس کے چلے جانے پر عمران بولا۔ "وقت کم ہے۔ اگر تم اس بحث کو چھوڑ کر اپنی دُشواری کی طرف آجاؤ تو بہتر ہوگا۔"

"لمبی کہانی ہے...!"

"اسی لیے تو کہہ رہا ہُوں کہ وقت نہ ضائع کرو!"

"تم نے ایک سفارت خانے کے ملٹری اتاشی کی موت کے بارے میں سُنا ہوگا؟"

"سُنا ہے..." عمران سر ہلا کر بولا...

روشی تھوڑی دیر تک کچھ سوچتی رہی پھر بولی... "تم کبھی ملٹی نام انٹرپرائزز کی زمینوں کی طرف گئے ہو...؟"

"ہاں شاید کبھی گزرا ہوں ادھر سے!"

"وہاں مسز گوہن کا بھی ایک فارم ہے۔ وہ بندروں اور خرگوشوں کی افزائش کرتی ہے۔"

"خوب...!"

"میرے اُس سے اچھے مراسم ہیں...!"

"بندروں کی وجہ سے یا خرگوشوں کی وجہ سے؟"

"دونوں کی وجہ سے بڑھاپے میں میں بھی یہی کروں گی۔"

"جوانی میں کس نے منع کیا ہے؟"

"اب خود موضوع سے ہٹ رہے ہو۔" روشی جھنجلا گئی۔

"ہاں تو خیر... پھر...؟"

"متوفی ملڑی آتاشی بھی اس کے دوستوں میں سے تھا۔ اسی کے توسط سے میں بھی اُن لوگوں سے متعارف ہُوئی تھی۔ میرا مطلب ہے رینا ولیمز اور ملڑی آتاشی سے رینا ولیمز کبھی کبھی اُس کے ساتھ ہوتی... ہفتے کی راتیں وہ دونوں عموماً مسز گوہن کے فارم ہی میں گزارتے تھے...!"

"کیا وہ ایک دوسرے سے وہ کرتے تھے...؟"

"کیا تم اب بھی محبت کو گالی ہی سمجھتے ہو؟"

"عملی گالی...!"

"خیر چھوڑو..." روشی ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "تم ہمیشہ گدھے ہی رہو گے۔ میں نہیں جانتی، کہ وہ اس معاملے میں مخلص تھے یا نہیں اور مجھے اُن سے سروکار بھی کیا... دونوں جائیں جہنم میں... میں تو مسز گوہن کے لیے پریشان ہوں..."

"ان کا بھی جغرافیہ بتاؤ...!"

"ایک سادہ و معصوم عورت ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اس پر کوئی آنچ نہ آنے پائے...!"

"جس نے تمھیں رینا کے ساتھ دیکھا تھا میرا خیال ہے کہ وہ اس فارم کی طرف کبھی نہ گیا ہوگا...!"

"کئی بار ایسا ہُوا ہے کہ ہم سب فارم سے اکٹھے آئے ہیں ہوسکتا ہے انھی مواقع پر کسی نے دیکھا ہو۔"

"اب مسز گوہن کو کیا تکلیف ہے؟"

روشی نے کوئی جواب نہیں دیا... کیونکہ ویٹر پہلا کورس لے آیا تھا...

اُس کے چلے جانے پر بولی: "وہ بہت زیادہ خائف ہے...!"

"پولیس کی پوچھ گچھ سے ڈرتی ہے؟" عمران نے سوال کیا۔

"میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہے...!"

"ہُوں... تو تم اس کی خوفزدگی کی وجہ جاننا چاہتی ہو؟"

"میں اس کی وجہ بھی جانتی ہُوں... کچھ نامعلوم لوگ اس کی نگرانی کر رہے ہیں لیکن نہ ان کا تعلق مقامی پولیس سے ہے اور نہ اس سفارت خانے سے، میں اس کی تصدیق کر چکی ہُوں...!"

"مقامی لوگ ہیں...؟"

"نہیں... غیر مُلکی...!"

"رینا ولیمز سے اب کہاں مُلاقات ہوسکے گی؟"

"کیا تم نے اخبارات میں نہیں پڑھا کہ وہ اپنی گاڑی سمیت سمندر میں غرق ہوگئی۔"

"اخبار والے تو کسی دن پوری دُنیا کو کسی دوسرے سیارے کے سمندر میں غرق کر دیں گے...!"

"کیا مطلب...؟"

"اس کا کوئی واضح ثبوت نہیں مل سکا کہ غرق ہوتے وقت وہ خود بھی گاڑی میں موجود تھی..."

روشی کچھ نہ بولی۔ تھوڑی دیر بعد عمران نے پوچھا۔

"کیا ان دونوں میں کچھ اَن بَن ہوگئی تھی؟"

"پتہ نہیں... اس سلسلے میں مسز گوہن بھی کچھ نہیں بتا سکی۔"

"سوال یہ ہے کہ اگر کچھ غیر مُلکی اس کی نگرانی کر رہے ہیں تو وہ اس کی رپورٹ پولیس کو کیوں نہیں کرتی...!"

"میں یہی معلوم کرنا چاہتی ہُوں...!"

"اسی لیے مجھ سے ملنا چاہتی تھیں...!"

"ہاں... آں...!"

"تمھیں اس سے کیا فائدہ ہوگا؟"

"میں جو خرگوش پالوں گی وہ انڈے دینے لگیں گے۔" روشی پھر جھنجلا گئی...

"ماشاءاللہ... بلکہ انشاءاللہ...!"

"بور مت کرو...!"

لنچ سے فارغ ہو جانے تک پھر روشی نے یہ ذکر نہیں چھیڑا تھا۔

عمران بھی خاموشی سے کھاتا رہا تھا۔

روشی کے انداز سے معلوم ہوتا تھا جیسے اس مُلاقات سے اُسے مایوسی ہُوئی ہو...

"مسز گوہن کی عمر کیا ہے؟"

"عمر سے تمھیں کیا سروکار!"

"اگر کم سِن ہے تو نگرانی کرنے والے عشاق بھی ہوسکتے ہیں۔"

"اگر تم ڈھنگ کی کوئی بات نہیں کرسکتے تو اس معاملے کو یہیں ختم کردو...!"

"ایک نظر دیکھنا چاہتا ہُوں مسز گوہن کو... اور ہاں کیا ملڑی اتاشی سے اس کے ایسے ہی تعلقات تھے کہ وہ اُسے اپنے کسی راز میں شریک کرسکتا؟"

"یہ ایک کام کی بات پوچھی ہے تم نے... ہاں میرا خیال ہے کہ وہ اسی بنا پر خائف ہے کہ شاید کسی معاملے میں اُس کی راز دار بھی تھی...!"

"غالباً اب میں کسی قدر دلچسپی محسوس کر رہا ہُوں۔"

روشی کا چہرہ کھِل اُٹھا...

* * *

مسز گوہن تیس سال سے زیادہ کی نہ رہی ہوگی... خاصی قبول صُورت اور صحت مند عورت تھی... اُس کے ملنے والوں کا خیال تھا، کہ وہ ایک ایماندار اور نیک سیرت عورت ہے۔ تین سال پہلے اُس کا شوہر ٹریفک کے حادثے کا شکار ہو کر اُسے تنہا چھوڑ گیا تھا...

اب وہ چند مُلازمین کی مدد سے فارم کی دیکھ بھال کرتی تھی... بندروں اور خرگوشوں کے ایکسپورٹ سے اُسے اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی...

قیام بھی فارم ہی میں تھا... یہ بڑی پُر فضا جگہ تھی... کبھی کبھی اُس کے شہری دوست چھُٹیاں گزارنے وہاں آجاتے... اس طرح کچھ دنوں کے لیے خاصی چہل پہل ہو جاتی...

وہ ہنس مُکھ اور ملنسار تھی لیکن پچھلے تین دنوں سے اُس کے چہرے پر گہرے تفکر کے آثار پائے جاتے تھے۔ کبھی کبھی خوفزدہ سی بھی نظر آنے لگتی۔

اس وقت بھی وہ رہائشی عمارت کے برآمدے میں کھڑی خوفزدہ نظروں سے سڑک کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔

دفعتہً ایک گاڑی عمارت کے کمپاؤنڈ میں داخل ہُوئی اور قریب پہنچی تو مسز گوہن کا چہرہ کھِل اُٹھا...

"ہیلو... روشی..." وہ چہکتی سی آواز میں کہتی ہُوئی برآمدے سے نیچے اُتر گئی اور خود ہی روشی کی طرف کا دروازہ بھی کھولا...

روشی کے ساتھ ایک مرد بھی تھا... فوری طور پر وہ اُس کی طرف خصوصی توجہ نہ دے سکی لیکن جب دونوں گاڑی سے اُتر کر نشست کے کمرے میں آئے تو روشی نے اُس کا تعارف کراتے ہُوئے کہا۔ "یہ میرے بہت پُرانے دوست مسٹر علی عمران ہیں۔ تم نے ذکر کیا تھا کہ تمھارے بندروں میں کسی قسم کی بیماری پھیل رہی ہے۔ یہ بندروں پر اتھارٹی ہیں۔"

"اوہ... بڑی خوشی ہُوئی..." مسز گوہن نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہُوئے کہا اور تب اُس نے پُوری طرح اُس کا جائزہ لیا خوش شکل جوان تھا لیکن چہرے پر یتیمی سی چھائی ہُوئی تھی اوّل درجے کا بے وقوف معلوم ہوتا تھا۔

روشی کہہ رہی تھی: "ہم تین چار دن یہاں گزاریں گے۔"

"اوہ... ضرور... ضرور...!" مسز گوہن خوش ہو کر بولی "میں بڑی شدّت سے تنہائی محسوس کر رہی تھی...!"

"یہ بہت اچھے پامسٹ اور ستاروں کی چال سمجھنے والے بھی ہیں...!"

روشی نے تعارف کے سلسلے کو آگے بڑھانے کے لیے کہا۔

"سچ مچ..." مسز گوہن نے مزید گرم جوشی سے عمران کا ہاتھ دبایا...

"تم دیکھ ہی لوگی...!"

عمران کے ہونٹوں پر جھینپی جھینپی سی مُسکراہٹ تھی۔

"لیکن بہت کم سخن معلوم ہوتے ہیں۔" مسز گوہن بولی۔

"بولنے پر آتے ہیں تو کسی کی بھی نہیں سُنتے...!" روشی نے ہنس کر کہا...

اور تھوڑی دیر بعد عمران نے اس کے قول کی تصدیق کردی تھی بندروں پر گفتگو شروع ہُوئی تو سچ مچ اُس نے مسز گوہن کو خاموشی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا...

وہ حیرت سے اُس کا مُنہ تکے جا رہی تھی۔ ساری دُنیا میں پائے جانے والے بندروں کی مختلف اقسام اور اُن کی عادات و خصائل پر اس طرح لیکچر دے رہا تھا جیسے بندروں کی "اقسام متحدہ" کا صدر آدمیوں سے مخاطب ہو...

جی بھر کے دماغ چاٹ چُکنے کے بعد مسز گوہن کے بندروں میں پائی جانے والی بیماری سے متعلق استفسار کیا۔

"پچھلے پندرہ دن سے روز صُبح ایک بندر مُردہ ملتا ہے... ایسا پہلے کبھی نہیں ہُوا۔" مسز گوہن بولی...

"کسی بندر کی لاش کا ڈاکٹری معائنہ بھی کرایا؟" عمران نے پوچھا۔

ظاہر ہے لیکن رپورٹ عجیب و غریب ملی تھی جو دم گھُٹ

کر مرنے کی کہانی سُناتی ہے۔“

”ذرا رپورٹ مجھے دکھایئے...!“

”رپورٹ کے مطابق اس بندر کی موت گلا گھونٹے جانے کی بنا پر واقع ہوئی تھی...“

”کیا آج صبح بھی کوئی لاش ملی ہے؟“

”ہاں... آج بھی...!“

”کہاں ہے...؟“

”صفائی کرنے والا کہیں پھینک آیا ہوگا...!“

”خیر میں دیکھوں گا کہ اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں...!“

”کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ان بندروں ہی میں سے کوئی دوسرے بندروں کا گلا گھونٹتا رہتا ہو...“ روشی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”پہلے میں نے بھی یہی قیاس کیا تھا“ مسز گوہن بولی...

”لیکن اس کے ثبوت میں کوئی علامت نظر نہیں آئی...!“

”علامت سے کیا مُراد ہے؟“ روشی نے سوال کیا۔

”غالباً آپ یہ کہنا چاہتی ہیں مسز گوہن کہ بندروں میں آپ کو ایک بھی زخمی نظر نہیں آیا...“ عمران بولا۔

”یقیناً... یقیناً...!“

عمران نے روشی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”اگر تم میرا گلا گھونٹنے کی کوشش کرو تو میں بندر نہ ہوتے ہوئے بھی تمہارا مُنہ دبوچ لوں گا...!“

بہر حال عمران نے دوپہر کے کھانے سے قبل تک خاصی عقل مندی کی باتیں کی تھیں... لیکن سہ پہر کو مسز گوہن نے محسوس کیا جیسے اُس کی شخصیت ہی بدل گئی ہو۔ گاؤدی پن کی باتیں کرنے لگا تھا اور چہرے پر برسنے والی حماقت کچھ اور گہری ہو گئی تھی...

روشی نے مسز گوہن کو بہت زیادہ حیرت زدہ دیکھا... تو الگ لے جا کر بولی... ”بس یہی دشواری ہے اِس شخص کے ساتھ ... ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وقفے وقفے سے عقل مندی اور بے وقوفی کے دورے پڑتے ہیں۔“

”بحیثیت مجموعی دلچسپ آدمی ہے۔“ مسز گوہن مُسکرا کر بولی۔ ”تم اِس وہم میں نہ پڑو کہ تمہارے ساتھ اُس کی آمد مجھے ناگوار گزری ہے... میں تو ہپّی مُراد جیسے لوگوں کو بھی برداشت کر لیتی ہوں۔“

عمران ٹھیک اُسی وقت اُن کے قریب پہنچا تھا جب مسز گوہن، ہپّی مُراد کا حوالہ دے رہی تھی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے اچانک کوئی بات یاد آئی ہو اور کچھ پوچھنے کے لیے اُن کے پاس دوڑا آیا ہو۔

”معاف کیجیے گا دخل اندازی پر...“ اُس نے مسمسی شکل بنا کر کہا۔ ”آپ کے پڑوس میں کسی کے پاس کوئی ٹرینڈ بندر تو نہیں ہے...؟“

”نہیں... کسی کے پاس کوئی ایسا بندر نہیں ہے...!“

پھر اچانک عمران پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا تھا جس نے اتنی شدّت اختیار کر لی کہ روشی کے ہاتھ پیر بھی پھُول گئے۔ مسز گوہن کے چہرے پر بوکھلاہٹ کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔

آخر کار عمران اپنی ہنسی میں بریک لگانے کی کوشش کرتا ہوا بولا۔ ”وہ ہپّی مُراد... ابھی آپ نے اُس کا نام لیا تھا۔“

”ہاں... ہاں... تو پھر...؟“ مسز گوہن کی حیرت اُس کی آواز پر بھی اثر انداز ہوئی تھی...

”اگر آپ اسے اپنے بندروں کے کسی کٹہرے میں بند کر دیں... تو کیسی رہے گی...؟“

”اوہ...“ مسز گوہن بھی ہنس پڑی... پھر سنجیدگی اختیار کر کے بولی۔ ”کیا آپ اُسے جانتے ہیں؟“

”شہر میں کون نہیں جانتا... لیکن آپ جیسی شائستہ خاتون کے پاس اُس کا کیا کام...؟“

”میرے کچھ احباب اُس میں دلچسپی لیتے ہیں...!“

”وہ بھی اُسی جیسے ہوں گے...!“

”نہیں میری ہی طرح شائستہ ہیں۔“

”لیکن... میں نہیں سمجھ سکتا کہ شائستہ لوگ اُسے کس طرح برداشت کرتے ہوں گے...؟“

”مجھے اُس سے ہمدردی ہے...“ مسز گوہن نے کسی قدر ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

روشی نے عمران کو اشارہ کیا کہ وہ اس سلسلے میں گفتگو کو طُول نہ دے... لہٰذا اُس نے ہپّی مُراد سے پھر بندروں کی طرف چھلانگ لگائی... لیکن مسز گوہن دل برداشتہ سی نظر آنے لگی تھی... اس لیے بات آگے نہ بڑھ سکی۔

◆

ظفر الملک کو رینا ڈیمز کی تلاش تھی اور وہ ابھی تک اس اُلجھن میں مبتلا تھا کہ عمران کسی ایسے آدمی سے متعلق کیوں استفسار کر رہا تھا جس کی آواز کیپٹن فیاض کی آواز سے مشابہہ رہی ہو۔ اچانک اُسے یاد آیا کہ ہپّی مُراد کے حوالے پر عمران نے کہا تھا کیا یہ ممکن ہے کہ وہ گدھے پر بیٹھ کر اتنی جلدی کسی ایسی جگہ پہنچ سکے گا جہاں فون ہو... آخر اس ریمارک کا کیا مطلب تھا۔ اُس وقت اُس نے اِس پر توجّہ نہیں دی تھی... کتنی جلدی؟ یہ کس قسم کا جُملہ تھا... اس کے پس منظر میں کیا تھا...؟

اُس نے فون پر عمران کے نمبر ڈائل کیے لیکن وہ گھر پر موجود نہیں تھا۔ اُس کی اُلجھن بڑھتی رہی... تو کیا ہپّی مُراد کا بھی ان واقعات سے کوئی تعلّق ہو سکتا ہے...!

ایک بار پھر وہ ہپّی مُراد کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا...

معلومات کے ذرائع ایسے تھے کہ اُسے جلد ہی اُس کے موجودہ ٹھکانے کا پتہ چل گیا۔

لیکن اُسے حیرت ضرور ہوئی... کیونکہ وہ ایک یورپین گھرانے کے ساتھ مقیم تھا... اب سوال یہ تھا کہ وہ اُس تک پہنچنے کے لیے کیا طریقہ استعمال کرے... جیمسن ساتھ تھا...

اُس نے کہا: ”اس میں پریشانی کی کیا بات ہے یور ہائی نس ... گاڑی ان کی کوٹھی سے ذرا فاصلے پر چھوڑ دیجیے گا... پھاٹک پر کھڑے ہو کر آپ مینڈولن بجایئے گا۔ میں حلق پھاڑوں گا۔ ظاہر ہے کہ وہ لوگ ہپّیوں سے دلچسپی رکھتے ہیں ورنہ مُراد وہاں کیوں ہوتا...!“

”بعض اوقات تمہاری عقل کا بھی لوہا ماننا پڑتا ہے۔“ ظفر مُسکرا کر بولا...

وہ اس عمارت کے پھاٹک پر جا پہنچے اور جیمسن غیر ملکی انداز میں میر تقی میرؔ کے ایک خوبصورت شعر کو توڑنے مروڑنے لگا۔

”اُلٹی ہو گئیں سب تد... تدتدتد... بیریں... گک... کچھ کک کچھ نہ دَوا نے کا... نے کا... نے کام کیا... دیکھا... بھئی دیکھا۔ ... اس بیما... اس بیما... بیما... بیماریٔ دل... نے آ... نے آ ... خر کام... تمام... کی یا... کی یا...!“

وہ حلق پھاڑ کر چیختا رہا اور ظفر جھوم جھوم کر مینڈولن بجاتا رہا... تدبیر کارگر ہوئی تھی... وہ سب ہپّی مُراد سمیت عمارت سے برآمد ہو کر پھاٹک پر جمع ہو گئے تھے... عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی۔ ہپّی مُراد اُنھیں کینہ توز نظروں سے دیکھے جا رہا تھا... دفعتہً آگے بڑھا اور جیمسن کا گریبان پکڑ کر چیخا۔ ”خاموش رہو!“

جیمسن خاموش ہو گیا اور ظفر کے ہاتھ بھی رُک گئے...

”گانے دو... گانے دو...“ دوسروں نے بیک زبان کہا۔

”میں گانے کو منع نہیں کرتا... لیکن یہ ہمارے ایک بہت بڑے شاعر کو تباہ کر رہا ہے۔“ ہپّی مُراد بولا۔

”میں عالمی برادری کا قائل ہوں۔“ جیمسن نے بے حد نرم لہجے میں کہا... ”اگر کہو تو ابھی ورڈز ورتھ اور بائرن کی قوالی کر کے رکھ دوں ... آخر میر صاحب کب تک طبلے اور سارنگی پر چلتے رہیں گے؟“

”آہا... آہا... شاید میں تم دونوں کو پہچانتا ہوں۔“ دفعتہً ہپّی مُراد خوش ہو کر بولا... ”تم نے میری جان بچائی تھی... آؤ... آؤ۔ اندر چلو... میں جسے بھی چاہوں اس چھت کے نیچے پناہ دے سکتا ہوں ... یہ سب انسانیت کے پرستار ہیں...!“

پھر اُس نے اپنے میزبانوں کو بتایا کہ وہ دونوں اس کے ہمدرد ہیں۔ اس طرح ظفر اور جیمسن عمارت میں داخل ہو سکے۔

وہ سب بڑے زندہ دل لوگ تھے... صاحب خانہ کا نام رچرڈسن تھا۔ ملکی اور غیر ملکی مشترکہ سرمایے سے کام کرنے والی ایک فرم کا ڈائریکٹر تھا۔

اس وقت یہاں کچھ مہمان بھی تھے۔ ہپّی مُراد نے ان کا تعارف بھی کرایا۔ ان میں ڈاکٹر النگھم کی شخصیت سب سے نمایاں تھی۔

مضبوط جسم کا ایک قد آور آدمی تھا... عمر پچاس کے قریب رہی ہوگی لیکن آنکھوں سے نوجوانوں کی سی توانائی جھلکتی تھی... سُرخ رنگ کی فرنچ کٹ داڑھی میں خاصا وجیہہ لگ رہا تھا۔

اُس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی جس کا نام کورنیلیا تھا... جسے وہ نیلی کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ بڑی دلکش لڑکی تھی۔ سفید فام ہی تھی... لیکن اُس کے بال گہرے سیاہ تھے۔ اگر آنکھیں بھی سیاہ ہوتیں تو وہ مشرق ہی کے کسی حصّے کی باشندہ معلوم ہوتی۔

نہ جانے کیوں ظفر محسوس کر رہا تھا جیسے اُس نے اُسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہو...

ظفر اور جیمسن کو رات کے کھانے کی دعوت دی تھی اور کھانے کے بعد وہ تمباکو نوشی کے کمرے میں آ بیٹھے، یہاں کافی سَرد کی گئی۔

پھر ان دونوں سے گانے کی فرمائش ہوئی۔ جیمسن نے اس بار ایک اسٹار لائٹ سیرے نیڈ شروع کیا۔ ظفر مینڈولن بجا رہا تھا۔

صاحب خانہ رچرڈسن کھڑکی کے قریب کھڑا ہو کر پائپ سُلگانے لگا۔ کورنیلیا کُرسی کے ہتھّے پر اُنگلیوں سے تال دے رہی تھی۔ ڈاکٹر النگھم ایڑیاں بجا رہا تھا... اور ہپّی مُراد پر وجد کی سی کیفیت طاری تھی...

اچانک اُنھوں نے رچرڈسن کی چیخ سُنی اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔ نیلے رنگ کے ایک بڑے سے ہاتھ نے رچرڈسن کی گردن دبوچ رکھی تھی...

ظفر مینڈولن پھینک کر اُس کی طرف جھپٹا لیکن اتنی دیر میں ہاتھ پردے کے پیچھے غائب ہو چکا تھا اور رچرڈسن کو اُنھوں نے فرش پر گرتے دیکھا...

[illegible] نے پردہ ہٹا کر کھڑکی سے باہر چھلانگ لگائی۔ برآمدے

سے پھاٹک تک روشنی ہی روشنی تھی... لیکن کہیں کوئی دکھائی نہ دیا. ڈاکٹر النگھم اور ہپی مُراد بھی اُس کے پیچھے پیچھے آئے تھے.

پھر انھوں نے عورتوں کی چیخیں سُنیں اور دوبارہ عمارت کی طرف بھاگے.

رچرڈسن مرچکا تھا اور اس کے خاندان والے بدحواس ہو کر چیخ رہے تھے...

آدھے گھنٹے کے اندر اندر پولیس آگئی. ظفر اور جیمسن ایک بار پھر دشواری میں پڑ گئے کیونکہ وہ ان لوگوں کے لیے اجنبی تھے اور اُن کی شانِ نزول بھی مشتبہ تھی. ویسے سبھی نے نیلے رنگ کے بڑے سے ہاتھ کی کہانی سُنائی تھی.

"وہ کسی آدمی کا ہاتھ تو نہیں ہو سکتا۔" ڈاکٹر النگھم نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا.

جیمسن اور ظفر پر سوالات کی بوچھاڑ ہوتی رہی. دفعتاً ہپی مُراد بولا۔ "میں اس خاندان کے لیے اجنبی نہیں ہُوں اور یہ دونوں میرے لیے اجنبی نہیں. ہم اپنی دُنیا میں مگن رہنے والے لوگ ہیں... ہمیں سازشوں یا کشت و خون سے کیا سروکار...!"

"اور پھر ہماری بیک گراؤنڈ مضبوط ہے۔" جیمسن نے سب انسپکٹر سے کہا... "کیا آپ نے نواب مظفر الملک کا نام نہیں سُنا؟"

"کیوں نہیں سُنا... پھر...؟"

"یہ نواب زادہ ظفر الملک ہیں. اُن کے بھتیجے...!"

"کیا ثبوت ہے؟"

"فون کر کے معلوم کر لیجیے... کہ بھتیجے صاحب ہپی ہو گئے ہیں یا نہیں...!"

"جیمسن... بکواس بند کرو..." ظفر بولا... "بزرگوں کا حوالہ نہ دو... مجھ پر جو گزرے گی بھگت لوں گا...!"

ویسے ہپی مُراد کو اُن کا طرفدار دیکھ کر ڈاکٹر النگھم بھی اس بات پر زور دینے لگا تھا، کہ وہ اجنبی ہی سہی لیکن کسی قسم کی سازش میں ملوث نہیں ہو سکتے...!

* * *

صُبح بڑی خوشگوار تھی. روشی اور عمران بندروں کے کٹہرے کے قریب چہل قدمی کر رہے تھے...

"میں نے اتنا بڑا کٹہرا پہلے پہل دیکھا ہے۔" عمران بچّوں کے سے انداز میں خوش ہو کر بولا۔ "سات آٹھ سو بندروں سے کم نہ ہوں گے... ذرا دیکھنا آج بھی کوئی لاش دکھائی دیتی ہے یا نہیں!"

اُنھوں نے کٹہرے کے گرد چکّر لگایا... سبھی بندر اُچھلتے کودتے نظر آئے...

"کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں تمھیں اس لیے یہاں لائی ہُوں کہ تم بندروں کی موت کا سبب معلوم کرو۔" روشی کچھ دیر بعد بولی.

"اچھا تو پھر...؟"

"کسی طرح یہ معلوم کرو کہ آخر وہ خوفزدہ کیوں ہے. یہ درُست ہے کہ مرنے والا فوجی اتاشی یہاں بھی آتا تھا. وہ اُس کی موت پر مغموم ہو سکتی ہے. خوفزدہ ہو جانا کیا معنی رکھتا ہے...!"

"تم نے دیکھا ہے کہ وہ اُس کے ذکر پر فوراً موضوع بدل دیتی ہے..." عمران نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا.

پچھلی رات میں نے اُس سے کچھ معلومات حاصل کی ہیں۔"

"سُنو... میں یہاں صرف اس لیے آیا ہُوں کہ رینا ولیمز کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کر سکوں۔"

"آخر اس کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو...!"

"وہ بھی غائب ہے..."

"نہیں...!"

"تمھیں اس پر حیرت کیوں ہُوئی...؟"

"دونوں ایک جان دو قالب کہلاتے تھے...!"

"تب تو تمھیں اس پر حیرت نہ ہونی چاہیے. ہو سکتا ہے کہ اُس نے بھی مارے غم کے کہیں چھپ چھپا کر خودکشی کر لی ہو... خیر ہاں تو تم نے اس سے کس قسم کی معلومات حاصل کی ہیں؟"

"ادھر ایک ایگریکلچرسٹ ڈاکٹر النگھم رہتا ہے۔" روشی بائیں جانب ہاتھ اُٹھا کر بولی... "اس کا بہت بڑا زراعتی فارم ہے... فوجی اتاشی جب بھی ادھر آتا تھا... ڈاکٹر النگھم اس طرح اُس کی نگرانی کرتا رہتا تھا. جیسے اُسے اُس کی طرف سے کسی قسم کا کوئی خدشہ ہو...!"

"ہاں... آں... ہو سکتا ہے... سوال تو یہ ہے کہ مسز گوہن کیوں خوفزدہ ہے...!"

دفعتاً اُنھوں نے دیکھا کہ مسز گوہن اُن کی طرف دوڑی آ رہی ہے...

"سرپٹ...!" عمران سَر کھجاتا ہُوا بڑبڑایا.

"روشی... روشی..." وہ قریب آ کر ہانپتی ہُوئی بولی۔ "بہت بڑا حادثہ ہوگیا... اب... رچرڈسن بھی..."

"اُسے کیا ہُوا؟"

"ابھی ابھی فون پر اطلاع ملی ہے. پچھلی رات ایک حیرت انگیز ہاتھ نے اُس کا گلا گھونٹ دیا..."

"حیرت انگیز ہاتھ نے؟" عمران نے احمقانہ انداز میں دیدے نچائے...

"ہاں... ایک بڑا سا نیلے رنگ کا ہاتھ... جسے انسانی ہاتھ باور نہیں کیا جا سکتا!"

"کس سے اطلاع ملی ہے؟" روشی نے پوچھا.

"مسز رچرڈسن سے... مجھے اس کے پاس پہنچنا چاہیے!"

"مجھے بھی... بڑے اچھے لوگ ہیں۔" روشی مغموم لہجے میں بولی...

"کیا میں یہیں قیام کروں...؟" عمران نے ایسے لہجے میں روشی سے پوچھا جیسے وہ ان کا ساتھ نہ دینا چاہتا ہو...

روشی نے مسز گوہن کی طرف دیکھا...

"کوئی مضائقہ نہیں..." وہ جلدی سے بولی۔ "ہم شام تک واپس آجائیں گے. اُنھیں یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"

ناشتے کے بعد وہ دونوں شہر روانہ ہو گئی تھیں اور عمران وہیں رہ گیا تھا. اُس نے اپنے مخصوص انداز میں مُلازموں سے پُوچھ گچھ شروع کی... گویا اسی قسم کے کسی موقعے کا منتظر تھا. روشی نے شہر روانہ ہونے سے قبل اس بات پر حیرت ظاہر کی تھی کہ عمران نے کسی غیر معمولی نیلے ہاتھ کا ذکر سُن کر بھی ان کے ساتھ جانے کی خواہش ظاہر نہیں کی...

اس پر عمران بولا تھا۔ "گلا گھونٹا جا چکا... لاش یا تو تدفین کے لیے تیار ہو گی یا پوسٹ مارٹم کی میز پر... اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے ہاتھ نیلا رہا ہو یا پیلا..."

دیسی مُلازمین اس کی دلچسپ باتوں اور حرکتوں سے لُطف اندوز ہوتے رہے اور وہ خود ان کے ذہنوں کو کُریدتا رہا. گفتگو فوجی اتاشی اور اُس کی سیکریٹری رینا ولیمز سے متعلق تھی...!

"وہ لڑکی بڑی کاٹیاں تھی جناب۔" ایک مُلازم نے اطلاع دی۔ "میں جانتا ہُوں کہ وہ چھپ چھپ کر ڈاکٹر النگھم سے بھی ملتی تھی...!"

"چھپ چھپ کر...!" عمران نے یقین نہ کرنے کے سے انداز میں کہا... "ارے اُسے کیا کسی کا ڈر پڑا تھا کہ چھُپ کر ملتی...؟"

"کرنل صاحب کا ڈر تھا جناب. وہ ڈاکٹر النگھم کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے... میرا خیال ہے کہ ان کی آپس میں دُشمنی بھی تھی..."

"ارے نہیں ایسا بھی کیا... یہ لوگ پیار کی باتیں بھی کرتے ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے کٹکھنے کُتوں کی طرح بھونک رہے ہوں؛" عمران نے ہنس کر کہا...

"یہ بات نہیں صاحب... کرنل صاحب، ڈاکٹر کو پسند نہیں کرتے تھے۔"

"ڈاکٹر النگھم یہاں آتا ہے...!"

"کبھی کبھی... لیکن ہماری میم صاحب اُس سے تعلّقات رکھنا پسند نہیں کرتیں، مجبوراً برداشت کرتی ہیں۔"

"کیا وہ بہت بدمعاش ہے؟"

"عورتوں کے معاملے میں تو بدمعاش ہی لگتا ہے سالا... ہر مہینے سیکریٹری بدل دیتا ہے. تین چار روز سے ایک نئی دیکھی جا رہی ہے...!"

"یار مجھے بھی دکھاؤ کیسی ہے؟"

"کیا آپ ڈاکٹر النگھم کو نہیں جانتے...؟"

"نہیں... میں تو پہلی بار یہاں آیا ہُوں۔"

"بہت مغرور بھی ہے شاید آپ سے ملنا پسند نہ کرے!"

"اچھا یہ رچرڈسن صاحب کون تھے... جن کے پُرسے کو تمھاری میم صاحب گئی ہیں؟"

"بہت اچھے آدمی تھے صاحب. کرنل صاحب کے خاص دوستوں میں سے تھے اور ہماری میم صاحب سے بھی دوستی تھی. وہ شاید کسی سے بھی نفرت نہیں کرتے تھے. تبھی تو النگھم سے بھی ان کے تعلّقات اچھے ہی تھے... حد ہے کہ یہ جو گندے گندے ہپّی گھومتے پھرتے ہیں... اُنھیں بھی اپنے پاس بٹھاتے تھے... ایک ہیں ہپّی مُراد صاحب... وہ رچرڈسن صاحب ہی کے ساتھ یہاں آیا کرتے تھے۔"

تھوڑی دیر بعد عمران نے ائرگن اُٹھائی اور باہر نکل کھڑا ہُوا. النگھم کے فارم تک پہنچنے کے لیے اُسے کم از کم چار پانچ فرلانگ کا فاصلہ طے کرنا پڑا تھا...

پھاٹک کے قریب پہنچا ہی تھا کہ ایک لمبی سی کار گرد اُڑاتی ہُوئی مخالف سمت سے آئی اور پھاٹک کے اندر مُڑ گئی.

"اوہو...!" عمران کے مُنہ سے بے ساختہ نکلا تھا... کیونکہ پچھلی سیٹ پر جیمسن، ظفر اور ہپّی مُراد نظر آئے تھے اور اگلی سیٹ پر ایک لحیم شحیم سفید فام مرد کے ساتھ اُسی کی نسل سے تعلّق رکھنے والی ایک لڑکی بھی تھی...

مسز گوہن کے مُلازموں کے بتلائے ہُوئے حُلیے کے مطابق وہ ڈاکٹر النگھم ہی ہو سکتا تھا.

عمران نے کمپاؤنڈ میں داخل ہونے کا ارادہ ترک کر دیا اور عمارت سے پرے پرے کھیتوں کی طرف جا نکلا... عمارت یہاں

جمیسن نے پھر مُنہ پھیر کر جارحانہ انداز میں دانت نکالے تھے۔ لڑکی عمران کو توجّہ اور دلچسپی سے دیکھ رہی تھی... ہپّی مُراد کے رویّے میں لاتعلقی تھی۔

وہ ڈرائنگ رُوم میں آئے۔ ڈاکٹر النگھم نے فون کی طرف اشارہ کرکے رچرڈسن کے نمبر بتائے۔

"ہیلو... اِز ڈیئر روشی... یس... یس... اِٹ اِز مِران... ہاں... اوہ... کیا بات ہے۔ رات تک واپسی ہوسکے گی... اچھا... اچھا... میں یہاں ڈاکٹر چیونگم کے ساتھ ہُوں۔"

"النگھم۔" ڈاکٹر النگھم پُشت پر دھاڑا اور عمران بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا... "النگھم... النگھم... اچھا... اچھا... بہت اچھا...!"

رسیور رکھ کر وہ اس طرح ہانپنے لگا تھا جیسے اپنی آواز ہی کے ساتھ خود بھی شہر تک دوڑتا چلا گیا ہو...

"کیوں کیا... کوئی دوسری بُری خبر ہے؟" ڈاکٹر النگھم نے اُسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"وہ دونوں رات گئے تک واپس آئیں گی اور مجھے اس عمارت میں اکیلے بہت ڈر لگے گا...!"

"وہاں کئی مُلازمین ہیں...!"

"سب اپنے اپنے کوارٹروں میں ہوں گے...!"

"مرد ہو کر ڈرتے ہو...؟"

"عورت ہوتا تو بالکل نہ ڈرتا... عورتوں کو کس بات کا ڈر ہوسکتا ہے...؟"

"اچھا تمھیں کس بات کا ڈر ہے؟" لڑکی پہلی بار اُس سے مخاطب ہوئی...

"کوئی پیچھے سے آکر ہاؤ کردے تو...؟"

"اے تم ہمیں بے وقوف بنانے کی کوشش کیوں کر رہے ہو؟" النگھم نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

"نہیں تو..." عمران کے چہرے کا ہونق پن کچھ اور بڑھ گیا۔

"میں نہیں سمجھ سکتا کہ روشی جیسی اسمارٹ عورت تم جیسے ڈفر کو کیسے برداشت کرتی ہے؟"

"آپ میری توہین کر رہے ہیں ڈاکٹر چیونگم...!"

"النگھم...!" وہ غرّایا۔

"وہی سہی... کیا فرق پڑتا ہے... میری توہین تو ہوچکی۔ میں ڈفر لگتا ہُوں صُورت سے؟" عمران نے لڑکی سے سوال کیا۔

"بالکل نہیں۔" وہ ہنس کر بولی۔ "تم بہت اچھے ہو... آؤ... میرے ساتھ...!"

وہ اُس کا بازو پکڑ کر دوسرے کمرے میں کھینچ لائی۔

"بیٹھ جاؤ...!" ایک کُرسی کی طرف عمران کو دھکیل کر کہا۔ "بہت خوبصورت ہو... مگر ڈھیلے ڈھالے...!"

"اسمارٹ ہونے کا فائدہ بھی کیا؟" عمران ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"کیوں... فائدہ کیوں نہیں؟"

"کوئی لڑکی پسند کرے گی... پھر شادی کرنی پڑے گی اور میں بالکل اُلّو ہو کر رہ جاؤں گا...!"

"کیا اب نہیں ہو...؟"

"پھر توہین...!" عمران دونوں ہاتھوں سے سر پیٹ کر کراہا۔

دفعتہً النگھم کمرے میں گھس آیا اور خاصے جارحانہ لہجے میں لڑکی سے بولا۔

"تم اسے یہاں کیوں لے آئی ہو؟"

"میرے حُسن کی تعریف کر رہی تھیں۔" عمران نے شرما کر کہا۔

"تم نکل جاؤ یہاں سے ورنہ سَر توڑ دُوں گا۔" ڈاکٹر النگھم دھاڑتا ہُوا اُس کی طرف جھپٹا اور عمران اُس کی ٹانگوں کے نیچے سے نکل کر دوسری طرف جا کھڑا ہُوا... یہ اتنی پُھرتی سے ہُوا تھا کہ النگھم بوکھلا گیا... البتہ لڑکی پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا تھا۔

"میں اب جا رہا ہُوں... میری اٹرگن کہاں گئی؟" عمران نے ایسے لہجے میں کہا جیسے کچھ ہُوا ہی نہ ہو۔

"یہ آدمی مجھے پاگل معلوم ہوتا ہے۔" النگھم نے لڑکی سے کہا۔

عمران ڈرائنگ رُوم میں آیا اور ائرگن اُٹھاتے ہُوئے ہپّی مُراد کو آنکھ ماری...

"کیا مطلب...؟" ہپّی مُراد ناخوشگوار لہجے میں بولا۔

"باہر چلو... تو بتاؤں۔"

"چلو..." ہپّی مُراد اُٹھ کھڑا ہُوا۔

دونوں باہر آئے... عمران اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "تم یقین کرو یا نہ کرو... وہ لڑکی مجھ پر عاشق ہوگئی ہے۔"

"تم مجھ سے یہ کیوں کہہ رہے ہو؟"

"النگھم کی کون ہے...؟"

"میں نہیں جانتا... مجھے ان فضولیات سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں تو قوم کو جگانا چاہتا ہُوں..."

"قوم کے تکیے کے نیچے ٹائم بم رکھ دو۔"

"تم آخر ہو کیا چیز...؟"

"ناچیز... آؤ چلو میرے ساتھ، اگر ان فضولیات سے کوئی دلچسپی نہیں!"

"میں یہاں ایک خاص مشن پر آیا ہُوں...!"

"اچھا تو فی الحال برآمدے سے نیچے اُتر چلو... کیونکہ ڈاکٹر چیونگم نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے...!"

"صاحبِ خانہ کی توہین کروگے تو یہی ہوگا۔ ویسے تم مجھے ضدی آدمی معلوم ہوتے ہو...!"

"وہ دونوں تمھارے ساتھی...؟" عمران نے ظفر اور جمیسن کے متعلق پوچھا۔

"نہیں... میرا خیال ہے کہ وہ دونوں سازشی ہیں۔ کیا مِسز گوہن نے تمھیں اپنے اُس دوست کی موت کے بارے میں کچھ بتایا ہے جس کی ماتم پُرسی کو وہ شہر گئی ہیں؟"

"ہاں کہہ رہی تھیں کوئی بڑا سا نیلا ہاتھ اُس کا گلا گھونٹ گیا۔"

"بالکل ٹھیک... میں وہاں موجود تھا اور تھوڑی ہی دیر پہلے یہ دونوں رچرڈسن کے پھاٹک پر کھڑے گا بجا رہے تھے اُنھیں اندر بُلوایا گیا تھا۔"

"یُونہی... خواہ مخواہ...!"

"ہاں... یہ سب بڑے زندہ دل لوگ ہیں۔" ہپّی نے کہا اور رچرڈسن والے حادثے کی تفصیل بتانے لگا اور پھر یہ بھی بتایا کہ ظفر اور جمیسن سے اس کی مُلاقات اس سے پہلے کہاں ہوئی تھی...

"آہا... تم ہپّی مُراد تو نہیں ہو...؟"

"ہاں... میں ہی ہُوں..."

"تب تو بڑی اچھی بات ہے... میں نے تمھاری بہت شہرت سُنی ہے اور یہ جاننا چاہتا ہُوں کہ تم نے قوم کی خدمت کا جو پروگرام بنایا ہے اس کی نوعیّت کیا ہوگی...؟"

"سُنو... اس مسئلے پر ہم پھر کبھی گفتگو کرلیں گے۔ میں اس وقت تمھارے ساتھ کہیں بھی چل کر تمھیں اپنا پروگرام سمجھا دیتا... لیکن میں نہیں چاہتا کہ میری عدم موجودگی میں اُن دونوں پر کچھ زیادہ ہی تشدّد ہوجائے۔"

"کیا مطلب...؟"

"النگھم ان دونوں کو پولیس سے تو بچا لایا ہے لیکن اپنے طور پر یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے گا کہ وہ تو اس سازش میں شریک نہیں تھے؟"

"یار سُنو... یہ دونوں تمھارے ہم قوم ہیں۔" عمران [illegible] لہجے میں کہا...

"یہی تو میں بھی سوچ رہا ہُوں اور پھر یہ بھی ممکن ہے... کہ وہ دونوں سچ مچ میری ہی تلاش میں وہاں آئے ہوں!"

دفعتہً النگھم کی دھاڑ سُنائی دی... "ارے تم ابھی یہیں موجود ہو؟"

اور عمران بے تحاشا پھاٹک کی طرف دوڑ پڑا... دوڑتا چلا گیا... انداز ایسا ہی تھا جیسے ڈر کر بھاگا ہو۔

پھاٹک پر رُک کر ایک بار مُڑا تھا اور پھر دوڑنے لگا تھا۔ وہ سبھی برآمدے میں نکل آئے تھے...

⁂

شام کے چھ بجے تھے۔ عمران مسز گوہن کے مکان کے برآمدے میں آرام کُرسی پر نیم دراز دھیرے دھیرے چیونگم کچل رہا تھا... اچانک اُسے ہپّی مُراد دکھائی دیا جو اسی طرف آ رہا تھا۔

عمران آرام کُرسی سے اُٹھ کر اس طرح آگے بڑھا جیسے اُس کا استقبال کرنا چاہتا ہو۔

"میں دوڑتا ہُوا آیا ہُوں۔" ہپّی مُراد بولا۔ وہ بُری طرح ہانپ رہا تھا...

"کیوں کیا ہُوا...؟"

"وہی ہُوا... جس کا خدشہ تھا۔ شام کی چائے میں اُنھیں کوئی نشہ آور چیز دی گئی۔ جب وہ بے ہوش ہوگئے تو اُنھیں ایک درخت سے اُلٹا لٹکا دیا گیا ہے...!"

"کیا وہ ہوش میں آگئے ہیں؟"

"نہیں... ہوش میں آنے کا انتظار کیا جا رہا ہے۔" ہپّی مُراد دردناک لہجے میں بولا۔

"کچھ سوچو... پتہ نہیں اُن کے ساتھ کیا برتاؤ ہو...!"

"چلو... دیکھیں...!"

"یُوں چلنا خطرے سے خالی نہ ہوگا۔ چھُپ کر چلیں گے۔"

"لل... لیکن... مَم... میں..." عمران ہکلایا۔

"مَرد بنو... اتنے ڈرپوک کیوں ہو؟" ہپّی مُراد جھنجلا گیا۔

"تو چلو... چھُپ کر چلیں۔"

ہپّی مُراد اُسے عمارت کی پُشت پر لے گیا... یہاں سے سَرکنڈوں کی جھاڑیوں کا ایک گھنا سلسلہ دُور تک پھیلتا چلا گیا تھا۔ وہ اُسی کی اوٹ میں النگھم کے زراعتی فارم کی طرف بڑھتے رہے اُن کی رفتار خاصی تیز تھی۔ اس لیے اس جگہ تک پہنچنے میں زیادہ وقت صرف نہیں ہُوا تھا...

ظفر اور جمیسن سچ مچ ایک درخت سے اُلٹے لٹکے نظر آئے... لیکن آس پاس کوئی اور موجود نہیں تھا...

اور وہ دونوں بے ہوش نہیں تھے... ظفر جیمسن سے کہہ رہا تھا۔ "یور ہائی نس... ایسی عیاشی کبھی خواب میں بھی نصیب نہ ہوئی ہوگی...!"

"کیا ہم خواب نہیں دیکھ رہے؟"

"آپ خواب ہی دیکھ رہے ہوں گے لیکن مجھے یقین ہے کہ میں اُلٹا لٹکا ہوا ہوں۔"

"اس دعوے کی دلیل...؟"

"آسمان نہیں دکھائی دیتا...!"

"تب تو ٹھیک ہی ہوگا...!"

"کیا ٹھیک ہوگا؟" جیمسن کے لہجے میں جھلاہٹ تھی۔

"خاموش... لڑکی ادھر آ رہی ہے!"

عمران نے بھی اُسے دیکھ لیا تھا۔ وہ خراماں خراماں اس درخت کی طرف چلی آ رہی تھی۔

یہ دونوں ایسی جگہ چھپے ہوئے تھے جہاں سے دیکھ لیے جانے کا امکان نہیں تھا۔

"شام بڑی خوشگوار ہے۔" ظفر نے لڑکی کو مخاطب کیا۔

لڑکی کچھ نہ بولی۔ انھیں بغور دیکھتی رہی۔ ظفر نے کہا۔ "مہمان نوازی کا بہت بہت شکریہ۔ ہم اپنے گھر پر بھی اسی طرح آرام کرتے ہیں۔"

"ہوں... تو تم جانتے ہو کہ تمھارے ساتھ ایسا برتاؤ کیوں کیا گیا ہے۔" لڑکی تلخ لہجے میں بولی۔

"صرف میں جانتا ہوں۔" جیمسن بول پڑا۔

"کیا جانتے ہو...؟"

"تاکہ تمھیں اُوپر سے بھی دیکھ سکیں۔"

دفعتہً ڈاکٹر النگھم کی چنگھاڑ سنائی دی۔ "تم وہاں کیا کر رہی ہو...؟"

لڑکی اُچھل پڑی اور مڑ کر عمارت کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی لیکن اُس نے وہ راستہ اختیار نہیں کیا تھا جدھر سے ڈاکٹر نمودار ہوا تھا...

"ہوش آ گیا تم دونوں کو؟" اُس نے قریب پہنچ کر طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"تم دیکھ ہی رہے ہو۔" ظفر بے پروائی سے بولا۔

"اور اب تم مجھے بتاؤ گے کہ نیلی سے ماضی میں تمھارا کیا تعلق رہا ہے؟"

"نیلی سے تعلق...؟" ظفر کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں... کیا تم اسی کے لیے رچرڈسن کے گھر نہیں پہنچے تھے؟"

"شاید تم نشے میں ہو۔ کل رات سے پہلے میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا...!"

"تم جھوٹے ہو... تم جس طرح ایک دوسرے کو دیکھتے ہو اس میں شناسائی کا انداز پایا جاتا ہے۔"

"تم بہت زیادہ وہمی معلوم ہوتے ہو ڈاکٹر۔" ظفر ہنس کر بولا۔

"جب تک تم اعتراف نہیں کر لو گے اسی طرح لٹکے رہو گے۔" ڈاکٹر نے کہا اور عمارت کی طرف مڑ گیا۔

"یہ تو کوئی دوسرا ہی چکر معلوم ہوتا ہے۔" ہپی مراد بڑبڑایا۔

عمران چپ چاپ النگھم کو جاتے دیکھتا رہا۔

اب اندھیرا پھیلنے لگا تھا...

"تم کیا سوچ رہے ہو؟" ہپی عمران کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا...

"یہ لڑکی... کیا نام لیا تھا اُس نے نیلی... بڑی حرافہ معلوم ہوتی ہے... دوپہر کو میرے حُسن کی تعریف کرتی رہی تھی اور اب یہ چکر...!"

"سوال تو یہ ہے کہ انھیں کیسے بچایا جائے؟"

"لٹکے رہنے دو۔" عمران نے لاپروائی سے کہا۔ "میں تمھاری طرح قوم کا درد نہیں رکھتا۔"

"تم عجیب آدمی ہو...!"

"مجھے درخت پر چڑھنا نہیں آتا۔" عمران نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

"میں چڑھوں گا درخت پر۔ تم نیچے کھڑے رہنا... اس کا دھیان رکھنا کہ کہیں وہ سر کے بل نیچے نہ گر پڑیں۔"

"میں بتاؤں...؟" عمران ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "انھیں اُتار کر تم مجھے لٹکا دینا...!"

"کیا بات ہوئی...؟"

"وہی کرو... جو میں کہہ رہا ہوں... ورنہ تم بڑی مصیبت میں پھنسو گے... ڈاکٹر کا کوئی مُلازم اس کی جرأت نہیں کر سکتا۔ لہٰذا ان لوگوں کا خیال تمھاری ہی طرف جائے گا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو... لیکن پھر تمھارا کیا ہوگا؟"

"میری فکر نہ کرو۔ لوگ بے وقوف سمجھ کر معاف کر دیتے ہیں۔"

پھر یہ کام بڑی پھرتی سے ہوا تھا۔ عمران ان دونوں کو جھاڑیوں کے پیچھے لے جا کر بولا تھا۔

"یہ لیجیے... میری گاڑی کی کُنجی... بس یہاں سے سیدھے چلے جایئے گا۔ آگے ایک عمارت ہے اُس کے کمپاؤنڈ میں کھڑی ملے گی... اب نہ دکھائی دیجیے گا ان اطراف میں...!"

وہ دونوں خاموشی سے رُخصت ہو گئے تھے۔

■

اس بار نیلی اور ڈاکٹر النگھم ساتھ آئے تھے... عمران نے پیروں کی چاپ سُن کر ڈرے ڈرے سے انداز میں چیخیں مارنی شروع کر دی تھیں لیکن شاید وہ دونوں اندھیرے میں یہ نہیں دیکھ سکے تھے کہ اب صرف ایک ہی آدمی درخت سے اُلٹا لٹکا ہوا ہے...

اچانک اس پر ٹارچ کی روشنی پڑی اور وہ زور سے چیخا "ارے باپ رے!"

"ہائیں...!" یہ ڈاکٹر النگھم کی آواز تھی۔ "تم کہاں؟"

"خُدا کے لیے مجھے بچاؤ!" عمران گھگھیایا...

"وہ دونوں کہاں ہیں...؟" النگھم دھاڑا...

"اس مُصیبت سے نجات دلاؤ... تو بتاؤں۔"

"نہیں..." یہ لڑکی کی آواز تھی۔ "پہلے تم بتاؤ...!"

"میری گردن ٹوٹی جا رہی ہے... اُتارو... مجھے... مم... میں مر رہا ہوں۔" عمران نے گھُٹی گھُٹی سی آواز میں کہا۔

کچھ دیر بعد النگھم کے مُلازم اُسے درخت سے نیچے اُتار رہے تھے...

زمین پر قدم رکھتے ہی وہ لڑکھڑایا اور ڈھیر ہو گیا۔ النگھم اُسے اُٹھوا کر عمارت میں لایا...

عمران نے اپنی "بے ہوشی" برقرار رکھی اور ان دونوں کی گفتگو سُنتا رہا۔ لڑکی کہہ رہی تھی... "یہ بہت بُرا ہوا... یہ کم بخت نہ جانے کون ہے اور کیا کرتا پھر رہا ہے...!"

"ہوش میں آنے دو۔ سب معلوم ہو جائے گا۔" النگھم بولا... عمران نے اُس کے لہجے میں فکرمندی محسوس کی تھی...

کچھ دیر بعد وہ بوکھلا کر نہ صرف اُٹھ بیٹھا بلکہ وہاں سے نکل بھاگنے کی کوشش بھی کر ڈالی... النگھم نے جھپٹ کر اُسے پکڑ لیا۔

"مم... مرا... بچاؤ... بچاؤ۔" عمران چیخنے لگا...

"اے... اب ہوش میں آ جاؤ ورنہ جان سے مار دوں گا۔"

"کیوں... کیوں...؟" عمران ہونقوں کی طرح اس کی شکل دیکھنے لگا۔

"وہ دونوں چور کہاں گئے...؟" النگھم اُسے جھنجھوڑ کر دھاڑا۔

"چچ... چور...؟"

"ہاں چور... مہمان بن کر آئے تھے اور میرا پرس لے بھاگنے کی کوشش کی تھی... میں نے سزا کے طور پر انھیں اُلٹا لٹکا دیا تھا..." النگھم غرایا...

"صرف چور ہی نہیں بلکہ وہ ڈاکو اور قاتل تھے۔" عمران خوفزدہ سی آواز میں بولا۔

"مگر تم کیوں لٹکے ہوئے تھے اُن کی جگہ؟"... لڑکی نے نرمی سے پوچھا۔

"پپ... پانی... ایک گلاس پانی... میرا دم گھُٹا جا رہا ہے۔"

پانی منگوایا گیا... عمران اب بھی بالکل اسی طرح چاروں طرف دیکھے جا رہا تھا جیسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا ہو...

پانی پی کر وہ یکلخت بولنے لگا۔ "میری شامت ہی آئی تھی کہ شام کو ٹہلتا ہوا ادھر آ نکلا تھا... ان دونوں کو درخت سے لٹکا دیکھ کر قریب سے اُن کی خیریت معلوم کرنے کی سوجھی۔ وہ میری خوشامد کرنے لگے کہ انھیں اس مُصیبت سے نجات دلاؤں۔ میں نے پوچھا مُصیبت آئی کیوں تو بولے۔ یہ ڈاکٹر النگھم پاگل معلوم ہوتا ہے۔ یونہی خواہ مخواہ اپنے نوکروں کو حکم دے دیا... کہ ہمیں باندھ کر لٹکا دیں... مجھے اُن پر ترس آیا اور میں درخت پر چڑھ گیا... رسّی ڈھیلی کر کے اُنھیں زمین پر پہنچایا اور جب درخت سے اترا تو دونوں مجھ پر ٹوٹ پڑے اور میرا گلا گھونٹنا شروع کر دیا۔ بس اِتنا ہی یاد ہے... دوبارہ ہوش آیا تو خود ہی اُلٹا لٹکا ہوا تھا۔"

"تم اتنے گدھے کیوں ہو؟" النگھم غصے سے بے قابو ہو کر دھاڑا...

"نہیں... نہیں..." لڑکی بولی۔ "یہ بے چارہ رحم کے قابل ہے۔"

"مجھ پر رحم کیا تو خدا تم پر بھی رحم کرے گا۔" عمران روہانسا ہو کر بولا...

"چلے جاؤ... نکلو یہاں سے ورنہ سچ مچ مار ڈالوں گا..."

"اندھیرے میں اکیلے تو نہ جا سکوں گا..." عمران نے خوفزدہ لہجے میں کہا...

"واقعی بہت ڈرپوک ہو۔" لڑکی ہنس پڑی

"اندھیرا نہ ہو تو بالکل نہیں ڈرتا...!"

"تم خواہ مخواہ اُس کی طرفداری کر رہی ہو۔" النگھم نے لڑکی کو گھورا...

"صُورت ہی سے یتیم معلوم ہوتا ہے۔" لڑکی بولی۔

"دوبار یتیم ہو چکا ہوں...!"

"دوبار کیسے...؟"

"یہ نہ بتاؤں گا... میرا ذاتی معاملہ ہے۔"

"میں کہتا ہوں تم خاموش کیوں نہیں رہتیں؟" النگھم نے پھر لڑکی کو ڈانٹا...

"اسے پال لو ڈاکٹر... جی بہلے گا۔" لڑکی اُس کے لہجے کی پروا نہ کر کے اِٹھلائی...

"اوہ... میں یہ تو بھول ہی گیا تھا کہ یہ ایک اچھی پڑوسن کا مہمان ہے۔" النگھم چونک کر بولا... "اگر تم چاہو تو رات یہاں گزار سکتے ہو... میں مسز گوہن کو فون کر دوں گا...!"

"بہت بہت شکریہ۔" عمران کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو چھلک آئے۔

لڑکی اُس سے متاثر معلوم ہوتی تھی۔ اُس نے کہا۔ "رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھاؤ...!"

"بہت بہت شکریہ...!"

اس کے بعد عمران نے چپ سادھ لی... النگھم وہاں سے چلا گیا تھا... لڑکی سامنے والے صوفے پر نیم دراز عمران کو ادھ کھلی آنکھوں سے دیکھے جا رہی تھی... اتنے میں ہپّی مُراد اندر داخل ہوا...

"تم کہاں تھے؟" لڑکی نے اُس سے پوچھا...

"سکون کی تلاش میں دُور تک نکل گیا تھا۔"

"واپسی ہوئی یا نہیں...؟" لڑکی نے ہنس کر سوال کیا۔

"اب واپسی ناممکن ہے۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا اور عمران کے قریب بیٹھ گیا۔

لڑکی اُسے بتانے لگی کہ کس طرح دونوں قیدی فرار ہو گئے۔

"ڈاکٹر نے غلطی کی... انھیں پولیس کے حوالے کر دینا تھا۔" ہپّی نے کہا۔

لڑکی کچھ نہ بولی... وہ پھر پہلے ہی کے سے انداز میں عمران کو دیکھنے لگی تھی... عمران بوکھلا کر کبھی چھت کی طرف دیکھتا اور کبھی ہپّی مُراد کو دیکھنے لگتا۔

"اسے اس طرح نہ دیکھو۔" ہپّی نے لڑکی سے کہا... "یہ کبوتر کی طرح معصوم ہے...!"

"جنگلی بکروں کی طرح حلق نہ پھاڑو۔" لڑکی نے غصیلے لہجے میں کہا اور اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

ہپّی کچھ کہنے ہی والا تھا... کہ ایک مُلازم نے آ کر کھانے کے کمرے میں چلنے کو کہا۔

کھانے کے بعد ڈاکٹر النگھم نے پائپ سُلگایا اور عمران کو گھورتا ہوا بولا...

"تم تمباکو کیوں نہیں پیتے...؟"

"والدین نے سکھایا ہی نہیں... میں بہت نالائق آدمی ہوں۔ تم مجھ میں ایسی بہت سی خامیاں پاؤ گے...!"

"کبھی آدمیوں میں نہیں رہے؟" لڑکی بول پڑی۔

"آج تک کوئی ملا ہی نہیں۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو گے۔ مجھے بھی آج تک کوئی نہیں ملا۔" ہپّی مراد بولا۔

"اپنے جیسے ریچھ تو ملے ہی ہوں گے۔" لڑکی نے ہنس کر کہا...

النگھم دروازے کے قریب کھڑا تھا... اچانک اُس کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی اور وہ اُچھل کر دُور جا گرا۔ عمران نے دروازے میں ایک بڑا سا نیلے رنگ کا ہاتھ دیکھا تھا۔

وہ دروازے کی طرف جھپٹا... ہپّی مُراد ڈاکٹر النگھم کی جانب دوڑ پڑا تھا۔ لڑکی کھڑی چیخیں مار رہی تھی...

"زندہ ہے... زندہ ہے!" دفعتہً ہپّی مُراد چیخا۔

لڑکی اُس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ڈاکٹر فرش پر چت پڑا گہری گہری سانسیں لے رہا تھا...

اُس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور وہ پلکیں جھپکائے بغیر چھت کو گھورے جا رہا تھا...

"ڈاکٹر... ڈاکٹر...!" لڑکی نے اُس پر جھکتے ہوئے آوازیں دیں...

ڈاکٹر نے ہاتھ اُٹھا کر اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا...

ہپّی مُراد اُسے اُٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔

"ارے وہ کہاں گیا؟" لڑکی یک بیک چونک کر بولی۔

"اُس نے کچھ دیکھا تھا۔ اُسی کے پیچھے بھاگتا چلا گیا ہو گا۔" ہپّی نے کہا۔

"کیا دیکھا تھا...؟"

"نیلا ہاتھ... کیا تم نے نہیں دیکھا تھا؟"

"نہیں...!" لڑکی دوبارہ خوفزدہ نظر آنے لگی۔

"ہاں وہی ہاتھ تھا۔ میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔" النگھم اُٹھ بیٹھا تھا۔ اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "اگر میں نے اُسے دیکھ نہ لیا ہوتا تو میرا ابھی وہی حشر ہوتا...!"

وہ مزید کچھ کہنے والا تھا کہ باہر سے کسی گاڑی کے رُکنے کی آواز آئی اور وہ استفہامیہ انداز میں لڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے بعد شاید پھر انجن اسٹارٹ ہوا تھا اور ایسا معلوم ہونے لگا تھا جیسے وہ گاڑی سیدھی اُسی کمرے میں گھسی چلی آ رہی ہو... ڈاکٹر بوکھلا کر کھڑا ہو گیا...

اِتنے میں دو مُلازم عمران کو گھسیٹتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ آٹو موبائل انجن کی سی آواز دراصل عمران کے حلق سے نکل رہی تھی... پھر جیسے ہی مُلازم رُکے، بریکوں کی سی چرچراہٹ بھی اُس کے حلق سے نکلی...

"کیا ہے...؟" ڈاکٹر اُنھیں گھورتا ہوا غرّایا۔

"یہ جھاڑیوں میں گھسے ہوئے موٹر کی طرح گھرگھرا رہے تھے..." ایک نوکر بولا...

اس اطلاع کے بعد عمران نے پھر وہی حرکت شروع کر دی... کبھی انجن کی آواز نکالتا اور کبھی ہارن کی... اس کے باوجود چہرے پر بلا کی سنجیدگی طاری تھی...

"شاید خوف کی وجہ سے اس کا دماغ اُلٹ گیا ہے۔" ہپّی مُراد نے ڈاکٹر سے کہا اور عمران کو مُلازموں کی گرفت سے رہائی دلا کر ایک طرف بٹھا دیا۔

وہ اُسے پُرتشویش نظروں سے دیکھے جا رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ڈاکٹر اپنی بپتا بھول گیا ہو...

"اسے چپ کراؤ... ورنہ میں بھی پاگل ہو جاؤں گا۔" ڈاکٹر نے خوفزدہ سے لہجے میں ہپّی مُراد سے کہا۔

ٹھیک اسی وقت تیسرے مُلازم نے کمرے میں داخل ہو کر کسی خاتون کی آمد کی اطلاع دی...

"اُسے سٹنگ رُوم میں بٹھاؤ۔" لڑکی بولی... لیکن قبل اس کے کہ مُلازم واپسی کے لیے مُڑتا روشنی اندر گھس آئی، عمران بدستور آٹو موبائل انجن بنا ہوا تھا...

"یہ... یہ... یہ کیا ہے؟" روشنی نے ان سبھوں کو گھورتے ہوئے کہا۔ "مجھے معلوم ہوا تھا کہ یہاں میرے دوست کے ساتھ کوئی بُرا برتاؤ ہوا ہے۔"

"خدا کے لیے اسے یہاں سے لے جاؤ۔" ڈاکٹر عمران کی طرف ہاتھ اُٹھا کر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "ورنہ ہم سب پاگل ہو جائیں گے۔"

"یہ کیا ہو رہا ہے... خاموش رہو۔" روشنی نے آگے بڑھ کر عمران کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"گھر... گھر... گھرپ... ہپ۔" عمران نے سختی سے ہونٹ بھینچ لیے لیکن بُری طرح کانپے جا رہا تھا...

"ڈاکٹر...!" روشنی النگھم کی طرف مُڑ کر بولی۔ "تم نے اچھا نہیں کیا..."

"میں نے کچھ بھی نہیں کیا... میں خود مرتے مرتے بچا ہوں۔"

"پوری بات کیوں نہیں بتاتے؟"

"مجھ پر بھی اس نیلے ہاتھ نے حملہ کیا تھا... یہ ڈر کر بھاگا۔ پھر میرے مُلازموں نے اسے جھاڑیوں سے نکالا جہاں چھپا ہوا یہ ایسی ہی آوازیں نکال رہا تھا...!"

"نیلا ہاتھ...؟" روشنی کے چہرے پر حیرت کے آثار نظر آئے...

"ہاں نیلا ہاتھ۔" ہپّی مُراد بولا۔ "تم براہِ کرم اپنے ساتھی کو یہاں سے لے جاؤ... ہم سب بہت پریشان ہیں۔"

"نیلا ہاتھ تو ہم سب کی پریشانی ہے۔" روشنی نے خوفزدہ سی آواز میں کہا۔

"اس کی بات پر یقین نہ کرو۔" عمران النگھم کی طرف ہاتھ اُٹھا کر بولا۔ "یہ مر چکا ہے۔ میں نے اسے مرتے دیکھا تھا۔"

"اگر میں نے بے تحاشہ اُلٹی چھلانگ نہ لگائی ہوتی... تو یقیناً اس وقت میرا جسم بے رُوح ہوتا۔"

"تم... مجھے لے چلو یہاں سے۔" عمران روشنی کی طرف دیکھ کر گھگھیایا...

"چلو اُٹھو...!"

"اندھیرے میں پیدل نہیں جاؤں گا۔"

"گاڑی لائی ہوں...!"

وہ دونوں تنہا باہر نکلے تھے، کوئی انھیں رخصت کرنے کے لیے گاڑی تک نہیں آیا تھا...

واپسی پر روشنی نے پوچھا۔ "کیا تم کسی درخت سے اُلٹے لٹکا دیے گئے تھے؟"

"تمھیں کیسے معلوم ہوا...؟"

"مسز گوہن کے ایک مُلازم نے بتایا تھا۔ اسی لیے تو دوڑی چلی آئی تھی...!"

"آہ... تم مجھے اُلٹا لٹکا دیکھنا چاہتی تھیں... اُس لڑکی کے لیے میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔"

"کس لڑکی کے لیے؟"

"النگھم کی سیکرٹری...!"

"دماغ تو نہیں چل گیا...؟"

"آج رات اُسے پار کر لائیں تو کیسی رہے؟"

"بکواس مت کرو... نیلے ہاتھ کا کیا قصہ ہے؟"

"انگھم سُنا چکا ہے... اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتا۔ ہاں تو وہ لڑکی...؟"

"شٹ اپ... میں تمھیں یہاں مسز گوہن کے لیے لائی ہوں۔"

"اُن سے کہو... پہلے آئینے میں اپنی شکل دیکھیں۔ انگھم کی سیکریٹری سے زیادہ حسین نہیں ہیں...!"

"اچھا اب کچھ نہ کہوں گی۔" روشنی جھنجلا گئی۔

"مسز گوہن کے چہرے کی کھال ڈھیلی ہو چکی ہے۔"

"میں تمھارے جبڑے ڈھیلے کر دوں گی ورنہ خاموش رہو!"

"اچھی بات ہے انگھم اور رچرڈسن کے کسی مشترکہ دشمن کا نام بتاؤ؟"

"مسز گوہن ہی اس پر بھی روشنی ڈال سکے گی۔"

"آہا... ہمارے پیچھے بھی کوئی گاڑی ہے لیکن تم اسی رفتار سے چلتی رہو...!"

"میرا خیال ہے کہ تم کسی خاص نتیجے پر پہنچ گئے ہو؟"

"اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ نیلی مسز گوہن سے زیادہ خوبصورت ہے...!"

"شٹ اپ۔"

مسز گوہن کے فارم میں پہنچ کر روشنی نے گاڑی روکی اور انجن بند کر دیا... پھر وہ گاڑی سے اتر ہی رہے تھے کہ دوسری گاڑی بھی وہیں آ رُکی...

"میں غلط فہمی رفع کرنے آئی ہوں۔" دوسری گاڑی سے انگھم کی سیکریٹری کورنیلیا کی آواز آئی...

اور پھر وہ گاڑی سے اُتر کر اُن کے قریب آ کھڑی ہوئی۔

"ہم نے تمھارے ساتھی سے کوئی بُرا برتاؤ نہیں کیا۔" اُس نے روشنی کو مخاطب کر کے کہا اور اُلٹے لٹکنے کی وہی داستان دُہرا دی جو عمران سے سُنی تھی۔

"اچھا... تو یہ خود تمھاری حماقت تھی۔" روشنی نے غصیلے لہجے میں عمران سے کہا۔

"مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ مجھے ہی لٹکا کر بھاگ نکلیں گے۔"

"اور پھر ہم سب نے دیکھا کہ اسی منحوس ہاتھ نے ڈاکٹر کا خاتمہ کر دینے کی بھی کوشش کی۔" لڑکی ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

"ایسی صورت میں یہی تو سوچا جا سکتا ہے کہ ان دونوں کو

ہاتھ سے ضرور کوئی تعلق تھا۔"

"داڑھی والے کا رہا ہوگا... دوسرا تو کافی خوبصورت تھا..."

عمران نے اپنی رائے ظاہر کی۔

"تم واقعی بالکل احمق ہو۔" لڑکی جھنجلا گئی۔

"خاموش رہو..." روشنی نے عمران کے شانے پر ہاتھ مار کر کہا۔

"اور ہاں... میں مسز گوہن سے بھی ملنا چاہتی ہوں۔" لڑکی

"اندر چلو۔" روشنی نے عمارت کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

وہ سٹنگ رُوم میں آئے... مسز گوہن شاید روشنی کی کی منتظر تھی۔ اُنھیں دیکھتے ہی صوفے سے اُٹھ گئی۔

فطری بات تھی کہ روشنی سب سے پہلے ڈاکٹر انگھم پر حملے کا ذکر کرتی...

مسز گوہن بہت زیادہ پریشان نظر آنے لگی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہو لیکن مناسب الفاظ نہ مل ہوں...

روشنی خاموش ہوئی تو انگھم کی سیکریٹری نے کہا۔ "مسز ڈاکٹر نے کہا ہے۔ اب میری زندگی کا کوئی اعتبار نہیں۔ پتہ نہیں کون ہمارے پیچھے پڑ گیا ہے لہٰذا آپ کی امانت واپس کر ہوں...!"

خاموش ہو کر اُس نے اپنے پرس سے ایک منقش ڈبہ نکالا تھا اور مسز گوہن کی طرف بڑھا دیا گیا۔

"او ہو... اچھا۔" مسز گوہن چونک کر ہاتھ بڑھاتی ہوئی "میں تو بھول ہی گئی تھی...!" اُس نے ڈبہ لے کر میز پر رکھ د

"اچھا اب میں جا رہی ہوں۔" نیلی نے کہا اور دروا کی طرف مُڑنے لگی۔

"اکیلے ہی...؟" عمران بوکھلا کر بولا۔ "اندھیرے میں؟"

وہ اُس کی طرف دیکھ کر مُسکرائی اور آگے بڑھتی چلی گئی۔

"مجھے اس لڑکی پر ترس آ رہا ہے۔" عمران نے ٹھنڈ سانس لی۔

"کیوں...؟" روشنی نے اُسے گھور کر پوچھا۔

"کچھ دیر بعد یہ بے چاری ڈاکٹر کی لاش کے پاس تنہا ہو گی"

"خاموش رہو۔" مسز گوہن خوفزدہ لہجے میں چیخی۔

"اس ڈبے میں کیا ہے؟" روشنی نے کچھ دیر بعد مسز گو سے پوچھا۔

"گُلوبند...!"

"مگر تم زیورات تو استعمال نہیں کرتیں۔"

"نہیں کرتی... لیکن یہ بہت مناسب وقت پر میرے پاس پہنچا ہے۔" مسز گوہن نے ڈبہ اُٹھا کر روشنی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا...

ڈبے میں قدیم مشرقی طرز کا ایک طلائی گلوبند تھا۔ عمران بھی دُور بیٹھا اُسے کن انکھیوں سے دیکھتا رہا۔

"دس سال پہلے کی بات ہے۔" مسز گوہن ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "ایک جوگی نے گوہن کو تحفتہً دیا تھا اور کہا تھا کہ یہ گلوبند جادوئی اثرات رکھتا ہے۔ اگر کسی عورت پر مصیبتوں کا نزول ہو رہا ہو تو وہ اس گلوبند کو پہن لینے کے بعد اُن سے محفوظ رہ سکتی ہے۔"

"ارے مجھے پہنا دو۔" عمران کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا۔ "ڈر کے مارے میرا دم نکلا جا رہا ہے۔"

"اس سے کہو خاموش رہے۔" مسز گوہن جھلا گئی اور عمران نے دونوں ہاتھوں سے اپنا مُنہ دبا لیا۔

"پہلے بھی اسے کبھی آزمایا ہے؟" روشنی نے پوچھا۔

"نہیں... میرے لیے تو یہ نوادر میں سے تھا۔ نوادر اکٹھا کرنے کا شوق بھی رکھتی ہوں... لیکن اب سوچتی ہوں کہ مجھے اسے استعمال کرنا چاہیے۔"

"ایک منٹ۔" عمران ہاتھ اُٹھا کر بولا۔ "یہ ڈاکٹر انگھم کے پاس کیسے پہنچا تھا...؟"

"میں کہتی ہوں تم دخل اندازی مت کرو۔" مسز گوہن بھڑک اُٹھی...

"یہ کام کی بات پوچھی ہے اُس نے۔" روشنی نے کہا۔ "میں بھی یہی سوال کرتی۔"

مسز گوہن کچھ دیر خاموش رہ کر بولی۔ "ایک ماہ پہلے کی بات ہے۔ انگھم اُس کی نقل تیار کرانے کے لیے مجھ سے عاریتاً لے گیا تھا..."

"کیا اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ یہ جادوئی اثرات کا حامل ہے؟" عمران نے پوچھا۔

"ہاں... جوگی کی کہی ہوئی بات میں سب کو بتاتی ہوں۔"

عمران نے ہونٹ بھینچ کر روشنی کی طرف دیکھا۔

"تو بہرحال اب تم اتنی پریشان ہو کہ اُس کی جادوئی حیثیت کو آزماؤ گی...!" روشنی نے کہا۔

"کیا یہ فطری امر نہ ہوگا۔ ایسے حالات میں آدمی موہوم سہاروں کی طرف بھی لپکتا ہے۔"

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم کیوں پریشان ہو؟"

مسز گوہن پھر جھنجلا کر کچھ کہنے ہی والی تھی کہ روشنی ہاتھ اُٹھا کر بولی۔ "اب یہ ڈھنگ کے سوالات کر رہا ہے اس لیے ہو سکتا ہے کہ تمھاری پریشانیاں رفع ہو جائیں۔"

"کیا مطلب...؟"

"بس یہی سمجھ لو کہ یہ بھی مجھے کسی جادوگر سے تحفتہً ملا تھا۔"

"میرا مذاق نہ اُڑاؤ...!" مسز گوہن مغموم لہجے میں بولی۔

"میں تمھیں دُشواریوں سے نکالنا چاہتی ہوں اسی لیے اُس کو ساتھ لائی تھی۔"

مسز گوہن کے چہرے پر کشمکش کے آثار تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ زبان کھولتے ہوئے ہچکچا رہی ہو...

"یقین کرو... ہم تمھارے لیے اپنی زندگیاں تک داؤ پر لگا دیں گے..." روشنی نے کہا۔

عمران نے گلوبند روشنی کے ہاتھ سے لے لیا تھا اور اُسے اُلٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ دفعتہً ایک مُلازم نے کمرے میں داخل ہو کر ہانپتے ہوئے کہا۔ "پولیس!" اس سے پہلے اُنھوں نے کسی گاڑی کی آواز سُنی تھی... مُلازم عمران کی طرف متوجہ تھا۔

"شاید وہ مجھے پوچھ رہے ہوں گے۔" عمران نے گلوبند کو پتلون کی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں۔" مُلازم نے جواب دیا۔ مسز گوہن بہت زیادہ بدحواس نظر آنے لگی تھی۔ مُلازم نے اس بار مسز گوہن کو مخاطب کر کے کہا۔ "پولیس آفیسر آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"

"اچھا... اچھا... اسے اندر لے آؤ۔"

عمران جانتا تھا کہ فیاض کے علاوہ اور کوئی نہ ہوگا۔ رچرڈسن کی موت کے سلسلے میں ظفر اور جیمسن کے نام بھی اُس تک پہنچے ہوں گے اور وہ پہلے انگھم کے پاس گیا ہوگا۔ اس کے بعد ادھر کا رُخ کرنا لازمی ٹھہرا...

"مم... میں ذرا ہاتھ رُوم...!" عمران نے روشنی کی طرف دیکھ کر کہا اور کمرے سے نکل گیا... مُلازم باہر جا چکا تھا۔ روشنی نے ذرا ہی دیر بعد کیپٹن فیاض کو کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا اور حیرت ظاہر کرنے کی بجائے زبردستی اپنے لہجے میں چہکار پیدا کرتی ہوئی آگے بڑھی...

"ہیلو کیپٹن... ہاؤ ڈو یو ڈو...!"

"ہوں تو آپ بھی ہیں۔" فیاض نے پھیکی سی مُسکراہٹ کے ساتھ کہتے ہوئے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

روشی نے مسز گوہن سے اُس کا تعارف کرایا۔

"میں ڈاکٹر النگھم کے پاس سے آ رہا ہُوں۔" فیاض بولا۔

"مم مجھے اطلاع مِلی ہے کہ اس پر بھی اسی پُراسرار ہاتھ نے حملہ کیا تھا۔" مسز گوہن کی آواز کانپ رہی تھی۔

"مجھے صرف ان دو آدمیوں سے سروکار ہے جنھیں ڈاکٹر النگھم نے درخت سے اُلٹا لٹکا رکھا تھا..." فیاض، روشی کی طرف دیکھتا ہُوا بولا...

"ڈاکٹر النگھم نے جسے اُلٹا لٹکا رکھا تھا۔ وہ یہیں ہے۔" روشی نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

"میں جیمسن اور ظفرالملک کی بات کر رہا ہُوں...!"

"میں اُن کے بارے میں کچھ نہیں جانتی...!"

"کیا یہ دونوں آپ کے پُرانے شناسا ہیں مسز گوہن...!" فیاض اُس کی طرف مُڑا...

"میرے لیے دونوں نام نئے ہیں۔"

"میں مس روشی اور مسٹر علی عمران کی بات کر رہا ہُوں۔"

"روشی سے پُرانے تعلقات ہیں۔ مسٹر علی عمران پہلی بار یہاں آئے ہیں۔"

اِتنے میں عمران ڈرائنگ رُوم میں داخل ہُوا۔ وہ لباس تبدیل کر چکا تھا اور ایک شریف آدمی کی طرح فلٹ ہیٹ بھی سر پر جما رکھی تھی۔ اندر پہنچ کر فلٹ ہیٹ اُتارتا ہُوا کسی قدر خم ہُوا... اور پھر سیدھا کھڑا ہو کر اُس اسٹینڈ کی طرف بڑھا جس پر ٹوپیاں لٹکائی جاتی تھیں۔ فلٹ ہیٹ بڑے سلیقے سے لٹکا کر فیاض کی طرف مُڑا۔

"تم کیا کرتے پھر رہے ہو؟" فیاض غرّایا۔

"جس راستے پر تم نے ڈالا ہے آنکھ بند کر کے دوڑا جا رہا ہُوں...!"

"کیا مطلب...؟"

"یہ پھر بتاؤں گا۔ فی الحال تم یہاں اپنی آمد کا مقصد بتاؤ۔"

"ظفرالملک اور جیمسن...!"

"وہ دونوں مجھے اُلٹا لٹکا کر فرار ہو گئے!" عمران بائیں آنکھ دبا کر مسکرایا...

"سوال یہ ہے کہ رچرڈسن کے گھر اُن کی موجودگی کا کیا مقصد تھا...؟"

"وہ دونوں وہاں ہپی مُراد کی تلاش میں گئے تھے!"

"کیوں...؟"

"میں نے اُن سے کہا تھا کہ وہ کسی ایسے آدمی کو تلاش کریں جس کی آواز کیپٹن فیاض کی آواز سے ملتی جلتی ہو اور اگر تم ڈاکٹر النگھم کے گھر سے آ رہے ہو تو تم نے محسوس کیا ہو گا کہ ہپی مُراد [illegible] تمھاری ہی طرح بولتا ہے۔"

"میں نے دھیان نہیں دیا۔" فیاض نے بُرا سا مُنہ بنا کر کہا۔ "ڈاکٹر النگھم ان دونوں کو اپنے ساتھ یہاں کیوں لایا تھا... اُس نے اُنھیں پولیس کے حوالے کیوں نہیں کر دیا تھا؟"

"میں نہیں جانتا۔"

"تو پھر یہاں کیوں آئے ہو؟"

"نیلے ہاتھ کی کہانی سُننے اور ان دونوں سے متعلق [illegible] حاصل کرنے...!"

"نیلا ہاتھ ڈاکٹر النگھم کی طرف جھپٹا تھا اور وہ دونوں [illegible] مجھے درخت سے اُلٹا لٹکا کر میری گاڑی لے بھاگے۔"

"آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" مسز گوہن نے خوفزدہ [illegible] دخل اندازی کی...

"میں رچرڈسن کی موت سے متعلق تفتیش کر رہا ہُوں۔ [illegible] ہُوا ہے، رچرڈسن اور متوفی فوجی اتاشی دونوں ہی آپ کے دو[illegible] تھے اور یہاں آتے رہتے تھے۔"

"جی ہاں... وہ میرے دوست تھے...!"

"ریناولیمز کے بارے میں آپ کیا جانتی ہیں؟"

"بس یہی کہ وہ کرنل کی سیکریٹری تھی۔"

"آخری بار آپ اُس سے کب مِلی تھیں؟"

"کوئی پندرہ دن پہلے کی بات ہے۔"

"کیا آپ کو کرنل نے بتایا تھا کہ وہ اُس کے کچھ کاغذات لے بھاگی ہے؟"

"پندرہ دن پہلے دونوں ساتھ ہی یہاں آئے تھے۔ اس کے بعد کسی سے بھی میری مُلاقات نہیں ہُوئی تھی۔"

"ہُوں... اب تم میرے ساتھ آؤ۔" فیاض نے عمران سے کہا۔

"برآمدے سے آگے نہ جا سکوں گا...!"

"کیوں...؟"

"میں یہاں چھٹیاں گزار رہا ہُوں کیونکہ سلیمان کے [illegible] پُورے کرنے کے قابل نہیں رہا... آج آٹا ختم... کل گھی ختم اور پرسوں مُونگ کی دال...!"

"میں تم سے صرف اس ہاتھ کے بارے میں پُوچھنا چاہتا ہوں۔ تم اُس وقت النگھم کے پاس ہی موجود تھے جب اُس پر [illegible] ہُوا تھا؟"

"اب کیسی طبیعت ہے اُس کی...؟"

"بُری طرح نروس ہے۔"

"میں نے دیکھا تھا... وہ صرف ایک ہاتھ تھا، جو النگھم پر حملہ کرنے کے بعد فضا میں تیرتا ہُوا باہر پھیلے ہُوئے اندھیرے میں گم ہو گیا تھا۔"

"صرف ہاتھ...؟"

"صرف ہاتھ کیپٹن فیاض... کہنی تک لمبا ہاتھ... کوٹ کی آستین نُما غلاف میں...!"

"کِس سمت گیا تھا...؟"

"برآمدے سے آگے میں اُسے دیکھ ہی نہیں سکا تھا۔"

"کیا تم سچ مچ اتنے خائف تھے کہ تمھارا دماغ اُلٹ گیا تھا؟"

"بہت ہی ذاتی قسم کا سوال ہے۔ اِس کا جواب تمھاری رپورٹ میں درج کرانے سے میرا مستقبل تباہ ہو سکتا ہے۔"

اچانک اُنھوں نے مسز گوہن کی چیخ سُنی اور اُس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں اور ہاتھ اُس اسٹینڈ کی طرف اُٹھا ہُوا تھا جس پر عمران نے فلٹ ہیٹ لٹکائی تھی۔ وہ ادھر ہٹے... نیلا ہاتھ عمران کی فلٹ ہیٹ اپنے پنجے میں جکڑے ہُوئے کھڑکی سے باہر جا رہا تھا۔

"چلو...!" عمران فیاض کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہُوا دروازے کی طرف جھپٹا...

وہ باہر پہنچے تھے لیکن وہ ہاتھ کہیں نہ دکھائی دیا۔

"جتنی جلد ممکن ہو النگھم تک پہنچو..." عمران فیاض کو جھنجوڑ کر بولا...

اب اُن کی گاڑی تیز رفتاری سے النگھم کے فارم کی طرف جا رہی تھی... عمارت کے پاس پہنچ کر جیسے ہی فیاض نے بریک لگائے عمران سیٹ سے کُود کر برآمدے کی طرف جھپٹا۔ فیاض اور اُس کے دونوں ماتحت بھی بالکل اُسی کے سے انداز میں عمارت کی جانب بڑھے تھے۔

"ڈاکٹر... ڈاکٹر۔" عمران آوازیں دیتا ہُوا اندر گھُستا چلا گیا۔

"کیا ہے؟ تم پھر دکھائی دیے۔" ڈاکٹر سامنے آ کر دھاڑا۔

اِتنے میں فیاض اور اُس کے ماتحت بھی وہاں پہنچ گئے۔

"مم... مسز گوہن...!"

"کیا ہُوا مسز گوہن کو؟"

"نن... نیلا ہاتھ...!"

چھوٹا قد کیوں؟ کیا آپ کا قد چھوٹا ہے؟ تو پھر کیوں نہ او کسم سے فائدہ اٹھائیں اِس سے قد چار انچ تک بڑھ سکتا ہے۔
قیمت =/۵۰ روپے

موٹاپے سے نجات پائیں کمر، پیٹ کولہے یا جسم کے کسی بھی حصے کا موٹاپا اور وزن ختم کرنا اور جسم کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسمارٹ بنانا چاہتے ہیں تو ویٹ لیس گولیوں سے فائدہ اٹھائیں۔
قیمت =/۵۰ روپے

موٹے نظر آئیں :- آپ کے جسم کا کوئی ایک حصہ یا سارا جسم پتلا ہے اور آپ کو مناسب اور تنومند جسم کی خواہش ہے تو ویٹو سے بہت کم عرصے میں آپ اپنی یہ خواہش پوری کر سکتے ہیں۔
قیمت =/۵۰ روپے

کیل چھائیاں ختم آپ کے خوبصورت چہرے کو کیل چھائیوں یا داغ دھبوں نے بدصورت بنا رکھا ہے اور آپ ان سے ہمیشہ کے لئے نجات چاہتے ہیں تو صافون استعمال کریں رنگ بھی گورا کرتی ہے۔ آزمودہ ہے
قیمت =/۵۰ روپے

صحت اور تندرستی بچپن کی لغزشوں یا جوانی کی بداعتدالیوں کا شکار افراد ہیلتھین سے کھوئی ہوئی خوشیاں واپس لا سکتے ہیں۔
قیمت =/۵۰ روپے

چہرے کے فاضل بالوں سے نجات جن خواتین کے چہروں پر فاضل بال اُگ آئے ہیں۔ وہ ان سے مکمل اور ہمیشہ کیلئے نجات چاہتی ہیں تو بالین سے فوراً فائدہ اٹھائیں آزمودہ ہے۔
قیمت =/۵۰ روپے

پرکشش نظر آئیے بعض خواتین شدید خواہش اور کوشش کے باوجود سینے کے متناسب اور جاذبِ نظر ابھاروں سے محروم رہتی ہیں اِس محرومی کا علاج بریسٹین میں ہے۔ قیمت =/۵۰ روپے
نیز مخصوص نسوانی شکایات اور عارضوں میں مبتلا خواتین نسوانین منگوا کر استعمال کریں پرانی سے پرانی شکایات بھی ختم ہو جائیں گی
قیمت =/۴۰ روپے

نوٹ: مکمل افاقے کے لئے مکمل کورس استعمال کریں۔ ہر دوا کا مکمل کورس صرف/96 روپے میں دستیاب ہے خط لکھ کر منگوالیں۔ مکمل کیفیت جوابی لفافے کے ساتھ لکھیں۔

آئینۂ صحت پوسٹ بکس 6023 کراچی ۲

"نہیں... " ڈاکٹر بوکھلائے ہُوئے انداز میں چیخا پھر آگے بڑھ کر عمران کو جھنجوڑتا ہُوا بولا۔ "مجھے کوئی بُری خبر نہ سُنانا۔"

"نن... نیلا... ہاتھ۔"

"میرے خُدا...!" ڈاکٹر دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر کُرسی پر گِر گیا۔

فیاض متحیّرانہ نظروں سے دونوں کو دیکھے جا رہا تھا۔ اچانک عمران نے زوردار قہقہہ لگایا اور ڈاکٹر اُچھل پڑا... پھر مُٹھیاں بھینچ کر عمران کی طرف بڑھتا ہُوا غرّایا۔ "چلے جاؤ یہاں سے پاگل آدمی ورنہ ٹھوکریں مار مار کر ختم کر دُوں گا۔"

"پُوری بات تو سُن لو... نیلا ہاتھ میری فلٹ ہیٹ لے گیا۔ مسز گوہن بالکل بخیریت ہے۔"

"یہ کیا بکواس کر رہا ہے؟" ڈاکٹر فیاض کی طرف دیکھ کر دھاڑا۔

"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔" فیاض نے سرد لہجے میں کہا۔

"تو پھر میں کیا کرُوں؟"

"میں تمھیں صرف یہ بتانے آیا ہُوں ڈاکٹر... کہ جس طرح وہ تمھارا پائپ لے گیا تھا اُسی طرح میری فلٹ ہیٹ بھی لے گیا۔"

"پپ... پائپ... کیا بکواس ہے؟"

"مَیں نے دیکھا تھا ڈاکٹر... وہ تمھارے مُنہ سے پائپ ہی نکال لے گیا تھا۔"

اِتنے میں ہپّی مُراد بول پڑا۔ "ہاں... ہاں... میرا خیال ہے کہ مَیں نے بھی یہی دیکھا تھا۔"

"تم چُپ رہو...!" ڈاکٹر اس پر اُلٹ پڑا۔

"نہیں... اسے بولنے دو۔" عمران سرد لہجے میں بولا۔ "تم سب چلے جاؤ یہاں سے... مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔"

"تمھارا پائپ گیا جہنّم میں۔" عمران جھلاّہٹ کا مظاہرہ کرتا ہُوا بولا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مسز گوہن کو کیسے مُنہ دکھاؤں گا۔"

"کیا مطلب...؟"

"تم نے اُسے جو گلوبند بھجوایا تھا، مَیں نے اپنی فلٹ ہیٹ کے چرمی استر میں رکھ دیا تھا۔"

دفعتہً پُشت سے ایک نسوانی آواز آئی۔ "اپنے ہاتھ اُوپر اُٹھاؤ...!"

وہ چونک کر مُڑے... ڈاکٹر کی سیکریٹری کورنیلیا ٹامی گن سنبھالے کھڑی تھی... ڈاکٹر کے علاوہ اور سب کے ہاتھ اُٹھ گئے... اور ڈاکٹر نے غصیلی آواز میں لڑکی سے کہا۔ "اتنی جلد بازی کی کیا ضرورت تھی...؟"

"کھیل ختم ہو چکا ہے۔" لڑکی بولی۔ "یہ بُزدل چھپا [illegible] اب انھیں ختم ہی کر دینا بہتر ہوگا۔"

"نہیں... بہتر طریقہ یہ ہوگا... کہ ان کا علاج کر کے انھیں واپس کر دیا جائے ورنہ یہاں سے بھاگنا پڑے گا۔" ڈاکٹر نے [illegible] نرم لہجے میں کہا...

"یہ سب کیا ہو رہا ہے... مَیں تو نہیں سمجھ سکتا۔" ہپّی مُراد بھرّائی ہُوئی آواز میں بولا... اُس نے ابھی تک ہاتھ نہیں اُٹھائے تھے۔

"تم بھی اپنے ہاتھ اُٹھاؤ۔ سب کا علاج ہوگا۔" ڈاکٹر نے اُس [illegible] کر کہا۔

اچانک پھر ایک نسوانی آواز آئی... "ٹامی گن زمین پر ڈال دو... ورنہ ریوالور کی گولی تمھارے دل میں سُوراخ کر دے گی۔"

کورنیلیا کے پیچھے روشنی کھڑی نظر آئی تھی۔ اُس کے ہاتھ سے ٹامی گن چھوٹ پڑی لیکن دوسرے ہی لمحے میں ڈاکٹر النگھم نے اُس پر حملہ کرنے کے لیے چھلانگ لگائی...

عمران نے بھی دیر نہیں لگائی تھی... مگر وہ بھی اُس پر ہاتھ نہ ڈال سکا کیونکہ دونوں کے سر آپس میں ٹکرا کر رہ گئے تھے... روشنی نے کورنیلیا کے بال مُٹھی میں جکڑ کر جھٹکا جو دیا تو وہ دُور جا گری... فیاض اور اُس کے ماتحت ڈاکٹر النگھم پر ٹوٹ پڑے تھے... لیکن ٹھیک اُسی وقت جب ٹامی گن عمران کے ہاتھ میں آئی۔ ڈاکٹر ان تینوں کو جھٹک کر دوسرے کمرے میں جا گھسا... دروازہ زوردار آواز کے ساتھ بند ہُوا تھا اور بولٹ سرکنے کی بھی آواز آئی تھی۔ عمران نے بند دروازے پر ٹامی گن سے فائر شروع کر دی... دوسری طرف روشنی نے کورنیلیا کو قابو میں لے کر اُس کے مُنہ پر تھپّڑوں کی بارش کر دی تھی...

دروازے میں سُوراخ ہوتے رہے... ادھر سے اس کمرے میں پہنچنے کے لیے کوئی اور راستہ نہیں تھا... فیاض نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ وہ باہر نکل کر عمارت سے نکاسی کے راستوں کی نگرانی کریں...

"تم اسے نہیں پا سکو گے۔" دفعتہً کورنیلیا چیخی۔ "وہ ذرا سی دیر میں تم سب کو فنا کر دے گا۔"

روشنی اُسے بُری طرح رگڑے ڈال رہی تھی۔ عمران نے اُس سے کہا۔ "اس کے ہاتھ پُشت پر باندھ دو۔"

"تمھاری مدد کے بغیر یہ ناممکن ہے۔" روشنی نے جواب دیا۔

"فیاض... دیکھو...!" کہتا ہُوا عمران باہر نکل گیا۔

فیاض کی مدد سے روشنی نے کورنیلیا کے ہاتھ رُومال سے

باندھ دیے...

وہ چیخے جا رہی تھی... "اگر مجھے کوئی گزند پہنچی تو ڈاکٹر پُورے شہر کو اُڑا دے گا۔ تم اب اُسے نہیں پا سکتے۔" پھر وہ پاگلوں کی طرح ہنسنے لگی تھی۔

فیاض نے روشنی سے کہا۔ "تم اسے مسز گوہن کے گھر لے جاؤ۔ ہم ابھی آ رہے ہیں۔"

"مَیں اس قسم کا کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتی کیپٹن... بہتر ہوگا کہ اسے فی الحال اپنی گاڑی میں ڈال لیں اور مَیں یہیں ٹھہر کر... اس کی نگرانی کرتی رہوں گی۔ ویسے میرے پاس ریوالور نہیں ہے وہ فاؤنٹین پن تھا...!"

"آخر اسی خبط الحواس کی تربیت کردہ ہو... اچھی بات ہے اسے گاڑی تک لے چلو...!"

روشنی اُسے دھکیلتی ہُوئی باہر لائی لیکن ابھی گاڑی کا دروازہ بھی نہیں کھول پائی تھی کہ کسی طرف سے اچانک فائر ہُوا۔ گولی فیاض کی گاڑی پر لگی تھی۔

"لیٹو... لیٹ جاؤ۔" فیاض دونوں کو زمین پر گراتا ہُوا بولا... اور خود بھی اُن کے قریب ہی گِر گیا...

روشنی نے لڑکی کا مُنہ دبا رکھا تھا اور وہ بُری طرح مچل رہی تھی۔ فائر پھر ہُوا... اس بار بھی گولی گاڑی ہی پر لگی تھی پھر ٹامی گن گڑگڑائی... شاید عمران نے فائروں کے رُخ کا اندازہ کر کے کسی طرف فائروں کی بوچھاڑ کی تھی۔ اس کے بعد سنّاٹا چھا گیا...

"چُپ چاپ پڑی رہنا۔" فیاض نے سرگوشی کی۔

یہ تینوں گہرے اندھیرے میں تھے۔ روشنی نے عمارت سے نکلتے وقت برآمدے کی لائٹ آف کر دی تھی ورنہ وہ اس جگہ قطعی محفوظ نہ ہوتے...

ہپّی مُراد برآمدے میں کھڑا چیخ رہا تھا۔ "ارے سب کہاں گئے...؟"

اور پھر شاید ڈاکٹر النگھم کے مُلازموں نے بھی چیخنا شروع کر دیا تھا۔

"بس اب نکل چلو۔" فیاض اُٹھتا ہُوا بولا... پھر دونوں نے لڑکی کو کھینچ کر پچھلی سیٹ پر ڈالا اور روشنی بولی۔ "بس تم جاؤ۔ مَیں اسے یہاں تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔"

"بچّوں کی سی باتیں نہ کرو... بیٹھ جاؤ۔ مَیں ڈرائیو کروں گا۔ کہیں یہ کوئی خطرناک حرکت نہ کر بیٹھے۔ صرف ہاتھ ہی تو بندھے ہُوئے ہیں۔ مَیں نہیں چاہتا کہ النگھم کے خلاف یہ شہادت بھی ضائع ہو جائے۔"

"تم اس کے خلاف مجھ سے ایک لفظ بھی نہ کہلوا سکو گے...!" لڑکی چیخی...

بالآخر روشنی کو پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر دوبارہ اُس کا مُنہ دبانا پڑا۔ کار اسٹارٹ ہو کر مسز گوہن کے فارم کی طرف مُڑی۔ شاید ابھی چوتھائی راستہ بھی طے نہ کیا ہو گا کہ بائیں جانب والی جھاڑیوں کے سلسلے سے ایک فائر ہُوا اور گاڑی کا پچھلا ٹائر دھماکے کے ساتھ برسٹ ہو گیا۔ گاڑی روک دینی پڑی۔ ساتھ ہی فیاض بغلی ہولسٹر سے ریوالور نکالتا ہُوا دوسری طرف اُتر گیا۔ روشنی بھی اتنی احمق نہ تھی کہ بیٹھی ہی رہ جاتی۔ لڑکی نے یہ احوال دیکھے تو پھر چیخنے لگی لیکن اس کے بعد کوئی فائر نہ ہُوا... روشنی اور فیاض گاڑی سے کچھ اور دُور کھسک کر جھاڑیوں میں جا چھپے تھے۔ تاروں کی چھاؤں میں گاڑی نظر آ رہی تھی۔ اس کے آس پاس کوئی موجود ہوتا تو وہ بھی دکھائی دے جاتا لیکن روشنی سوچ رہی تھی کہ اگر کوئی مخالف سمت سے گھٹنوں کے بل چلتا ہُوا گاڑی تک پہنچے تو اُنھیں کانوں کان خبر نہ ہوگی۔ اُس نے آہستہ سے اپنا خیال فیاض پر بھی ظاہر کر دیا لیکن فیاض بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔

⁂

فائر اور ٹائر پھٹنے کی آواز ہی نے عمران کو اس طرف متوجّہ کر دیا تھا۔ اُس نے اپنا رُخ بدل دیا۔ اس سے پہلے وہ گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز بھی سُن چُکا تھا۔ پھر وہ ٹھیک اس وقت وہاں پہنچا جب ایک متحرّک سایہ جُھکا ہُوا فیاض کی گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ عمران ٹامی گن کو صرف ایک ہاتھ سے سنبھالے ہُوئے سینے کے بل رینگتا ہُوا سائے کی طرف بڑھنے لگا۔

گاڑی سے سائے کا فاصلہ بمشکل ایک فٹ رہ گیا ہوگا کہ عمران نے اُس کے سر پر ٹامی گن کے دستے سے وار کیا جو انداز کی ذرا سی غلطی کی بِنا پر خالی گیا۔ سایہ اُلٹ کر اس سے لپٹ پڑا تھا۔ ٹامی گن عمران کے ہاتھ سے چھُوٹ پڑی۔

"النگھم تم بچ نہیں سکتے۔ جدّوجُہد فضول ہے۔" عمران نے اُس کی گرفت کا توڑ کرتے ہُوئے کہا۔

"گھبرانا نہیں... مَیں موجود ہُوں...!" دوسری طرف سے فیاض کی آواز آئی اور النگھم کا حملہ پہلے سے بھی شدید ہو گیا۔ یہ دونوں تو گُتھے ہی ہُوئے تھے۔ فیاض بھی النگھم سے چمٹ گیا۔

"تم ہٹ جاؤ فیاض...!" عمران بولا۔

"بے وقوفی کی باتیں نہ کرو۔" فیاض نے کہا۔

حالانکہ حماقت فیاض ہی سے سرزد ہوئی تھی۔ لپیٹ پڑنے کی بجائے اُسے ریوالور کی دھمکی سے الگ کرنے کی کوشش کرنی چاہیے تھی لیکن فتح کا سہرا اپنے سر باندھنے کے جوش میں اُس نے عقل ہی رُخصت کر دی... پھر وہی ہُوا جیسا کہ ایسے حالات میں ہوتا ہے... عمران کی گرفت کسی قدر ڈھیلی پڑی ہی تھی کہ وہ دونوں کی گرفت سے نکل گیا۔ روشی نے اُسے گاڑی کے پیچھے والی جھاڑیوں میں چھلانگ لگاتے دیکھا تھا۔ اس طرف جھاڑیوں کا سلسلہ دُور تک پھیلتا ہُوا گنّے کے کھیتوں سے جا ملا تھا۔ ذرا دیر تلاش جاری رہی پھر عمران نے گردن جھٹک کر کہا۔ "جہنم میں جائے۔ مجھے کیا۔ میں تو صرف ظفر الملک کی صفائی پیش کرنا چاہتا تھا وہ کر چکا۔"

کچھ دیر بعد وہ سب روشی کی گاڑی میں مسز گوہن کی... رہائش گاہ تک پہنچے تھے۔ فیاض کے دونوں ماتحت بھی ساتھ تھے... ہپّی مُراد نجانے کدھر نکل بھاگا تھا۔ کورنیلیا کے ہاتھ اب بھی پُشت پر بندھے ہوئے تھے۔ عمران نے اُس کا بازو پکڑ کر فیاض کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "اب اس سے خود ہی پوچھ لو کہ یہ ظفر الملک اور جیمسن کو کب سے جانتی ہے؟"

"کیا مطلب؟"

"اسی کے لیے تم نے مجھے دھوکا دیا تھا۔ خود ہی شاہ آباد کے اسٹیشن انچارج کو فون پر ہدایت دی کہ دونوں کو چھوڑ دیا جائے اور پھر مُکر گئے۔ مقصد یہی تھا کہ ان دونوں کو کسی سازشی گروہ سے متعلق ثابت کر کے مجھے اس کیس میں پوری طرح دلچسپی لینے پر مجبور کر دو..."

"لیکن یہ رینا ولیمز تو نہیں ہے۔" فیاض بے ساختہ بولا۔

"دل کی آنکھوں سے دیکھو عزیز از جان کپتان"... عمران بائیں آنکھ دبا کر بولا...

"مت بکواس کرو...!"

"اسے لیبارٹری میں لے جا کر اس کے بال کیمیکلز سے دُھلواؤ۔ سیاہ خضاب اُتر جائے گا اور آخروٹ کی رنگت کے سے بال نکل آئیں گے۔ پھر ناک کے نتھنوں پر چپکے ہوئے پلاسٹک کے ٹکڑوں پر بھی دھیان دینا... میرا کام ختم... رینا ولیمز ہی کے لیے تو تم نے مجھے اس راہ پر ڈالا تھا۔"

گفتگو اُردو میں ہو رہی تھی۔ دفعتہً فیاض نے لڑکی سے پُوچھا۔ "تم رینا ولیمز ہو...؟"

"نہیں..." وہ حلق پھاڑ کر چیخی اور عمران بے تحاشہ ہنس پڑا... پھر بولا۔

"رچرڈسن کے یہاں ان دونوں کو دیکھ کر تم چکّر میں پڑ گئی تھیں۔ اسی لیے انھیں پولیس کے حوالے کر دینے کی بجائے اپنے ساتھ یہاں لائی تھیں۔ کیا النگھم انھیں لٹکا کر یہی نہیں پُوچھتا رہا تھا... کہ کیا وہ تمھیں جانتے ہیں۔"

"اوہ..." وہ مٹھیاں بھینچ کر چیخی۔ "میں نہیں جانتی تھی کہ تم اتنے خبیث ہو۔ ورنہ سب سے پہلے تمھارا ہی خاتمہ کر دیا جاتا۔"

"جس طرح کرنل کا خاتمہ کیا تھا... کیوں! بس ایک ننھی سی زہریلی سُوئی کافی ہوتی..."

"یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ خُدارا مجھے بتاؤ۔" مسز گوہن کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

"کہانی کا پہلا حصّہ تو تم ہی سُناؤ گی مسز گوہن۔"

"وہ... وہ... ہاتھ...!"

"وہ ہاتھ میرا فلٹ ہیٹ اس لیے لے گیا کہ میں نے اُس کے استر میں تمھارا طلسمی گلوبند چھپا دیا تھا۔ اگر وہ تمھارے گلے میں پڑا ہوتا تو تم اِس وقت فرش پر پڑی ہوتیں۔ وہ ہاتھ جتنی قوت سے چیزوں کو گرفت میں لیتا ہے۔ وہ گلا گھونٹنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہو؟" فیاض اُسے گھورتا ہُوا بولا۔

"وہ ریڈیائی لہروں کے ذریعے اپنے ریسیور تک پہنچایا جاتا ہے اور ریسیور کو گرفت میں لے کر اس سمیت اپنے مستقر کو روانہ ہو جاتا ہے۔ النگھم کے پائپ میں کوئی ننھا سا ریسیور موجود تھا۔ ویسا ہی ریسیور اُس نے مسز گوہن کے گلوبند میں ٹانک کر واپس کیا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا اس پریشانی کے عالم میں مسز گوہن اُسے فوری طور پر پہن لے گی۔"

عمران پَل بھر کے لیے رُک کر فیاض کو گلوبند کی طلسم [illegible] کی کہانی سُنانے لگا پھر بولا۔ "النگھم نے اس ہاتھ کو آدمیوں پر آزمانے سے پہلے مسز گوہن کے بندروں پر آزمایا تھا۔ [illegible] کی کامیابی کا یقین ہو جانے کے بعد رچرڈسن کا نمبر آیا [illegible] چونکہ مسز گوہن خود النگھم کی طرف سے مشتبہ ہو گئی تھیں اس لیے اُس نے انھیں ختم کر دینے سے پہلے وہ ہاتھ خود [illegible] اس طرح کہ وہ صرف اس کا پائپ لے جا سکے۔ یہ ڈرامہ [illegible] ہپّی مُراد کی موجودگی میں کھیلا گیا تاکہ سند رہے اور وقت [illegible] کام آئے۔ ہپّی مُراد بے چارہ ان حالات سے بے خبر [illegible] کی آواز ضرور تمھاری ہی سی ہے، لیکن لہجہ بالکل مختلف [illegible] ہے۔ وہ خواہ مخواہ ہمارے شبہات کا شکار رہا۔"

عمران کے خاموش ہوتے ہی فیاض، مسز گوہن کی طرف مُڑا... "آپ کو کس بات کا شبہ تھا اس پر؟"

"مم... میں مجبور ہُوں۔ اس سلسلے میں کچھ بھی نہ بتا سکوں گی"

"تو گویا آپ ایک مُجرم کا تحفظ کرنا چاہتی ہیں!"

"یہ بات نہیں... میں اپنی تنظیم کے سربراہ کی اجازت کے بغیر ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکال سکتی۔"

"اوہو..." عمران اُسے گھورتا ہُوا بولا... "تو النگھم کسی دوسری تنظیم سے متعلق تھا۔"

"یقیناً... یہ تو اب ظاہر ہُوا ہے ورنہ پہلے یہی سمجھا جاتا تھا کہ وہ ہم ہی میں سے ہے۔"

"کرنل اور رچرڈسن آپ کی تنظیم سے متعلق تھے؟"

"ہاں... اس حد تک میں بتا سکتی ہُوں کہ رینا اور النگھم کی چوری چھپے مُلاقاتوں سے میں نے یہی اندازہ لگایا تھا۔ میں نے کرنل کو اس سے مطلع کیا تھا اور وہ رینا پر کڑی نظر رکھنے لگا تھا۔ النگھم نے تو یہی ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی کہ عورت اُس کی کمزوری ہے لیکن وہ درپردہ کچھ اور تھا۔ رینا ولیمز حقیقتاً النگھم ہی کی تنظیم سے تعلق رکھتی تھی۔ اچانک ایک دن یہ ہماری تنظیم سے متعلق کچھ اہم کاغذات کرنل کی تحویل سے اُڑا کر غائب ہو گئی۔ کرنل پہلے تو خود اُسے تلاش کرتا رہا پھر مقامی پولیس سے مدد کا طالب ہُوا... اس کے بعد کیا ہُوا، آپ جانتے ہی ہیں...!"

"لیکن رچرڈسن اور آپ کیوں؟"

"غالباً وہ یہاں کی تنظیم کے سارے ارکان کو اسی طرح ختم کر دینا چاہتا تھا۔"

"بہرحال دو تنظیموں کے جھگڑے کی بنا پر یہاں دو قتل ہُوئے ہیں۔ اِس لیے دونوں ہی ملزم گردانی جائیں گی۔" فیاض بول پڑا...

"یقین کیجیے، میں ایک محبِ وطن عیسائی عورت ہُوں، یہاں کی شہریت رکھتی ہُوں اور یہی میرا وطن ہے، میری تنظیم بھی مُلکی مفاد کے خلاف کچھ نہیں کر رہی۔"

"لیکن... یہ جھگڑا بھی غیر قانونی ہے۔"

"کیپٹن فیاض۔" دفعتہً عمران نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ "ملزمہ رینا یہاں موجود ہے تم اسے لے جا سکتے ہو۔"

"مسز گوہن...!"

"نہیں... مسز گوہن کو یہاں سے کوئی ہلا بھی نہیں سکتا... اتنا یاد رکھو... اگر میں تمھاری مدد نہ کرتا تو رینا ولیمز تمھارے ہاتھ نہیں لگ سکتی تھی... اسے لے جاؤ۔ مسز گوہن کا ذکر تک تمھاری رپورٹ میں نہ آنا چاہیے۔ رینا سے اُس کی تنظیم کے بارے میں تم بہت کچھ معلوم کر سکو گے۔" عمران نے کہتے کہتے اچانک رینا پر چھلانگ لگائی، ساتھ ہی ایک فائر بھی ہُوا تھا۔ گولی سامنے والی الماری کا شیشہ توڑ گئی...

پھر وہ رینا پر سے اُچھل کر دروازے کی طرف لپکا۔ اتنے میں پھر ایک فائر ہُوا اور باہر سے ایک چیخ سُنائی دی۔ فیاض بھی بوکھلا کر باہر نکل آیا۔ تھوڑے ہی فاصلے پر اُس کا ایک ماتحت زخمی پڑا تھا۔ اُس کے دائیں بازو پر گولی لگی تھی اور دُوسرا اُسے اُٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اُس نے کھڑکی سے اندر فائر کیا تھا!" دُوسرا ماتحت اُسے چھوڑ کر اُٹھتا ہُوا بولا۔ "ہم پُوری طرح چوکس تھے جناب، اُسے پکڑنا چاہا لیکن وہ دوسرا فائر کر کے بھاگ گیا۔"

فیاض بے بسی سے چاروں طرف اندھیرے میں گھورنے لگا... عمران کا کہیں پتہ نہ تھا... روشی بھی باہر نکل آئی۔ فیاض کا زخمی ماتحت اُٹھ بیٹھا تھا۔

"اُس نے رینا پر فائر کیا تھا۔" روشی بھرّائی ہُوئی آواز میں بولی۔ "وہ پاگل کسی دن اپنی جان ضرور گنوائے گا۔"

"چلو... اندر چلو...!" فیاض نے اپنے زخمی ماتحت کو سہارا دے کر آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

ابھی تک وہ فورس نہیں پہنچی تھی جس کے لیے اُس نے مسز گوہن کے یہاں سے ہیڈ کوارٹر کو فون کیا تھا۔ رینا فرش پر بیٹھی سسکیاں لے رہی تھی۔

فیاض نے اُس کی طرف توجہ دیے بغیر ٹامی گن اُٹھائی اور باہر نکل کر برآمدے کی لائٹ آف کر دی۔ اس کے بعد وہ برآمدے ہی میں ٹھہرا رہا تھا...

"اُس نے تمھیں مرنے سے بچا لیا۔" روشی نے رینا کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "کیا تم بتا سکو گی کہ ڈاکٹر النگھم رُوپوشی کے لیے کہاں جائے گا؟"

"میں نہیں جانتی۔ جانتی ہوتی تب بھی نہ بتاتی۔ کیا تم ذرا دیر کے لیے میرے ہاتھ نہیں کھول سکتیں؟"

"ہرگز نہیں... میں تمھیں خودکشی نہیں کرنے دُوں گی۔"

"لیکن کوئی میری زبان بھی نہیں کھلوا سکے گا۔" رینا ولیمز نے طویل سانس لے کر کہا۔

مسز گوہن بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی۔ اچانک چونک پڑی اور اُٹھ کر فون پر کسی کے نمبر ڈائل کرنے لگی۔

"ہیلو...!" اُس نے ماؤتھ پیس میں کہا۔ "میں مسز گوہن بول رہی ہوں۔ انگھم ہی کالی بھیڑ ثابت ہوا... سب کو مطلع کردو کہ اب کوئی ٹائی کی گرہ پر اسٹار نہ لگائے، ورنہ رچرڈسن ہی کی طرح موت کے گھاٹ اُتر جائے گا! انگھم نکل بھاگا ہے۔ پولیس اُس کے پیچھے ہے بس تفصیل پھر بتائی جائے گی۔"

ریسیور رکھ کر وہ پھر اپنی جگہ آ بیٹھی... روشی نے کہا...

"تمھیں پولیس کی موجودگی میں ایسا نہ کرنا چاہیے تھا۔ اب میں تفصیل معلوم کرنے پر مجبور ہوں۔"

"گک... کیوں... تت تمھارا وہ پاگل دوست!"

"پاگل نہ کہو... یہاں کا بہت بڑا دماغ ہے۔"

"بے شک... بے شک... اسے تسلیم کرنا پڑے گا۔"

"تفصیل مسز گوہن...؟"

"یہ تجویز انگھم ہی کی تھی کہ ہماری تنظیم سے تعلق رکھنے والے سارے مرد اپنی اپنی ٹائی کی گرہ پر پیتل کے اسٹار لگایا کریں، تاکہ آپس میں پہچانے جاسکیں... وہ اسٹار بھی خود اُسی نے فراہم کیے تھے۔ خود بھی لگاتا تھا۔ تمھارے دوست نے اس ہاتھ کے ریسیور کے بارے میں جو انکشاف کیا ہے اس کے مطابق وہ اسٹار ہی رچرڈسن کی موت کا باعث بنا ہوگا۔"

"تنظیم کے بارے میں کچھ نہ بتاؤ گی؟"

مسز گوہن نے اس سوال پر خاموشی اختیار کرلی۔

ریناولیمز اُسے غصّے اور نفرت سے گھورے جارہی تھی۔

اِتنے میں عمران کی آواز سُنائی دی۔ "میں آرہا ہوں۔ کہیں فائر نہ کر بیٹھنا کپتان صاحب...!"

پھر وہ اندر آیا تھا... کیپٹن فیاض نامی گن سنبھالے اُس کے پیچھے تھا۔

"مسز گوہن...!" عمران نے بڑے شرمیلے انداز میں کہا۔ "کیا ہم کہیں الگ چل کر ذرا دیر گفتگو کرسکتے ہیں؟"

"اب نہیں ہوسکتا..." فیاض جھنجلا کر بولا۔

"دیکھو... تمھارا ماتحت زخمی ہے... اس کے لیے فرسٹ ایڈ ضروری ہے...!"

"نہیں...!"

"اچھا تو سُنو... کیپٹن فیاض... میں بتاتا ہوں کہ مسز گوہن کٹّر مذہبی عیسائیوں کی اُس تنظیم سے تعلق رکھتی ہے جو دُنیا پر صیہونی غلبے کے خلاف جدّوجُہد کررہی ہے۔"

"تت... تم کیا جانو..." مسز گوہن بوکھلا کر بولی۔

"تمھارا اتنا ہی کہنا کافی تھا... کہ تم ایک مُحبِّ وطن عیسائی ہو۔ صیہونیت ساری دُنیا پر اپنی بالادستی چاہتی ہے۔ اس کے خلاف کام کرنے والی کوئی بھی تنظیم ہماری دُشمن نہیں ہوسکتی...!"

"لیکن یہ کشت وخون...؟"

"تم فی الحال صرف ریناولیمز سے سروکار رکھو... جب تک انگھم ہاتھ نہ آجائے تمھاری رپورٹ میں مسز گوہن کی طرف ہلکا سا اشارہ بھی نہ ہونا چاہیے۔"

"ہوں... اچھا... لیکن تم علٰحدگی میں کیا باتیں کرنا چاہتے تھے؟"

"اب کچھ بھی نہیں... جو مسز گوہن سے سُننا چاہتا تھا خود کہہ چکا ہوں۔ تمھاری وہ فورس ابھی تک نہیں پہنچی!"

"پھر رنگ کرتا ہوں۔" فیاض کہتا ہوا فون کی طرف بڑھا ہی تھا کہ بیّتی مُراد اندر گھس آیا۔ اس کے سارے کپڑے پھٹے ہوئے تھے... اور جگہ جگہ سے خون رِس رہا تھا۔

وہ سب اُس کی طرف متوجہ ہوگئے لیکن وہ صرف عمران کو گھورے جارہا تھا۔

"تت... تم آخر ہو کیا بلا؟" وہ بالآخر بولا۔

"اندرونی ہیچ... تم اب تک کہاں تھے؟"

"جھاڑیوں میں چھپتا پھر رہا تھا... اور باہر تاریکی میں جھینگر جھائیں جھائیں کیے جارہے تھے...!"

آپ کی عدالت

500,00 روپے انعام

قارئین کرام!

- ● یہ انعامی مقابلہ مارچ ۱۹۷۹ء کے خاص شمارے سے شروع کیا گیا تھا اور اس کی انعامی رقم تین سو روپے تھی جسے بڑھا کر اس خاص شمارے سے پانچ سو روپے کردیا گیا ہے۔ اس انعامی مقابلے میں جو مقدمات پیش کیے جاتے ہیں وہ مختلف ممالک کی عدالتوں میں زیرِ سماعت رہ چکے ہیں اور ان کا قانونی تقاضوں کے مطابق فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس لیے ہمارے نزدیک وہی جواب دُرست ہوگا جو اس مقدمے کے جج نے اپنے فیصلے میں لکھا ہے۔ یہ فیصلہ ہمارے پاس محفوظ ہے۔
- ● بنیادی طور پر یہ سلسلہ قارئین کی تفریح کے لیے پیش کیا جارہا ہے۔ اس سلسلے کو حتمی قانون نہ سمجھا جائے۔ کسی مقدمے کو حوالے کے طور پر کسی عدالت میں استعمال نہ کیا جائے کیونکہ ہر ملک کا اپنا اپنا قانون ہے۔ امریکی ریاستوں میں تو حالات کے تحت قوانین میں تبدیلیاں ہوتی ہی رہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی مقدمے کے فیصلے کو ہر جگہ یا مماثل موقعوں پر حوالے کے طور پر استعمال نہیں کیا جاسکتا۔
- ● اس مقابلے میں شرکت کی کوئی فیس نہیں ہے، صرف ٹوکن اپنے جواب کے ساتھ ارسال کیجیے۔
- ● تمام فیصلے ہر ماہ کی دس تاریخ تک دفتر میں پہنچ جانے چاہئیں۔ مقررہ تاریخ کے بعد موصول ہونے والے جوابات مقابلے میں شامل نہیں کیے جائیں گے۔
- ● اپنا فیصلہ صاف ستھرا اور کاغذ کے ایک طرف لکھیے۔ ایسی تحریریں انعامی مقابلے میں شریک نہیں کی جائیں گی جن کو پڑھنے میں دُشواری ہو۔
- ● ہر ٹوکن کے ساتھ صرف ایک ہی فیصلہ بھیجا جاسکتا ہے۔ ٹوکن پر اپنا نام اور پتا صاف صاف لکھیے۔
- ● ایک سے زائد قارئین کا فیصلہ درست ہوا تو انعام کی رقم سب میں برابر برابر تقسیم کردی جائے گی۔
- ● ہر ماہ انعام حاصل کرنے والوں کے ناموں کا اعلان کردیا جائے گا اور ہر ماہ کی ۲۵ تاریخ تک انعامی رقم منی آرڈر سے بھجوا دی جائے گی۔ اگر کسی کو انعام کی رقم نہ ملے تو وہ ایک ماہ کے اندر اندر اطلاع دے کر اپنی رقم منگوالے۔ اس کے بعد ادارہ اس رقم کا ذمے دار نہ ہوگا۔
- ● انعامی مقابلے کے مقدمے سے کسی ملکی مقدمے کی مماثلت محض اتفاقیہ ہوگی۔
- ● اس مقدمے میں ادارے کے افراد یا اعزازی کاپیاں حاصل کرنے والے افراد حصّہ نہیں لے سکتے۔

اپنے فیصلے اس پتے پر بھیجیے
آپ کی عدالت
پوسٹ بکس نمبر ۲۱۴۷، ناظم آباد، کراچی ۱۸

ٹوکن
آپ کی عدالت
۴۸

نام ________________________

پتا ________________________